حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ
کی
سیاسی ڈائری
اخبار و افکار کی روشنی میں
جلد پنجم
تواریخ و سنین مختلفہ
عطا فرمودہ
جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ العالی
تالیف و تدوین
ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا

سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

کی

سیاسی ڈائری

اخبار وافکار کی روشنی میں

جلد پنجم

عطا فرمودہ

جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی مدظلہ العالی

(استاذ الحدیث دار العلوم دیوبند و صدر جمعیت علماء ہند)

تالیف وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

باہتمام: محمد ناصر خان

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

New Delhi - 110002

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی

سیاسی ڈائری

(جلد پنجم)

تالیف وتدوین .... ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

باہتمام .... محمد ناصر خان

صفحات 580

اشاعت 2018ء
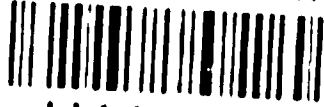
Maulana Sayyad Hussain Ahmad Madani (R.A.) Ki

Siyasi Diary

Akhbâr wa Afkâr Ki Roshni Mein

(Vol. 5)

Compiled by : Dr. Abu Salman Shahjahanpuri

Edition : 2018

Pages : 580

ناشر

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2

Ph.: 011-23289786, 23289159 Fax: 011-23279998

E-mail: faridexport@gmail.com | Website: faridexport.com

Printed at : Farid Enterprises, Delhi-2

عرض ناشر

بحمد اللہ، ادارہ فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمیٹڈ) قرآن حکیم، احادیثِ مقدسہ، اسلامی تاریخ، فقہ، تبلیغی، اصلاحی، ادبی اور دیگر علوم وفنون پر اہم کتابوں کی طباعت واشاعت کے لیے پورے عالم اسلام میں مشہور ومقبول ہے۔ ادارہ کی اس نمایاں کامیابی میں اللہ رب العزت کی بے پایاں رحمت ونصرت اور بانی ادارہ خادم قرآن الحاج محمد فرید خاں مرحوم کا دینی وملی خلوص اور دعائیں شامل ہیں جنھوں نے قرآن مجید اور دینی لٹریچر کی اشاعت کو غیر منفعتی تبلیغی مشن کے طور پر جاری کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بانی ادارہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخِ آزادی علمائے دیوبند کے بے مثال جذبہ حریت اور جہدِ مسلسل سے روشن ہے۔ حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہم اللہ کے جانشین عظیم مجاہد آزادی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی ذاتِ گرامی اسلامی ہند کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ زیر نظر کتاب

"حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری: اخبار وافکار کی روشنی میں"

شیخ الاسلامؒ کی حیات، علمی، دینی وملی خدمات اور وطن کی آزادی میں عدیم المثال قیادت کی مستند ومعتبر دستاویز ہے جسے نامور اسلامی دانشور حضرت مولانا ابوسلمان شاہجہانپوریؒ نے مدون کیا ہے۔

ادارہ فرید بک ڈپو کو بجا طور پر فخر ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی سوسالہ تقریبات کے سلسلے میں اکابرینِ جمعیۃ علماء ہند کی یاد میں ان شاہکار کتابوں کو شائع کرنے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی ہے۔

اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ 'چراغِ مدنی' اسی آب وتاب سے روشن رہے اور دار العلوم دیوبند وجمعیۃ علماء ہند ملتِ اسلامیہ کی خدمت، حفاظت اور قیادت کی شاہراہ پر پیش رفت کرتے رہیں۔ آمین۔

خادم قرآن

(الحاج) **محمد ناصر خان**

اللهم صل على محمد النبي
الأمي وعلى آله وسلم تسليما

نذرِ عقیدت

اللہ تعالیٰ نے جس کام کی انجام دہی کی ہمت اور توفیق عطا فرمائی، اس کا ہزار بار نہیں لاکھ بار شکریہ! صبح و شام نہیں زندگی کے ہر لمحے اور زندگی بھر شکریہ! لیکن اس کے احسان اور ہمت و توفیق کے شکریے کا تو میں ایک شمہ حق ادا نہیں کر سکتا۔ پھر بھی اس کی شفقت اور فضل و کرم سے امید یہی رکھتا ہوں کہ وہ اس محنت کو قبول فرمالے گا!

اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بات ہرگز بعید نہیں کہ وہ آسمان سے ہمت و توفیق کے فرشتوں کو اپنے کسی بندے کی نصرت و ہمت افزائی کے لیے زمین پر بھیج دے، لیکن اس کی سنت یہ ہے کہ اپنے بندے کے دل میں ہمت و عزم کا بیج بو دیتا ہے اور اس کی سیرابی و ہمت افزائی اور حفظ و دفاع کے لیے گرد و پیش کی فضا کو سازگار بنا دیتا ہے۔ خدا نے حضرت شیخ الاسلامؒ اور ان کے خانوادۂ مقدس و معظم کی خدمت میرے مقدر میں لکھ دی تھی۔ اس کی مثال ایک درخت کی سی تھی جس کی جڑیں زمین میں اور شاخوں کا فضا میں پھیلاؤ وسیع اور پتے گھنے ہوں، جس کے سایے میں تھکے ماندے مسافر آرام کرتے ہوں اور پھلوں سے کام و دہن کی لذت حاصل کرتے ہوں اور تازہ دم ہو کر سفر کی اگلی منزل کو روانہ ہو جاتے ہوں۔

میں تنہا اور ناتواں تھا اور لاچار و نادان تھا۔ اس نے میرے لیے فضا کو سازگار اور موسم کو خوش گوار بنا دیا۔ سرپرستی اور رہنمائی کے لیے حضرت مخدومی و مطاعی قاری شریف احمد دہلوی دامت برکاتہم کو، نصرت و ہمت افزائی کے لیے محترم قاری رشید احمد ذام عنایتہ کو، اور دوستی و دل داری اور خدمت کے لیے عزیزی مکرم مولوی حافظ تنویر احمد شریفی سلمہٗ کو مستعد کر دیا۔ والحمد للہ علی ذالک

یہ اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ گذشتہ ۲۰، ۲۲ برس کے عرصے میں اپنی کسی ضرورت کے لیے نہ تو ہاتھ سمیٹ لینے کی ضرورت پیش آئی اور نہ آستانۂ شریفی سے باہر دیکھنا پڑا۔ الحمد للہ! اسی کی یہ دولت میں دل جمعی کے ساتھ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری کی تالیف و تدوین کی خدمت بجا لا سکا۔

اللہ! تو اس ناکارۂ خلایق کے کارِ شوق کو قبول فرمالے۔ آمین!

(ا۔ س۔ ش)

حرفِ حقیقت

جس طرح انسان کے لیے دل و دماغ اور آنکھ، ناک، کان اور دیگر اعضا و جوارح کی ضرورت ہوتی ہے اور چھوٹے سے چھوٹا عضو بھی اپنی ناقابلِ تبدل اہمیت رکھتا ہے۔ انسانی جسم کا اگر کوئی عضو پیدائشی طور پر یا کسی حادثے کی بنا پر عمل کی فطری صلاحیت کھو چکا ہو تو انسان صبح و شام پیش آنے والی اپنی ضرورتوں کو بھی پورا نہیں کر سکتا۔ چھوٹے سے چھوٹے عضو کے وجود اور اس کی صلاحیتِ کار پر ہم اللہ کے انعامات کا شکر ادا کرتے اور اپنی بندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔

اسی طرح انسانی معاشرے میں امرا، حکام، فضلا اور کسی لحاظ سے اونچے درجے کے افراد، خاندانوں، پیشہ وروں اعلا دماغوں اور تعلیم یافتوں کے معاشرے میں غریبوں، مزدوروں، کسانوں، مددگاروں، خدمت گذاروں اور معمولی کام کرنے والوں کی بھی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے، جن کے بغیر ہم نہ معاشرے کی ترقی کی امید کر سکتے ہیں اور نہ انسانی زندگی کی راحت کا کوئی تصور کر سکتے ہیں۔ انسانی زندگی کا حسن خدا نے اس میں رکھا ہے کہ معاشرتی زندگی میں ہر شخص کو اپنے درجے کا احساس ہو اور وہ اس کے فرض کی ادائیگی کے لیے مستعد ہو۔ اس حقیقت کو ہم اپنی زندگی کے ہر دائرے میں دیکھ سکتے ہیں۔

آج جب کہ ہم حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈائری کی تکمیلی جلد کو پیش کر رہے ہیں تو خیال آتا ہے کہ اگر ہمیں اس کے لیے خوش نویس، کمپوزر، پریس کے مشین مین اور جلد سازی کے فن کار کا بروقت تعاون حاصل نہ ہوتا تو ہم خوشی اور مسرت کے یہ لمحات کیوں کر پا سکتے تھے! اس موقعے پر ہم کمپوزر، مشین مین اور بک بائنڈر کو کیوں کر بھول سکتے ہیں؟ ہمیں ان حضرات کا گذشتہ دس برس میں کارِ درپیش کے ہر موڑ پر ان کا تعاون میسر آتا رہا ہے۔ ہم ان کے شکر گذار ہیں!

ناظم امورِ عامہ و طباعت و اشاعت
مجلس یادگارِ شیخ الاسلامؒ پاکستان۔ کراچی

اظہارِ مسرت

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی سیاسی ڈاری کے جلدوں کی اشاعت اس جلد پر مکمل ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ یہ کام جو اب ہندوستان میں نہیں ہو سکتا تھا، پاکستان میں ہو گیا، ہمارے یہاں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ کام کر سکتے تھے، ان کے بعد کوئی نہیں ہے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری صاحب نے اس کام کو اپنی مصروفیات میں شامل کیا اور ایک طویل عرصے تک تحقیق میں مشغول رہے اور ساتھ ساتھ ڈاری کی اشاعت ہوتی رہی۔

اس کی اشاعت میں حضرت مدنی رحمہ اللہ سے تعلق رکھنے والے حضرت قاری شریف احمد صاحب زادمجدہٗ نے سرگرم حصہ لیا۔ اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازے۔

مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ اس ڈاری کی ترتیب و تحقیق اور نشر و اشاعت میں جس جس کا بھی حصہ ہے وہ سب اسی مکتبۂ فکر (جماعت شیخ الہندؒ) سے وابستہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو مقاصدِ حسنہ میں کامیاب فرمائے۔ آمین

(حضرت مولانا سید) ارشد مدنی (مدظلہ)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
کی سیاسی ڈائری (جلد پنجم) ایک نظر میں

مقدمہ

جمعیت علمائے ہند کے صدر نشیں حضرت مولانا سید اسعد مدنی علیہ الرحمہ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۷ء میں کراچی میں ہوئی۔ وہ نہایت شفقت سے پیش آئے اور دیر تک میرے تصنیف و تالیف کے پس منظر، میرے شوق کے موضوعات اور پیش نظر کاموں اور آیندہ کے منصوبوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ہندوستان کے سفر کے لیے دعوت دی اور ملاقات ختم ہوگئی۔ ۱۹۸۸ء میں حضرت پھر کراچی تشریف لائے۔ میں خدمت میں حاضر ہوا۔ اس مرتبہ ہندوستان کے سفر کے لیے اصرار فرمایا۔ میں نے عزم ظاہر کیا۔ فرمایا: آیئے، ضرور آیئے اور جلد آیئے! محترم قاری رشید احمد مدظلہ نے مجھ سے پوچھا: مولانا سے آپ کی ملاقات کیسی رہی؟ میں نے تفصیل بتائی اور کہا میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ حضرت کو میرے ہندوستان کے سفر پر اصرار کیوں ہے؟ جانے کو تو میرا بھی جی بہت چاہتا ہے! قاری صاحب نے فرمایا: اب آپ ہندوستان ہو آیئے، آپ کی آرزو بھی پوری ہو جائے گی اور حضرت مولانا کے اصرار کی علت بھی معلوم ہو جائے گی۔

جولائی ۱۹۸۸ء میں میں دہلی پہنچ گیا۔ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا بہت خوش ہوئے اور شفقت سے پیش آئے۔ میرا پروگرام معلوم کیا۔ جمعیت علمائے ہند کے شعبۂ افتا کے ایک نوجوان اور مستعد مفتی صاحب کو مقرر فرمایا کہ ابوسلمان صاحب جہاں جانا چاہیں اور جس سے ملنا چاہیں انھیں لے جایئے، ملایئے اور پورے سفر میں ان کے ساتھ رہیے۔ سب سے پہلے انھیں دارالعلوم دکھالایئے اور مولانا ارشد میاں کو فون کر دیجیے۔

دوسرے روز مفتی صاحب کے ساتھ دیوبند روانہ ہوگیا۔ مولانا سید ارشد میاں بہت محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ اپنے گھر طالبات کے مدرسے میں قیام کا انتظام کیا۔ یہیں حضرت شیخ الاسلامؒ کے بڑے داماد مولانا رشید الدین حمیدیؒ سابق مہتمم جامعۂ قاسمیہ مدرسۂ شاہی مرادآباد سے ملاقات ہوئی۔ انھیں معلوم ہوا کہ میں مدرسۂ شاہی کا طالب علم رہا

ہوں تو بہت خوش ہوئے اور مصر ہوئے کہ صبح میرے ساتھ مراد آباد چلو۔ جی میرا بھی چاہتا تھا کہ مراد آباد جاؤں اور مدرسے کو دیکھوں، جس میں چند سال طالب علمانہ زندگی کے گزارے تھے، لیکن ۱۵، ۲۰ دن جو میں نے ہندوستان کے سفر کے لیے نکالے تھے، ان میں مراد آباد کا سفر ممکن نہ تھا۔ معذرت کے سوا چارہ نہ تھا۔ مولانا فجر کے فوراً بعد مراد آباد جانے کے لیے تیار تھے۔ میں دیو بند پہنچنے کے فوراً بعد دارالعلوم کی عمارت کو کچھ اندر باہر سے دیکھ چکا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوا تھا کہ مفتی صاحب تشریف لے آئے ان کے ساتھ پھر نکلا اور اطراف میں گھوم پھر کر اندر کی مختلف عمارتوں کا نظارہ کیا۔ اسی دوران مفتی صاحب کے ایک واقف مل گئے، ان کے ساتھ ان کے کمرے میں گیا، انھوں نے چائے سے تواضع کی۔ جامع رشید زیر تعمیر تھی، سامان تعمیر چاروں طرف دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور ایک روز پہلے زوردار بارش ہو چکی تھی۔ پانی اور کیچڑ نے مسجد کو گھیر لیا تھا۔ اس کا وہ حسن جس نے ۲۰۰۵ء کے سفر میں متحیر کر دیا تھا۔ پانی، کیچڑ کے موسم میں اس کا تصور نہ کیا جا سکتا تھا۔

دو پہر کو مخدوم زادۂ محترم مولانا ارشد مدنی مدظلہ خوان سجا کر لائے۔ اس کے ساتھ کپڑے میں لپٹا ہوا کوئی صحیفہ سا تھا، جسے انھوں نے الگ رکھ دیا اور دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ کھانے کے بعد مولانا نے چند جملے ارشاد فرمائے: آپ کا مدت سے انتظار تھا، آپ کے لیے ایک امانت رکھی تھی، مولانا سید محمد میاںؒ کے انتقال کے بعد کوئی نہیں جو اس کا حق ادا کر سکے۔ یہ بات مشورے سے طے پائی تھی۔ یہ حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈائری ہے، آج اس امانت کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام!

اس بیان کی زبان اور مطالب کی ترتیب میں شک ہو سکتا ہے، مفہوم کی تفصیل اور سچائی میں شبہ نہیں۔ یہ گفتگو فرماتے ہوئے بستہ کھولا اور دو کاپیاں نکال کر میرے ہاتھوں میں تھما دیں۔

مولانا ارشد مدنی کا کلام سن کر اور ان کا اعتماد دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈائری کی ترتیب و تدوین کے بارے میں آں محترم نے مجھ نیاز مند پر جو اعتماد فرمایا، مجھے معلوم نہیں کہ اس مشاورت اور فیصلے میں کون کون صاحب شریک تھے، لیکن فدائے ملت صدر نشین جمعیت علمائے ہند حضرت مخدوم زادۂ معظم مولانا سید اسعد مدنی علیہ

الرحمہ کے نہ صرف شریکِ مشورہ ہونے میں بلکہ تجویز کے محرک ہونے میں بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خاک سار کے لیے یہ بہت فخر کی بات تھی۔ حضرتؒ کے ایک دورافتادہ ارادت مند پر اس درجے اعتماد! میں اس کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا۔ میرے اوپر جو ذمے داری ڈالی گئی تھی، میں نے اسے قبول کرلیا تھا۔ میں نے کہا: مولانا! دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اس ذمے داری کو اٹھانے اور آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی مجھ میں قوت اور صلاحیت پیدا کرے۔

یہ اعتماد صرف تحریر و نگارش پر نہیں ہوسکتا تھا، اس کا دایرہ اس سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ خاندان کے بعض بزرگوں، بعض اساتذہ اور مدرسۂ شاہی۔ مرادآباد کی صحبتوں اور دین و سیاست کی مجموعی معطر فضا نے میرے قلب نے اثرات قبول کیے تھے اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ اور حضرتؒ کے انقلابی سلسلے کے بزرگوں سے رشتۂ عقیدت و نیاز استوار اور مستحکم کردیا تھا۔ اس لیے وہ ڈایری جس کی ترتیب و تدوین مؤرخِ ملّت مولانا سید محمد میاں مرحوم کو کرنی تھی، تو یہ صرف حضرت شیخ الاسلامؒ کی ذات گرامی مرتبت اور حضرتؒ کے اسلاف و اخلاف کے سیاسی افکار و خدمات اور خصایصِ اخلاق و تہذیب کے تذکار کی ترجمانی تک محدود نہیں رہ سکتی تھی اور نہ کسی جماعت کے افکار و فلسفۂ سیاسی اور اس کی سرگرمیوں کا بیان اس کی آخری حد ہوسکتی تھی۔

دیوبند کا تاریخی مدرسہ:

مدرسۂ عربیہ۔ دیوبند کا قیام ۱۵؍محرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ ۳۰؍مئی ۱۸۶۶ء کا واقعہ ہے۔ اس کا آغاز مسجد چھتہ میں ایک انار کے درخت کے نیچے عمل میں آیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعے کے ظہور کو اس وقت تک نو برس گزرے اور واقعے کے اختتام کی تاریخ کو ملحوظ رکھا جائے تو نو برس کی مدت کم از کم ایک سال اور کم ہوجاتی ہے اور ہنگامے کے اختتام کو ملکۂ وکٹوریا کے اعلان نامۂ معافی کو حد قرار دیا جائے تو یہ مدت گھٹ کر سات سال سے زیادہ نہیں رہتی۔ اس وقت تک ملکی فضا میں چھائی ہوئی دہشت بھی دور نہ ہوئی تھی اور ملک جن حالات سے گزر رہا تھا، لوگوں کے حواس بھی درست نہ ہوئے تھے کہ بزرگان دیوبند نے ردِ عمل کا سفر شروع کردیا تھا اور نئے محاذوں نے قیام کے سروسامان سے تحریک آزادیٔ وطن کے نئے

دور کا آغاز کر دیا تھا۔

مدرسۂ عربیہ کا قیام دراصل مجاہدین آزادی کی تربیت گاہ کا قیام تھا۔ فکری اور ذہنی تربیت کے لیے اولاً ثمرۃ التربیت، ثانیاً نظامِ جمعیۃ الانصار اور اسی مرحلہ تربیت کا اگلا قدم نظارۃ المعارف القرآنیہ کا قیام تھا اور میدان جنگ کی تلاش اور اعوان و انصار کی جستجو کے لیے اکتوبر ۱۹۱۵ء میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کابل کے لیے اور حضرت مولانا محمود حسن حجاز کے سفر اور ترکی، جرمنی وغیرہ کا تعاون حاصل کرنے اور وقت سے فایدہ اٹھانے کے لیے وطن سے نکلے تھے۔

اگر مدرسۂ دیوبند کے قیام پر نظر ڈالی جائے تو اس کی تاریخ مسلم دورِ حکومت کے عہدِ زوال سے شروع ہوتی ہے اور تقریباً اسی دو سو برس کی علمی، تہذیبی تاریخ اور مسلمان حکومت کی شکست و ریخت نے حضرت شیخ الاسلامؒ کی شخصیت کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ جن حالات نے مدرسۂ دیوبند کو وجود بخشا تھا انھیں حالات نے حضرتؒ کی شخصیت کی تعمیر اور ذہن و فکر کی نشو ونما میں حصہ لیا تھا۔

جس زمانے میں حضرت شیخ الاسلامؒ مدرسہ کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث بنائے گئے تھے یہ مدرسہ ایک عظیم الشان دار العلوم اور ایک مستقل جامعہ کی خصوصیات کا حامل بن چکا تھا اور مولانا سید حسین احمد مدنی اس کے پورے نظامِ تعلیم و تدریس کے مسایل، اساتذہ کی رہنمائی، طلبہ کی تعلیم و تربیت، دار العلوم کے بے شمار مسایل اور اس کے استحکام و بقا کے افکار و انتظام کے مرکز میں اور پورے برِ اعظم ہند پاکستان میں دینی مدارس کے پھیلے ہوئے نظام کی مرکزی اور رہنما شخصیت تھے۔ حضرتؒ کی راہ میں بے شمار مشکلات تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں تدبر و بصیرت اور حکمت کے اوصاف سے متصف فرمایا تھا، ان کی روشنی میں وہ ان آزمایشوں سے کامیاب اور سرخ رو گزرے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک!

دیوبندی مکتبِ فکر:

دیوبند ایک دینی اور سیاسی مکتبِ فکر بھی تھا اور اس کے حوالے سے ان کی ذمے داریاں صرف اس کے زمینی حدود تک ہی نہ تھیں۔ اس کی خصوصیات نے انیسویں صدی

کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستان کے علمی، تعلیمی اور دینی ذوق وفکر کی ایک دنیا پیدا کردی تھی، جس کے رجال علم وعمل، افکار وسیر اور اخلاق وتہذیب کے سانچوں میں ڈھلے براعظم کے ہر سہ ممالک (ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش) اور ان کے اطراف میں جنوب مشرقی ایشیا سے افریقہ ویورپ کے ممالک تک چلتے پھرتے نظر آتے اور اپنی خصوصیات سے پہچانے جاتے تھے، جن کے ذوق وخدمات، افکار دینی وملی اور آثارِ علمیہ نے تصنیف و تالیف اور تعلیمی وتہذیبی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات ۱۹۲۸ء سے اپنی وفات ۱۹۵۷ء کے اختتام تک دیوبند کے دارالعلوم اور دینی مکتبِ فکر کی سب سے بڑی اور مرکزی رہنما شخصیت تھی۔

سیاسی مکتبِ فکر:

دارالعلوم دیوبند کے بانی بزرگوں نے جو دیوبندی مکتبِ فکر کے بانی بھی تھے، اپنے اخلاف کے لیے دینی ذوق وفکر، علم وعمل اور اخلاق وسیرت کی جو میراث چھوڑی تھی، اس میں مسلمانوں کی عام دنیاوی زندگی، اس کی اجتماعی، معاشی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کے ان تمام مسایل میں اسلام کے جادۂ قویمہ پر ان کی رہنمائی بھی کی تھی۔ اس کا ایک اہم جز بلاتفریقِ مذہب وملت خدمتِ خلق تھی اور ایک خدا کی بندگی کے سوا، ہر قسم کی بندگی (غلام بن کر جینے کی تمام قسموں) کو وہ خواہ ذہنی وفکری، خواہ جسمانی، خواہ معاشی واقتصادی اور خواہ سیاسی ہو، انھوں نے انسانیت کے لیے موجب شرم اور آزادی کو انسانیت کا شرف قرار دیا اور اس سے نجات پانے کی سعی کو ہر انسان پر اس کی قوت واستعداد کے مطابق لازم قرار دیا ہے۔ نیز غلامی سے نجات پانے یا آزادی کے حصول کے ان تمام طریقوں، ذریعوں، وسیلوں اور آلات کو انھوں نے جو انسانیت کے لیے توہین آمیز اور اس کے شرف کے خلاف نہ ہوں، روا قرار دیا ہے۔

فرایض قومی کی ادائیگی اور مقاصد کے حصول کے لیے اقطار عالم میں، مسلمانوں کی تاریخ کے ہر دور میں پختہ وپاکیزہ سیرت، بلند خیالات، ایثار وقربانی اور جہد وسعی کی بہترین

مثالیں ملتی ہیں۔ ہندوستان میں اس پاکیزہ سیرت اور ان خصوصیات کا پیکر حضرت شیخ الاسلامؒ کی ذات والاصفات تھی۔

دعوت وارشاد کا میدان:

دیوبند کے حوالے سے ایک اور خصوصیت کا ظہور ہوا۔ وہ دیوبند کے دارالعلوم اور دیوبندی مکتبِ فکر سے الگ اور مستقل دایرۂ خدمت دین اور اصلاح المسلمین ہے۔ یہ مدرسۂ دیوبند اور مکتبِ فکر سے الگ اپنی خصوصیات رکھتا ہے۔ میرا اشارہ اس سرچشمۂ فیض کی طرف ہے جسے سلوک وتصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حقیقی سلوک محبت وعقل کا جامع ہے۔ وہ نہ محض عشق ومحبت ہے کہ دیوانہ بنادے، نہ محض عقل کہ خدا اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں اور ان کے پیغام کو بھلا کر بندے کو ان سے دور اور ان کا منکر بنا کر خدا کی رحمت سے اُس کی محرومی کا موجب ہو اور ہر دو انتہاؤں میں اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کو فراموش کردے۔ دیوبند کے بزرگوں اور بانیوں میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے تلامذہ ومریدین میں مولانا محمود حسن اور اُن کے مریدوں اور شاگردوں میں مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے سلسلۂ سلوک وتصوف میں آخری روشن اور تابندہ مولانا سید اسعد مدنی رحمہم اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ یہ تمام بزرگ اپنے عقاید واعمال میں اتنے متوازن، دین ودنیا کے دایروں اور ان کی ذمے داریوں سے ایسے آشنا، قوم وملت کے فرایض اور مخلوقِ خداوندی کے حقوق کی ادائیگی میں ایسے عادل تھے کہ چراغ لے کر دنیا میں ڈھونڈا جائے تو شاذ کے درجے ہی میں شاید کوئی مل سکے۔ ایسے خدا پرست اور انسانیت کے خدمت گذاروں سے دنیا کبھی خالی نہیں ہوتی۔ خدا کے نظام شمسی کی طرح یہ بھی ایک خدائی نظام ہے۔ یہاں بھی ثوابت وسیارے ہیں اور مخلوق کو فیض رسانی کے لیے ان کے ظہور ونمود اور طلوع وغروب کا بالکل اسی طرح ایک سلسلہ قایم رہتا ہے۔ یہ ہمارے بزرگ اسی نظام ہدایت کے سیاروں میں سے تھے جن کا اپنے وقت پر ظہور ہوا۔ ہدایت وخدمت خلق کا فرض انجام دیا اور اپنا اپنا دور پورا کر کے رحمتِ الٰہی کے جوار میں جا بسے!

حضرت شیخ الاسلامؒ کی جامعیت اور میری مجبوری:

حضرت شیخ الاسلامؒ کی شخصیت تاریخ، مذہب، سیاست، تعلیم و تدریس، سلوک و طریقت اور علم و عمل کی جامع جہات تھی اور خاک سار ہر علم و فن سے محض نا آشنا اور ذوق سے محروم تھا۔ میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ کسی ایک گوشے میں پناہ لوں! اور سیاست ہی ایک ایسا گوشہ نظر آیا جس میں پناہ لے سکتا تھا اور کچھ نہ کچھ کام بھی ہو جانے کی توقع تھی۔

سیاسی گوشے میں پناہ لینے میں میرے ذوق کی تسکین کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ میں نے جب ۱۹۶۰ء میں تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا تھا تو یہ عہد بھی کیا تھا کہ کسی مذہبی بحث میں کبھی نہ پڑوں گا اور عملی سیاست میں کبھی حصہ نہ لوں گا۔ اس صورت میں میرا یہ عہد بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔ قلب کی تسکین کے کئی اور پہلو بھی تھے:

۱۔ میری ایک کم زوری ''جہالت'' کی پردہ پوشی کی فکر تھی کہ میں دین اور سلوک و تصوف سے محض نا آشنا ہوں!

۲۔ جمعیت علماے ہند آزادی وطن کی صبح ہی کو لکھنؤ کی میٹنگ میں سیاست سے علاحدگی کے فیصلے کا اعلان کر چکی تھی اور

۳۔ حضرت شیخ الاسلامؒ ۶ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو دنیا سے انتقال فرما کر جوارِ رحمتِ الٰہی میں پہنچ چکے تھے اور اس واقعے پر تیس برس پورے ہو چکے ہیں اور اس سے پہلے کی ہر بات خواہ وہ حضرت شیخ الاسلامؒ اور امام الہندؒ اور جمعیت علماے ہند کی سیاست ہو، یا مسلم لیگ کی سیاست ہو۔ مسٹر محمد علی جناح کے سوانح و سیرت ہوں یا تحریک پاکستان کے نتائج پر نقد و تبصرہ ہو، کوئی بات سیاست نہیں ''تاریخ سیاست'' بن چکی ہے۔ اب اگر کوئی حکومت یا کوئی صاحب اقتدار یا صاحبِ اثر ورسوخ کسی مبصر، تنقید نگار یا مورخ کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ہے تو یہ اس کا حدود سے تجاوز ہوگا۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈاری کی ترتیب و تدوین کے کام کا اسی اصول کے تحت آغاز کیا تھا اور اس کی زیرِ نظر آخری جلد پریس کے حوالے کیے جانے اور اس کے مقدمے کی تالیف کے موقع پر میں نہایت خوش ہوں اور وَاَمَّا بِنِعْمَتِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کی حد تک اس

پر فخر کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس خدمت کی توفیق بخشی۔ میں اس قابل نہ تھا، سفر طویل تھا، راہ مشکل اور آزمایش سخت تھی، لیکن اس کا فضل و رہنمائی شاملِ حال تھی، اس نے منزل پر پہنچا کر سرخ رو کیا۔

ولی اللّٰہی تحریک کے دورِ آخر کی رہنما شخصیت:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فکر و فلسفے نے جو تحریک پیدا کر دی تھی اس کے مختلف ادوار میں اسلام کے شیدائیوں اور وطن کی آزادی کی راہ میں اصحابِ عزیمت و رجال کار کے جو نادر الوجود نمونے پیدا کر دیے تھے، جن کی مثالیں حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک ملتی ہیں، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اسی سلسلۂ اصحابِ عزیمتِ دعوت کی ایک نادرِ روزگار اور یادگار شخصیت تھے۔ جمعیت علماے ہند کے رہنما اور اس کے صدر کی حیثیت سے انھیں قدم قدم پر سخت آزمایشوں سے گزرنا پڑا۔ ہر آزمایش سے وہ کامیاب اور سرخ رو گزرتے، تا آں کہ برِاعظم ہند پاکستان کی تحریک آزادی اپنی منزل مراد کو پہنچ گئی۔

حضرت شیخ الاسلامؒ-ایک سیاست داں:

حضرت شیخ الاسلامؒ ۱۹۴۰ء سے جمعیت علماے ہند کے صدر تھے، لیکن ان کی رہنمائی کا دایرہ صرف جمعیت کی صدارت تک محدود نہ تھا۔ ٹھیک اسی وقت کانگریس کے لیڈر بھی تھے۔ وہ کانگریس کے ان رہنماؤں میں سے تھے جنھوں نے کانگریس کو فرقہ پرستی کی سیاست اختیار کرنے سے روک رکھا تھا اور فرقہ وارانہ مسایل میں اسے ایک سیکولر جماعت بننے پر مجبور کر دیا تھا اور ایسے حالات میں کہ لیگ کی قیادت نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ ہندو پاکستان کے مطالبے کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ انھیں ان کے مطالبے کے مطابق ملک تقسیم کر کے مسلمانوں کا حصہ دے دیا جائے، باقی ملک میں رام راج قایم کر لیں۔ انھیں اس بارے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا! حضرت شیخ الاسلامؒ اور ان کی جماعت کو اس سے اتفاق نہیں

تھا۔ ان کے نزدیک یہ ملک کے سیاسی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ وہ اس کے خلاف سینہ سپر ہوگئے۔ ہندوستان کو خالص فرقہ وارانہ ریاست بننے سے جن اسباب نے روک رکھا تھا ان میں حضرت شیخ الاسلامؒ کا تدبر، اندازِ سیاست اور کانگریس میں ان کا رسوخ اور اثرات بھی شامل تھے۔

کانگریس کے دایرۂ کار اور سیاست میں ان کے رسوخ اور کارگزاری کے علاوہ ملک کی تقریباً ایک درجن مسلمان، غیر مسلمان اور آزاد خیال مقامی، غیر مقامی اور کل ہند سطح کی جماعتیں تھیں، جن میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے رسوخ وتعلقات سے آگے بڑھ کر حضرت کی قیادت پر کامل اعتماد پایا جاتا تھا۔ ان میں سوشلسٹ، کمیونسٹ جماعتوں کے رہنماؤں سے روابط کے علاوہ قریش، انصاری برادری کی کل ہند جماعتوں، کسانوں، مزدوروں کی جماعتوں، اہلِ تشیع کی ایک نہایت موثر کل ہند جماعت کے علاوہ بہار کی انڈی پنڈنٹ، بنگال کی پرجا پریشک، کل ہند مجلس احرار اسلام، سرحد کی خدائی خدمت گار، بلوچستان کی وطن پارٹی، کشمیر کی نیشنل کانفرنس وغیرہ جماعتوں کے اعتماد کو قایم رکھنا حضرت کی غیر معمولی صلاحیت وبصیرت وتدبر اور کمالات کی مثال بے مثال ہے۔

ایک قابلِ توجہ پہلو:

شیخ الاسلامؒ کی سیاسی شخصیت کے دینی پہلو اور مذہبی خدمات پر بہت لکھا گیا ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اس سے ان کی سیاست، ان کے فکر وفلسفے، ان کی عظیم الشان خدمات کے تعارف میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کی سیاست کی زبان گذشتہ پوری صدی میں انگریزی ہی رہی تھی اور اس کی اہمیت سے آج بھی انکار ممکن نہیں۔ اردو میں حضرتؒ کی شخصیت کے سیاسی پہلو پر، ان کی سیاسی فکر وفلسفے پر، ان کی سیاسی خدمات کے تذکرے میں کچھ کم لٹریچر نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو تصانیف و تالیفات اور صحافت کے ذریعے ہم ان کی شخصیت، ان کے فکر اور طرزِ فکر کے فروغ اور ان کی خدمات کے فیضان عام سے فایدہ اٹھانے سے قاصر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تاراچند کی ''تاریخ تحریک آزادی ہند''، ایس پی سین کی ''ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی''

حضرتؒ کی مشہور تالیف ''اسلام اور متحدہ قومیت'' اور مولانا محمد میاںؒ کی تالیف ''اسیرانِ مالٹا'' کے انگریزی تراجم حال آں کہ یہ دونوں کام نصف صدی کی تاخیر سے انجام پائے۔ نیز ڈی آر گوپال کی انگریزی کتاب ''مولانا حسین احمد مدنی'' مطبوعہ۔ کلکتہ، میری نظر سے گزری ہے، یا پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا تحقیقی مقالہ ''دیوبند اسکول اینڈ دی ڈیمانڈ فار پاکستان'' اور باربرا مٹکاف کی تحقیق ''اسلامک ریوایول ان برٹش انڈیا۔ دیوبند، ۱۹۰۰ء-۱۸۶۰ء'' میرے سامنے ہے۔ اس میں دیوبند کے مدرسہ و تحریک کے علاوہ ہندوستان کی دوسری تحریکات کا بھی کچھ صحیح و غلط جائزہ لیا گیا ہے۔ اگر ان کاموں کے علاوہ کوئی اور کام انجام پائے ہوں تو میں ان سے واقف نہیں۔

حضرت شیخ الاسلام کی شخصیت اور سوانح و سیاست کے تعارف میں انگریزی کتاب کی اشاعت کا صحیح وقت ۱۹۴۵ء میں تھا، جب فروری میں تین سال کی قید کے بعد حضرت کو رہائی ملی تھی، مئی میں جمعیت علمائے ہند کا اجلاسِ سہارن پور منعقد ہو رہا تھا اور شملہ کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ حال آں کہ اس وقت تک اردو میں بھی کوئی کتاب اس نوع کی نہ تھی۔

جمعیت علمائے ہند اپنی پوری تاریخ میں عالمی سطح پر اپنے وجود، اپنے فلسفۂ سیاست اور اپنی اہمیت کو منوانے میں اور ملک کے اکثریتی طبقے تک اپنے موقف کی آواز پہنچانے میں صرف اس لیے قاصر رہی ہے کہ اس نے ملکی سطح پر انگریزی اور ہندی صحافت کا تعاون حاصل کرنے پر توجہ نہیں دی۔

تعصبات سے مسموم اس دور میں انگریزی میں اس کام کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''مسلمز ان انڈیا۔ اے بایوگرافیکل ڈکشنری'' وینگارڈ بکس لمیٹڈ۔ لاہور نے چھاپی ہے، اس میں مولانا حسین احمد مدنی کا نام نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ تعصب نہیں جہالت ہے۔ اسی نام کی ایک نیشنل ڈکشنری مطبوعہ ہند میرے پاس ہے، لیکن اِس وقت اُس تک رسائی ممکن نہیں ہو سکی۔ اس میں شاید حضرت شیخ الاسلامؒ کے سوانح و خدمات کا تذکرہ ہو! اسی نام کی ایک تیسری ڈکشنری جو ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء کے عہد کی پابندی کے ساتھ احمد سعید نامی ایک پاکستانی اسکالر نے مرتب کی ہے،

اس میں حضرت مدنیؒ کی سوانحی معلومات کا اندراج ہے۔

تحریک آزادی کے دور میں انگریزی ہندی زبانوں میں دیوبند کے مدرسے، دیوبندی مکتبِ فکر، دیوبند کے پولی ٹیکل اسکول (سیاسی مکتبِ فکر) اور جمعیت علماے ہند کی تاریخ اور اس کے رہنماؤں کی سیاسی خدمات پر لکھنے کی ضرورت تھی، لیکن آج کے زمانے میں یہ ضرورت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔

متحدہ قومیت کا مدنی تصور:

حضرت شیخ الاسلامؒ کا متحدہ قومیت کا تصور کوئی پیچیدہ اور نا قابل فہم فلسفہ نہ تھا، ایک سیدھی اور سادہ سی بات تھی کہ ہندوستان میں جو لوگ رہتے ہیں، وہ ہندوستانی ہیں، ملک کی آزادی، ترقی اور حفظ و دفاع میں سب کے یک ساں فرایض ہیں اور ملک کے فواید کے حصول میں سب کے برابر کے حقوق ہیں۔ اس لیے آزادی کے حصول کا، اس کی ترقی، فلاح و بہبود کا اور سرحدوں کی حفاظت اور دفاع کے لیے مستقبل کا تقاضا یہ ہوگا کہ سب مل کر اپنی ذمے داریوں کو پورا کریں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں تھا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ جب قومیت کے فلسفے پر عمل اور اس کے نفاذ کا وقت آیا تو پاکستان کے دستور میں قومیت کے اسی تصور کو اختیار کیا گیا جو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (رحمہما اللہ تعالیٰ) نے پیش کیا تھا۔ ہندوستان میں خدا کی ایک ارب مخلوق پر ان دونوں بزرگوں کا سب سے بڑا احسان اور تاریخ آزادیٔ ہند کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں نے ہندوستان میں ایک دایمی فرقے وارانہ حکومت کے قیام، مسلمانوں کو ہندوستان کی سرزمین سے ہمیشہ کے لیے حرف غلط کی طرح مٹا دینے اور اسلام کو دنیا کے اس خطے سے رخصت کر دینے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا اسے نہ صرف ملیامیٹ کر دیا بلکہ ہندوستان کے دستور کو سیکولر بنوا کر اس کے امکانات کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

ڈایری کی ترتیب:

مخدوم زادگان معظم و محترم سے ملاقات اور ڈایری کی تدوین کے عزم و عہد کا یہ واقعہ

۱۹۸۸ء کے ماہ جولائی کے آخری ہفتے کی کسی تاریخ کا ہے۔ آج ۲۰؍فروری ۲۰۱۰ء کو یہ سطریں لکھ رہا ہوں، واقعے پر ۲۱؍برس ۷ ماہ پورے گزر چکے ہیں۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس ذمے داری سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ اس کی مسلسل سات جلدیں جن کی ضخامت ۶۲۲۳ صفحات ہے، شایع ہو چکی ہیں اور تکمیلی جلد جو چھ سو صفحات تک پھیل سکتی ہے۔ طباعت کے لیے پریس کے حوالے کی جارہی ہے۔

اس ڈایری کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے کیا گیا اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے وصال دسمبر ۱۹۵۷ء پر ہندوستان پاکستان کی سیاسی، دینی اور صحافتی دنیا میں غم واندوہ کے اظہار و ماتم پر اس کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ ڈایری میں اس کے دورانیے کے صرف سیاسی واقعات وحوادث کی خبریں ہی درج نہیں کر دی ہیں بلکہ سیاست کے اتار چڑھاؤ، سیاسی تحریکات اور ان کے مقاصد، شخصیات کے افکار واقدامات اور ان کے پس منظر اور نتایج پر تقریباً ڈھائی ہزار صفحات میں وقت کے مدبرین اور مبصرین کا نقد و نظر بھی شامل ہے۔ اس میں یقینی طور پر ایک ہزار صفحوں پر محیط مجھ ناچیز کے قلم سے بھی نقد و تبصرہ ہے۔

ڈایری کے اصل متن کی ترتیب وتدوین میں خبروں اور سیاسی جماعتوں کے فیصلوں اور ان کے رہنماؤں کے بیانات اور ان پر نقد میں مختصر تحریرات کو جگہ دی گئی اور وقت کے افکار و مسایل، حضرت شیخ الاسلامؒ اور جمعیت علماے ہند کے فکر وفلسفۂ سیاست کے تعارف اور دفاع میں جو مفصل اور طویل مقالات لکھے گئے تھے، انھیں ''مقالات سیاسیہ'' کے عنوان سے تین جلدوں میں الگ مرتب کیا گیا تھا اور پریس میں فرصت کے اوقات میں چھاپ لیا گیا تھا۔ ان کی ترتیب یہ ہے۔

۱۔ مقالات سیاسیہ: از قلم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (ڈایری کی جلد ششم) اس میں حضرت شیخؒ کے قلم سے وہ تمام تحریریں مرتب کر دی گئی ہیں جو وقت کے سیاسی افکار و مسایل کے بارے میں کتابچوں اور رسالوں کی صورت کے میں شایع ہوئی تھیں۔

۲۔ مقالاتِ سیاسیہ: از قلم مولانا سید محمد میاںؒ (ڈایری کی جلد ہفتم) اس میں مولانا محمد

میاں مرحوم کے قلم سے چھوٹے بڑے وہ تمام رسایل اور مقالات ہیں، جو اخبارات میں چھپے تھے، انھیں مرتب کردیا گیا ہے۔

۳۔ مقالات سیاسیہ: اس میں تقریباً تیس اہل قلم کے رسایل و مقالات نو بنیادی عنوانات کے تحت خاک سار ابوسلمان نے مرتب کردیے ہیں۔ اہم اصحابِ قلم کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا ابوالکلام آزادؒ، مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا عبدالحق نافع گلؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا سید محمد میاںؒ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ، مولانا عبدالحلیم صدیقیؒ، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا سید طفیل احمد منگلوریؒ، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادیؒ، مولانا سید حامد میاںؒ، مولانا سید اخلاق حسین قاسمیؒ، مولانا سید انور حسین نفیس رقمؒ، مسیح انصاری ٹیابرجیؒ، خواجہ عبدالوحیدؒ (لاہور)، مولانا دین محمد وفائیؒ (سندھی) مولانا مظہر علی اظہر وغیرہم۔ یہ ڈایری کی جلد ہشتم ہے، اسی پر ڈایری کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

ایک حادثہ:

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ میں ۱۹۸۸ء کے اگست میں حضرت شیخ الاسلام کے قلم سے یادگار تحریرات کا ایک مجموعہ میرے ہاتھوں میں آگیا تھا۔ لیکن تقریباً ایک سال تک کام کا آغاز نہیں کرسکا تھا۔ اس دوران مخدوم زادۂ محترم مولانا ارشد مدنی تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا ابھی تک تو کام کا آغاز نہیں کرسکا، لیکن اب ان شاء اللہ کام جلد شروع ہوجائے گا۔ مولانا تشریف لے گئے۔ میں نے اپنے قلب پر ایک سخت دباؤ محسوس کیا، لیکن یہ کسی ایک کتب خانے میں بیٹھ کر کرنے کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے اخبارات کے تلاش کرنے اور ان سے استفادے کی ضرورت تھی۔ میں نے سندھ کے کئی دورے کیے اور پنجاب و سرحد میں سال میں کم از کم ایک دورہ لازم ٹھہرایا اور کراچی کے کتب خانوں میں مواد تلاش کرتا رہا اور جو کچھ ملتا تھا اسے سال اور اس کے مہینوں کے الگ الگ فایلوں میں جمع کرتا جاتا۔ ۱۹۹۷ء میں میں نے سندھ، پنجاب اور سرحد کے آخری دورے کیے۔ ۳۱ر دسمبر کو میں سفر سے لوٹا تھا۔ ۲ر جنوری کو رمضان شروع ہوگیا۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۹۹ء کو عید ہوئی۔ یکم فروری سے میں

نے پورے زور وشور کے ساتھ کام کا آغاز کر دیا، لیکن ابھی دو ہی روز گزرے تھے ۳؍فروری کی شب میں میرے سینے میں درد اٹھا اور فجر ہونے تک میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ہسپتال سے رخصت ملی تو دواؤں کے استعمال کی تاکید اور پرہیز میں اخبار پڑھنے اور تصنیف وتالیف یا کسی قسم کی معمولی محنت سے بھی سختی کے ساتھ روک دیا گیا۔ میں خود بھی اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ چہل قدمی جو لازم ٹھہری تھی میری بیٹی فوزیہ عالیہ مجھے پکڑ کر چند قدم چلاتی تھی۔ اللہ کا فضل شامل حال تھا، بیماری نے طول نہیں کھینچا، کمزوری بالکل تو ختم نہیں ہوئی، لیکن بہت کچھ دور ہوئی۔ دواؤں کا استعمال آج تک جاری ہے۔ میں ابھی ہسپتال ہی میں تھا کہ مخدوم زادۂ محترم جو پاکستان کے سفر میں کراچی کے دورے پر تھے، ہسپتال میں مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے۔ اگرچہ آں موصوف نے ڈاری کے متعلق کچھ نہیں فرمایا لیکن خاک سار نے خود یہ بتانا ضروری خیال کیا کہ ڈاری کے لیے خاصا مواد فراہم کر لیا ہے۔ یہاں سے چھوٹتے ہی اس کی ترتیب کا کام شروع ہو جائے گا۔ مولانا نے مجھے تسلی دی اور دعائے صحت سے نوازا۔

اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل فرمایا۔ ۱۲، ۱۳؍دن کے بعد گھر واپس آگیا، لیکن زینہ چڑھنے کی ممانعت تھی، زمینی منزل میں میرے لیے چارپائی ڈال دی گئی۔ میری لائبریری کا بڑا حصہ نیچے ہی تھا۔ لیٹے لیٹے کسی کتاب کے مطالعے اور کسی عبارت پر پنسل سے نشان لگا دینے کو میں نے پرہیز کی شرط سے نکال دیا تھا۔ اپریل کے وسط میں دو ماہ سخت احتیاط کے پورے ہو گئے۔ جہاں تک پرہیز واحتیاط کا تعلق ہے، وہ میرے لیے دائمی توجہ اور صبح وشام نگرانی کا مسئلہ ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی سخت پابندی کا دور ختم ہو گیا۔ اب میں اپنے کاموں کی انجام دہی اور زندگی کے فرائض کی ادائیگی کے لیے اس حد تک آزاد تھا کہ جوں ہی تھکاوٹ محسوس کروں فوراً کام چھوڑ دوں اور لیٹ جاؤں۔ ڈاکٹر صاحب کی ہدایات پر سختی کے ساتھ عمل کرتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے حالت سنبھل گئی ہے۔

ڈاری کی تکمیلی جلد:

اپریل کے آخر تک ڈاری میں استعمال ہونے والا بیشتر میٹریل سال اور مہینوں کی

ترتیب سے میرے سامنے آچکا تھا۔ اب میں اس کے مطالعے اور ڈایری میں استعمال کے لایق حوالہ جات کے انتخاب اور ترتیب میں مصروف ہوگیا۔ گذشتہ دس برسوں میں میری مصروفیات کا سب سے بڑا اور اہم یہی موضوع رہا تھا۔ میرے قریبی حلقے سے باہر دور دور تک اس بات کی شہرت ہوگئی تھی کہ میں حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈایری مرتب کر رہا ہوں، میں نے اپنے دوستوں سے گذارش کی تھی کہ اگر ان کی نظر سے کوئی ایسی خبر یا مضمون گزرے جسے وہ ڈایری میں درج کیے جانے کے لایق سمجھیں تو ڈایری کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش میں میری مدد کریں اور اپنی معلومات اور مطالعے سے مجھے استفادے کا موقع دیں۔ میرے دور و نزدیک کے بہت سے دوستوں نے میری گذارش پر توجہ فرمائی۔ ان کی عنایات کا یہ سلسلہ قریبی زمانے تک جاری رہا اور میں اس سے استفادہ کرتا رہا۔ اور نئے دریافت شدہ احوال و اخبار کو ایک فایل میں جمع کرتا رہا۔ میرے پاس اخبار و افکار کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ بہت سے تاریخی حقایق کا انکشاف قریبی زمانے میں ہوا تھا، جب کہ ڈایری کی ابتدائی جلدیں چھپ چکی تھیں اور ان حقایق کی شمولیت کا صحیح مقام گزر چکا تھا، لیکن ان واقعات و حقایق اور انکشافات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے انھیں تکمیلی جلد میں (جو اشاعت کی ترتیب میں آخری تھی) شامل کرنا پڑا۔

جیسا کہ عرض کیا زیرِ نظر جلد میں بعض ایسے حقایق ہیں جن کا صحیح مقام اس سے پہلی جلدوں میں تھا، اس لیے انھیں ڈایری کے اصولِ ترتیب کے مطابق تاریخ وار مرتب نہیں کیا جاسکتا تھا اگر ایسا کیا جاتا تو حقایق و واقعات میں تاریخ کے اتنے طویل وقفے پیدا ہوتے کہ ڈایری کا حسن غارت ہوتا اور ان کی افادیت ختم ہوجاتی۔ اس لیے اس جلد کے میٹریل کو نو موضوعات میں تقسیم کردیا۔ زیادہ توجہ اس کی اندرونی ترتیب پر دی ہے۔ یہ بحث چوں کہ زیرِ نظر جلد کے بارے میں ہے، اس لیے اس بحث کو طول دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ مجھے امید ہے کہ قارئینِ کرام خود اس ترتیب کے حسن و افادیت کو محسوس فرمائیں گے!

مجھے یقین ہے کہ ۲۱ برس سے زیادہ مدت تک مجھ ضعیف و ناتواں کی استقامت اور ہر لمحہ شوق کی فراوانی سات ہزار صفحات پر مشتمل آٹھ جلدوں کی تیاری اور سات جلدوں کا شایع ہوجانا حضرت شیخ الاسلامؒ کے جانشین صادق فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد

مدنیؒ کی توجہ سامی اور صرف ہمت، نیز محترم مولانا سید ارشد مدنی مدظلہٗ کی دعاؤں کی مقبولیت اور مشیت ایزدی کی تائید کی طرف صاف اشارہ ہے۔

اسی دایرۂ فکر کے دوسرے کام:

یہ تو اس منصوبے کی تکمیل کا ذکر تھا جو ڈایری کی تالیف وتدوین کے آغاز میں بنالیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی فیض بخشیوں کا عالم نرالا ہے۔ ایک کسان نے اپنی ہمت کے مطابق اپنی تھوڑی سی کھیتی کی سیرابی کے لیے بارانِ رحمت کی دعا مانگی تھی۔ برسانے والے نے ایسی بارش کی کہ ہر چہار طرف جل تھل ہوگیا اور دور دور تک کتنی ہی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اس دوران جو اور کام انجام پا گئے۔ میں انھیں اللہ کی فیض بخشی اور اس کی مقبولیت کے دایرے سے باہر کیوں کر شمار کروں؟ یہ اسی کی بخشی ہوئی ہمت، عزم اور استقامت کا نتیجہ ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک!

یہ تمام کام بھی ڈایری ہی کے سلسلے کے اور اسی کے مقاصد کی تکمیل کرنے والے ہیں نیز ڈایری کی تالیف کے دوران انجام پائے ہیں۔ آئیے ان پر بھی ایک نظر ڈال لیتے ہیں:

۱۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ - ایک سیاسی مطالعہ: اس کا پہلا ایڈیشن کراچی سے جنوری ۱۹۸۷ء میں شایع ہوا تھا، جسے قریبی ایام میں حضرت شیخ الاسلامؒ پر دہلی میں ہونے والے سیمنار کے مندوبین کے نام معنون کیا تھا۔ میں خود بھی سیمنار میں مدعو تھا، لیکن اس کے انعقاد تک مجھے پاسپورٹ بھی نہ مل سکا اور کتاب بھی وقت پر دہلی نہ پہنچ سکی۔ البتہ ایک خاص حلقے میں اس کی شہرت ہوگئی۔ دراصل جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ سے تعارف کا یہی تالیف ذریعہ بنی تھی۔ اس کی اشاعت میری خوش نصیبی کا موجب ہوئی۔ اس کے دو ایڈیشن ۱۹۹۳ء اور ۲۰۰۶ء میں! نظرثانی اور ہر دو بار مضامین کے اضافے اور تصحیح کے اہتمام کے ساتھ شایع ہوچکے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کے افکار ومسایل - آزادی سے پہلے اور بعد: حضرت شیخ الاسلامؒ کے افادات پر مشتمل یہ رسالہ خدا بخش اورینٹل پبلک لایبریری - پٹنہ (انڈیا) سے ۲۰۰۳ء میں شایع ہوا تھا۔ اب اس پر نظرثانی کے بعد ''مجلس یادگار شیخ الاسلام - کراچی'' کی جانب سے

شایع کیا جارہا ہے۔

۴۔ مناقب شیخ الاسلامؒ: ۱۹۸۸ء میں دیوبند گیا تو مکتبۂ دینیہ میں مولانا افضال الٰہی سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے حضرت شیخ الاسلامؒ پر اخبارات و رسایل سے ماخوذ مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے اور اسے چھپوانے کی فکر میں ہیں۔ انھوں نے اسی وقت مجموعہ لاکر مجھے دکھایا۔ اس میں ایک مضمون میرا بھی تھا جو حضرت کے انتقال پُر ملال کے موقع پر دسمبر ۱۹۵۷ء کے آخری ہفتے کے ہفت روزہ چٹان - لاہور میں ''ابوسلمان الہندی'' کے نام سے چھپا تھا۔ میں نے اس مضمون کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا تو بہت مسرور ہوئے اور جب میں نے پیش کش کی کہ اگر آپ یہ مجموعہ یا اس کی نقل مجھے عنایت فرمائیں تو میں پاکستان میں اسے چھپوا دینے کا انتظام کرسکتا ہوں، تو انھوں نے فوراً مجموعہ میرے حوالے کردیا۔

وہ مجموعہ لاکر میں نے محترم قاری رشید احمد صاحب کو دیا اور گذارش کی کہ اسے چھاپ دیجیے! قاری صاحب کو میری خاطر عزیز تھی، فوراً آمادہ ہوگئے۔

یہ بات قاری صاحب کے لیے مزید موجب کشش بنی کہ مضامین کا تعلق حضرت شیخ الاسلامؒ کی ذات ستودہ صفات سے تھا اور جب میں نے قاری صاحب کو یہ بتایا کہ مولانا افضال الٰہی حضرت شیخ الہندؒ کے بھانجے اور داماد مولانا سعید احمدؒ کے بیٹے، قاضی مظہر حسین کے پوتے اور حضرت شیخ الہندؒ کے نواسے ہیں۔ مولانا سعید احمدؒ وہی بزرگ ہیں جنھیں ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ نے ۱۹۱۶ء میں حج کے موقعے پر حضرت شیخ الہندؒ کے لیے کچھ رقوم دے کر بھیجا تھا اور یہ مقصود بھی تھا کہ حضرت اپنے عزیز سے مل کر خوش ہوں گے۔ اندرونِ خانہ کی خیریت اور بیرونِ خانہ کے حالات کا علم بھی ہوجائے گا اور مولوی سعید احمد کو حج کی سعادت بھی حاصل ہوجائے گی۔ الحمد للہ کہ ڈاکٹر انصاریؒ کو ان کی خدمت اور نیک نیتی کا پھل ملا، حضرتؒ اپنے عزیز جان بھانجے کو دیکھ کر خوش ہوئے اور گھر کے حالات سن کر اطمینان ہوا اور مولوی سعید احمد کو حج کی سعادت حاصل ہوگئی۔

محترم قاری رشید احمد صاحب کو مولانا افضال الٰہی کی حضرت شیخ الہندؒ سے قرابت قریبہ کا علم ہوا تو مجموعہ مضامین کی اشاعت کے لیے مزید جوش پیدا ہوا۔ قاری صاحب

نے اپنا عہد نبھایا اور میری لاج رہ گئی، لیکن کتاب کی اشاعت میں بہت تاخیر ہو گئی تھی۔ ۱۹۹۷ء میں شایع ہوئی۔ میں نے چند نسخے انھیں بہ ذریعہ ڈاک بھیجے اور ایک مدت تک ان کے جواب کا منتظر رہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

میں نے بڑے شوق سے مجموعے کا پیش لفظ لکھا تھا اور اس میں جامع مولانا افضال الٰہی مرحوم کا تعارف بھی کرایا تھا، لیکن میں نے مجموعے سے اپنا مضمون نکال لیا۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ ایک بچکانا اور طالب علمانہ مضمون ہے اور اس قابل نہیں کہ اہل علم واصحاب قلم کے یادگار مضامین سے اسے ہم ردیف کیا جائے۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ میں اپنے اس مضمون کو کیوں کر نظر انداز کر سکتا ہوں جب کہ اس خانوادۂ دینی و تہذیبی سے نسبت کی تاریخ فخر کا حرف اول وہی مضمون ہے۔ چناں چہ میں نے اپنے مرتبہ مجموعہ مضامین "شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی - ایک سیاسی مطالعہ" کے دوسرے ایڈیشن میں اُسے بھی شامل کر لیا تھا۔ مولانا افضال الٰہیؒ نے خط نستعلیق میں منتخب مجموعہ مضامین کا جو قلمی نسخہ مجھے عنایت فرمایا تھا وہ میرے کتب خانے کی زینت ہے اور جب اس پر نظر پڑتی ہے، مولانا مرحوم بہت یاد آتے ہیں۔

۴۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ - ایک سیاسی مطالعہ: یہ ایک مختصر رسالہ تھا، جو ۱۹۸۸ء میں اسی عنوان سے پہلی بار شایع ہوا اور موضوع علیہ شخصیت کے اہم سیاسی کی مقبولیت کی بنا پر جلد ہی ختم ہو گیا۔ نظر ثانی اور اضافہ مضامین کے بعد ۱۹۹۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شایع ہوا۔ اب وہ بھی ختم ہے اور تیسرے ایڈیشن کے لیے نظر ثانی اور کئی اہم مقالات کے اضافے کے ساتھ از سر نو مدون کر دیا ہے۔

۵۔ کلیاتِ شیخ الہندؒ: اولاً کلیات شیخ الہندؒ مولانا میاں اصغر حسین مرحوم نے ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۳ء) میں مرتب کی تھی اور مطبع قاسمی دیوبند سے شایع ہوئی تھی، لیکن حضرتؒ کا بہت سا کلام اس میں شمولیت سے رہ گیا تھا جو بعد میں دست یاب ہوا تھا۔ خاک سار نے بلاد مین دست یاب شدہ کلام تلاش کر کے جن شخصیات کے قصاید یا تواریخ وفات تحریر فرمائی تھیں ان کے سوانح کے اضافے اور تمام فارسی اردو کلام کی سائنٹیفک ترتیب اور حضرتؒ کی شاعری

اور اس کی خصوصیات کے بیان میں ایک مقدمے کے اضافے کے ساتھ ۱۹۹۴ء میں ''مجلس یادگار شیخ الاسلام۔ کراچی'' سے چھپوا دیا تھا۔

٦۔ برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت: علمائے دیوبند کے سیاسی فلسفے کی بنیاد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے فتویٰ دارالحرب پر ہے۔ مسلمان حکمرانوں کے ڈیڑھ سو سال پر پھیلے عہد حکومت میں ہندوستان دارالاسلام تھا، لیکن ابھی حکمرانی کے تخت پر مسلمان ہی بیٹھے تھے کہ ملک کے لیے قانون سازی، قانون کے نفاذ کا اختیار ان سے چھین لیا گیا۔ وقت کے سب سے بڑے عالم دین اور بالغ نظر مدبر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ملک کے دارالحرب بن جانے کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اب مسلمانوں کے سامنے:

- جبر کو برداشت کرنے اور حالات پر قانع ہو جانے،
- ملک چھوڑ دینے اور راہِ فرار اختیار کرنے کا، یا
- جبر سے مقابلے اور حالات کو بدل دینے کے لیے اقدام و سعی،

کے تین راستے کھلے تھے۔

ولی اللّٰہی فکر اور انقلابی ذوق رکھنے والے علما نے تیسرا راستہ اور انقلاب و جہاد کی حکمت عملی اختیار کی۔ دیوبند کے بزرگوں اور علما کے نزدیک جنگ آزادی میں حصہ لینے اور حریت پسند انقلابی غیر مسلم قوتوں سے تحریک آزادی میں تعاون کرنے کا جواز ملک کا دارالحرب ہو جانا تھا۔ جن فرقوں اور مکاتبِ فکر کے نزدیک انگریزی عہد میں بھی ہندوستان حسبِ سابق دارالاسلام ہی تھا اور وہ غیر مسلموں کی ایک بڑی جماعت کی طرح وطن دوست، قوم پرور اور حریت پسند بھی نہ تھے، تو وہ تحریک آزادی میں کیوں کر مخلص ہو سکتے تھے؟ کیا کسی نے یہ سوچا تھا کہ ہندوستان حسب سابق دارالاسلام تھا، تو پاکستان کیا ہے؟ آخر وہ دارالاسلام کے خلاف تحریک چلا کر کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟

یہ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ ایڈیٹر برہان — دہلی کا ایک سلسلۂ مضمون تھا، جو برہان سے اخذ کر کے مرتب کر دیا گیا ہے۔ یہ جمعیت علمائے ہند کے طرزِ فکر اور فلسفۂ سیاست کے دفاع میں لکھا گیا تھا۔ خاکسار راقم الحروف نے ایک مفصل مقدمے کے ساتھ مرتب کر دیا تھا اور مجلس یادگار شیخ الاسلام۔ کراچی سے ۱۹۹۳ء میں شایع ہوا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن

جمعیت پبلی کیشنز- لاہور نے شائع کیا ہے۔

۷۔ فتویٰ دار الحرب: حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے فتوے کے تعارف اور اس کی تاریخی سیاسی اہمیت کے بیان میں ہے۔ اس مقالے کو حافظ تنویر احمد شریفی سلمہٗ نے کتابچے کی شکل میں چھاپ دیا تھا۔ مدت سے نایاب ہوگیا تھا، اب وہ اسے دوبارہ چھاپ رہے ہیں۔

۸۔ علمائے ہند کا سیاسی موقف: یہ بھی مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کا ایک سلسلۂ مضمون تھا جو برہان- دہلی میں قسط وار شائع ہو رہا تھا اور مکمل ہونے سے پہلے یہ سلسلہ بند ہوگیا، جسے خاک سار ابو سلمان نے مکمل و مرتب کر کے ۱۹۹۷ء میں مجلس یادگار شیخ الاسلام- کراچی سے چھپوا دیا تھا۔ یہ سلسلۂ مضمون بھی جمعیت علمائے ہند اور اس کے رہنماؤں کے تحریک آزادیٔ وطن میں حریت پسندانہ کردار، غیر مسلم برادران وطن کے تعاون سے برٹش استعمار کے خلاف محاذ بنانے، آزاد ہندوستان کے ایک نئے تصور کے تعارف میں اور مسلم لیگ کے طرزِ سیاست سے اختلاف، دیو بند کے سیاسی مکتبِ فکر کے بزرگوں کے رویے کے دفاع اور ان کی سیاسی حکمت عملی کی وضاحت میں تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ''ہند پاکستان کی تحریک آزادی میں علمائے حق کا سیاسی موقف'' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں جمعیت پبلی کیشنز- لاہور نے شائع کیا ہے۔

۹۔ بزرگان دار العلوم دیو بند: جہاد شاملی اور علمائے دیو بند کی سیاسی خدمات کے دیگر پہلو: یہ تالیف تین حصوں میں بہ عنوانات ذیل مرتب کی گئی ہے۔

حصۂ اوّل: بزرگانِ دار العلوم دیو بند اور معرکۂ شاملی ۱۸۵۷ء۔ خانقاہ تھانہ بھون کے بزرگوں اور معتقدوں نے ''تذکرۃ الرشید'' کی بعض پیچیدہ اور مرموز عبارتوں سے بعض بزرگوں کی تحریک آزادی میں شرکت کے بارے میں جو شکوک پیدا کر دیے تھے خاک سار ابو سلمان نے ''تذکرۃ الرشید'' ہی سے اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حکیم ضیاء الدینؒ یکے از مریدان حافظ محمد ضامن شہیدؒ، حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ، نیز سر سید احمد خان کی تحریرات سے ان کی شرکت کے وقوع کو ثابت کیا ہے۔

حصۂ دوم: علمائے دار العلوم دیو بند اور جمعیت علمائے ہند کے یادگار کارناموں کے تذکرے اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے انقلابی منصوبے کے تعارف میں ہے۔ یہ تین مضمون

ہیں اور تینوں خاک سار راقم التحریر کے قلم سے ہیں۔

حصۂ سوم: چند تاریخی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ تمام مقالات دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں، عالموں اور ان کے خصایص و خدمات کے تعارف میں ذیل کے اہل علم اور مفکرین کے قلم سے یادگار ہیں۔ سر سید احمد خاں، پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ، مولانا غلام رسول مہرؒ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، اقبال شیدائی اور مولانا ابوالکلام آزادؒ۔

کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے، جس میں خاک سار ابوسلمان نے واقعۂ شاملی پر چند اہم حوالہ جات کو مرتب کر دیا ہے۔ یہ تالیف جمعیت پبلی کیشنز۔ لاہور نے شایع کی ہے۔ اور اب نظر ثانی و بعض اضافات و تصحیحات کے بعد مجلس یادگار شیخ الاسلام۔ پاکستان، کراچی چھاپ رہی ہے۔

۱۰۔ تذکرۂ شیخ الہندؒ: حضرت شیخ الہندؒ کے تذکروں میں سب سے اچھا اور حضرتؒ کے سوانح، شخصیت اور افکار و خدمات میں سب سے زیادہ متوازن اور جامع تذکرہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے خلیفۂ مجاز مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوریؒ کا یہ تذکرہ تھا، جو ۱۹۶۵ء میں بجنور سے شایع ہوا تھا۔ کسی وجہ سے اس کی اشاعت ثانیہ کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ میرے دل کو شروع ہی سے یہ بھا گیا تھا اور اسی وقت یہ عزم کر لیا تھا کہ اس کی اشاعت کا سر و سامان ضرور کروں گا۔ الحمد للہ! وقت جلد آ گیا، اور ۲۰۰۷ء میں اس کا پہلا پاکستانی ایڈیشن شایع ہو گیا۔

اس ایڈیشن میں خاک سار مدون کے قلم سے ۳۸ صفحات کا مقدمہ ہے، جس میں اولاً حضرت شیخ الہندؒ کی کتابیات کا تعارف ہے۔ ثانیاً تذکرے کے متن پر تبصرہ ہے۔ متعدد ابواب پر ضروری حواشی ہیں اور آخری میں ۱۳۶ صفحات میں ''آثار علمیہ و ادبیہ'' کے عنوان سے چند تاریخی اور نادر تحریرات اور رسایل ہیں؛

الف: حضرت مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ کا وہ نایاب تاریخی رسالہ ہے جو ۱۹۱۸ء میں انجمن اعانتِ نظر بندان اسلام۔ دہلی کی جانب سے ''شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قبلہ محدث دیوبندی کے مختصر سوانح و حالات اسیری'' کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ ۱۹ صفحات پر مرتب (ابوسلمان) کا مقدمہ ہے۔ اس رسالے میں حضرت شیخ الہندؒ کے

تعارف میں دو جملے ''شیخ الہند'' اور ''محدث دیو بندی'' میرے علم کے مطابق پہلی بار استعمال ہوئے تھے۔

ب: حضرت سید سلیمان ندویؒ کا اسی زمانے کا وہ تاریخی مضمون ہے جو انھوں نے ''نظر بندانِ اسلام'' کے عنوان سے سلسلۂ مضمون میں حضرت شیخ الہندؒ کے تعارف میں لکھا تھا اور ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ کے شمارۂ مارچ ۱۹۱۹ء میں شایع ہوا تھا۔

ج: ذکر محمود: حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال کے بعد شایع ہونے والا پہلا رسالہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے قلم سے یادگار ہے، جو دو ماہ کے اندر تالیف کیا گیا۔ اشاعت کا مقصد حضرتؒ کے سوانح و شخصیت اور فضایل و کمالات کی جامعیت کی تشہیر و تعارف کے بجاے خود مؤلفؒ نے اپنی صفائی میں تحریر فرمایا تھا۔ اس کے مطالعے سے تو یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ حضرتؒ بحرِ سیاست کے شناور، صف اول کے مدبر اور شیخ الہند کے منصب پر بھی فایز تھے۔ نو صفحے کے ''حرفِ چند'' کے عنوان سے پیش لفظ خاک سار ابوسلمان کے قلم سے ہے۔

مذکورۂ بالا حضرات دہلویؒ و تھانویؒ کے دونوں رسایل ایک ایک بار ہی شایع ہوئے تھے۔ یہ ان کی دوسری اشاعت ہے۔

۱۱۔ مفتی کفایت اللہ دہلویؒ - ایک سیاسی مطالعہ: خاک سار ابوسلمان کی ترتیب دادہ و تالیف کردہ، سات ابواب اور ۴۳۲ صفحات پر مشتمل ایک گل دستۂ مضامینِ علم و دین و سیاست دسمبر ۲۰۰۴ء میں جمعیت پبلی کیشنز - لاہور سے شایع ہوا۔

۱۲۔ مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلویؒ - ایک ادبی اور سیاسی مطالعہ: یہ تالیف دو حصوں میں تقسیم اور ۲۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

حصہ اول بہ عنوان سوانح اور ادب و سیاست، آٹھ ابواب بہ عنواناتِ ذیل میں تقسیم ہے:
(۱) حالات زندگی، (۲) خدمات کے مختلف میدان، (۳) جمعیت علماے ہند کے داعئ اول اور خدمات، (۴) تحریکیں اور کانفرنسیں، (۵) تصنیفات و تالیفات، (۶) شاعری، (۷) حضرت مفتی صاحبؒ کے اخلاف (الف: اولاد، ب: تلامذہ)، (۸) اعترافات (اکابر و مشاہیر کا خراج تحسین)۔

حصہ اول کے آخری باب نمبر (۸) کے سوا تمام خاک سار کی کاوش قلم کا حاصل ہے۔
حصۂ دوم، آثارِ علمیہ وادبیہ (دینی، ادبی، تاریخی اور سیاسی نوادر)، سات عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔
یہ تالیف ۲۰۰۵ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری- پٹنہ کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا نظرثانی اور بعض نوادر کے اضافے کے ساتھ نیا ایڈیشن عزیزم مکرم حافظ تنویر احمد شریفی ''مجلس یادگارِ شیخ الاسلام- پاکستان (کراچی)'' کی طرف سے شائع کر رہے ہیں۔

۳۱۔ سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ- ایک سیاسی مطالعہ: سال اشاعت ۲۰۰۷ء، صفحات ۳۲۸، ناشر: جمعیت پبلی کیشنز- لاہور

مولانا احمد سعید دہلویؒ جمعیت علماے ہند کے بانیوں میں سے تھے۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں جب جمعیت کے قیام کا فیصلہ ہوا تو مولانا اس مجلس میں شریک تھے اور دسمبر میں جمعیت کے قواعد اور ضوابط مرتب ہوئے، عہدے دار اور مجلس عاملہ منتخب ہوئی تو حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اس کے صدر اور مولانا دہلویؒ اس کے سکریٹری بنائے گئے تھے اور ۱۹۴۰ء کے آخر تک حضرت مفتی صاحبؒ کی صدارت کے دور میں مولانا دہلویؒ جمعیت کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۵ء جب حضرت شیخ الاسلامؒ جیل میں تھے تو مولانا نے قایم مقام صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور دسمبر ۱۹۵۷ء میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے انتقال کے فوراً بعد (۱۹۵۷ء- ۱۹۵۸ء) میں وہ صدر رہے تھے۔ ایک مدت تک جمعیت علماے دہلی کے صدر رہے تھے۔ جب صوبے یا مرکز میں ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں تھا تب بھی جمعیت کے کاموں میں اور عوام کی خدمت میں وہ ہمیشہ سرگرم رہے۔ آزادی کے فوراً بعد ملک اور اس کے عوام پر برا وقت آیا تو وہ جان ہتھیلی پر رکھ میدانِ عمل میں نکل آئے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے انتقال کے بعد انھیں مدرسۂ امینیہ- دہلی کا مہتمم بنایا گیا تھا اور اپنی وفات تک وہ اس منصب پر فائز رہے تھے۔ انھوں نے قوم وملک اور دین وملت کی خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔
یہ تالیف مولانا احمد سعید دہلویؒ کے سوانح، شخصیت، اخلاق وسیرت اور افکار وخدماتِ

دینی وسیاسی اور علمی وادبی کے تعارف میں ہے۔ کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصہ اول میں ان کے سوانح، شخصیت اور افکار و خدمات کے تذکار و تعارف میں مختلف ناموران علم اور اہل قلم کے پندرہ مقالات ہیں۔

حصہ دوم آثار اور نوادرِ ادبیہ وسیاسیہ کے عنوان کے تحت ان کی ایک مناجات، ایک یادگار نظم، ایک یادگار غزل، ایک یادگار مضمون، ترک موالات کا ایک فتویٰ، جمعیت علماے ہند کے قیام کے بارے میں ایک تاریخی مضمون، چودھری خلیق الزماں، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، ملا واحدیؒ اور چند دیگر حضرات کے نام ان کے نادر سیاسی اور ادبی خطوط ہیں۔

حصہ سوم میں ان کے ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کی کانفرنسوں میں پیش کیے جانے والے ان کے تین اہم خطبات ہیں۔ بیانات کے ضمن میں وقت کے مسایل کے بارے میں ان کے سات تاریخی بیانات میں اور ''جناح سعید مراسلت'' کے تحت اتحاد بین المسلمین کے مسئلے میں مسلم لیگ کے صدر سے ان کی تاریخی مراسلت ہے۔

۱۴۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ۔ ایک سیاسی مطالعہ: سال اشاعت ۲۰۰۱ء، صفحات ۵۰۰، ناشر: جمعیت پبلی کیشنز۔ لاہور

قدرت نے حضرت مجاہد ملتؒ کو ذہن وفکر، علم وعمل، اخلاق وسیرت کے بے شمار اوصاف اور خوبیوں سے نوازا تھا اور قوم وملک اور دین وملت کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔ مجاہد ملت کا خطاب ان کو زیب دیتا ہے۔ وہ زندگی بھر نہ صرف مسلمانوں بلکہ بلا تفریق مذہب وملت، خلق خدا کی خدمت میں سرگرم رہے۔ زیر نظر کتاب ان کی شخصیت اور افکار وخدمت کا آئینہ ہے۔ ان کی علمی وعملی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اس کتاب میں زیر بحث نہ آ گیا ہو۔

یہ کتاب پانچ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) حالاتِ زندگی، (۲) شخصیت وسیرت، (۳) خدماتِ جلیلہ،

(۴) تصنیفات وتالیفات، (۵) خطبات وتحریرات۔

۱۵۔ حضرت شیخ الہندؒ کے نامور شاگرد اور انقلابی مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے بارے

میں ان کے سوانح و سیرت، افکار و خدمات اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے ۱۹۹۴ء سے ۲۰۰۷ء تک پاکستان اور ہندوستان سے تقریباً ایک درجن کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ ان میں؛

❁ ایک ضخیم و جامع کتاب اندرون و بیرون ملک ان کی سیاسی اور علمی سرگرمیوں کے تذکرے میں ہے۔

❁ ایک کتاب ان کے انقلابی منصوبوں کے تعارف اور اہمیت کے بیان میں ہے۔

❁ ایک ان کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔

❁ ایک کتاب ان کے بعض معاصرین کے ذکر میں ہے جو دارالعلوم دیو بند سے ان کے اخراج کا موجب ہوئے اور شیخ الہندؒ کی سیاسی تحریک کو ملیامیٹ کرنے والے تھے۔

یہ کتابیں پٹنہ، کراچی اور لاہور کے مختلف اداروں نے شایع کی ہیں اور ان کا بنیادی موضوع براعظم ہند پاکستان میں تحریک ولی اللہی کے عہد قاسمی و محمودی سے لے تا عہدِ حسینی و اسعدی کی ترجمانی ہے۔ خصوصاً شیخ الہندؒ اور جمعیت علماے ہند کی سیاست اور طرزِ سیاست کی ترجمانی اور دفاع ہے۔

۱۶۔ علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: مؤرخ ملّت مولانا سید محمد میاںؒ کی دو حصوں میں یہ مشہور تالیف ہے، جس میں انگریزوں کی حکم رانی کے آغاز سے لے کر اپریل ۱۹۴۸ء میں جمعیت کے سالانہ اجلاس۔ بمبئی کے خطبۂ صدارت حضرت شیخ الاسلامؒ میں زیرِ بحث آنے والے حالات و سیاسیات پر اس تاریخی دستاویز کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

خاک سار راقم التحریر نے اسے جدید اندازِ تدوین کے مطابق مرتب کر دیا ہے۔ اس میں تصحیح، توضیح اور معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ ابواب قایم کر دیے ہیں۔ استدراکات اور حواشی سے اسے مستحکم کیا گیا ہے۔ نقل و اقتباسات اور مسودے کی تیاری میں بعض تسامحات در آئے تھے، انھیں دور کر دیا ہے۔ استدراکات و اضافات اور مؤلف کے تسامحات کی تصحیح سے کسی غلط فہمی میں نہ پڑ جانا چاہیے۔ اطمینان کے لیے مکتبۂ رشیدیہ۔ کراچی کا نیا ایڈیشن دیکھ لینا چاہیے۔

جلد اول کا پہلا ایڈیشن جو دہلی سے اور پھر کراچی سے شایع ہوا تھا ۱۶/۲۳×۳۶

سارؔ کے ۴۷۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ نیا ایڈیشن اسی تقطیع کے ۵۸۴ صفحات میں اختتام کو پہنچا ہے۔ مؤرخ ملت ؒ کی یہ تالیف کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ کراچی کے مکتبۂ رشیدیہ اور لاہور کے جمعیت پبلی کیشنز نے بہ یک وقت شایع کی ہے۔

۱۷۔ تحریک ریشمی رومال: اس موضوع پر خاک سار نے ایک مقالہ لکھا تھا جو کالج کے میگزین میں چھپا تھا اور اصحابِ ذوق و علم نے اسے پسند کیا۔ اس کی بنیاد حضرت شیخ الاسلامؒ کی ''نقشِ حیات'' اور مولانا سید محمد میاںؒ کی تالیف ''تحریکِ شیخ الہندؒ'' پر تھی۔ اس کے بعد بھی میں نے اپنی تحقیق جاری رکھی اور مجھے اپنے ایک دوست کی عنایت سے انڈیا آفس لائبریری سے کئی اہم ڈاکومنٹ حاصل ہو گئے، جو پہلے کسی کو حاصل نہ ہوئے تھے۔ میں نے ان کی روشنی میں ایک نیا مقالہ تالیف کیا، جو تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اسی عنوان سے میرے ہی ایک مجموعۂ مقالات ''بیسویں صدی میں ہندوستان کی ملی تحریکیں'' (حصۂ اول) میں شامل ہے۔ اس مجموعے کے دیگر مقالات یہ ہے: تحریکِ خدامِ کعبہ، تحریکِ ہجرت، تحریکِ خلافت اور ترک موالات۔ یہ کتاب ۲۰۰۹ء میں پورب اکادمی۔ اسلام آباد سے شایع ہوئی۔ مجموعے کے دیگر مقالات میں بھی حضرت شیخ الہندؒ کا ذکر آیا ہے اور حضرتؒ کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ہوئی ہے اور حضرتؒ کے چند تاریخی خط اور فتوے شامل ہیں۔

۱۸۔ تحریکِ ریشمی رومال اور سندھ: یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں تحریک کے پس منظر اور اجرا کی تاریخ و مقاصد اور اس کی خصوصیات و اہمیت کا تذکرہ ہے اور دوسرے حصے میں تحریک کے ان رجال کا تذکرہ ہے، جن کا تعلق سندھ سے تھا۔ یہ کتاب فکشن ہاؤس۔ لاہور نے ۱۹۹۷ء میں شایع کی تھی۔ اب نایاب ہے۔

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے ایک شاگرد جنھیں حضرتؒ نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ساتھ خط لکھ کر بلایا تھا کہ جمعیت الانصار کی تشکیل کے لیے مشورہ کر کے تحریک کے نئے دور کا آغاز کیا جائے، مدرسۂ مظہر العلوم۔ کراچی (محلہ کھڈا) کے شیخ الحدیث تھے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے تحریک شیخ الہندؒ کے رجال کار کے تذکرے میں نمبر ۱ پر انھیں مولانا محمد صادقؒ (کراچی والے) کا تذکرہ لکھا ہے اور فرمایا ہے

کہ "مشن آزادی میں ہمیشہ سرگرمی کے ساتھ شریک رہے۔ ایام جنگ عمومی میں جب کہ انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو انھوں نے اوران کے رفقا نے لسبیلا وغیرہ کے بلوچستانی علاقے میں بغاوت کرادی تھی....." الخ (نقش حیات، حصہ دوم)

لسبیلا کے تحت قلات اور گرد ونواح کا بلوچستان کا علاقہ تھا۔ مشن کے اس مرکز کے سربراہ اور نگراں یہی مولانا محمد صادقؒ تھے۔ ان کی سرگرمیوں اور گرفتاری وسزایابی کی تفصیلات سب سے زیادہ اسی کتاب میں ہیں۔

یہ تالیف دیوبندی مکتبِ فکر کے علما وکارکنان، ان کی سیاسی خدمات اوران کی ایک اہم تحریک ریشمی رومال کے تعارف میں ہے۔

۱۹۔ سندھ میں ریشمی رومال تحریک: مرتبہ عبدالرحمٰن جتوئی: فاضل مرتب نے میرے ایک مقالے کا سندھی زبان میں ترجمے کر کے سندھی ساہت سوسائٹی۔ شکار پور (ضلع لاڑکانہ) کی طرف سے ۱۹۸۸ء میں چھاپا ہے۔ سندھ میں تحریک شیخ الہندؒ، جمعیت علماے ہند اور علماے دیوبند کی سیاست کے اثرات وخدمات کے مطالعے میں ان ہر دو کتب کی اہمیت مسلم ہے۔

۲۰۔ تحریک اتحاد بین المسلمین اور جمعیت علماے ہند: اس موضوع پر مولانا سید اخلاق حسین قاسمی دہلوی مرحوم کا ایک مختصر رسالہ تھا۔ خاک سار راقم التحریر نے اس میں ابواب کے قیام اور بعض اہم مضامین وحوالہ جات کے اضافے، نیز فاضل مؤلف کے تعارف اور پیش لفظ سے مزین کر کے ۲۰۰۳ء میں مجلس یادگار شیخ الاسلام۔ کراچی سے چھپوادیا۔

اس رسالے کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جمعیت علماے ہند اور اس کے رہنماؤں نے کس طرح نازک حالات اور تاریخ کے ہر موڑ پر لیگ کے رہنماؤں کو کسی متفقہ فیصلے تک پہنچنے کے لیے ملاقات اور گفتگو کی دعوت دی اور انھوں نے ہمیشہ گریز اور انکار کا رویہ اختیار کیا۔

۲۱۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ذکر نہیں کیا۔ حال آں کہ وہ ولی اللٰہی مکتب فکر کی ایک بلند پایہ شخصیت تھے۔ شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید مولانا عبیداللہ سندھی اور ابوالکلام آزادؒ میں اتنا ہی فرق تھا کہ

مولانا سندھیؒ "شاہ ولی اللہ دہلویؒ" کے حوالے کے بغیر جملہ مکمل نہیں کرتے تھے۔ مولانا آزادؒ نے ولی اللّٰہی فکر کو گھول کر پی لیا تھا اور یہ فکر ان کے ذہن و دماغ میں اس طرح رچ بس گئی تھی کہ ان کی زبان و قلم سے جو بات نکلتی تھی وہ ولی اللّٰہی فکر میں ڈوبی ہوئی نکلتی تھی۔ ان کے سیاسی فلسفے پر سب سے گہری چھاپ ولی اللّٰہی فکر کی تھی۔ دارالعلوم کے بزرگوں کی سیاسی فکر سے مولانا کے محکم تعلق کا ثبوت ۱۸۵۷ء میں شاملی کے معرکۂ جہاد پر ہر دو فریق کا اتفاق اس کی بہت بڑی شہادت ہے۔ مولانا آزادؒ کو حضرت شیخ الہندؒ سے جو اعتقاد اور ان کے طرز سیاست پر جو اعتماد تھا اس کا اندازہ مولانا کی اس رائے سے کیا جاسکتا ہے کہ تحریکِ نظم جماعت کی صدارت کے لیے انھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کو منتخب کیا تھا اور راضی کرلیا اور حضرت شیخ الہندؒ کے مولانا آزادؒ پر اعتماد کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرتؒ نے ۱۹۲۰ء میں اپنی صحت کے عذر کی بنا پر مولانا آزادؒ کے حق میں اپنی رائے دی تھی اور بے چین تھے کہ ان کی صدارت میں ہونے والے جمعیت کے اجلاس دہلی میں نظم جماعت کی صدارت کے لیے مولانا آزادؒ کا انتخاب کرلیا جائے۔ اور بعد کی زندگی میں بھی جمعیت علمائے ہند کے فلسفۂ سیاست کے مولانا آزادؒ نہ صرف مؤید تھے بلکہ اس کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اگر مولانا ابوالکلام آزادؒ جمعیت علمائے ہند کی سیاست کے ایک رکن تھے تو ان پر ہونے والے تصنیفی و تالیفی کاموں کے حوالہ و تذکرے اور استدلال سے اس موقع پر کیوں کر گریز کیا جاسکتا ہے۔ الحمدللہ! یہ اتنا بڑا کام انجام پایا ہے اور اس کی اتنی شہرت ہوچکی ہے، ہندوستان پاکستان کا کوئی صاحبِ ذوق اور شائقِ مطالعہ اس سے ناواقف نہیں ہوسکتا۔

قیام پاکستان کے بعد لیگیوں نے حضرت شیخ الاسلامؒ اور حضرتؒ کے معتقدین کو سیفِ تنقید کی نوک پر رکھ لیا تھا اور ہمارے بعض بزرگ سیاست سے علاحدگی اور وعظ و تبلیغ کے گوشۂ عافیت میں پناہ لینے پر مجبور ہو رہے تھے تو آزاد، احرار، چٹان وغیرہ اخبارات قوم پرور مسلمانوں کی وکالت میں برگرم تھے۔ خصوصاً مولانا ابوالکلام آزادؒ پر الزامات و اتہامات سے ان کی صفائی کے لیے مستعد تھے۔ یورپ سے واپسی کے سفر میں مولانا آزادؒ کا کراچی میں چند گھنٹے ٹھہرنے کے اتفاق اور جناح صاحب کی قبر پر ان کا جانا۔ عام لوگوں

اور بعض لیگیوں کے لیے موجب حیرت تھا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کا دل کتنا بڑا اور اخلاق کتنے بلند ہیں کہ جناح صاحب نے انھیں کانگریس کا شو بوائے کہا اور ان سے ہاتھ ملانے سے انکار کر کے انھیں مجمع میں ذلیل کیا اور پھر بھی ابوالکلام ان کی قبر پر کھڑا ہاتھ اٹھائے خدا سے ان کی مغفرت کی دعا مانگ رہا ہے! مولانا کے اس رویے کا عوام پر اثر کم کہ وہ اسے ایک رسمی اور روایتی چیز سمجھ رہے تھے اور خواص پر زیادہ پڑا کہ ان کے نزدیک یہ بلند اخلاق کی ایک غیر معمولی بات تھی اور یہ کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں کے ہندوستان کے سفروں اور لیاقت نہرو معاہدات میں ان کے ساتھ اچھے رویے ہمدردی اور عمدہ اخلاق کا اظہار کیا تھا۔ نیز یہ کہ ہندوستان میں پاکستان کے سفرا اور سفارت خانے کے دیگر حکام کے ساتھ محبت و شفقت اور احترام کا سلوک روا رکھا تھا اور پاکستان جانے والے وفود کے ارکان اور قومی مشاعروں میں شریک ہونے والے مندوب شعرا، پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بوگرا سے ملاقات اور ان کے شریک سفر حکام سے ملاقات کر کے اور بوگرا مرحوم کے اعزاز میں دعوت کر کے ان کے دلوں کو جس طرح موہ لیا تھا، اس کے جو اثرات پاکستان کے اعلا حکام کے رویوں پر پڑے تھے اور جو کایا پلٹی تھی اس کا اثر مولانا آزادؒ کی وفات پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ ۱۹۶۴ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال تک محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اور یہ بات کیسے یقین کی جا سکتی ہے کہ جناح صاحب کا سخت دل جو پنڈت جی اور گاندھی جی کو معاف کر سکتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے گاندھی جی قربانی کا معترف ہو گیا تھا۔ ''گاندھی جی کے پاکستان پر اس احسان کو کیوں کر بھلا سکتے جو پاکستان کے پچاس کروڑ روپے اپنی حکومت کے ارکان کو مجبور کر کے اور مرن برت میں بہ طور شرط رکھ کر دلوائے تھے۔'' کیا وہ مسلمانوں کے لیے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا ابوالکلامؒ کی خدمات اور قربانیوں سے نہیں پسیج گیا ہوگا؟ ان بزرگوں سے جناح صاحب کی ذاتی لڑائی تو تھی نہیں، پھر کیا ان کے لیے جناح صاحب کے دل میں نرم گوشہ نہیں پیدا ہو گیا ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ ان کے دل میں یہ ٹوٹ پھوٹ اسی وقت شروع ہوئی ہوگی۔ پھر نفرت ہمیشہ باقی رہنے والی چیز تو ہوتی نہیں، چھوٹی چھوٹی باتیں بھی رفتہ رفتہ اس کے نقش کو مٹا دیتی ہیں۔ یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے موجبات تھے جنھوں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے تذکار کو

پاکستان کی سیاسی فضا کے لیے گوارا بنایا اور پھر رفتہ رفتہ پاکستان کی علمی فضا کو حضرت مولاناؒ کے تذکار کے لیے سازگار بنا دیا۔ الحمدللہ علی ذالک!

یہ انھیں باتوں کا تواتر ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے نام پر ادارے قایم ہیں، ان پر تصنیف و تالیف کے کام انجام پا رہے ہیں، ان کی سیاسی ڈایری مرتب ہو رہی ہے، ان کے بزرگوں، دوستوں، ہم مشربوں کے سوانح حیات اور سیاسی خدمات کے تذکرے شایع ہو رہے ہیں، ان کے سیاسی مسلک و موقف اور سیاسی خدمات کے مطالعے ہو رہے ہیں، یونی ورسٹیوں میں ان کے آثار و افکار و خدمات پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ یہ بات کیسے نظر انداز کر دی جا سکتی ہے کہ ایک دوسرے پر تحقیقی و تصنیفی کاموں کی شہرت اور اثرات سے بلند خیالی کی فضا میں وسعت پیدا ہوتی ہے!

غور تو فرمایئے! پشاور میں دار العلوم دیو بند کے قیام کا ڈیڑھ سو سالہ جشن جس شان و شوکت سے منایا گیا، اس کے ظہور کا واقعی پس منظر کیا تھا؟

۲۲۔ مسلم افکار و سیاست از ڈاکٹر تارا چند: مولانا ابوالکلام آزادؒ نے وزارت تعلیم کے ایک منصوبے کے مطابق ڈاکٹر تارا چند کو ایک ایسی ''تاریخ آزادی ہند'' لکھنے کی ہدایت فرمائی جس میں حقیقت پسندی، سچائی اور غیر جانب داری سے کام لیا جائے۔ ہمایوں کبیر کے قول کے مطابق:

''مولانا (آزاد) نے انھیں صرف یہ ہدایت کی تھی کہ وہ ایک سچے مؤرخ کے نظریے سے یہ کتاب لکھیں۔ تاریخ کو حقیقت پسندانہ اور غیر جانب دارانہ انداز پر مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔'' اس کے سوا ڈاکٹر تارا چند کے لیے کوئی ہدایت نہ تھی۔

ڈاکٹر تارا چند نے اپنے کام سے ثابت کر دیا کہ انھوں نے دیانت، قابلیت، جامعیت اور خوش اسلوبی سے اپنی ذمے داری کو پورا کیا ہے۔ یہ تاریخ ''ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ'' کے نام سے بہ زبان انگریزی چار ضخیم جلدوں میں شایع ہوئی ہیں۔ اس کے دورانیے کے متعلق خاک سار ابوسلمان نے زیر بحث کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا:

> ''چوں کہ اٹھارھویں صدی میں سلطنت مغلیہ کے زوال سے تاریخ کا آغاز کیا گیا ہے: اس لیے اکبر کے دین الٰہی، جہاں گیر کی پالیسی اور اس کے ردِ عمل

میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کی تحریک تجدید واحیاے اسلام کا ذکر پس منظر میں آیا ہے اور اس کے بعد تعلیم، ثقافت، علوم، فنون، معاشیات، اقتصادیات، سیاسیات وغیرہ کے تمام مباحث میں مسلمانوں کی تحریکات اور خدمات کا ذکر بہ ترتیب آتا رہا ہے۔

مغلیہ حکومت کے عہد عروج میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا اور دورِ زوال میں حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا تذکرہ فکر انگیز ہے۔ خاک سار کو چوں کہ ولی اللّٰہی مکتبِ فکر اور اس کی سیاسی، تعلیمی، اصلاحی تحریک اور ان کے اکابر اور اصحابِ عزیمت سے خاص دل چسپی اور ارادت کا تعلق ہے، اس لیے ڈاکٹر تارا چند کے علمی مطالعے، انداز فکر اور نقطۂ نظر کے مطابق علم وعمل کے مختلف میدانوں میں نام ورانِ تحریک کی خدمات اور ان کے افکار وسیرت سے دل متاثر ہوا اور فیصلہ کر لیا کہ تیسری جلد سے ''مسلم افکار وسیاست'' کا پورا باب اخذ کر کے اشاعت کے لیے مرتب کر دیا جائے۔'' (ص۱۲، ۱۳)

''مسلم افکار وسیاست'' دراصل اسی عزم وکاوش کا نتیجہ ہے۔ اس باب میں چوں کہ ولی اللّٰہی فکر کے مدرسۂ دیوبند کی پوری ترجمانی ہوئی تھی اور یہ باب ماضی قریب کے بزرگوں کے تذکرے سے معمور تھا، اس لیے میں نے اس کی اشاعت کا انتظام بھی کر دیا۔ میں ذیل میں اس کے مضامین کی فہرست مرتب کرتا ہوں، تاکہ قارئین کرام اس کی نوعیت سے واقف ہو جائیں؛

مولانا حسین احمد مدنی

مولانا عبید اللہ سندھی

۷ مولانا ابوالکلام آزاد

۸ مجلس احرار اسلام ہند

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

۹ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

اس انڈکس کے مطالعے ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ براعظم ہند پاکستان میں سب سے بڑا علماے دین کا سیاسی مکتبِ فکر دیوبند تھا۔ علامہ اقبالؒ ایک بڑے مدبر اور فلسفی تھے، جن کا شروع سے آخر تک لیگ سے تعلق رہا۔ مجلس احرار اور اس کے رہنماؤں کے دینی و سیاسی افکار وعقاید کا رشتہ ہمیشہ دیوبند کے مکتبِ فکر سے قایم رہا۔ اس سے الگ ان کا کوئی مدرسۂ فکر نہ تھا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا نام یہاں اسی لیے آیا ہے کہ وہ نیشنلسٹ تھے اور طبقۂ علما میں حریت پرور مسلمان گروپ سے تعلق رکھتے تھے، نیز ماضی قریب میں یہ وہی گروپ تھا جس کے رہنما شیخ الہندؒ تھے۔

مولانا مودودی اسی دیوبندی مکتبِ فکر کے اساتذہ کے فیض یافتہ تھے، بعد میں انھوں نے اپنی راہ الگ کر لی تھی۔ مسلمانوں سے الگ انھوں نے اپنا دارالاسلام قایم کیا اور کعبۂ مقصود آباد کیا تھا، لیکن وہ اپنی راہ پر چل کر حصولِ مقصد میں سخت ناکام ہوئے۔ وہ بہت اچھے صحافی اور بلند پایہ ادیب تھے۔ سیاسی ذوق سے محض ناآشنا تھے۔ ان کی جماعت کی ستر سالہ تاریخ میں ان کا کوئی جانشین بھی اپنے ذوق وفکر سے سیاسی مدبر ثابت نہیں ہو سکا!

بزرگانِ دیوبند کے افکار وخدمات کے تمام مآخذ ڈاکٹر تارا چند کے سامنے چوں کہ اردو میں آئے تھے اور انھیں ان کا انگریزی میں ترجمہ کرنا پڑا تھا اور تلخیص کی بنا پر ماخذ کے بعض اہم مطالب چھوٹ گئے تھے۔ قاضی عدیل عباسی نے اردو ترجمہ کرتے ہوئے اصل ماخذ سے رجوع کرنے کے بجائے انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ کر دیا تھا، اس لیے اصل تحریرات کے مطالب حقیقت سے بہت دور ہو گئے تھے۔ خاک سار نے حوالے کی تمام

تحریرات کو اصل اردو تحریرات کے مطابق کر دیا ہے۔

یہ ڈاکٹر تارا چند کی کتاب کی تیسری جلد کے ایک باب کا ترجمہ تھا۔ ۳۶×۲۳/۱۶ تقطیع کے ۲۱۶ صفحات میں آیا تھا اور خاک سار نے اپنے وقتی جذبے کے مطابق مرتب کر کے چھپوا دیا تھا، لیکن تاریخ کی مستقل ضرورت یہ تھی کہ ''ہسٹری آف دی فریڈم مومنٹ'' کی چاروں جلدوں سے مسلمانوں کے افکار و خدمات کے تمام مباحث کو اخذ کر کے انھیں ایک جلد میں مرتب کر کے چھپوا دیا جائے۔ یہ نہ صرف دیوبندی مکتبِ فکر اور نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی بلکہ پاکستان کی تاریخ سیاسیات کی بھی ضرورت ہے۔ یہ سوچ کر خاک سار نے تمام جلدوں سے متعلقہ مواد تو اخذ کر لیا، لیکن گذشتہ آٹھ سال میں اس اہم کام پر توجہ نہ دے سکا۔

۲۳۔ مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان اسکیم: از پیر علی محمد راشدی: براہِ راست اس کتاب کا تعلق جمعیت علماے ہند یا دیوبند کے سیاسی مکتبِ فکر سے نہیں، لیکن اس میں ایک ایسا حوالہ ہے کہ مسلم لیگ کی تحریک و تاریخ کا کوئی مورخ اور کوئی قوم پرور اور حریت پسند اس کے حوالے کو نظر انداز نہیں کر سکتا!

اس مسئلے کی طرف کسی مؤرخ نے توجہ نہیں کی یا میری نظر سے نہیں گزری۔ خان عبدالولی خان نے اپنی تحقیقی کتاب ''حقایق، حقایق ہیں!'' میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ بعض وہ باتیں جو حریت پسند حلقے میں لوگوں کی زبان پر آتی رہی ہیں ان میں کوئی حقیقت ضرور ہے۔ خان عبدالولی خان نے تو اپنی کتاب میں کم و بیش پچاس صفحات میں یہ بحث کی ہے کہ ''مسلم لیگ برطانیہ کے ہاتھ میں کھیلتی رہی ہے۔'' میں نے مذکورہ بالا کتاب میں خان صاحب کی ''حقایق.....'' سے استفادہ کر کے ایک ضمیمہ مرتب کر دیا تھا۔ یہاں اسی کو نقل کیے دیتا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے:

سب کمیٹی کا قیام، اس کا پس منظر اور مقصد

ایک ضروری بحث جو ابھی تحریر میں نہیں آسکی، یہ ہے کہ یہ سب کمیٹی جس نے پاکستان اسکیم مرتب کی تھی، کب قایم ہوئی تھی اور اس کا واقعی پس منظر کیا تھا؟ اس واقعے اور اس کے

پس منظر پر خان عبدالولی خان کی دستاویزی تالیف ''حقایق، حقایق ہیں!'' سے روشنی پڑتی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتائج نے مسلم لیگ کے لیے بڑی مشکلات پیدا کردی تھیں۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہونے کی دعوے دار تھی، لیکن مسلم اکثریت کے کسی صوبے میں بھی اس کی حکومت نہ تھی۔ صورت حال یہ تھی:

صوبۂ سرحد میں مسلم لیگ کا کوئی نمایندہ نہ تھا۔ نہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کوئی کھڑا ہوا تھا، نہ کامیاب ہوا۔

صوبۂ سندھ میں بھی یہی صورت حال تھی۔ نہ مسلم لیگ کا یہاں کوئی وجود تھا، نہ اس کے ٹکٹ پر کسی نے انتخاب لڑا تھا اور نہ اس کا کوئی نمایندہ تھا۔

صوبۂ پنجاب میں مسلم لیگ کے دو نمایندے کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک سر فیروز خاں نون کامیابی کے اعلان کے فوراً بعد مسلم لیگ چھوڑ کر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے تھے O۔

بلوچستان کو صوبائی درجہ اور اس کے حقوق ہی حاصل نہ تھے۔ اس لیے انتخابات کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوا تھا۔

گویا کہ ۱۹۳۷ء کے صوبائی الیکشن میں پورے پاکستانی علاقے سے پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کا صرف ایک نمایندہ پنجاب میں تھا۔ اس صورت حال کے باوجود مسلم لیگ چاہتی تھی کہ کسی صوبے میں کوئی فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے۔ وائسرائے اور وزیر ہند کے لیے مشکل تھا کہ وہ صوبوں میں کامیاب اکثریتی پارٹیوں کو نظر انداز کردے۔ اگر ایسا کرے تو انگلستان میں پارلیمنٹ کو کیا جواب دے اور کیوں کر مطمئن کرے؟ وائسرائے نے یہ بات مسلم لیگ کے رہنماؤں پر واضح کردی تھی کہ اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اقلیت کو یہ اختیار دے کہ وہ اکثریت کا راستہ روکے اور آئینی اور جمہوری مطالبات کو مسترد کردے۔ مہذب دنیا ایسی کسی بات کو قبول نہیں کرسکتی۔ اس لیے انھیں کوئی مثبت اور تعمیری تجویز پیش کرنی چاہیے۔ وائسرائے نے یہ بات سر سکندر حیات سے کی تھی اور وزیر ہند کو لکھا تھا:

''وہ (سکندر حیات) کہتا ہے کہ میں تمہاری (وائسرائے کی) اس بات کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں پیش کروں گا......''

چناں چہ اس منصوبے کے مطابق:

(۱) ایک سب کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ۳ر فروری ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں بنائی گئی ❷۔

(۲) اس کا کام یہ تھا کہ وہ کوئی ایسی مثبت اور تعمیری تجویز پیش کرے جس سے مسلم لیگ کا مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہونے کا دعویٰ بھی سچا ثابت ہو جانے اور برٹش مفادات کو تحفظ بھی مل جائے۔

(۳) یہ بات شک سے بالا ہے کہ یہ کمیٹی وائسرائے کے ایما سے بنائی گئی تھی اور اس کے لیے سر سکندر حیات اور ان کے ساتھ اے کے فضل الحق وغیرہ کو استعمال کیا گیا تھا۔

(۴) سکندر حیات نے وائسرائے سے پہلے ہی وعدہ کر لیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ۳ر فروری کے اجلاس کی کارروائی سے بھی اسے (وائسرائے کو) راز داری کے ساتھ مطلع کریں گے۔ وائسرائے کے الفاظ جو اس نے وزیر ہند کو لکھے تھے، یہ ہیں:

"He would let me know confidentially how matters went in the meeting of the Muslim League working committee on 3rd feb."

(حقایق، حقایق ہیں!: ص ۵۲)

(۵) چناں چہ اگلے ایک دو روز میں سکندر حیات اور فضل الحق نے وائسرائے سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ اس کی تجویز کے مطابق سب کمیٹی بنا دی گئی ہے۔ وائسرائے نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ مجھے اس سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ اب میں یہ جاننے کے لیے بہت بے چین ہوں کہ کمیٹی کیا تجویز کرتی ہے۔ وائسرائے کے الفاظ یہ ہیں:

"That I should be interested to learn that the W.C. of the M.L. has now instructed a sub-committee to draft a constructive

program me. I said I was delighted to hear it and that I should await its terms with the greatest interest." (حقایق، حقایق ہیں!:ص ۵۳)

(۶) بہ قول ولی خان ۶ر فروری کو صدر مسلم لیگ مسٹر محمد علی جناح نے خود وایسرائے سے ملاقات کی اور اسے کمیٹی کی تمام کارروائی سے آگاہ کیا اور پھر دریافت کیا کہ اب انھیں یعنی مسلم لیگ کو کیا کرنا چاہیے؟ وایسرائے کے مراسلے بہ نام وزیر ہند کے الفاظ یہ ہیں:

"After the usual compliments he (Jinnah) opened the proceedings by asking me what were we to do assuming that we meant Muslim League " (حقایق، حقایق ہیں!:ص ۵۳)

مسلم لیگ، کانگریس، برعظیم پاک و ہند کی آزادی اور اس کی مختلف اسکیموں کے بارے میں انگریزوں کے خیالات میں اتار چڑھاؤ ہوتے رہے ہیں۔ کہیں ہدف بدلا ہے تو کہیں طریقۂ کار تبدیل ہوا ہے۔ شاید کسی ایسے ہی موقع پر پاکستان اسکیم سے انگریزوں کی عدم دل چسپی دیکھ کر اس کے مسلم لیگ کی اسکیم ہونے سے انکار کر دیا گیا ہو ❷؟ (حقایق، حقایق ہیں! از خان عبدالولی خان، ۱۹۸۸ء ناشر زاہد خان، ۶۰ لاین۔ دیر ہاؤس، پشاور روڈ- راول پنڈی کینٹ، طابع محمد محسن لاہور آرٹ پریس: ۱۵- نیوانارکلی۔ لاہور)

کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی تھی اور پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کے جو اعداد و شمار پیش کیے تھے، جن پر کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد تھی۔ ان پر یامین خاں نے سخت اعتراضات کیے اور مسٹر جناح کے ایک بیان پر بھی نکتہ چینی کی اور اخبار میں بیان کی تصحیح کا مشورہ دیا۔ جناح صاحب نے اپنے بیان کی وضاحت کی لیکن یامین خاں اس پر بھی معترض ہوئے تو جناح صاحب نے خاموشی اختیار کر لی اور کمیٹی کی رپورٹ کا کبھی نام نہیں لیا۔

حواشی:

❶ مسلم لیگ کے دوسرے کامیاب نمایندے ملک برکت علی تھے۔ وہ جناح صاحب کے معتمد اور لیگ

کے مخلص ۔ن تھے۔ انھوں نے پوری استقامت کے ساتھ پوری زندگی لیگ کا ساتھ دیا۔ ۱۵/اپریل ۱۹۴۶ء کولاہور میں انتقال ہوا۔

❷ یہ اجلاس دہلی میں لیاقت علی خاں کے مکان ''گل رعنا'' میں مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا تھا۔

❸ پاکستان کی اسکیم اس کی تاویلات، انگریزوں کی اس سے دل چسپی اور مسلم لیگ کی بہ حیثیت انگریزوں کے مفادات کی محافظ جماعت کے تفصیلی مطالعے کے لیے ''حقایق، حقایق ہیں!'' کا مطالعہ کیجیے۔ (ص ۵۲-۴۱) بہ عنوان ''مسلم لیگ برطانیہ کے ہاتھ میں کھیلتی رہی'' اور بعدہ متفرق صفحات پر مجموعی طور پر تقریباً ۵۰ صفحات اس بحث اور اس کے لیے تاریخی دلایل اور حوالہ جات میں صرف ہوئے ہیں۔ ''پاکستان اسکیم'' کے تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجیے: مولانا غلام رسول مہرؒ اور پاکستان اسکیم' مصنف پیر علی محمد شاہ راشدی/مرتب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، مجلس یادگار مہر- کراچی ۱۹۹۲ء

پیش نظر کام:

پچھلے چند صفحات میں خاک سار نے ان ۲۳ تالیفات پر روشنی ڈالی تھی جو شیخ الاسلامؒ کے حوالے سے یا تو حضرتؒ کی شخصیت، اوصاف و محاسن اور افکار و خدمات کے تعارف، جمعیت علماے ہند کی تاریخ، خصوصیات اور خدمات کے بارے میں یا دیوبند کے مدرسۂ عالیہ اور دیوبندی مکتب فکر اور سلوک و تصوف میں حضرتؒ کی خصوصیات اور دعوت و ارشاد کے تذکار سے مزین اور انھیں مقاصد کو پورا کرنے والی ہیں، جو حضرتؒ کی سیاسی ڈایری کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کا مقصود ہوسکتی ہے۔

اس سلسلے کے چند اور کام بھی انجام پائے جو مذکورۂ بالا تصانیف اور ڈایری کی اشاعت کا مقصود قرار پائی تھیں۔ زیر بحث آنے والے کام بھی انھیں مقاصد کے حصول کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوں گے۔ میں یہاں پر صرف دو مکمل کاموں کی طرف اشارہ کروں گا۔

ان میں پہلا کام حضرت شیخ الاسلامؒ کے خطبات، و تقاریر، بیانات وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام تر ذخیرہ سیاسی خطبات و تقاریر پر مشتمل ہوگا۔ اس مجموعے کے مشمولات کو ذیل کے عنوان و ترتیب سے پیش کردیا گیا ہے؛

اداروں او راجتماعوں کی ترتیب سے:

۱۔ مرکزیہ جمعیت علماے ہند کے صدارتی اجتماعات کے خطبات به تعداد: ۹
۲۔ جمعیت کی صوبائی، ضلعی اور مقامی شاخوں کے
صدارتی وغیر صدارتی خطبات به تعداد: ۳
۳۔ دیگر قومی وملی تنظیمات کے صدارتی وغیر صدارتی خطبات به تعداد: ۴
۴۔ تعلیمی تنظیمات واجتماعات کے خطبات وتقاریر به تعداد: ۲
۵۔ عدالتی بیانات وتقاریر به تعداد: ۳
۶۔ احتجاجی بیانات وتقاریر به تعداد: ۲
۷۔ پیغامات به تعداد: ۱
۸۔ متفرق تقاریر (جلسوں اور کانفرنسوں کی) به تعداد: ۱۳=کل ۳۷

ایک اندازے کے مطابق یہ ایک ہزار سے زاید صفحات ہوں گے اور حالات و وقت کے فیصلے کے مطابق تمام اندراجات تاریخی ترتیب یا موضوعاتی ترتیب کے تحت، ایک، دو یا تین جلدوں میں شایع ہوں گے۔

۲۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے سیاسی مکتوبات: مکاتیب شیخ الاسلامؒ کے مدون ومطبوعہ مجلدات اور غیر مرتب ومنتشر مکاتیب سے ماخوذ سیاسی خطوط کی تین جلدیں ہوں گی۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کے بارے میں اور بھی کئی کام جاری ہیں۔ ان میں سے کچھ ترتیب وتدوین اور تکمیل کے مرحلے میں، کچھ زیر غور ومشورہ طلب ہیں اور زندگی اسی کے لیے وقف ہے۔ خدا مہلت اور توفیق عطا فرمائے!

ایک معذرت:

قارئین کرام کو اس کے مطالعے اور اس سے استفادے کے دوران میری بہت سی کوتاہیاں محسوس ہوں گی، لیکن مجھے امید ہے کہ مبصروں اور تنقید نگاروں کی رہنمائی اور غور و فکر کے نتیجے میں وہ ان کی اصلاح ضرور کریں گے۔ البتہ ایک امر کے لیے میں خود معذرت خواہ ہوں۔ میں اس کی تالیف وتدوین میں اپنے آپ کو ایک خاص نقطۂ نظر، طرزِ فکر اور فلسفۂ سیاست کی طرف داری سے الگ نہیں کر سکا، لیکن اتنے طویل مدتی اور اتنے

عظیم وضخیم منصوبے کی تکمیل کسی پختہ فکر سے گہری وابستگی کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی تھی۔ مجھے اس فکر اور اس کے بزرگوں سے سچی عقیدت نہ ہوتی تو ہرگز مجھ میں استقامت اور ایثارِ وقت ومال کی جذبہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر یہ محض شوق کی بات ہوتی تو اس کے ٹھنڈے پڑ جانے کے لیے دو، چار سال بھی بہت تھے، ۲۲ برس تک یہ مشقت برداشت نہیں کی جاسکتی تھی اور نہ کوئی شخص اتنی طویل مدت کے لیے گھریلو ذمے داریوں سے صرفِ نظر کرسکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ اس نے اپنے ایک بندۂ ضعیف وناتواں کو یہ ہمت اور توفیق عطا فرمائی۔ والحمد للہ تعالیٰ!

آخری گذارش:

زیرِ نظر تالیف میں تحریر وکتابت کی غلطی ہوسکتی ہے، حوالے کی نہیں۔ میں نے اس میں کوئی ایسا حوالہ نہیں دیا، جس کے صحت پر اطمینان نہ ہو۔ کسی معاملے میں میری رائے غلط ہوسکتی ہے، لیکن میں نے اپنے اخلاص کو کہیں داغ دار نہیں ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ اس تالیف میں میری غلطیوں کے اثر کو دور اور مجھے معاف فرمائے اور اس میں حسن وخوبی کی باتوں سے قوم وملت کو مستفید ہونے کی توفیق بخشے!

حضرت اسعد الملتؒ کے انتقال کے بعد:

دیوبند کی انقلابی جماعت جس کی تنظیم وتشکیل اور اجرا کے لیے قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے شاگرد رشید مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کو اپنی تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں قومی وملی رہنمائی کے سب سے بلند منصب پر فایز اور ''شیخ الہندؒ'' کے لقب سے ملقب کیا اور قوم کے مدبرین اور ملت اسلامیہ ہند کے اعاظم رجال نے ان کی عظمت کے اعتراف واحترام میں سر جھکایا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے شاگرد رشید مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو اپنی تعلیم وتربیت سے سنوارا اور پھر انھوں نے اپنے محترم استاد کے نقش قدم پر چل کر قوم ووطن کی آزادی کی تحریک اور ملت کے قیام و اصلاح کی دعوت کو ملک کے کونے کونے تک پھیلا کر اہل وطن کو بیدار کیا اور منزل آزادی

تک پہنچا کر قوم و ملت پر تعمیر اور ترقی کی شاہ راہ مقصود کو کھولا۔ قوم نے ان کی عظمت و خدمت کے اعتراف میں انھیں سب سے بڑے قومی اعزاز پدم بھوشن سے اور ملت نے سب سے محترم خطاب ''شیخ الاسلام'' سے مخاطب فرما کر اپنی عقیدت واحترام کا ثبوت دیا، لیکن حضرتؒ کے ذوقِ استغنا کا یہ عالم تھا کہ نہ قومی اعزاز کو قبول فرمایا نہ ملت کے بخشے ہوئے خطاب سے رغبت ظاہر فرمائی۔ اسلاف کرام سے محبت کو اپنا اعزاز و طرۂ امتیاز سمجھا اور ''ننگ اسلاف'' لکھنا ہمیشہ اپنے لیے فخر جانا۔

حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے عہد کے بلند پایہ محدث تھے، دیوبندی مکتب فکر کی سب سے بڑی شخصیت تھے، جمعیت علمائے ہند کے محبوب و کامیاب ترین صدر نشین اور قومی رہنماؤں کی صفِ اول کی ممتاز شخصیت تھے۔ جنوب مشرقی ایشیائی براعظم کے ہر سہ ممالک پر محیط ان کا حلقۂ سلوک و تصوف اس عہد کا سب سے وسیع نظام رشد و ہدایت ہے۔

آزاد ہندوستان میں تحریک شیخ الہندؒ کے جدید دور کا آغاز ۱۹۵۸ء میں فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ (وفات ۱۹۷۱ء) کی صدارتِ جمعیت علمائے ہند سے ہوتا ہے۔ اس دور کی دوسری بڑی شخصیت محدثِ کبیر مولانا عبد الوہاب آروی (۱۹۷۲ تا ۱۹۷۳ء) کی تھی اور تیسری شخصیت جس کے سر پر رہنمائی کا تاج رکھا گیا، جس کی روشنی نے راہ و منزل کو چمکایا اور ہم رہانِ سفر کے قلوب کو عزائم اور امیدوں سے بھر دیا تھا، اسعد الملت مولانا سید اسعد مدنیؒ کی تھی، جن کی وفات (فروری ۲۰۰۶ء) حسرت آیات پر جمعیت علمائے ہند کے جدید دور کے پہلے ۴۹ سالہ (۱۹۵۷ء تا ۲۰۰۶ء) عہد سعادت کا خاتمہ ہوگیا۔

دورِ ارشد کا آغاز:

عہدِ جدید کے دورِ ثانی میں قوم و ملت کی رہنمائی اور سیادت کے لیے وقت کے اصحابِ نظر و تدبر اور مخلصینِ صادقین نے اسلاف کی میراث، حضرت قاسم العلومؒ کا ذوق و فکر، حضرت شیخ الہندؒ کی نظر و تدبر اور حضرت شیخ الاسلامؒ کی جانشینی، درس و تدریس کی ذمے داریوں، دار العلوم کے مصالح و مفادات کی نگہ داشت، جمعیت علمائے ہند کی صدارت،

تحریک امارتِ شرعیہ کی رہنمائی، قوم کی دردمندی، ملت کی فکر اور ذمے داریوں کے بوجھ کے لیے حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم پر اپنے اعتماد کا اعلان کر دیا ہے۔ ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حضرت مدظلہ العالی کی ذات گرامی میں جس ذوقِ خدمت، نظر و بصیرت خصایص علم اور اخلاصِ عمل و ایثار کی خوبیوں کو اپنے علم و تجربے کی روشنی میں بنیاد بنایا ہوگا، یقین کامل ہے کہ حضرت مخدوم زادۂ محترم کا مقام اس سے بہت بلند ثابت ہوگا۔

ابو سلمان

(ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری)

(۱)

محمد علی جناح

سوانح اور افکار و سیرت کی چند جھلکیاں

تاریخ پیدائش

(۱) ۲۱ر اکتوبر ۱۸۷۵ء. سندھ مدرسۃ الاسلام- کراچی اور کرسچین مشن اسکول- کراچی کے رجسٹروں کے اندراجات کے مطابق قایداعظم کی تاریخ پیدائش ۲۰ر اکتوبر ۱۸۷۵ء ہے۔

(۲) اکتوبر ۱۸۷۶ء: ۲۵ر جنوری ۱۸۹۶ء کو ایک مقدمے میں قایداعظم کی طرف سے کراچی کی ایک عدالت میں ایک تحریری بیان (حلف نامہ) داخل کیا گیا، جس میں انھوں نے لکھا کہ وہ ۱۸۹۲ء میں ہنڈی کی تعمیل کے وقت نابالغ تھے۔ وہ اکتوبر ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔

(۳) ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۶ء: قایداعظم کے دو پاسپورٹوں میں ہفت روزہ انجام- دہلی کے ایک سوال نامے کے جواب میں قایداعظم نے اپنے قلم سے تاریخ، وقت اور مقام پیدائش ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۶ء، علی الصبح، کراچی تحریر فرمائی ہے اور ہمیشہ اسی تاریخ کو قایداعظم کی سال گرہ بھی منائی جاتی رہی ہے۔

(۴) بعض دیگر بیانات و تحریرات سے قایداعظم کا سال پیدائش ۱۸۷۰ء، ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۴ء بھی ثابت ہوتا ہے۔

(قائداعظم محمد علی جناح- حیات، افکار و خدمات، گورنمنٹ نیشنل کالج۔ کراچی، ۱۹۷۷ء: ص ۱۵۵)

نام:

محمد علی جناح کا نام پہلے "محمد بھائی علی بھائی خوجانی" رکھا گیا تھا۔ بمبئی نیوز پیپر کمپنی کے زیر اہتمام ۱۹۴۸ء بمبئی سے شایع ہونے والی "مسلم ایر بک آف انڈیا اینڈ پاکستان" میں

محمد علی جناح کا اصل نام ''محمد بھائی علی بھائی خوجانی'' تحریر کیا گیا ہے۔

(قائد اعظم کے بہتر سال ا۔ بی بی سی سد ۱۹۸٦ء، کراچی ص ۳)

جائے پیدائش

سرکاری سطح پر وزیر مینشن کراچی کو قائداعظم کی جائے پیدائش تسلیم کر لیا گیا ہے، لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ جھرک کے مقام پر پیدا ہوئے۔ جھرک میں پیچا پٹ کے نام سے اب بھی ایک میدان (پٹ) ہے جس کے قریب قائداعظم کا کراچی میں پہلا آبائی مکان بتایا جاتا ہے۔ اس وقت جھرک ضلع کراچی ہی کا ایک قصبہ تھا، اس لیے قائداعظم کا کراچی کو اپنی جائے پیدائش بتانا خلاف واقعہ نہیں کہا جا سکتا۔

رضوان احمد کی تحقیق کے مطابق قائداعظم چھاگلی اسٹریٹ (کراچی) کے کنارے واقع ایک مکان میں پیدا ہوئے جو ان کے والد نے شادی کے بعد کرائے پر لے لیا تھا۔

یہ نوٹ نہ صرف لکھا جا چکا تھا بلکہ کتابت و تصحیح کے مراحل سے گزر کر کاپی جوڑی جا رہی تھی کہ روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ایک مضمون نظر سے گزرا (یہ مارچ ۱۹۷۷ء کے نصف آخر کا کوئی پرچہ ہے) اس سے معلوم ہوا کہ بعض نصابی کتابوں میں ابھی تک یہی درج ہے اور بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ قائداعظم جھرک میں پیدا ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتابیں پنجاب بورڈ کے دائرۂ اثر میں ہوں گی، اس لیے کہ سندھ بورڈ کے دائرۂ اثر میں بہت پہلے کتابوں میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ میں نوائے وقت کے مضمون نگار کے اس خیال سے بالکل متفق ہوں کہ قومی سطح پر خاص کراچی کو قائداعظم کا مقام پیدائش طے کر لینے کے بعد نصابی کتابوں میں بھی یہ تبدیلی کر دینی چاہیے۔ بلاشبہ اہل علم و ارباب تحقیق کے لیے یہ ایک اہم موضوع ہے، وہ ضرور دادِ تحقیق دیں گے، لیکن نصابی کتابوں میں اور ایسی کتابوں میں جو علمی و تحقیقی مباحث کے بجائے قومی نقطۂ نظر کی تشریح و تعارف کے لیے لکھی جائیں ان میں علم و تحقیق کے اختلافات کو جگہ نہیں دی جانی چاہیے۔

(علم و آگہی (گورنمنٹ نیشنل کالج کا میگزین، قائداعظم نمبر، ۱۹۷۷ء: ص ۲۴۸)

ذات:

(۱) سندھ مدرستہ الاسلام (کراچی) میں قائداعظم محمد علی جناح کے داخلے کے تین

اندراج ہیں، تینوں میں ان کی ذات ''خوجہ'' کی صراحت موجود ہے۔

(قایداعظم محمد علی جناح کی نجی زندگی کے دو اہم پہلو: از شریف الدین پیرزادہ، کراچی، ۱۹۸۸ء: ص ۱۴، ۱۵)

(۲) بمبئی کی طرح کراچی میں بھی خوجہ جماعت کافی تعداد میں آباد ہے۔ کراچی کے ایک تاجر پیشہ، خوش حال اور متمول خوجہ جناح پونجا تھے .. ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو اتوار کے روز پونجا کے خاندان میں وہ نونہال پیدا ہوا..... جو آگے چل کر اس خاندان کا نہیں، ملّت اسلامیہ کا ناخدا بننے والا تھا..... باپ خوش تھا کہ اسے ..... بڑھاپے کا سہارا ....مل گیا.. لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ.. .. یہ سہارا ایک چھوٹے سے خوجہ خاندان کا نہیں، ایک بڑی اور عظیم الشان قوم کا بننے والا ہے۔ (قایداعظم اور ان کا عہد از سید رئیس احمد جعفری لاہور: ص ۲۱)

سرگزشت قایداعظم، جناح:

مسٹر محمد علی جناح کو قایداعظم کب، کہاں اور کس نے کہا؟ یہ ایک دل چسپ سوال ہے۔ اس سلسلے میں متعدد اور مختلف روایات ہیں۔ یہاں ان تمام روایات کو کسی تبصرے کے بغیر جمع کر دیا ہے۔ اسی طرح لفظ جناح کی ایک سرگزشت ہے، چوں کہ اس بحث کا تعلق لسانیات سے بھی ہے اس لیے اس کے مطالعے کی افادیت کا یہ ایک مزید پہلو ہے۔

قایداعظم:

(۱) پنجاب کے مشہور سیاسی کارکن میاں فیروز الدین احمد کے صاحب زادے میاں کمال پاشا اپنے والد مرحوم پر ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''قایداعظم'' کا لقب موچی دروازے لاہور کے ایک عوامی کارکن میاں فیروز الدین احمد مرحوم نے سب سے پہلے لکھنؤ کے اجلاس میں دیا۔

اسی طرح انھوں نے لکھنؤ اور بعد میں پٹنہ کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مسٹر جناح کو زور دار آواز میں سب سے پہلے قاید اعظم کہا اور نعرہ لگایا۔ فضا زندہ باد کے نعرے سے گونج اٹھی۔

ایک کارکن کی اخلاص میں ڈوبی ہوئی آواز قومی نعرہ بن گئی۔''

(جنگ کراچی 'قایداعظم ایڈیشن ۷۶ء: ص ۶)

(۲) محمد دین کلیم نے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے حوالے سے اپنے مضمون میں لکھا ہے

''لاہور کے ایک جلسۂ عام میں خواجہ فیروز الدین مرحوم نے آپ کو'' قاید اعظم'' کا خطاب دیا۔'' (برگ گل، کراچی، قاید اعظم نمبر ۱۹۷۶ء)

(۳) مسعود زاہدی کی روایت ہے:

''اب قابل صد تحسین حسن اتفاق کہیے یا قدرت کا انعام خاص کہ جب مسٹر ایم اے جناح ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں تشریف لائے تو تاریخ میں پہلی بار انھیں قاید اعظم کے خطاب سے مخاطب کیا گیا، جواب جزو نام با احترام بن چکا ہے۔'' (راوی- لاہور، قائد نمبر، ۱۹۷۶ء)

(۴) خواجہ ظفر نظامی فرماتے ہیں:

''اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ محمد علی جناح کے لیے قاید اعظم کا لقب سب سے پہلے میاں فیروز الدین شاہ نے استعمال کیا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میاں فیروز الدین شاہ نے بہت سے رہنماؤں کے لیے بڑے شان دار القاب ایجاد کیے، وہ اس میں بڑے ماہر تھے ... خود انھیں بھی لوگوں نے'' نقیب الملت'' کا خطاب دے رکھا تھا۔

اکتوبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس قاید اعظم کی صدارت میں بہ مقام پٹنہ منعقد ہوا، اس میں میاں فیروز الدین بھی شریک ہوئے تو انھوں نے پہلی بار'' قاید اعظم زندہ باد'' کا نعرہ لگایا۔ ساتھ ہی علم بردار جمہوریت، فاتح کانگریس زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اجلاس میں جب میاں فیروز الدین تمام نعرے لگا چکے تو آخر میں نقیب الملت زندہ باد کا ایک نعرہ بھی جوش و خروش سے بلند ہوا، اس پر قاید اعظم مسکرا دیے تھے۔''

(۵) مظہر الدین شیر کوٹی کا بیان

''محمد علی جناح کے لیے'' قاید اعظم'' کا لقب سب سے پہلے مولانا مظہر الدین نے استعمال کیا تھا۔ وہ دہلی سے سہ روزہ'' الامان'' شایع کرتے تھے۔ .....

مولانا اپنے اخبار میں پٹنہ اجلاس سے کئی ماہ قبل محمد علی جناح کے ساتھ قاید اعظم
کا لقب استعمال کر رہے تھے۔ اس کے جواب میں ماہ نامہ ''محشر خیال'' دہلی
نے ستمبر ۱۹۳۸ء میں طنزاً قاید اعظم کا لفظ شایع کیا تھا اور اس کے ایک ماہ بعد
پٹنہ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو میاں فیروز الدین نے ''قاید اعظم زندہ باد'' کا
نعرہ لگا کر اس لقب کو تمام برصغیر میں مشہور کر دیا۔''

(نوائے وقت- لاہور، قاید اعظم نمبر، ۱۹۷۶ء)

(۶) حسین ملک کا بیان ہے:

''۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں دہلی میں ایک جلسہ ہوا، جلسے کے بعد جلوس نکالا گیا،
قاید اعظم بگھی میں سوار ہوئے، دہلی مسلم لیگ کے صدر شیخ شجاع الحق ان کے
ساتھ بیٹھے تھے اور میں سامنے والی سیٹ پر تھا۔ ہجوم بہت تھا، اس لیے بعض
اوقات مجھے بگھی سے اُترنا پڑتا۔ دہلی کی فضا اللہ اکبر اور زندہ باد کے نعروں سے
معمور تھی۔ مختلف بازاروں میں سے ہوتا ہوا جلوس دریا بازار میں سے گزر رہا
تھا کہ ''قاید اعظم'' زندہ باد کا نعرہ بلند ہوا، پھر یہ نعرہ مسلسل بلند ہونے لگا۔ لوگ
یہ نعرہ پوری قوت سے لگا رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب انھیں قاید اعظم کے
لقب سے پکارا گیا۔ اس کے بعد مسٹر جناح کسی نے پکارا ہی نہیں۔ قاید اعظم
ہی ان کا نام بن گیا۔ (آتش فشاں- لاہور، قاید اعظم نمبر، ۱۹۷۶ء)

جناح:

قاید اعظم کے جد امجد کا نام پونجا تھا۔ ان کے تین صاحب زادے تھے۔ وال جی، جنا
اور نتھو۔ منجھلے صاحب زادے، جنا، پیدایش کے وقت چوں کہ بہت دبلے پتلے اور کم زور تھے
اس لیے دیکھنے والوں نے انھیں، جھینا کہنا شروع کر دیا۔ گجراتی زبان میں جھینا کے معنی کم
زور کے ہیں۔ اردو زبان میں بھی جھنا تقریباً انھیں معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً جھنا کپڑا،
یعنی ایسا کپڑا جو باریک اور جھر جھرا ہو۔ بہر حال لفظ جھینا نے کثرتِ استعمال سے جینا یا جنا
کی شکل اختیار کر لی، لیکن حال ہی میں رضوان احمد صاحب نے قاید اعظم کے والد کی تحریر کا
جو عکس شایع کیا ہے اس میں ان کے نام کا املا انگریزی میں ''ایچ'' کے اضافے کے ساتھ

یعنی Jinnah ہے، لیکن قایداعظم کے نام کے ساتھ ابتدا میں ''جنا'' بغیر ''ح'' کے ملتا ہے۔

جی الانا صاحب نے اپنی کتاب ''قایداعظم جناح - ایک قوم کی سرگذشت'' میں لکھا ہے کہ قایداعظم کے نام میں سندھ مدرسۃ الاسلام کے دوران تعلیم میں تین مرتبہ تبدیلی ہوئی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب لکھتے ہیں کہ سندھ مدرسہ اور کرسچین مشن اسکول کے ریکارڈ میں ان کا نام ''محمد علی جنا'' ملتا ہے، لیکن اس وقت تک ان کے نام کے ساتھ، بھائی کا لاحقہ بھی جزو نام تھا۔ سندھ مدرسے کے رجسٹر کے آخری اندراج میں جنا بھائی کا املا Jinna Bhoy ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ جنٹیر اں (جناح) کا لفظ قایداعظم کے والد کے نام میں شامل تھا اور اسی بنا پر ان کے نام کا جزو قرار پایا جیسا کہ گجرات میں عام طریقہ ہے۔

''بھائی'' کا لاحقہ قایداعظم نے اپریل ۱۸۹۶ء میں اس وقت ترک فرمایا جب انھوں نے لندن میں قانون کا امتحان دیا تھا۔ اردو اخبارات ۱۹۱۶ء تک بلا استثنیٰ ان کے نام کے ساتھ جینا استعمال کرتے تھے اور انگریزی اخبارات Jinna لکھتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں جب قایداعظم مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے تو اس وقت سید سلیمان ندویؒ کی روایت کے مطابق حبیب جالب مرحوم ایڈیٹر ''ہمدم'' لکھنؤ کی ذہانت نے ''ح'' کے اضافے سے اسے جناح بنا دیا۔ اس کے بعد وہ ایسا مشہور ہوا کہ اس نے اصل کی جگہ حاصل کر لی۔ اس کے بعد عام طور پر تو لفظ جناح استعمال ہوتا رہا لیکن خواص اہل علم کی زبان پر اس کے بعد بھی جینا ہی کا لفظ جاری رہا۔ غالباً اس کی وجہ جناح کا معنوی سقم ہوگا۔ جناح کوئی لفظ نہیں، صحیح لفظ جَناح ہے جس کے معنی بازو کے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۱۶ء میں قایداعظم کی لکھنؤ آمد کے موقع پر جو نظم لکھی تھی اس میں لفظ جینا استعمال کیا ہے۔

پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

مولانا شبیر احمد عثمانی نے ۱۹۴۶ء میں ایک انٹرویو میں ''جینا'' لفظ ہی استعمال کیا تھا۔ یہ انٹرویو خواجہ عبدالوحید صاحب نے لیا تھا اور اسی زمانے میں لاہور کے ایک اخبار میں شایع ہوا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں قاید اعظم کی وفات پر سید سلیمان ندوی نے معارف اعظم گڑھ میں جو تعزیتی شذرہ لکھا تھا اس میں بھی انھوں نے لفظ ''جینا'' استعمال کیا ہے۔ اس کے عنوان میں بھی یہی لفظ ہے یعنی ''قاید اعظم محمد علی جینا رحمۃ اللہ علیہ'' کسی جگہ نظر سے یہ بھی گزرا ہے کہ ''جنا'' یا ''جینا'' کو سب سے پہلے مولانا ظفر علی خاں کا اضافہ کر کے معرب کیا تھا لیکن یہ حوالہ اس وقت سامنے نہیں ہے۔ اس لیے بالیقین اس امر پر اصرار نہیں کر سکتا۔ ناقابل تردید تاریخی شہادت یہی ہے کہ جناسے جناح ۱۹۱۶ء میں سید حبیب جالب مرحوم نے بنایا تھا اور اب صحیح اور معروف و مستعمل نام ''محمد علی جناح'' ہے۔ قاید اعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح انھیں پیار سے ''جن'' کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔

اردو نامہ کراچی قاید اعظم نمبر (اپریل ۱۹۷۷ء) کے مضمون نگار اعظم علی خاں نے جن کے دعوے کے مطابق قاید اعظم انھی کی برادری (راجپوت) سے تعلق رکھتے تھے، پاکستان کے مشہور مورخ عشرت رحمانی کے حوالے سے قاید اعظم کا نام اور شجرۂ نسب اس طرح لکھا ہے:

> ''محمد علی جنیرا بھائی ابن جنیرا بھائی ابن پونجا بھائی ابن میگھ جی ابن بیر جی۔ محمد علی اپنے والد جنیرا بھائی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔''

عشرت رحمانی نے ایک نہایت مفصل مضمون صحیفہ لاہور کے قاید اعظم نمبر میں لکھا ہے:

> قاید اعظم کے والد بزرگ وار کا نام جنیرا بھائی پونجا تھا...... جنیرا بھائی کی اولاد میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں...... (قاید اعظم) کا خاندانی نام ''محمد علی جنیرا بھائی'' تھا، لیکن سن شعور کو پہنچ کر انھوں نے لفظ ''جنیرا'' کو معرب کر کے جناح کر لیا۔'' (سید رضوان علی علوی)

(علم و آگہی (نیشنل کالج کا میگزین) قاید اعظم محمد علی جناح، خصوصی شمارہ: ص ۵۳-۲۴۹)

ابتدائی حالات پر ایک سرسری نظر:

مسٹر جناح کی بہن فاطمہ جناح لکھتی ہیں:

''میری والدہ امید سے تھیں اور میرے والد اپنی نوجوان بیوی کی پوری طرح دیکھ بھال کر رہے تھے، دونوں میاں بیوی اپنے پہلے بچے کی ولادت کے بارے میں خاصے پرجوش اور مسرور تھے۔ اس وقت کراچی میں میٹرنٹی ہوم نام کی شاید ہی کوئی چیز تھی، بس چند ایک دائیاں تھیں، جن کی اپنے پیشے میں شہرت اچھی تھی۔ لہٰذا انھی کو چاروں طرف سے بلاوے آتے رہتے تھے اور وہ خاصی مصروف رہا کرتی تھیں۔ بچے کی ولادت سے قبل زچہ اور بچہ کی صحت سے حفاظت تدابیر اور علاج معالجہ وغیرہ سے کوئی آگاہ نہ تھا بلکہ عین ولادت کے وقت ہی دائی کو گھر میں بلایا جاتا تھا۔ متمول علاقہ ہونے کی وجہ سے کھارادر میں ایک دائی رہتی تھی، جسے شہر کی بہترین دائی سمجھا جاتا تھا، اسے زچگی کے روزمرہ کے واقعات میں مسلسل خدمات سرانجام دینے کے باعث اس قسم کے امور کا کافی تجربہ تھا۔ چناں چہ والدہ نے اس عورت کی خدمات پہلے ہی سے حاصل کرلیں۔ اسی عورت کے ہاتھوں میری والدہ کے ہاں اُن کے پہلے بچے کی ولادت عمل میں آئی۔ یہ لڑکا تھا۔ اس روز اتوار تھا اور تاریخ تھی ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۶ء۔

بچہ کم زور اور دبلا پتلا سا تھا۔ اس کے ہاتھ لمبے اور پتلے پتلے تھے اور سر لمبوترا سا تھا۔ والدین اس کی صحت کے بارے میں بہت پریشان تھے۔ بچے کا وزن بھی معمول سے کئی پونڈ کم تھا۔ انھوں نے بچے کا ایک ڈاکٹر سے معاینہ کرایا، جس نے بتایا کہ ظاہری کم زوری کے سوا بچے کی صحت یا اعضا میں کوئی نقص نہیں ہے اور یہ کہ والدین کو اس کی صحت کے بارے میں زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے، مگر ایک ڈاکٹر کی خالی خولی یقین دھانی سے ایک شفیق ماں کے خدشات اور تشویش کیوں کر ختم ہوسکتی تھی؟

اس کے بعد بچے کا نام رکھنے کا سوال پیدا ہوا۔ اب تک کاٹھیاواڑ میں آباد ہمارے خاندان کے مردوں کے نام بڑی حد تک ہندوؤں کے ناموں سے مشابہ تھے، مگر سندھ ایک مسلم صوبہ تھا اور یہاں والدین کے پاس پڑوس میں آباد لوگوں کے بچوں کے نام مسلمانوں جیسے تھے۔ والدین کا اتفاق رائے اس پر ہوا کہ ان کے پہلے بیٹے کا نام محمد علی مناسب رہے گا۔ چناں چہ انھوں نے اپنے بچے کا نام یہی رکھا۔

میری والدہ محمد علی سے انتہائی محبت کرتی تھی اور اس حقیقت کے باوجود کہ انھوں نے

بعد ازاں چھ اور بچوں کو بھی جنم دیا، وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک محمد علی سے سب سے زیادہ پیار کرتی رہیں۔ رحمت، مریم، احمد علی، شیریں، فاطمہ اور بندہ علی ان کے دیگر بچے تھے، جن میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔

میرے والد کے کندھوں پر پھیلتے ہوئے کاروبار کی بھاری ذمہ داریاں تھیں، مگر میری والدہ کا اصرار تھا کہ محمد علی کو ہمارے آبائی گاؤں پانیلی سے دس میل کے فاصلے پر واقع گانود میں حسن پیرؒ کی درگاہ پر لے جا کر ان کی رسم عقیقہ وہاں ادا کی جائے۔ بچپن ہی سے میری والدہ نے اس درگاہ میں مدفون اس پیر کے عقیدت مندوں سے ان کی معجز نما قوتوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ان (میٹھی بائی) کی والدہ کی پیش گوئی نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ ایک عظیم مستقبل محمد علی کا منتظر ہے۔ اس لیے بھی وہ اُسے حسن پیرؒ کی درگاہ پر لے جانا چاہتی تھیں۔ اُس زمانے کے رواج کے مطابق وہاں محمد علی کے سر کے بال اتارنے کی تقریب منعقد کی جاتی تھی۔ بچے کی والدہ اپنی منّت پوری ہونے کے لیے مقدس پیر کی نوازشات طلب کرنا چاہتی تھیں۔ پہلے پہل تو میرے والد نے یہ کہہ کر اس رسم سے بچنے کی کوشش کی کہ وہ ایک ماہ سے زاید عرصے تک کراچی سے باہر نہیں رہ سکتے، مگر آخر کار انھیں اپنی نوجوان بیوی کے دلایل کی گرم جوشی کے سامنے نرم ہونا پڑا اور یوں اپنے چند ماہ کے بیٹے کے ہم راہ ہمارے والدین نے کراچی سے ویراوال جانے والی ایک بادبانی کشتی میں اپنی نشستیں بک کروالیں۔

کشتی ویراوال بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئی اور وہ بہ خیر و عافیت خشکی پر قدم رکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ گانود تک چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے لیے انھوں نے ایک بیل گاڑی کرائے پر لے لی۔ بحیرۂ عرب میں ایک طوفانی سفر اور ہچکولے کھاتی ہوئی بیل گاڑی میں سواری کے بعد یہ لوگ بالآخر اپنی منزل پر جا پہنچے اور اب میرا ننھا بھائی محمد علی اپنی والدہ کی آغوش میں اور بے شمار رشتہ داروں کے ہجوم میں گھرا حسن پیرؒ کی درگاہ پر سر منڈانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس طرح میری والدہ کی منّت پوری ہوگئی۔

حسن پیرؒ کی زندگی کے حقایق داستانوں کے ساتھ یوں خلط ملط ہوگئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ تاہم یہ بات مسلم ہے کہ حسن پیر اسماعیلی مبلغ کی

حیثیت سے ایران سے خشکی کے راستے بلوچستان سے ہوتے ہوئے اس علاقے میں آئے تھے۔ راستے میں انھوں نے کچھ عرصے ملتان میں بھی قیام کیا تھا۔ ان کی متصوّف اور مثل زندگی کے باعث بہت سے لوگ ان کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے تھے اور بہت سے غیر مسلموں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ یہ بزرگ بعدازاں سندھ کی جانب روانہ ہو گئے، جہاں انھوں نے تبلیغ کا کام جاری رکھا۔ پھر وہ کچھ میں آنکلے اور بالآخر پائیلی کے قریب ایک مقام پر خیمہ زن ہوئے۔ انھوں نے اپنی باقی ماندہ زندگی اس علاقے میں آباد غیر مسلموں کو اسلام کی تبلیغ کرنے میں گزار دی۔

کہا جاتا ہے کہ وہ مافوق الفطرت قوتوں کے مالک تھے۔ ان کی ذات سے بہت سی حکایات وابستہ ہیں۔ اس قسم کی باتیں عموماً ایسی شخصیات سے وابستہ کر دی جاتی ہیں، جن کی زندگی کے اصل واقعات اور کارنامے تاریخی شہادتوں سے محروم ہوا کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ حسن پیر اُن مسلمان صوفیائے کرام کے نقش قدم پر گامزن تھے جن کے دن قرآن کی تعلیم اور اسلام کا پیغام پھیلانے اور راتیں عارفانہ مراقبوں میں گزرتی ہیں۔ ان کی عادت تھی کہ رات کو جلدی سو جایا کرتے تھے اور علی الصبح دو بجے کے قریب بیدار ہو کر اپنے خیمے کے باہر دریائے بدھار کے کنارے صبح کو نماز تک محوِ استغراق رہا کرتے تھے۔ ایک رات جب وہ نامعلوم سے لو لگائے بیٹھے تھے کہ پانی کی ایک بہت بڑی لہر دریا کا کنارہ پھلانگ کر حفاظتی پشتے سے بھی آگے تک نکل گئی۔ دریا کے منہ زور پانی کے اچانک آنے والے ریلے نے حسن پیر کو اپنے ساتھ دریا کے اندر کھینچ لیا، جو حسب معمول دریا کے کنارے پر مراقبے میں بیٹھے تھے اور اس طرح ان کی فانی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کی لاش اندھیرے کی چادر تلے دریا کے بہاؤ پر سفر کرتی اس جگہ کے قریب کنارے سے آ لگی جسے گانود گاؤں کہا جاتا ہے۔ یہاں راباری ذات کے غیر مسلموں کی اکثریت آباد تھی۔ ان لوگوں کا آبائی پیشہ گائیں پالنا تھا۔

علی الصبح جب چند راباری دریائے بدھار کے کنارے پہنچے تو انھوں نے حسن پیر کی لاش دیکھی، جسے دریا کی لہریں ساحل پر چھوڑ گئی تھیں۔ انھوں نے اس بزرگ کو فوراً پہچان لیا۔ جس کی شہرت پائیلی گاؤں کی جغرافیائی حدود سے نکل کر آس پاس کے علاقوں تک پھیل

چکی تھیں۔ راباریوں کے بڑوں نے باہم صلاح مشورہ کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس بزرگ کی لاش انھیں قدرت کی جانب سے تحفے میں دی گئی ہے۔ چناں چہ وہ اس کی شایانِ شان طریقے سے تدفین کریں گے اور ان کا مزار بھی تعمیر کرائیں گے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ حسن پیر کی درگاہ تعمیر کرنے سے ان کے گاؤں میں خوش حالی آئے گی۔

اس طرح حسن پیر گانود گاؤں میں دفن ہوئے۔ برسوں گزر جانے کے باوجود گونڈل ریاست کے لوگوں کا حسن پیرؒ کی درگاہ کی زیارت کرنے کے لیے جوش وخروش کم نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ ان بزرگ کی درگاہ پر آج بھی ان کا عرس ہر سال باقاعدگی سے منعقد ہوتا ہے، جس میں ان کے ہندو اور مسلمان عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔

حسن پیر کی درگاہ پر عقیقے کی رسم سرانجام دینے کے بعد میرے والدین بالوں سے صاف سر والے ننھے منے بیٹے کو لے کر اپنے آبائی گاؤں پانیلی آ گئے۔ یہ سفر بھی انھوں نے بیل گاڑی میں طے کیا۔ میرے والد کے لڑکپن کے دوست اور رشتے دار کراچی میں ان کی کامیابیوں کے بارے میں شان دار کہانیاں سن چکے تھے۔ اس کامیابی نے انھیں اس قدر اہمیت دلا دی تھی کہ ان کے آبائی گاؤں کے باشندوں کی نظروں میں ان کے لیے بے حد احترام پیدا ہو گیا تھا۔ میری والدہ نے اپنے چہیتے بیٹے کی ولادت کی خوشی منانے کے لیے ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ جس میں پورے گاؤں کو رات کے کھانے پر بلایا۔ اپنے بچپن کے دنوں میں میں نے اپنے بزرگوں سے سنا:

> ''اس روز پانیلی کے کسی ایک گھر میں بھی چولھا نہیں جلایا گیا تھا۔ لوگوں کے گھروں میں کھانے پکانے کے برتن اور کھانا کھانے کی پلیٹیں بدستور باورچی خانوں کے طاقچوں میں پڑی رہیں۔ گویا یہ بھی اپنی اپنی جگہوں پر آرام کرتے ہوئے ننھے محمد علی کی پیدائش کی خوشی منا رہی ہوں۔ جو پانیلی کے ایک دیہاتی کا بیٹا تھا۔''

پانیلی اور گونڈل میں چند ہفتے قیام کرنے کے بعد میرے والدین اپنے ننھے بیٹے کے ساتھ کراچی واپس آ گئے۔

(''میرا بھائی'' از محترمہ فاطمہ جناح: ص ۲۳-۲۰)

والدہ:

محمد علی جناں کے دادا ''پونجا بھائی'' کاٹھیاواڑ کی ریاست گونڈل کے قریب واقع ایک دیہہ پانیلی کے رہنے والے تھے.........

پونجا بھائی کے تین لڑکے والجی بھائی، نتھو (نھتو) بھائی، جینا (جینڑاں) بھائی اور ایک لڑکی مین بائی تھی۔ جینا بھائی سب سے چھوٹے لڑکے تھے......

پونجا بھائی نے جینا بھائی کی.... خوجہ خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی مٹھی بائی سے تقریباً ۱۸۶۴ء میں شادی کردی۔ (قائد اعظم کے بہتر سال: خواجہ رضی حیدر ۱۹۸۶ء، کراچی: ص ۹)۔

مذہب-اسماعیلی خوجے:

وہ نہ تو سنی مسلم تھے اور نہ ہی خاص قسم کے شیعہ تھے۔ ان کا خاندان ایک چھوٹے سے فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو اسماعیلی خوجے کہلاتے ہیں اور آغا خان اس فرقے کے راہنما تھے۔ اس کے باوجود محمد علی جناح ہندوستان کے مسلمانوں کے راہنما بن کر اُبھرے۔ اپنے رہن سہن اور رکھ رکھاؤ میں وہ انگریزی تہذیب سے متاثر تھے اور ہندوستانی زبان میں تقریر نہیں کرسکتے تھے۔ وہ مساجد سے الگ تھلگ رہتے اور مذہب اور سیاست کو گڈمڈ کرنے کے خلاف تھے۔ اس کے باوجود وہ آخری دور میں ''اسلام خطرے میں ہے'' کا نعرہ بلند کرنے سے الگ نہ رہ سکے!

والدین:

ان کے والد جینا بھائی پونجا ایک خوش حال تاجر تھے اور کھالوں کا بیوپار کرتے تھے، ان کے آباؤ اجداد ہندو تھے۔ پونجا کے والد گجرات کاٹھیاواڑ کے باسی تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کیا تھا❶ پونجا کی بیوی کا نام مٹھو (مٹھی) بائی تھا جو اکثر ہندو گھرانوں میں رکھا جاتا۔ (مسلم افکار: ص: ۱۹۲)

حاشیہ ❶: اسلام قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے خوجہ اسماعیلی مذہب قبول کرلیا تھا۔

راجہ صاحب محمود آباد کا بیان:

راجہ محمود آباد نے ۲۵ر نومبر ۱۹۴۵ء کو بمبئی کے ایک امام باڑے میں قاید اعظم کی حمایت میں انتخابی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

''ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے قاید اعظم سچے شیعہ ہیں۔ تاریخ اسلام بدل رہی ہے اور ہندوستان کے تمام سنی آج ایک جانشین حضرت امام حسین علیہ السلام کی فہم و فراست کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور اس کے حکم پر سر کٹانے کو تیار ہیں۔ اگر اس سے پہلے کے لوگوں میں سمجھ ہوتی تو نہ اختلافات کا دروازہ کھلتا اور نہ اعلائے کلمتہ الحق کے لیے شیعہ وجود میں آتے۔ آج قاید اعظم کی مخالفت کرنا اپنی تاریخ کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔''

(راوی) احمد اللہ کمال خاں چالی امام باڑہ روڈ بمبئی نمبر ۳)

(سہ روزہ ''زمزم'' لاہور، ۳ر اکتوبر ۱۹۴۵ء و سہ روزہ مدینہ بجنور، یکم دسمبر ۱۹۴۵ء)

جناح صاحب کا اپنا بیان:

ایک دن مسٹر جناح فارغ ہوئے تو انھیں پیغام ملا کہ مسز جناح لابی میں چائے کے لیے ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ تشریف لائے۔ دونوں میاں بیوی اور راجہ غضنفر علی چائے پی رہے تھے کہ سر چمن لال سیتلواد بھی وہاں آ گئے۔ وہ جناح صاحب کے خاصے بے تکلف دوست تھے۔ آتے ہی بیگم جناح سے کہنے لگے: مسز جناح! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی محفل میں مخل ہو جاؤں؟ یہ کہہ کر وہ بھی چائے میں شریک ہو گئے اور پھر مسٹر جناح سے کہنے لگے:

''جناح! میں ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس بات پر ایک جگہ بحث ہو رہی تھی اور میں کہہ رہا تھا کہ تم اسماعیلیہ فرقے سے تعلق رکھتے ہو۔ کیا میرا خیال درست ہے؟''

''بالکل غلط'' جناح صاحب نے فرمایا:

''میں اثنا عشری شیعہ ہوں۔ جس کا مطلب ہے بارہ اماموں کو ماننے والا۔

اسماعیلیہ فرقہ اس سے بالکل الگ شے ہے۔''

بیگم جناح مسکرا کر کہنے لگیں:

''چمن! میرے بارے میں بھی کسی غلط فہمی میں نہ پڑنا۔ میں بھی وہی ہوں جو جناح نے ابھی تمھیں بتایا ہے۔''

(مارشل لا سے مارشل لا تک، از غضنفر علی: ص ۵۳)

آغا خانی:

اکبر علی غلام حسین اپنی آپ بیتی ''ہم آغا خانی کیسے ہوئے؟'' (کراچی ۱۹۹۶ء) میں ''مسٹر محمد علی جناح آغا خانی تھے'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

''مجھ سے ایک تقریب میں چند اسماعیلی نوجوانوں نے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ مسٹر محمد علی جناح ''قاید اعظم'' خالص آغا خانی اسماعیلی تھے۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ توحید پرست مسلمان تھے لیکن نوجوان اپنی ضد پر قایم رہے اور یہ دلیل پیش کی جسے میں سن کر سوچ میں غرق ہو گیا کہ اس کا کیا جواب دوں؟ بہرحال ان کے الفاظ ہو بہو بلا تبصرہ پیش ہیں:

''آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسٹر جینا پونجا اسماعیلی برادری کے متمول اور بااثر افراد میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ جماعت خانے کی حاضری قایم رکھی اور ''دعا'' میں شرکت کی۔ اسی نسبت سے ان کے فرزند محمد علی جینا بھی اسماعیلی آغا خانی ٹھہرے (اس موقع پر تصحیح کر لی جائے کہ جینا پونجا کے فرزند ارجمند کی حیثیت سے ان کو ہمیشہ محمد علی جینا پکارا جاتا جو بعد کے ایام میں جینا سے جناح معروف ہو گیا)۔ حاضر امام نے بھی اسماعیلیوں کے روحانی پیشوا کے طور پر اس حیثیت (Status) کو قایم رکھا اور آج (کے) روز تک قایم ہے۔ وہ جب بھی سرکاری یا غیر سرکاری، نجی یا ذاتی دورے پر کراچی تشریف لاتے ہیں تو دیگر غیر ملکی سربراہان مملکت کی طرح کبھی قاید اعظم کے مزار پہ حاضری نہیں دیتے۔ سرکاری و غیر سرکاری طور پر اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ کبھی ''حاضر امام'' نے قاید اعظم کے مزار پر حاضری دی ہو۔ بس یہ ایک ایسی

مثال ہے کہ روحانی پیشواچوں کہ اپنی پوری جماعت کا ''روحانی باپ'' ہوتا ہے
اس ناطے وہ اعلا درجے پر فایز ہونے کی وجہ سے اپنے پروکار ''روحانی بچے''
کی قبر پر کیسے حاضری دے سکتے ہیں؟ اسی لیے آج تک ''حاضر امام'' کراچی
آمد پر کبھی قاید اعظم کے مزار پر حاضر نہیں ہوئے!!
رہا دعائے فاتحہ کی بات تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آغا خان دنیا میں خدا کا انسانی
روپ ہے یعنی وہ مولا ہے۔ اب خود خدا ہوتے ہوئے آغا خان دعائے فاتحہ
اپنے روحانی بچے کی قبر پر کیسے پڑھ سکتے ہیں؟ اسی وجہ سے آپ نے یہ بات
نوٹ کی ہوگی کہ صدر پاکستان مرحوم جنرل محمد ضیاء الحق کی تدفین کے موقع پر
حاضر امام نے دعائے فاتحہ نہیں پڑھی۔ آخر خدا کو دعا مانگنے کی کیا ضرورت پڑی
ہے؟ وہ تو خود بخشش کرتے ہیں، مغفرت کرتے ہیں اور اپنے پیروکاروں کی
دعائیں خود قبول کرتے ہیں۔'' (ص ۹۲-۳۹۱)

حدیث دیگراں:

مذہب کا جہاں تک تعلق ہے پاکستان میں کوئی کچھ بھی کہا کرے، لیکن وہ بنیادی طور
سے سیکولر اور ناعقیدہ (اگناسٹک) تھے۔ ان کے انتہائی معتقد سوانح نگار کو بھی اس کی تلاش
میں خاصی مشکل پڑے گی کہ ان کی تحریر و تقریر سے مذہب کی تبلیغ یا تشویق کے سلسلے میں ایک
آدھ جملہ بھی مہیا کر سکے۔ مجھے ان کی کسی تحریر و تقریر میں ایسی کوئی چیز یاد نہیں آتی جس میں
انھوں نے اسلام کی خوبیاں بیان کی ہوں اور وہ کبھی مسجد میں گئے ہوں۔ کم سے کم میری یاد
میں ایسا کبھی نہیں ہوا، ہو تو وہ سیاسی ضرورت کے تحت ہوا ہوگا۔ اگر مولاناؤں سے انھوں نے
کبھی کچھ تعلق رکھا ہو، کم سے کم مجھے ایسا یاد نہیں آتا، تو یہ محض ووٹوں کے سلسلے سے ہوا ہوگا۔
جناح صاحب خالصتاً پارلیمانی سیاست میں دل چسپی رکھتے تھے اور مسلم لیگ بھی ان
کے ذہن میں محض پارلیمانی اقتدار کے حصول کے لیے ایک ذریعے کے بہ طور تھی اور بس۔ وہ
مسلم لیگ کے خالق اور پاکستان کے بانی کہے جا سکتے ہیں، لیکن ان کی لاادریت اپنی جگہ پر
تھی۔ ان کی اپروچ اور فکری سانچہ خالص Synical اور سیاسی تھے اور وہ ان لوگوں پر تختی

سے حملہ کرتے تھے جو مذہب میں سیاست کو آمیز کرتے تھے۔ یقیناً وہ مسلمانوں کو سیاست میں لائے لیکن اسلام کو نہیں۔ دوسری طرف گاندھی جی ہندومت کو سیاست میں لاتے رہے۔ ہریجن مسئلے پران کا مرن برت اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

جناح صاحب اول و آخر ایک سیاسی مسلمان تھے وہ اپنے آپ کو مسلمان فرقے کا سیاسی لیڈر سمجھتے تھے۔ جب غیر منقسم ہندوستان ان کے ذہن میں تھا اور پھر مسلمان قوم کا سیاسی لیڈر جب وہ پاکستان کے بارے میں سوچنے لگے، اسلام ان کے فکری دایرے میں کسی جگہ کم ہی آتا تھا اور اگر کوئی پوچھتا کہ محض مشترک عقیدہ نسلی اعتبار سے مختلف لوگوں کو ایک قوم کیسے بنا سکتا ہے تو ان کا جواب یہ ہوتا کہ امریکا نے ثابت کر دیا ہے کہ قومیت تو محض اپنی اختیاری ہوتی ہے۔ اگر مسلمان ایسا سوچتے ہیں کہ وہ ایک قوم ہیں تو وہ ایک قوم ہیں اور یہی اس کے لیے کافی ہے۔

وہ اتنا ہندومت یا ہندوؤں کے خلاف نہ تھے جتنا کانگریس کے، جسے وہ مسلم لیگ کی سیاسی حریف سمجھتے تھے۔ ہندو مسلم فسادات سے اچھا خاصا فایدہ اُٹھایا، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کی حفاظت کی اہل نہیں اور مسلمانوں کو خوف زدہ کر کے لیگ کی طرف رولنے کے لیے ہندو راج کا ہوّا بھی کھڑا کرتے رہے، لیکن ان سے بے تعداد مرتبہ بات چیت میں مجھے مشکل ہی سے کوئی بات یاد آتی ہے جب انھوں نے ہندوؤں یا ہندو مذہب پر کوئی حملہ کیا ہو۔ ان کی مخالفت جو بعد میں نفرت میں ڈھلتی گئی، کانگریس قیادت کی جانب مزکور تھی، اور اگر وہ گاندھی جی اور جواہر لال جی سے ٹکر لینا چاہتے تھے تو اس میں دونوں کے ہندو پن سے زیادہ ان کی کانگریست کو دخل تھا۔ ان کے کتنے ہی ہندو دوست تھے......

اور یہ کم اہم بات نہیں ہے کہ ایک بار اپنی نفرت انگیز کانگریس سے گلوخلاصی پانے کے بعد جناح صاحب نے اپنے بنیادی سیکولرزم کو پھر سطح کے اوپر اُبھر آنے دیا۔ تقسیم کی انتہائی ہول ناک فرقہ پرستی بھی بہ ظاہر ان کے بنیادی سیکولرزم کو نہ دبا سکی۔ یہ سچ ہے، جیسا کہ تفصیل آئے گی کہ غالباً ان کے محرکات ملے جلے تھے، لیکن اس سے زیادہ کون سی چیز نمونہ کے سیکولرزم کے طور سے پیش کی جا سکتی ہیں، جو انھوں نے پاکستان میں آئین ساز اسمبلی کو

۱۱؍اگست ۱۹۴۷ء کے خطاب میں کہا، جب انھوں نے اعلان کیا کہ

> ''تم میں سے ہر ایک خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو اور خواہ کسی بھی رنگ، ذات یا عقیدے کا ہو اولاً، ثانیاً اور آخراً اس ریاست کا شہری ہے۔ برابر کے حقوق، برابر کے امتیازات اور برابر کی ذمے داریوں کے ساتھ..... تم کسی بھی مذہب، ذات یا عقیدے سے متعلق ہو، ریاست کے معاملے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول سے ابتدا کر سکتے ہیں۔ اسے ہمیں اپنے نصب العین کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ پھر جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی معنی میں نہیں کہ مذہب تو ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی معنی میں، قوم کے شہری کی حیثیت سے۔''

ان کا سخت ترین نقاد بھی یہ تو مانے گا کہ کسی اسلامی ریاست کی افتتاحی تقریر تو یہ ہونے سے رہی! ذہن عجیب فضاؤں میں پرواز کرنے لگتا ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کیا ہوتے اگر کشمیر بیچ میں ایک دیوار بن کر نہ ابھرا ہوتا۔ کچھ بھی ہو بعد میں صورت حال جس طرح خراب ہوئی اور حتیٰ کہ باقاعدہ جنگ تک نوبت پہنچی اس کی ذمے داری ان کے سر نہیں ڈالی جاسکتی۔ جناح کچھ بھی رہا ہو، مذہبی مجنوں ہرگز نہیں تھا!

لیکن آخر آخر ان میں اتنا ضرور ہو گیا تھا کہ وہ بے حد سخت دل ہو گئے تھے۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں، پاکستان میں، ہندوؤں کے ٹھہرے رہنے کے وہ ممکن ہے دل سے خواہش مند رہے ہوں لیکن ان کے اندر کے سیاست داں نے یرغمال کا نظریہ محض ان کے سبب نہیں چلایا! ان کے اپنے اور کچھ گنے چنے انتہا پسند لیگیوں کے سوا مجموعی طور سے مسلمانوں نے پاکستان کو سودے بازی کے ایک نقطۂ آغاز سے بڑھ کر کچھ نہیں سوچا تھا۔ اسی لیے جب انھوں نے دیکھا کہ وہ تو سچ مچ ملنے لگا تو ہندو اکثریت کے علاقوں میں رہنے والے مسلمان حیران و پریشان رہ گئے کہ ان مسلمانوں کی ڈھارس کے لیے اور انھیں سیاسی حمایت مہیا کرنے کے لیے ہی جناح صاحب نے انھیں یہ یقین دہانی کی تھی کہ پاکستان میں ایک مطمئن ہندو اقلیت کا وجود ہندوستان میں باقی ماندہ مسلمانوں کے ساتھ اچھے سلوک

کی خود بہ خود ضمانت بن جائے گا۔

ان کے اس استدلال میں ایک Cynicism تھا جس پر یونہی تنقید کے تیر نہیں برستے رہے ہیں۔ جناح جس کا نام تھا وہ ایسا کوئی کند ذہن شخص نہیں تھا کہ اسے اپنے ان عقیدت گزاروں کے ذہنی رخ کا اندازہ نہ ہو، جنھیں اس نے خود ہندوؤں سے کٹ کے ایک الگ ریاست بنانے کے راستے پر ڈالا تھا۔ یہ ذہنی رخ کہ وہ اپنے درمیان ہندوؤں کو کس حد تک گوارا کر سکیں گے اور کانگریس اور ہندو ان کے پروپیگنڈا کیے ہوئے پیمانے کا دسواں بیسواں حصہ بھی اینٹی مسلم تھے تو اپنے ملک کو منقسم دیکھنے کے بعد اس میں کسی قسم کی کمی آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندو اقلیت پاکستان سے نکالی جارہی ہے یا انھیں مسلمان بنایا جارہا ہے۔ ادھر ہندوستان میں کتنے ہی فرقہ وارانہ فسادات ہوتے چلے آرہے ہیں اور جتنے پتا چلتے ہیں اس سے کہیں زیادہ تعداد میں مسلمان مارے جا چکے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ کتنے ہندو اور مسلمان اب تک اس پُرخون نظریے کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔

لیکن یہی Cynicism میرے اس خیال کو کم زور کرنے کے بجائے مزید قوی کر دیتا ہے کہ جناح صاحب لاادریے تھے اور زندگی کے اخیر تک لاادریے رہے۔ جداگانہ انتخابات سیاسی اسباب کی بنا پر روشناس کیے گئے۔ جناح صاحب انھیں کے زائیدہ اور ایک سیاسی مسلمان تھے۔ مسلمان فرقہ ان کے لیے حلقۂ انتخاب کی جگہ حاصل کرتا گیا اور مسلمان قوم ان کے سیاسی ارادت مند۔ جنگ جو انھوں نے لڑی سیاسی تھی مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان! اور پاکستان ان کی سیاسی مانگ تھی ایک الگ علاقہ کے لیے، جس پر وہ اور مسلم لیگ حکومت کر سکیں۔ اس سب میں مذہب محض امر اتفاقی تھا۔

۱۹۳۹ء سے پہلے پاکستان بھی ان کے فکری سلسلے کی کڑی نہیں بنا۔ میرا خیال ہے ۱۹۳۴ء کے آس پاس قطعی خلوص کے ساتھ انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ ہندو اور مسلمان ایک ہندوستانی جسم کے دو بازو ہیں۔ جب کانگریس نے ۱۹۳۶ء میں صوبائی وزارتیں بنائیں اس وقت انھیں توقع تھی کہ کانگریس لیگ مخلوط وزارتیں بنیں گی اور یہی ان کے ہندو مسلم اتحاد کا تصور تھا، مگر کانگریس نے رویہ ہی دوسرا اپنایا۔ اس وقت کانگریس ان سیاسی

نظریات پر عامل ہو رہی تھی جن پر مکمل طور پر اطلاق ہو سکتا تھا، مثلاً اکثریتی پارٹی کی حکومت کا نظریہ اور اس سلسلے میں یہ خیال نہیں رہا کہ ہندوستانی حالات کے پس منظر میں عددی اکثریت کا مطلب فرقہ وارانہ اکثریت ہوگا۔ کانگریس نے صوبوں میں حکومت بنائی تو خالص کانگریس پارٹی کی۔ اس رویے نے بالآخر انھیں پاکستان کی طرف ڈھکیل دیا۔ مخلوط وزارتیں ہی سب کچھ تو نہیں اور محض آغاز کار تھیں نہ کہ انجام یا مقصد، لیکن یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اکثریتی حکومت کی قسم کے نظریات کو چھوڑ کے مسلمانوں کی حمایت کے حصول کا یہ ذریعہ بڑی حقیری قیمت تھی جو ادا کر دینی چاہیے تھی۔ یہ سچ ہے کہ ۱۹۴۷ء کی عارضی حکومت جو مخلوط حکومت تھی، قطعی ناکام ہوگئی، لیکن یہ وہ وقت تھا جب پاکستان مسلم لیگ کا مذہب بن چکا تھا۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس وقت اس میں کامیابی نہیں ہوتی، جب مسلم لیگ غیر منقسم ہندوستان ہی میں یقین رکھتی تھی۔

(محمد علی جناح از مرزا راشد علی بیگ، خدا بخش لائبریری جرنل ۱۰۳: ص ۵۰-۳۴۶)

جناح صاحب کی ازدواجی زندگی:

تقریباً ۴۰ سال کی عمر تک جناح قید محبت سے آزاد اور ناآشنائے محبت تھے، لیکن ۱۹۱۵ء کا سال جناح کی زندگی میں ایک یادگار سال تھا کہ اس سال وہ ایک رومان سے دوچار ہوئے۔ ہم سبھی لوگ گرمی کی چھٹیوں میں دارجلنگ میں تھے پٹیٹ خاندان بھی وہاں تھا، ادھر جناح بھی تھے اور ساتھ ہی ان کے کچھ دوست بھی Sir Dinshaw Petit اس نام کے ساتھ دوسرے امیر (Baronet) تھے، ان کی لڑکی رتن پریا (جن کی عرفیت رتی تھی) ان کے ساتھ تھیں۔ ہماری آمد کے ساتھ ہی یہ بات کہی جانے لگی کہ محبت جو نادیدہ تھی دارجلنگ کی فرحت بخش فضا میں محوِ خرام ہے اور اس کی فضا ایک کہنہ چالیس سالہ کنوارے اور ایک بہت ہی کمسن سولہ سالہ لڑکی کے رومان کی خوش بو میں بسی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے دلہن کے والدین سے ایک رسمی اجازت لینا بھی ضروری نہیں سمجھا O۔ کیوں کہ محبت خسرے جیسی ہوتی ہے اور اس وقت اور بھی خراب ہو جاتی ہے جب وہ زیادہ عمر میں ہوتی ہے۔ سر ڈنشا اور جناح گہرے دوست تھے، لیکن

کیوپڈ کے تیر نے جناح کے دل کو زخمی کر دیا اور معمول کے مطابق مقصد کی محکم گیری نے انھیں یہ فیصلہ لینے پر مجبور کر دیا کہ انھیں رتن سے شادی کرنا ہے، خواہ اس کے لیے کچھ بھی ہو جائے۔ جناح اس وقت رتن سے شادی کرنے کی خواہش میں اس طرح ڈوبے ہوئے تھے جس طرح وہ ایک ربع صدی بعد اپنے اس مستحکم ارادے میں ڈوبے ہوئے تھے کہ انھیں پاکستان کی بنیاد رکھنا ہے۔ خوش قسمتی نے ان کا ساتھ دیا اور وہ دونوں (اپنی مطلوبہ) شے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ دنیا میں کچھ ہی لوگ جناح سے زیادہ خوش نصیب ہوں گے، لیکن نہ تو پہلی اور نہ دوسری کامیابی کچھ آسان ثابت ہوئی اور نہ ہی ان میں سے کوئی بھی ان کے لیے خالص رحمت ثابت ہوئی ❷۔

رتن کے والدین نے اس خیال سے کہ جناح کو شادی سے روکیں، بمبئی ہائی کورٹ سے ایک حکم امتناعی حاصل کر لیا جو کہ کہنہ سال کنوارے دولہا کو اپنی منگیتر سے شادی کرنے سے باز رکھتا تھا، جب تک کہ وہ سن بلوغ کو نہ پہنچ جائے۔ اس طرح شادی کوئی دو سال کے لیے ملتوی ہو گئی، لیکن سچی محبت کی راہ ہم وار ہی رہی (ایک ناتجربہ کار شاعر کا اعلان کے باوجود) اور بعد میں شادی انجام پا گئی۔ اس طرح کہ دلہن نے اسلام قبول کر لیا۔ مذہب اکثر اونچے طبقوں میں سول میرج کے لیے پردہ بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی زندگی کے بچے ہوئے مختصر لمحوں میں بیگم جناح کی شخصیت بمبئی، دلّی اور شملہ کے سماجی حلقوں میں جاذبیت کی حامل رہی اور جناح اپنے کنوارے دوستوں کے حلقے میں رشک کی نظر سے دیکھے جانے لگے کہ وہ ایک بے انتہا حسین، حد درجہ باصلاحیت اور ہندوستان کی ایک انتہائی شایستہ لڑکی کے شوہر ہیں۔ انھوں نے جناح کو ایک بیٹی کا تحفہ دیا جو کچھ سال پہلے سرنس واڈیا کے بیٹے سے بیاہی گئی۔ یہ بمبئی کے رہنے والے تھے، (پارسی کرسچن کروڑ پتی تھے)۔ پریس میں یہ رپورٹ آئی کہ جناح نے اپنی بیٹی کے کرسچن ہو جانے پر اعتراض کیا، لیکن اس نے اپنی سمجھ کو ترجیح دی کہ اس کے خیال میں ان معاملات میں باپ کی ہدایتوں پر عمل کرنے کی بجائے اس پر بھروسا کرنا چاہیے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ رتن اپنے ساتھ ایک بڑی دولت لائی تھیں اور چالیس لاکھ کی میراث جو جناح نے چھوڑی تھی۔

ہندوستان اور پاکستان کے مختلف اداروں کے لیے اس کا ایک بڑا حصہ وہ تھا جو ان کی

بیگم اپنے جہیز میں لائی تھیں۔ ان عام تاثرات کا ذکر جو بے بنیاد تھے سچے واقعات کے طور پر اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں کچھ سال پہلے ان کے ایک مداح نے اپنے خاکے میں کیا تھا، لیکن دوسرے تصحیح شدہ ایڈیشن میں جو جناح کے انتقال سے کچھ ماہ پہلے گزشتہ ستمبر میں شائع ہوا تھا وہ حصے نکال دیے گئے تھے اور یہ کہا گیا تھا کہ جناح کی یہ خواہش تھی کہ انھیں حذف کردیا جائے، کیوں کہ وہ غیر مصدقہ تھے۔ بہر حال جناح کی شادی ایک کروڑ پتی پارسی کی لڑکی سے جس نے مذہب تبدیلی کرلیا تھا اور جو شاید اپنے شوہر سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی قوم پرست تھیں، بہ حیثیت ایک قوم پرست لیڈر ان کے تابناک کیریئر میں ایک نمایاں واقعہ ہے۔

(وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں! از ڈاکٹر سچد انند سنہا، خدا بخش لائبریری، جرنل ۱۰۱: ص ۳۰۱-۲۹۹)

حواشی ❶: ڈاکٹر سچد انند سنہا کا اشارہ اسی طرف ہے کہ رتی جناح نے سول میرج کرلی تھی۔ مولانا دین محمد وفائی نے جناح صاحب پر تعزیتی مضمون میں صاف طور پر ان کی سول میرج کا ذکر کیا ہے۔

(تذکرہ وحیاتِ توحید)

❷ پہلی اور دوسری کامیابی سے اشارہ شادی کا وقوع اور پاکستان کا قیام ہے۔ شادی کے بعد بہت تھوڑے عرصے میاں بیوی کے مابین رنجیدگی پیدا ہوگئی۔ بیٹی پیدا ہوئی وہ ایک پارسی یا عیسائی کی محبت میں گرفتار ہوئی اور اسی کی شریک زندگی بن گئی۔ پاکستان کا قیام عمل میں آگیا لیکن ان کے ساتھیوں اور پیرووں نے انھیں اتنے دکھ پہنچائے کہ وہ چیخ اٹھے۔ اور بمبئی (ہندوستان) لوٹ جانے کا عزم کرلیا۔ فرشتہ اجل نے ان کی یہ آرزو بھی نہ پوری ہونے دی۔

پہلی شادی:

حسن پیر کا تذکرہ فاطمہ جناح نے بہت تفصیلی اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے، لیکن اقبال حسین قادری نے اس عبارت کا ترجمہ بالکل چھوڑ دیا ہے۔

"اور جب جناح صاحب کی شادی کا مسئلہ پیدا ہوا تو ان کے لیے بھی اسماعیلی خوجہ خاندان کی لڑکی کی تلاش ہوئی۔ فاطمہ بیان کرتی ہیں:

"میری والدہ..... پانیلی کے ایک اسماعیلی خوجہ خاندان کو جانتی تھیں جن سے

ان کی دور کی رشتہ داری تھی۔ ان کی لڑکی ایمی بائی..... محمد علی کی دلہن بننے کے لیے بالکل موزوں تھی۔" (ترجمہ اشرف تنویر: ص ۳۵) چناں چہ ایمی بائی کے ساتھ جناح صاحب کی شادی ہوگئی۔"

اسٹینلے والپرٹ کی مشہور کتاب "جناح آف پاکستان" اب پاکستان میں بھی چھپ گئی ہے۔ (سول اینڈ ملٹری پریس- کراچی برائے آکسفورڈ یونی ورسٹی ۱۹۸۹ء) اس میں بھی انھیں شیعہ اسماعیلی خوجہ لکھا گیا ہے O۔

"مسٹر جناح ایک شیعہ مسلمان خوجہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ خوجے اسماعیلی کہلاتے ہیں اور آغا خان کے پیرو ہیں۔" (ص ۴)

جناح صاحب کی پہلی بیوی کے بارے میں کہ ایمی بائی ایک خوجہ لڑکی تھی، فاطمہ جناح کی روایت نقل کی گئی ہے۔ (ص ۷،۸)

قائداعظم کی بہن فاطمہ جناح نے "مائی برادر" کے نام سے لکھی اور شایع کرائی ہے۔ اس کے بعد ترجمے

(۱) اقبال حسین قادری (قائداعظم سوسایٹی- لاہور، ۱۹۷۸ء)

(۲) اشرف تنویر (آتش فشاں پبلی کیشنز- لاہور، ۱۹۸۸ء) شایع ہوئے ہیں۔

اس میں بہن نے بہ انداز دگر اپنے دادا، والد، والدہ، بھائی، بھاوج کے اسماعیلی خوجا ہونا کا ذکر کیا ہے اور ایک اسماعیلی مبلغ حسن پیر سے خاندان خصوصاً والدہ کی عقیدت کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً:

(۱) "میرے دادا کی عمر بڑھتی جارہی تھی، ان کے دونوں بڑے بیٹوں اور بڑی بیٹی کی شادی ہوچکی تھی، والدین کی واحد ذمہ داری اب یہ باقی رہ گئی تھی کہ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی کسی اچھی سی لڑکی کے ساتھ انجام پاجائے، جس کا تعلق ان کے اسماعیلی خوجہ فرقے سے ہو۔" (ترجمہ اقبال حسین قادری: ص۲، وترجمہ اشرف تنویر: ص ۱۵)

(۲) "کاٹھیاواڑ میں ہمارے خاندان کے مردوں کے نام کچھ ہندوانہ انداز پر رکھے جاتے تھے۔ سندھ میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور کھارادر میں ہمارے ہمسایہ بچوں کے نام مسلمانوں کے انداز پر رکھے ہوئے تھے، لہٰذا طے پایا کہ ان پہلے بچے کا نام محمد علی موزوں

رہے گا۔'' (ترجمہ اقبال حسین قادری: ص۴، وترجمہ اشرف تنویر: ص۲۰)

ہندوانہ طرز کے ناموں کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جناح صاحب کے باپ دادا کے نام جینڑاں پونجاہ، میگھ جی، ہیر جی تھے اور بہن اور بھائیوں (جناح صاحب کی پھوپھی اور چچاؤں) کے نام مان بائی، داں جی اور ناتھو یا منتھو بھائی تھا۔

(۳) جناح صاحب کی والدہ کا اصرار تھا:

''محمد علی کو آبائی گاؤں پانیلی سے دس میل دور ''گانوڈ'' گاؤں میں حسن پیر کی درگاہ پر لے جا کر ان کی رسم عقیقہ وہاں ادا کی جائے۔''

(ترجمہ اشرف تنویر: ص۲۱)

والدہ ان بزرگ کی بہت معتقد تھیں۔

''حسن پیر اسماعیلی مبلغ کی حیثیت سے ایران سے خشکی کے راستے بلوچستان سے ہوتے ہوئے اس علاقے میں آئے تھے۔'' (ترجمہ اشرف تنویر: ص۲۲)

حاشیہ ❶: اسی ادارے نے ۱۹۹۸ء میں اس کا اردو ترجمہ بھی ''نورانی پیکجز۔ کراچی'' سے چھپوا کر شایع کر دیا ہے۔ اس کے انگریزی ایڈیشن پر بہ صراحت و بہ طور خاص یہ جملہ درج ہے:

"Printed by permission of government of Pakistan."

دوسری بیوی:

م۔ ع۔ سلام (ملک عبدالسلام) کے ادارے ملک بک ڈپو، ککے زئیاں اسٹریٹ، لاہور نے ایک کتاب ''قایداعظم۔ یعنی مسٹر محمد علی جناح بار ایٹ لا، صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی سوانح حیات'' کے نام سے شایع کی ہے۔ (گیلانی الیکٹرک پریس، ہسپتال روڈ، لاہور، ۱۹۲۹ء، بار اول) اس میں جناح صاحب کی شادی کے متعلق مصنف لکھتا ہے:

''اپریل ۱۹۱۸ء میں آپ کی شادی سر ڈنشا پٹیٹ، بمبئی کے متمول و ممتاز پارسی کی لڑکی سے ہوئی۔ بے شک اس وقت یہ شادی اسلامی اصول کے خلاف تھی، لیکن کچھ عرصے کے بعد آپ کی بیوی نے اسلام قبول کر لیا اور مذہبی اصولوں پر کاربند رہیں۔ (ص۲۰)

مسٹر جناح کے اوصاف اور مبینہ واقع میں کئی مغالطے ہیں:

(۱) مسٹر جناح بارایٹ لا نہیں تھے۔

(۲) واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۱۷ء میں مسٹر جناح سے سر ڈنشا پٹیٹ کی بیٹی رتن بائی سے سول میرج کر لی تھی۔ سر ڈنشا نے ان پر اغوا کا مقدمہ کر دیا اور یہ کہ ان کی بیٹی ابھی نابالغ ہے اور ابھی وہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنے کا قانوناً اختیار نہیں رکھتی۔ رتن بائی عرف رتی نے عدالت میں بیان دیا کہ اغوا مسٹر جناح نے مجھے نہیں، میں نے انہیں اغوا کیا ہے۔ دوسرا قانونی پہلو کمزور تھا، چناں چہ ایک سال بلوغ کی عمر (۱۸ سال) تک کو پہنچنے تک اسے باپ کے گھر جانے اور مسٹر جناح سے نہ ملنے کا فیصلہ صادر کر دیا گیا۔ مسٹر جناح کے لیے صرف عدالتی سرزنش یا تنبیہ کافی سمجھی گئی۔

(۳) ایک سال کے بعد اپریل ۱۹۱۸ء میں اس کے اسلام لانے اور بعدہٗ مسٹر جناح سے شیعہ طریقے پر نکاح ہونے کی خبریں چھپوائی گئیں۔

(۴) اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ مذہبی اصولوں پر کاربند رہیں۔ ایم سی چھاگلا، دوارکا درس کانجی، سر یامین خان کے بیانات اس کی تصاویر اور اس کے مصنفین کے بیانات و واقعات اس کی مذہبی سیرت کی سراسر نفی کرتے ہیں۔

لیکن کیا واقعی یہ حقیقت ہے کہ رتن بائی نے اسلام قبول کر لیا تھا؟ اخبار کی خبر کے سوا اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ رتن بائی اور مسٹر جناح کے دوستوں، واقفوں کے بیانات اس کے برعکس ہیں۔ وہ سب اسے شادی بین المذاہب (انٹر کمیونل میرج) قرار دیتے ہیں۔

> ''قائداعظم کی دوسری شادی ۱۹/اپریل ۱۹۱۸ء کو شیعہ طریقے پر ہوئی اور شریف دیوجی نامی اثناعشری قاضی نے ان کا نکاح پڑھایا۔''

(قائداعظم محمد علی جناح کی نجی زندگی کے دو اہم پہلو، از شریف الدین پیرزادہ: ص ۲۷-۲۸)

حقیقت اور افسانے:

محمد علی جناح کی اسلامیت کو ثابت کرنے کے لیے جو افسانے تراشے گئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی بیوی مسلمان ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو اس کی پسند کی ایک غیر مسلم سے شادی کے بعد عاق کر دیا تھا اور اس سے زندگی بھر تعلق نہ رکھا تھا۔ ''ہندوستان

اپنے حصار میں'' کے مصنف ایم جے اکبر بھی اسی خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ لکھتے ہیں:

''پاکستان جانے والوں میں ان کے ساتھ تنہا ان کی بہن فاطمہ تھیں..... جناح صاحب کی اکلوتی بیٹی دینا نے پاکستان جانے سے انکار کر دیا تھا۔ جناح صاحب جنھوں نے رتی سے شادی کی، اب بالکل بدل چکے تھے اور اسلامی فوجوں کے کمانڈر ہو گئے تھے۔ دینا ایک پارسی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ خبر جب جناح صاحب کو ملی تو وہ بہت خفا ہوئے۔ انھوں نے اپنی بیٹی سے کہا کہ لاکھوں مسلمان لڑکے ہیں وہ ان میں سے کسی کا بھی انتخاب کر سکتی ہے۔ اس پر دینا نے جواب دیا تھا کہ ''پہلے بھی لاکھوں مسلمان لڑکیاں موجود تھیں، اس کے باوجود جناح صاحب نے ایک پارسی لڑکی سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔'' جناح صاحب کے پاس اس بات کا صرف ایک جواب تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو عاق کر دیں۔ انھوں نے اس کے بعد کبھی دینا کو دینا کہہ کر نہیں پکارا۔ اگر کبھی نام لینے کی ضرورت پیش آئی تو مسز واڈیا کہا۔ وہ بہر حال اپنے باپ کی خاصی وفادار تھی۔ ۱۴؍ اور ۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء کو اس نے اپنی بالکونی پر پاکستان اور ہندوستان دونوں کے جھنڈے لگائے تھے۔''

اس ایک بیان میں کئی باتیں پوشیدہ ہیں:

(۱) بیٹی نے گواہی دی کہ اس کے باپ نے ایک مسلمان لڑکی سے نہیں ایک پارسی لڑکی سے شادی کی تھی۔ لڑکی کو اعتراف ہے کہ اس کی ماں پارسی تھی۔ باپ نے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا اور اگر یہ محض الزام تھا تو بہت ضروری ہو گیا تھا کہ بیٹی کی غلط فہمی کو دور کیا جاتا۔

(۲) یہ بات بھی درست نہیں وہ ایک غیر مسلم۔ سے شادی کے فیصلے پر بیٹی سے ناراض ہو گئے تھے۔ بلا شبہ وہ شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے، یہ ان کی سیاسی مصلحت تھی، لیکن انھوں نے شادی کے موقع پر اظہار مسرت کے لیے گل دستہ بھیجا تھا۔ وہ زندگی بھر اس سے ملتے رہے۔ اس کے ساتھ تبدیلیٔ آب وہوا کے سفر کیے، اس کے ساتھ شاپنگ کی، اسے تحائف دیے، اس کی پسند سے اپنے اور اپنے گھر کے لیے چیزیں خریدیں، بیٹی کے ساتھ

شادی کے بعد مختلف ادوار کی تصاویر موجود ہیں، اگرچہ وہ بیٹی کو خطوط بہت کم لکھتے تھے، لیکن خط لکھنے کا ثبوت بھی موجود ہے۔ انھوں نے بیٹی کو عاق بھی نہیں کیا تھا، وہ اس سے ناراض بھی ہرگز نہیں تھے، وصیت نامے کے مطابق ترکے میں سے اسے حصہ دیا تھا اور فارن کرنسی میں اس کی نقد ادائیگی کی ہدایت کی گئی۔ اگر انھوں نے دینا کہہ کر بیٹی کو نہیں پکارا، مسز واڈیا کہہ کر مخاطب کیا تو اس سے تو تعلق اور قرب وملاقات کا ثبوت ملتا ہے، نہ قطع تعلقات یا عدم تعلقات کا؟

(۸)

یورپ میں تعلیمی دور:

مسٹر جناح وطن لوٹے تو ان کی بیوی اور والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑی بہنیں اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں تھیں، والد بیمار تھے، چھوٹی بہن فاطمہ تھی۔ وہ والد کو چھوڑ کر اور بہن کو ساتھ لے کر بمبئی کو روانہ ہو گئے۔ معلوم نہیں والد کا کب انتقال ہوا اور جناح صاحب کو ان کی میت کو کاندھا دینے کا بھی اتفاق ہوا یا نہیں!

یورپ کی زندگی کے اثرات:

جناح صاحب بنیادی طور پر پکے بیچلر تھے۔ ان میں وہ تمام عادتیں تھیں جو انگلستان سے آئے ہوئے ہندوستانی طبقۂ اشراف کے ایک فرد کی خصوصیات ہو سکتی ہیں۔ اسلامی حکومت پاکستان کے تمام دفاتر میں ان کی تصویریں بڑے نمایاں طور پر لگی ہوئی ہیں، مگر جنرل محمد ضیاء الحق کو اس بات پر بڑا اطمینان ہوگا کہ پاکستان کے "باپ" جناح صاحب آج بہ قید حیات نہیں ہیں، نہیں تو انھیں بھی ان کی شخصی عادتوں کی وجہ سے سرعام کوڑے لگائے گئے ہوتے۔ مسٹر جناح صرف یہی نہیں کہ Carvan A کی سگریٹیں لگاتار پیتے تھے بلکہ انھیں وہسکی بھی اچھی لگتی تھی اور............ان کی زندگی اعلا طبقے کے ایک آزاد خیال فرد کی زندگی تھی۔ اپنی نجی اور پبلک زندگیوں کے بیشتر حصے میں وہ یقیناً آزاد خیال تھے۔

۱۹۱۶ء میں جناح صاحب اپنے ایک پارسی دوست مسٹر ڈنشا مانک جی پٹیٹ کے ساتھ چھٹیاں منانے کے لیے دارجلنگ چلے گئے۔ پینتیس سال کا یہ کنوارا اپنے دوست کی نڈر اور چنچل سولہ سالہ لڑکی رتی کے بے پناہ عشق میں مبتلا ہو گیا۔ رتی کے باپ نے اس

شادی کو روکنے کی بس بھر کوشش کی۔ یہاں تک کہ وہ کورٹ بھی گئے مگر رتی اپنی اٹھارویں سال گرہ کے موقع پر اپنے پالتو کتوں کے علاوہ ہر چیز کو چھوڑ کر اس شخص سے شادی کرنے کے لیے گھر سے نکل گئی جس سے اس نے محبت کی تھی۔ رتی کا تعلق بمبئی کے تجارتی اور پیشہ ورانہ طبقہ امرا سے تھا۔ کچھ دنوں تک بمبئی میں اس جوڑے کا بڑا چرچا رہا۔ رتی کو محفل پسند تھی اور وہ پر لطف گفتگو کی عاشق تھی، مگر یہ شادی کچھ بہت زیادہ دن چل نہ سکی۔ سات سال بعد جناح کی عمر اڑتالیس سال کی تھی اور رتی کی پچیس سال، وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ رتی اور جناح صاحب کی شادی کے بعد رتی کے باپ نے پہلی بار جناح صاحب سے اس وقت بات کی جب انھوں نے جناح صاحب کو یہ خبر دینے کے لیے فون کیا کہ ان کی بیوی مر رہی ہے۔ رتی کا انتقال ۱۹۲۹ء میں ہوا۔ انتقال کی وجہ تھی کولائٹس کے پرانے مرض کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے بڑی مقدار میں مارفین کھا لینا۔ اس کو دفن کرتے وقت جناح صاحب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ایک نئے ملک کی طرف جانے کے لیے بمبئی چھوڑتے وقت جناح صاحب نے آخری کام یہ کیا کہ وہ رتی کی قبر پر گئے۔ تند و خشک مزاج جناح صاحب جس نے سب کے سامنے شاید ہی کبھی جذبات کا اظہار کیا ہو، ایک بار پھر زار و قطار رو دیا۔

لیکن یہ روشن اور آزاد خیال جناح ہی تھے جن کی طرف اول اول سارے ملک کی نگاہیں اٹھیں۔ وی پی مینن نے اپنی کتاب ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا (اورینٹ لانگ مینس ۱۹۵۷ء) میں انھیں ''اپنی نسل کا حقیقی ہیرو'' کہا ہے۔ جناح صاحب سیاست کے میدان میں بہت پہلے ہی آ گئے تھے۔ امپریل لیجس لیٹو کونسل میں وہ بمبئی کے نمائندے کی حیثیت سے ۱۹۰۹ء میں داخل ہوئے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں اس وقت تک اسمبلی کے رکن رہے جب تک کہ انھوں نے رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ نہیں دے دیا۔ ۱۹۲۰ء میں وہ مسلم لیگ کے صدر بھی تھے اور کانگریس کے اہم لیڈر بھی۔ وہ گاندھی جی سے اولاً دور اس وقت سے ہونے لگے جب انھیں حقیقتاً یہ محسوس ہوا کہ گاندھی جی سیاست میں مذہبیت کو متعارف کرا رہے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے مسلم لیگ کے سشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں سے لڑنے کے خیال سے

نہیں، بلکہ اپنے مادر وطن کے لیے انھیں متحد کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے خیال سے۔ مدھولی مائے نے اپنے ایک اچھے مضمون ''جناح دی لبرل'' (سنڈے اکتوبر ۱۹۸۳ء) میں لکھا تھا۔ اگر قوم پرستی سے فرقہ پرستی مرادنہ ہوتو جناح ایک کٹر قوم پرست تھے۔ ۱۹۱۹ء میں پارلیمانی سیلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت کے موقع پر ان سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی امتیازات کا یکسر خاتمہ چاہتے ہیں؟ تو ان کا جواب تھا ''جی ہاں! ایسی ساعت آنے سے زیادہ خوش کن بات میرے لیے اور نہیں ہوسکتی۔'' تیسری دہائی کے وسط تک وہ انتہائی فخر کے ساتھ یہ اعلان کرتے رہے کہ وہ ''ایک ہندوستانی پہلے ہیں اور ایک مسلمان بعد میں۔'' جناح صاحب کو ان مولویوں اور ملاؤں سے کوئی محبت نہیں تھی جو سیاست میں دخل اندازی کرتے تھے۔.......

جناح صاحب کے دست راست اور جانشین لیاقت علی خاں کے یہاں بھی قاید اعظم ہی کے جذبات کی بازگشت تھی۔ جب انھوں نے ۱۱راگست کو کراچی میں آئین ساز اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے اس پرچم کی وضاحت کی تھی جسے وہ اس وقت لہرانے جارہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ''یہ پرچم کسی ایک مخصوص جماعت یا فرقے کا پرچم نہیں ہے۔ یہ پرچم ان تمام لوگوں کے لیے ہے جو اس کے وفادار ہوں گے۔ آزادی، حریت اور مساوات کا پرچم ہوگا۔ پاکستان کی ریاست کا جو تصور میرے ذہن میں ہے اس میں کسی مخصوص فرقے یا فرد کے لیے خصوصی مراعات نہیں ہیں، خصوصی حقوق نہیں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر پاکستان کیوں؟

پاکستان کی تخلیق کرنے والوں اور عوام میں جو تضادات تھے وہ خود جناح صاحب کی زندگی ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ جناح صاحب خود اردو نہیں جانتے تھے۔ گجراتی ان کی مادری زبان تھی اور انگریزی ان کی بقا کا ذریعہ۔ سارے کا سارا بنگالی پاکستان اردو نہیں جانتا تھا۔ مگر یونائیٹڈ پروونس لابی کے دباؤ کی وجہ سے اردو پاکستان کی قومی زبان قرار پائی۔ ۲۴ر مارچ ۱۹۴۸ء کو جب ڈھاکہ یونی ورسٹی کے طالب علموں کو جناح صاحب خطاب کرنے گئے تو انھوں نے ان کو آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے

ملک کی صرف ایک ہی (قومی) زبان ہوسکتی ہے۔...... اور وہ صرف اردو ہی ہوسکتی ہے۔ ہر برٹ فلڈ مین (دی انڈ اینڈ دی بگننگ. پاکستان ۷۱-۱۹۶۹ء، آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس) نے کچھ زیادہ صفائی سے یہ بات کہی ہے:

"یہ بات مشکوک ہے کہ خود محمد علی جناح ان سیاسی الجھنوں سے واقف تھے جو اس پاکستان میں فطری طور پر مضمر تھیں، جو بالآخر انھوں نے منظور کیا تھا۔"

پاکستان کا خیال تیسری دہائی میں پیدا ہوا، چوتھی دہائی میں جد و جہد شروع ہوئی، پانچویں دہائی میں اس کی شکل مسخ ہوئی، چھٹی دہائی میں اس کا گلا گھٹا اور ساتویں دہائی میں وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

برصغیر کے حالات ایک بار پھر غیر یقینی ہو رہے ہیں۔ اگر جناح صاحب صحیح تھے تو ۱۹۴۷ء ایک کرم خوردہ (تقسیم کے بعد پاکستان کو بیان کرتے وقت جناح صاحب نے یہی الفاظ استعمال کیے تھے) برصغیر کی طرف بڑھنے کے عمل کا محض آغاز تھا۔ اپنی اپنی حکومت کے پینتیس سال بعد اب وقت آگیا ہے کہ حقایق کا جایزہ لیا جائے اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کی جائے کہ زبردست دشواریوں اور مسایل کے باوجود کون زیادہ کامیاب رہا۔ جمہوری وفاقی ریاست جسے مہاتما گاندھی چاہتے تھے یا وہ مذہبی ریاست جو جناح صاحب اپنے بعد چھوڑ گئے۔ تقسیم ایک حقیقت تھی یا برصغیر کے ارتقا کے سفر میں ایک بے کیف وقفہ۔ آخری وایسرائے لارڈ لوئیس فرانسس البرٹ وکٹر نکولس ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب دیا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی تقسیم پر اتفاق رائے حاصل کرنے کے فوراً بعد نجی طور پر لکھا تھا:

"اس مجنونانہ فیصلے کی ذمہ داری دنیا کی نگاہوں میں پورے طور پر ہندوستانیوں پر ڈالی جانی چاہیے۔ ایک دن وہ اس فیصلے پر جو وہ عن قریب لینے والے ہیں خود کفِ افسوس ملیں گے۔" (ہندوستان اپنے حصار میں: ص ۲۹-۲۶)

قانون کی تعلیم:

سری پرکاش لکھتے ہیں:

اس نئی ریاست کے قایم ہوتے ہی وکلاے ہائی کورٹ نے مسٹر جناح کو جو خود ایک

ممتاز اور مشہور قانون داں تھے، بہ حیثیت گورنر جنرل کے ایک جلسے میں مدعو کیا۔ دوران تقریر مسٹر جناح نے کہا:

''جب میں انگلستان گیا اور یہ غور کر رہا تھا قانون کی کس تعلیم گاہ میں بیرسٹری کے امتحان کے لیے داخلہ لوں تو میں ''لنکنس ان'' کے پاس سے گزرا۔ وہاں میں نے بیرونی دروازے کے اوپر دیکھا کہ تصویریں کندہ ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کن لوگوں کی تصاویر ہیں؟ ایک تصویر کے بارے میں جس پر میری نظر پڑی میں نے خصوصیت کے ساتھ دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ پیغمبر اسلام کی تصویر ہے۔ میں نے طے کر لیا کہ یہیں پڑھوں گا۔''

''مسٹر جناح نے لنکنس ان سے بیرسٹری کی سند لی تھی۔ یہ سنتے ہی حاضرین نے جوش مسرت سے تالیاں بجائیں۔ میں اپنی جگہ حیرت زدہ ہو گیا کیوں کہ چند روز قبل یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ کراچی سے تمام مجسمے ہٹا دیے جائیں کیوں کہ از روئے شریعتِ اسلامی انسان یا کسی جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے۔ متقشف مسلمان تو فوٹو بنانا بھی ناجائز قرار دیتے ہیں درحالے کہ مسٹر جناح کے فوٹو ہر جگہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ تعجب انگیز بات ہے کہ ریاست پاکستان کا حاکم بجائے اس کے کہ اس پر معترض ہوتا کہ پیغمبر اسلام کی تصویر دروازے پر کندہ کی گئی؟ اس تصویر کو دیکھ کر اسی تعلیم گاہ کو پسند کرے جہاں یہ تصویر نمایاں طور پر کندہ تھی۔ اس سے زیادہ حیرت مجھے اس پر ہوئی کہ مسلم حاضرین نے یہ سن کر داد دی۔'' (پاکستان- قیام اور ابتدائی حالات: ص ۸۰)

اس روایت سے تو فکر و عمل کا تضاد ہی ظاہر ہوتا ہے، لیکن اس روایت کا عجیب تر پہلو یہ ہے کہ تحقیق نے ثابت ہو چکا ہے کہ لنکن ان کے دروازے پر نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک کبھی کندہ تھا نہ تصویر و شبیہ!

بانی پاکستان کا آخری سفر:

۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸: بانی پاکستان کی موت کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ بعض کہتے

ہیں ان کے انتقال کوئٹہ ہی میں ہو گیا تھا، کچھ کا بیان ہے کہ یہ حادثہ دوران سفر میں پیش آیا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ ماری پور (ایرپورٹ) اور گورنر جنرل ہاؤس کے مابین ایمبولنس میں انھوں نے کس مپرسی کے عالم میں دم توڑ دیا تھا اور عام طور پر یہی مشہور اور اعلان شدہ ہے کہ انھوں نے گورنر جنرل ہاؤس میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی تھی۔

لاہور (خصوصی رپورٹ) بانیٔ پاکستان قاید اعظم کی موت ۱۱ر ستمبر کو ہوئی۔ ایئر مارشل محمد اصغر خان اس روز کراچی میں تھے، انھیں اس سانحے کی خبر ملی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ اس وقت ایئر وائس مارشل اور پاک فضائیہ کے ماڑی پور ہوائی اڈے کے انچارج تھے، جس پر اس روز قاید اعظم کا طیارہ اترا تھا۔ ان دنوں شایع ہونے والی خبروں کے مطابق ایئر وائس مارشل محمد اصغر خان نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا کہ

> ''میں ہوائی اڈاے کا انچارج ہوں مگر مجھے اطلاح نہیں ہوئی کہ قاید اعظم کو طیارے کے ذریعے لایا گیا ہے۔ میں سہ پہر کے وقت اس سڑک پر سے بھی گزرا جس پر قاید اعظم کو لے جانے والی ناکارہ ایمبولنس گندگی کے ایک ڈھیر کے پاس کھڑی تھی اور اس میں بے بسی کے عالم میں پوری قوم کا قاید پڑا تھا۔ جو قوم کے لیے باپ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں اس ایمبولنس کے پاس سے گزرا۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ میرے قاید اس بدبخت ایمبولنس میں بے چارگی کے عالم میں پڑے ہیں تو میں ان کے لیے اپنا سب کچھ نثار کر دیتا۔ پاک فضائیہ کے سارے طیارے انھیں لے جانے کے لیے سڑک پر اتار دیتا۔ مجھے اس بات کا عمر بھر دکھ رہے گا کہ میری گاڑی قاید اعظم کی ایمبولنس کے پاس سے گزر گئی اور مجھے خبر نہ ہوئی۔''

یہ باتیں ممتاز صحافی، مؤرخ اور کشمیریات کے ماہر محمد کلیم اختر نے اپنے مضامین میں درج کی تھیں، جو کئی برس پہلے روزنامہ ڈان میں شایع ہوئے تھے۔ گزشتہ روز روزنامہ پاکستان سے ایک ملاقات میں محمد کلیم اختر نے بتایا: اگلے روز اخبارات سے معلوم ہوا کہ قاید اعظم کی وفات کی خبر پر سب سے پہلے کراچی کے کمشنر سید ہاشم رضا فلیگ اسٹاف ہاؤس پہنچے، ان کے بعد بیگم عبداللہ ہارون، ور بیگم عزیز الدین (قطب الدین عزیز کی والدہ) اور پھر قاید

اعظم کے اپنے عزیز واقارب گورنر جنرل ہاؤس پہنچے۔ سیاسی رہنما بہت بعد میں آئے تھے۔ اخبارات میں یہ خبر بھی چھپی کہ وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں نے قاید اعظم کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور نماز سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے رہے۔ ان کی یہ تصویر بھی اخبارات میں شایع ہوئی۔ اخبارات کے مطابق ان سے پوچھا گیا کہ انھوں نے جنازے کی نماز کیوں نہیں پڑھی؟ سر ظفر اللہ نے جواب دیا کہ

''میں احمدی ہوں، آپ لوگ تو ہمیں کافر سمجھتے ہیں، ویسے بھی احمدی لوگ عقیدے کے طور پر غیر احمدی لوگوں کا جنازہ نہیں پڑھ سکتے۔''

(روزنامہ پاکستان۔ لاہور۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۹۵ء: ص ۱)

بانیٔ پاکستان کے انتقال کی نوعیت کے بارے میں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں کہ آیا ان کی موت طبعی تھی یا کسی سازش کا نتیجہ؟ ان کے معالجے اور ضروری نگہداشت سے عدم توجہ اور بے اعتنائی کی شکایت تو گویا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ جس کا الزام اس وقت کے وزیر اعظم خان لیاقت علی خاں پر آتا ہے۔ نوائے وقت لاہور کے چیف ایڈیٹر مجید نظامی نے تو ان کے انتقال کے اسباب اور نوعیت کی تحقیقات کے مطالبہ بھی کر دیا تھا:

لاہور (سرفراز سید) روزنامہ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر مجید نظامی نے کہا ہے کہ قاید اعظم محمد علی جناح کا انتقال نہایت بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں ہوا، ان حالات اور واقعات کا تجزیہ اور تحقیقات ضروری ہیں کہ ایسا کیوں کر ہوا؟ اس بات کی تحقیقات بھی ضروری ہے کہ مادر ملت فاطمہ جناح، خان لیاقت علی خاں اور حسین شہید سہروردی کی پراسرار اموات کے اسباب کیا تھے؟ یہ باتیں ابھی تک عوام کے سامنے نہیں آئیں، انھیں سامنے آنا چاہیے تا کہ عوام کو حقایق کا علم ہو سکے۔ انھوں نے کہا: اس وقت یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ قاید اعظم اور مادر ملت کی اموات کسی سازش کا نتیجہ تھیں مگر یہ بات ضرور بار بار سامنے آتی ہے کہ قاید اعظم کی موت کراچی جیسے شہر میں جن حالات میں نہایت بے چارگی کے عالم میں ہوئی ان سے وہاں کے حکمران اور حکومت کے لوگ کیوں بے نیاز تھے؟ اس بات کا تجزیہ ہونا چاہیے کہ کیا اس وقت اقتدار یا کرسی کی کوئی جنگ ہو رہی تھی؟ اگر ایسا تھا تو بھی لوگ قاید اعظم کی طبعی موت کا انتظار کر سکتے تھے جو پہلے ہی بیمار تھے۔ پھر ایسا کیوں نہ کیا گیا؟ انھوں

نے کہا غالباً حسن شیخ یا کسی اور کا بیان بھی تھا کہ مادرِ ملت کی گردن پر کچھ نشانات تھے، مگر ان خبروں پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، مگر اس کی تحقیقات کے نتائج عوام کے سامنے نہیں آسکے۔ (پی پی)

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۹۵ء: ص ا)

بانیٔ پاکستان کی موت، اس کے پس منظر اور علاج معالجے سے غفلت وغیرہ کے بارے میں جو شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں اس کا اندازہ عوام کے جذبات اور ان کے اُن مطالبات سے لگایا جاسکتا ہے جو اخبارات کے صفحات میں آچکے ہیں۔ روزنامہ پاکستان، لاہور کے ۱۹ر جنوری ۱۹۹۵ء کی خبروں کی ذیل کی چند سرخیوں سے ان شکوک و شبہات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے:

❁ ''قائداعظم کی موت کے ذمے دار افراد کے خلاف خصوصی عدالتوں میں مقدمے چلائے جائیں۔ شہریوں کا مطالبہ''

❁ ''بابائے قوم کو غیر ملکی ایجنٹوں نے گھناؤنی سازش کے تحت راستے سے ہٹایا، لاش کئی گھنٹے سڑک کے کنارے پڑی رہی، موت کے ذمے دار وہی ہیں جو خود پاکستان کے خلاف تھے۔''

❁ ''فاطمہ جناح کا انتقال بھی بے چارگی کے عالم میں ہوا، ملک کے بانیوں کا سسک سسک کر مرنا پوری قوم کے لیے باعث ندامت ہے، ذمے دار افراد کے خلاف اتنی سخت کارروائی کی جائے کہ آئندہ ظلم نہ ہو۔''

❁ ''ملک پر کباڑیوں کی حکومت ہے، پوری قوم مردہ ہو چکی ہے، ہم جس طرف چل پڑے ہیں واپسی کا شاید ہی کوئی راستہ ہو، محسنوں کو بھول جانے والی قومیں ترقی نہیں کرسکتیں۔''

❁ ''کروڑوں مسلمانوں کا محسن ٹھنڈے پانی، آرام دہ بستر اور مناسب علاج کے بغیر گوشۂ گم نامی میں مرگیا، تاریخ ان کی موت کے ذمہ دار افراد کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ شہریوں کے تاثرات۔''

(۲)

مسٹر محمد علی جناح کا تعلق خوجہ جماعت سے تھا۔ ان کے والد اور والدہ کا تعلق اسی فرقے سے تھا۔ ان کی پیدایش پر تمام رسوم، عقیقہ وغیرہ اسی فرقے کے عقاید کے مطابق کیا گیا۔ اسی فرقے کے بزرگ کے مزار پر رسم کے مطابق حاضری دی گئی۔ اسی فرقے سے ان کے لیے بیوی تلاش کی گئی، ان کا دوسرا نکاح بھی شیعہ قاضی نے شیعہ طریق پر پڑھایا۔ ان کے نکاح کے گواہ بھی شیعہ تھے۔ ان سے ان کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے اپنے آپ کو شیعہ اثنا عشری بتایا۔ ان کی بہن نے، ان کے دوستوں نے، ان کے مصنفوں اور محققوں نے انھیں شیعہ یا آغا خانی اسماعیلی خوجہ لکھا ہے۔ زندگی کے آخری رسم غسل، تکفین وغیرہ، نماز بھی ان کے مذہبی عقیدے اور ان کی بہن کی ہدایت کے مطابق ادا کیے گئے۔ ہم یہاں ان کے آخری رسوم کے بارے میں مولانا سید انیس الحسنین کا جنھوں نے اپنے رہنما کے غسل میں مدد دی تھی، تکفین کی تھی اور نماز جنازہ پڑھائی تھی، ایک انٹرویو (اردو ترجمہ) نقل کرتے ہیں:

''یہ ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح کا واقعہ ہے جب محمد علی جناح کی آخری مذہبی رسوم ان کے اپنے فرقے (اثنا عشری خوجہ جماعت کے عقاید) کے مطابق ادا کیے گئے۔ مولانا سید انیس الحسنین جو کہ شیعہ عالم دین اور سندھ مدرسۃ الاسلام (کراچی) میں شیعہ تھیالوجی کے استاد تھے، انھیں بلایا گیا۔ مولانا موصوف نے جن کا دل غم سے بوجھل تھا، قاید کی تغسیل و تکفین کا انتظام کیا تھا۔ انھوں نے بتایا:

۱۱ر ستمبر کی صبح کو تین بجے کے قریب مجھے گہری نیند سے اٹھایا گیا اور دریافت کرنے پر نہایت راز داری کے ساتھ بتایا گیا کہ قاید اعظم کا انتقال ہو گیا ہے اور مجھے گورنر جنرل ہاؤس طلب کیا گیا ہے۔ جو گاڑی مجھے لینے آئی تھی وہ مجھے پہلے ''ڈان'' (کراچی) اخبار کے دفتر لے گئی، وہاں سے دوسری گاڑی میں مجھے عجلت کے ساتھ گورنر جنرل ہاؤس لے جایا گیا۔ وہاں سب سے پہلے میری ملاقات جناب یوسف ہارون اور ان کی والدہ (لیڈی عبداللہ ہارون) سے ہوئی۔ وہ مجھے قاید اعظم کے بیڈ روم میں لے گئے، جہاں قاید اعظم کا جسد بے

روح رکھا ہوا تھا۔ میت کو درست حالت میں رکھا گیا تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میت کی تجہیز و تکفین کا انتظام آپ کو کرنا ہے۔ میں انتظامات کی تکمیل کے لیے واپس ہوا اور ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح آٹھ بجے جناب رحیم علی چھاگلا صدر خوجہ اثنا عشری جماعت اور الحاج سیٹھ عبدالرسول سیکریٹری خوجہ اثنا عشری جماعت کے ساتھ مل کر یہ تکلیف دہ فریضہ انجام دینا شروع کیا۔ میں نے قاید اعظم کا باتھ روم کھولا تا کہ آخری رسوم ادا کروں، میں کام کا آغاز کر ہی رہا تھا کہ گورنر جنرل کے سیکریٹری نے بہت سخت الفاظ میں مجھ سے پوچھا: آپ کو اس بات کی اجازت کس نے دی؟ میں نے انھیں دوسرے کمرے میں خواتین سے دریافت کرنے کو کہا۔ وہ گئے اور جب انھیں بتایا گیا کہ مولانا انیس الحسنین ہی غسل دیں گے۔ تو یہ سن کر وہ چلے گئے۔ دروازے بند کر دیے گئے اور غسل شروع ہوا۔ باتھ روم میں جناب آفتاب ایچ علوی، حاتم اے علوی کے بیٹے اور ایک اور نوجوان بھی تھا۔ غسل کے بعد کفن دیا گیا جو قاید اعظم کی ذاتی ملکیت تھا اور جسے خانہ کعبہ سے چھوا کر پاک کیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے نماز جنازہ پڑھائی، جس میں مندرجہ ذیل افراد شامل تھے:

جناب یوسف ہارون، جناب سید کاظم رضا، جناب سید ہاشم رضا، جناب آفتاب ایچ علوی، حاجی شیخ ہدایت علی عرف حاجی کلو (غسال اثنا عشری خوجہ جماعت) ان کے علاوہ چار دوسرے افراد تھے، جن کے نام اب مجھے یاد نہیں۔ اس کے بعد میت کو پورے اعزاز کے ساتھ باہر لایا گیا اور جنازہ فوج کے ایک دستے کے سپرد کر دیا گیا۔ جلوس کی قیادت گورنر جنرل کا باڈی گارڈ کر رہا تھا، اس کے ساتھ مسلح افواج کا ایک دستہ بھی تھا۔ اس کے پیچھے گاڑی میں قاید اعظم کا جسد خاکی قومی پرچم میں لپٹا ہوا رکھا تھا، جسے نیوی کے جوان کھینچ رہے تھے۔ ان کے لیفٹیننٹس، غم زدہ لوگوں کا ہجوم اور غیر ملکی نمایندے جلوس کے ساتھ تھے۔ غم زدہ انسانوں کا ایک سمندر تھا جو اپنے قاید کو اس کی آخری آرام گاہ کی طرف لے جا رہا تھا اور بالآخر قوم نے اپنے قاید کو پورے

اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا۔ اس موقع پر ہوائی جہازوں نے بھی اپنے قاید کو سلامی دی۔"

(ماہنامہ الامیر- کراچی: جلد ۸، نمبر ۳، بابت ماہ ستمبر ۱۹۹۶ء: ص ۴۵، ۴۶، بہ حوالہ "نیشن" ویکلی- کراچی، ۱۱ر ستمبر ۱۹۵۰ء)

مسٹر جناح کا انتقال:

۱۲ر ستمبر ۱۹۴۸ء: پاکستان میں ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر مسٹر سری پرکاش لکھتے ہیں:

۱۲ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو صبح چار بجے ہوں گے، جب کہ کراچی پر شب تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ میرے ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بجنے لگی۔ میں نے ٹیلی فون اُٹھایا، گورنمنٹ پاکستان کا ایک سیکرٹری بول رہا تھا۔ "سنیے مسٹر سری پرکاش!........کا انتقال ہوگیا۔" توصیفی لفظ قابل تعریف نہ تھا ❶۔ اس لیے میں نے پوچھا: کون؟ جواب ملا: "قایداعظم۔" میں نے کہا: "شاید آپ غلطی پر ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے! کل شام کو میں اور آپ سب لوگ فرانسیسی سفارت خانے کی پارٹی میں تھے اور آپ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مسٹر جناح اچھے ہیں۔ پھر یہ خبر کیسی؟" جواب ملا کہ صرف پارٹی نہیں بلکہ ہم لوگ کھانے کے لیے بھی مدعو تھے، آدھی رات کو اس انتقال کی خبر ملی۔ میں ابھی گورنمنٹ ہاؤس سے اس کی تحقیق کر کے آرہا ہوں کلہ کون جانشین ہوگا۔ میں آپ سے پرمٹ مانگ رہا ہوں تاکہ دہلی سے نئے گورنر جنرل اور دوسرے اراکین ہوائی جہاز سے یہاں آسکیں۔

اس وقت گورنر جنرل معبود، خواجہ ناظم الدین جو اس وقت مشرقی پاکستان کے چیف منسٹر تھے، کسی ضرورت سے دہلی گئے ہوئے تھے۔ سیکرٹری موصوف سے جن سے میرے تعلقات دوستانہ تھے، میں نے کہا کہ کسی کو بھیج دیجیے کہ فوراً آکر مجھ سے پرمٹ لے جائے تاکہ جہاز جلد تر دہلی پہنچ سکے۔ ایک شخص کو اس سیکرٹری نے بھیجا، میں اٹھا اور لیمپ روشن کیا۔ مکان کی پہلی منزل پر میں تنہا رہتا تھا اور میرا دفتر بائیں حصے میں تھا۔ میرا ذاتی رہن سہن بہت سادہ تھا۔ اکثر لوگوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کا طرز معاشرت جیسا یہاں ہونا

چاہیے نہیں ہے۔ میں یہی جواب دے دیا کرتا تھا کہ خود میں اس معیار کا نہیں ہوں جیسا مجھے ہونا چاہیے۔ شان وشوکت اور اعلا ساز وسامان میرے کام کو معیاری کیسے بنا سکتا ہے؟ جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں پرمٹ کا سامان میں اپنے پلنگ کے پاس ہی رکھتا تھا۔ قاصد سے میں نے ان سب لوگوں کے نام دریافت کیے جو جانے والے تھے تاکہ پرمٹ میں اندراج کردوں، مگر وہ بالکل لاعلم تھا۔ اس لیے میں نے سادے کاغذ پر دستخط کر کے لکھ دیا کہ جن لوگوں کے نام اس پر لکھے ہوں ان سب کو دہلی جانے کی اجازت دی جائے۔ انکسار کے ساتھ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ پوری کوشش کی کہ حکومت پاکستان کی فرمائش، جہاں تک میرے امکان میں ہو پوری کر دیا کروں تاکہ اس کو کسی معاملے میں شکایت کا کوئی موقع ہاتھ نہ آئے۔

مسٹر جناح کا انتقال ایک پراسرار معاملہ ہے۔ تفصیلات نہ تو اس وقت کسی کو معلوم ہوئیں اور نہ آیندہ معلوم ہوں گی۔ غالباً صرف ان کی بہن مس فاطمہ جناح ہی اس معمے پر روشنی ڈال سکیں۔ مگر شاید بہ وجوہ وہ بھی ایسا کرنا پسند نہ کرتی ہوں۔ یہ کھلی بات ہے کہ گورنر جنرل کے خاص ہوائی جہاز میں مسٹر جناح کراچی میں مخصوص ہوائی اڈے ماڑی پور ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو سہ پہر میں پہنچے۔ مس فاطمہ ان کے ہم راہ تھیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو نہایت تعجب انگیز ہے کہ ان کے ساتھ نہ تو کوئی ڈاکٹر تھا نہ نرس۔ یہ نہیں پتا کہ اس ہوائی جہاز میں اور کون لوگ تھے۔ عموماً جب وہ آتے تھے تو ڈپلومیٹک زمرے کے افسران کو اطلاع دی جاتی تھی اور ہم سب سرکاری رسم و رواج کے مطابق ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر وزرا اور اعلا افسران نیز بہت سے غیر سرکاری لوگ وہاں موجود رہتے تھے۔ ڈپلومیٹک حضرات ایک صف میں کھڑے ہوتے تھے اور ان کا تعارف کرایا جاتا تھا۔ ان کی آمد کا ہمیشہ اعلان ہوتا تھا۔ غالباً ماڑی پور سے ان کو کسی شکستہ ایمبولنس کار میں لے گئے جو گورنمنٹ ہاؤس جاتے (ہوئے) راستے میں ٹوٹ گئی۔

ان دنوں مقامی ریڈ کراس (صلیب احمر) کے انچارج مسٹر جمشید مہتا تھے، جن کی عزت کراچی کا ہر فرد بشر کرتا تھا۔...... مجھے انھوں نے بتایا کہ

''مجھے شام کو یہ پیغام ملا کہ ایک آدمی بہت علیل ہے، کیا آپ اس کے لیے

ایمبولنس کار بھیج سکتے ہیں؟''

یہ واقعہ ساڑھے پانچ بجے شام کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ساڑھے سات بجے شام کو ان کا انتقال ہوا، مگر اس وقت کسی کو بھی اس کی خبر نہ دی گئی۔ مسٹر جناح کے انتقال کے بتائے ہوئے وقت پر فرانسیسی سفارت خانے میں شراب کی پارٹی ہو رہی تھی اور کسی کو بھی اطلاع نہ ملی۔ اس پارٹی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں سے مسٹر جناح کے آنے کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ

''مسٹر جناح سادہ مزاج آدمی ہیں، اس لیے انھوں نے اس کو پسند نہیں کیا کہ ان کی آمد کے وقت ہنگامہ ہو۔''

بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کا انتقال کوئٹہ میں ہو چکا تھا اور آخری رسوم ادا کرنے کے لیے ان کی بہن ان کی نعش یہاں لائی تھیں۔ بہر حال نہ تو وزیر اعظم کو اس کی اطلاع دی گئی اور نہ کسی اور کو! کہا جاتا ہے کہ نواب زادہ سو رہے تھے، یہ خبر معلوم ہوتے ہی وہ بھاگے ہوئے گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ وہ اور دیگر وزرا صبح چار بجے تک مشورہ کرتے رہے کہ مسٹر جناح کا جانشین کون ہو؟ کراچی میں لوگوں کا خیال تھا کہ مس فاطمہ جناح سے زیادہ جانشینی کا مستحق اور کوئی نہیں، لیکن ارباب حل وعقد کی نظر انتخاب خواجہ ناظم الدین پر پڑی۔

بہتوں کو یاد ہوگا کہ جب وایسرائے ہند لارڈ ویول گورنر جنرل متحدہ ہندوستان نے بٹوارے اور آزادی کے موقع پر کانگریس اور مسلم لیگ کے نمایندوں کو ایگزیکٹو کونسل کی ممبری کے لیے بلایا تو مسلم لیگ اور مسٹر جناح نے کونسل کی ممبری کا بائیکاٹ کیا۔ کچھ روز بعد مسلم لیگ نے رضامندی دے دی۔ مسلم لیگ نے پانچ ممبر نامزد کیے، ان میں سے چار مسلمان تھے اور ایک ہریجن مسٹر جوگندر ناتھ منڈل۔ یہ دکھاوا محض اس غرض سے تھا کہ دنیا پر یہ ظاہر کیا جائے کہ مسلم لیگ ہر فرقے اور جماعت کی (جس کو اعلا طبقے کے ہندو کچلنا اور مٹا دینا چاہتے ہیں) بہی خواہ ہے۔ جب ایک آزاد ریاست پاکستان بن گیا تو مسٹر منڈل کو پاکستان کابینہ میں بھی شامل کر لیا گیا۔ مسٹر منڈل کے ہم عصر ممبران کابینہ کا ان پر اعتماد نہ تھا۔ وہ مجھ سے اکثر ملنے آتے تھے اور اسی امر کے شاکی تھے۔

مسٹر جناح کے انتقال کے چند روز بعد مسٹر منڈل سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں

نے بتایا کہ اس آدھی رات والی کانفرنس میں ان کو نہیں شریک کیا گیا۔ یہ بھی انھوں نے کہا کہ

''چار بجے صبح ایک شخص یہ پیغام لے کر آیا کہ گورنمنٹ ہاؤس میں مجھ کو بلایا ہے۔ میں نے اپنے نوکروں کو حکم دے دیا تھا کہ رات کو نہ تو کوئی میرے پاس آئے نہ کوئی پیغام لائے، اس لیے انھوں نے قاصد سے کہا کہ ہم بیدار نہیں کر سکتے۔ اس نے کہا یہ کہ پیغام بہت اہم ہے اور جیسے بھی ممکن ہو مجھ سے اس کا ملنا بہت ضروری ہے، تب میرے ملازمین نے مجبور ہو کر مجھے جگایا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ فلاں شخص کوئی خبر لے کر آیا ہے تو مجھے سخت تردّد ہوا اور خوف ہوا کہ یہ مجھ کو گرفتار کرنے آیا ہے۔ میں نے اپنے جملہ ملازمین کو اپنے پاس اکٹھا کر کے خبر لانے والے کو طلب کیا اور خبر سنتے ہی گورنمنٹ ہاؤس روانہ ہو گیا۔ وہاں مجھے سارا واقعہ بتایا گیا مگر نہ تو میری رائے دریافت کی گئی نہ کانفرنس کا فیصلہ مجھے بتایا گیا۔''

کچھ عرصے کے بعد یہ استعفا دے کر کلکتہ میں آ کر بس گئے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں نے ان کے خلاف ایک سخت تحریر شایع کی تھی۔ مسٹر منڈل پر گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی اعتماد نہ تھا اور چین کے حملے کے دوران یہ قانون تحفظ ہند کے ماتحت گرفتار بھی کر لیے گئے تھے۔

مسٹر جناح کے انتقال کی خبر سارے عالم کو دے دی گئی۔ ہمارے گورنر جنرل مسٹر راج گوپال اچاریہ کا پیغام ملا کہ میں ان کی طرف سے مسٹر جناح کی نعش پر ہار چڑھاؤں۔ میں ایک ہار جس پر بہ حیثیت ہائی کمشنر میرے نام کا کارڈ لگا ہوا تھا، لیے ہوئے زینے سے اتر ہی رہا تھا کہ راجہ جی کا پیغام موصول ہوا۔ میں نے اپنے نام کا کارڈ نکال کر راجہ جی کے نام سے وہ ہار چڑھا دیا۔ اسی وقت ایک تار مسز سروجنی نائیڈو، گورنر اتر پردیش کا موصول ہوا کہ میں ان کی جانب سے مسٹر جناح کی فیملی سے تعزیت کروں۔ اس تار میں انہوں نے مسٹر جناح کو ''میری جوانی کا سب سے پیارا دوست'' کے الفاظ سے یاد کیا تھا۔ یہ اور ایسے ہی دیگر پیغامات میں نے مناسب مقامات پر پہنچا دیے۔ ہم لوگوں کے لیے ''پروٹوکول'' کا کام

بالکل نیا تھا۔ خود پاکستان کی سیکرٹریٹ کو نہیں معلوم تھا کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے، اس لیے برطانوی ہائی کمشنر سے مشورہ کیا گیا۔ اس نے بتایا کہ سیکرٹریٹ میں ایک کتاب رکھ دی جائے، جو لوگ تعزیت کرنا چاہیے وہاں جا کر اس پر دستخط کر دیں۔ گورنمنٹ ہاؤس میں لوگوں کا بڑا مجمع ہو گیا تھا۔ چند سیکرٹری یورپین راج کے مطابق نہایت فیشن ایبل لباس میں تھے۔ غالباً اس وقت ایسا ہی کرنا مناسب ہوگا۔ میں قدیم کاشی کا ایک ہندو باشندہ سادہ کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے گیا۔ برہنہ سر اور برہنہ پا اس کمرے میں داخل ہوا جہاں مسٹر جناح کی نعش فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے طواف کیا۔ درحقیقت مجھے صدمہ تھا کہ ایسا خوددار شخص جیسا مسٹر جناح (جن سے مل کر یہ گمان ہوتا تھا کہ سطح زمین اس قابل نہ تھی کہ وہ اس پر قدم رکھیں) فرش خاک پر موت (جس سے کسی کو چھٹکارا نہیں) کی گود میں پڑا ہوا تھا۔

سہ پہر کو جنازے کے ساتھ بڑا ہجوم تھا۔ مسٹر جناح کی لڑکی نیول واڈیا بہ ذریعہ ہوائی جہاز بمبئی سے آ گئی تھی۔ شادی کے بعد باپ بیٹی کے تعلقات برائے نام تھے۔ اس سے پہلے میں نے اس کو کراچی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مس فاطمہ جناح اور مسٹر جناح کی بیٹی سیاہ لباس پہنے موٹر کار میں تھیں۔ باقی سب لوگوں نے گورنمنٹ ہاؤس سے دفن تک کا طویل راستہ پیدل طے کیا۔ اس روز سہ پہر کو سخت گرمی تھی۔ آفتاب اپنی پوری تمازت کے ساتھ روشن تھا۔ مجمع کو تکلیف دہ سفر درپیش تھا۔ مسٹر جناح کی نعش ایک توپ گاڑی پر تھی۔ تدفین بڑی شان سے ہوئی جو ایک ملک کے فرماں روا، نیز مسٹر جناح کی ایسی بڑی ہستی کے شایانِ شان تھی۔

دوسرے روز ایک سرکاری افسر میرے پاس آیا کہ مسز واڈیا کو میں بمبئی جانے کا پرمٹ دے دوں۔ چند روز کے بعد بمبئی کا ایک پارسی وکیل اسی نوعیت کا پرمٹ لینے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مسٹر جناح کی وصیت کے مطابق عمل درآمد کرنے کا انچارج ہے۔ اس سلسلے میں اس کو بمبئی سے یہاں آنا پڑا۔ ازخود بغیر میرے دریافت کیے اس نے بتایا کہ مسٹر جناح نے اپنا کراچی اور بمبئی والا مکان اور ایک معتد بہ ماہانہ رقم اپنی بہن کو دی ہے اور بہ قول اسی وکیل کے مسٹر جناح نے ایک نام نہاد رقم اپنی لڑکی کو بھی دی ہے۔ ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ چوں کہ شادی کی وجہ سے اس کو وافر دولت مل گئی ہے اس وجہ سے اس کو روپیہ کی احتیاج نہیں۔

باقی رقم ہندوستان کے مختلف تعلیمی اداروں کو جہاں مسٹر جناح نے پڑھا تھا یا جس سے ان کا کسی نوعیت سے تعلق رہا تھا ہبہ کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی بھی ان اداروں میں شامل تھی۔ مجھے یہ پتا نہیں کہ کراچی میں کسی ادارے کو کچھ ہبہ کیا یا نہیں۔ شاید کسی ایک اسکول کو کچھ رقم دی ہے۔ اس وکیل نے جو کچھ مجھے بتایا تھا اس کو میں محض اپنی یادداشت سے لکھ رہا ہوں۔ مجھے دوسروں کے ذاتی معاملات جاننے کا بالکل شوق نہیں اور نہ میں نے اس وکیل سے اس ضمن میں کچھ پوچھا، لیکن جو کچھ اس نے کہا وہ میں نے سنا ضرور۔

ایک بڑے انسان کی زندگی کے سوانح ختم ہو گئے۔ مسٹر جناح دنیا کی ان معدودے چند ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے از سرنو ایک آزاد ملک بنایا جو دنیا کے نقشے پر ثبت ہو گیا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام خوش گوار نہ تھے۔ وہ بالکل تنہائی محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے دوست اِنے گِنے تھے کیوں کہ وہ ہر ایک کے ساتھ مساوات برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مقنن اور ایک وکیل کی حیثیت سے وہ حالات حاضرہ کی وجہ سے افسردہ رہتے تھے، جن کو بر بنائے خودداری و تمکنت وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ غالباً یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ مرد، عورتیں اور بچے اتنے وسیع پیمانے پر لاکھوں کی تعداد میں اپنا گھر بار چھوڑ کر چل دیں گے اور اس قدر خون ریزی اور سفا کی وقوع میں آئے گی، لیکن خدا کی مرضی یہی تھی۔ مسٹر جناح اب دنیا میں نہیں رہے، اس لیے ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کرنا چاہیے۔ خدا ان کی روح کو سکون عطا فرمائے۔

(پاکستان- قیام اور ابتدائی حالات: ص ۹۴--۱۰۰)

حاشیہ ❶: کیا اس جملے کا یہ مطلب ہے کہ اطلاعی جملہ مہذب یا احترام آمیز نہ تھا؟

بہن:

مسز جناح......ایک حقیقی قومی جذبہ رکھتی تھیں۔ وہ جب تک زندہ رہیں انھوں نے جناح کو صحیح راستے پر رکھا، ان کی طبیعت میں ایک قسم کا مزاح تھا، جس سے جناح بالکل عاری تھے۔ جب جناح اپنی طبیعت میں اداسی اور کسل مندی محسوس کرتے تو وہ انھیں ایک دو پیگ پلا کر اصلی حالت میں لے آتی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد گھر میں جناح کی

ساتھی صرف ان کی بہن فاطمہ رہ گئی تھیں۔ وہ بڑی فرقہ وارانہ ذہنیت کی مالک تھیں۔ بعد میں جناح میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں اس کی ذمہ دار بڑی حد تک وہی ٹھیرتی ہیں۔ جناح ان کے سامنے اپنی تقریر کی ریہرسل کرتے تھے۔ انھیں شاید معلوم نہ ہو کہ کوئن وکٹو۔ یہ بھی گلیڈ اسٹون کے ساتھ ایسا ہی کرتی تھیں۔ وہ (فاطمہ) ان سے کہتی نہیں کہ اس طرح کرو جیسے پبلک سامنے ہو۔ وہ جناح کی ہندوؤں کے خلاف لعنت ملامت کا لطف لیا کرتی تھیں اوران کے خیالات میں اور زیادہ زہر گھولتی تھیں۔ (ص ۱۱۹)

بیٹی:

جناح کے صرف ایک بیٹی تھی۔........وہ ایک پارسی نوجوان سے شادی کرنا چاہتی تھی جوایک مشہور خاندان کا فرد تھا۔ اسی (دینا) نے والد (جناح) سے اسی نوجوان سے شادی کی اجازت چاہی۔ جناح نے بیٹی سے کہا: ہندوستان میں ہزاروں مسلمان لڑکے ہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ تم شادی کرسکتی ہو۔ بیٹی نے جو اپنے باپ سے بھی دو ہاتھ آگے تھی، جواب دیا: ابا! ہندوستان میں لاکھوں مسلمان لڑکیاں تھیں، پھر آپ نے ان میں سے کسی ایک سے شادی کیوں نہ کرلی تھی؟ جناح کے پاس بیٹی کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ (ص ۱۲۰)

قایداعظم کی رہایش گاہوں کا قصہ:

قایداعظم کے دہلی اور بمبئی کے بنگلوں کے بارے میں سر یامین خاں اور مسٹر سری پرکاش دونوں حضرات نے اپنی اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے۔ سر محمد یامین خاں نے دہلی میں واقع قایداعظم کے بنگلے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ قایداعظم نے اپنا بنگلہ فروخت کر دیا ہے تو اس سے مسلمانوں کو سخت دھچکا لگا۔ انھوں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا کہ یہ قیادت انھیں تنہا چھوڑ جائے گی۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''سب سے اہم اور بڑا یہ واقعہ ہے کہ قایداعظم محمد علی جناح نے اپنی کوٹھی سیٹھ ڈالمیا کے ہاتھ اس سے کئی گنا قیمت پر فروخت کردی، جس قدر میں خریدی تھی۔ سیٹھ ڈالمیا کی سیمنٹ فیکٹری کراچی میں ہے جس کو پاکستان کا

دارالسلطنت مقرر کیا جارہا ہے۔ وہاں ایک کوٹھی قاید اعظم نے سنا ہے کہ کسی پارسی سے خریدی ہے اور خود دہلی سے کراچی منتقل ہو رہے ہیں۔ اس نے تمام دہلی میں ہلچل مچادی ہے اور سوداگروں میں کھلبلی پڑ گئی ہے۔ اب تک تو سب اس خیال میں تھے کہ پاکستان علاحدہ ہو جائے گا تو ادھر کے آدمی ادھر اور اُدھر کے آدمی اُدھر رہیں گے اور قاید اعظم کی صحت خراب ہے وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر بمبئی میں قیام کریں گے اور پاکستانیوں پر پاکستان چھوڑ دیں گے، مگر قاید اعظم کے پاکستان جانے سے رنگ بدل گیا اور لوگ حیران ہوئے کہ ایسا کیوں کیا۔" (نامۂ اعمال۔ حصہ دوم ص ۲۶-۱۳۲۵)

مسٹر سری پرکاش قاید اعظم کے بمبئی اور دہلی کے مکانات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس اثنا میں مسٹر جناح سے جو انٹرویو ہوا تھا وہ قابل ذکر ہے۔ ان کو اپنے دونوں مکانوں سے جو بمبئی اور دہلی میں تھے بہت وابستگی تھی اور غالباً یہی دو چیزیں ہندوستان سے ان کا تعلق رکھے ہوئے تھیں۔ دہلی والا مکان تو وہ فروخت کر چکے تھے مگر باضابطہ کارروائی کی کچھ تکمیل باقی تھی۔ بمبئی کے مکان سے ان کو بہت زیادہ وابستگی تھی۔ ان کے احترام کو مدنظر رکھتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے اس مکان کو بعینہٖ اصلی حالت میں محفوظ رکھا۔ اس چند گوشوں سے حکومت ہند پر سخت نکتہ چینی ہوا کرتی تھی۔ ایک دن ہمارے وزیراعظم نے بذریعہ ٹیلی فون یہ پیغام دیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا بڑے پس و پیش میں ہے اور اب حکومت مجبور ہے کہ اس مکان پر قبضہ کرلے۔ اس لیے تم مسٹر جناح سے دریافت کرو کہ وہ اس مکان کا کتنا کرایہ چاہتے ہیں۔ چناں چہ میں نے انٹرویو کے لیے تعین وقت چاہا۔ مسٹر جناح پنڈت جی کا یہ پیغام سن کر اچنبھے میں پڑ گئے اور تقریباً درخواست کے لہجے میں بولے "سری پرکاش! تم جواہر لال سے کہو کہ میری دل شکنی نہ کریں۔ میں نے اینٹ پر اینٹ جما کر وہ مکان بنایا ہے، ایسے گھر میں کون رہ سکتا ہے۔ برآمدہ کتنا خوشنما ہے! گھر تو چھوٹا ہے لیکن وہ کسی یورپین فیملی یا کسی خوش مذاق والی ریاست کے رہنے کے لائق ہے۔ تم کو

نہیں معلوم کہ مجھے بمبئی کتنا عزیز ہے۔ میرا تو خود وہاں جا کر رہنے کا ارادہ
ہے۔'' میں نے پوچھا کہ کیا واقعی آپ کا ارادہ وہیں رہنے کا ہے؟ میں جانتا
ہوں کہ بمبئی کس قدر آپ کا زیر بار احسان ہے اور آپ نے اس شہر کی کیا
خدمات کی ہیں۔ کیا میں وزیر اعظم سے کہہ دوں کہ آپ کی نیت بمبئی میں قیام
کرنے کی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ''ہاں! کہہ دو۔''

انٹرویو ختم ہو گیا اور وزیر اعظم کو میں نے بتا دیا۔ گھر بدستور خالی پڑا رہا۔ چند ماہ کے بعد ایک تاکیدی ٹیلی فونی پیغام ملا کہ اب گورنمنٹ مخالفانہ ریمارک زیادہ نہیں سن سکتی اور حکومت اس مکان پر قبضہ کر لینے پر مجبور ہے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ تم مسٹر جناح سے دریافت کرو کہ کتنا کرایہ لیں گے؟ اس وقت مسٹر جناح کی تن درستی اچھی نہ تھی اور وہ زیارت یا کوئٹہ میں مقیم تھے۔ اس وقت مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ وہ کس جگہ قیام پذیر تھے۔ میں نے فوراً ان کو ایک خط لکھا، جواب آیا کہ

''تین ہزار رُپیہ ماہوار مطلوب ہے اور امید ہے کہ کرائے کے بارے میں میری
خواہش کا لحاظ رکھا جائے گا۔''

اس طرح مسٹر جناح کی خواہش کا احترام ملحوظ رکھا گیا اور کرایہ تین ہزار رُپیہ ماہ ور مقرر کیا گیا۔ عہد نامہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر خود مسٹر جناح اس مکان میں رہنا چاہیں گے تو کرایہ دار کو مکان چھوڑ دینا پڑے گا۔

تعجب انگیز بات یہ ہے کہ مسٹر جناح نے یورپین فیملی اور والیان ریاست کا تو نام لیا لیکن یہ نہیں کہا کہ وہ اس کو بمبئی کے مسلمانوں کی تفریح گاہ بنانے کے خواہش مند ہیں۔ مسٹر جناح نے جن الفاظ میں اس مکان کا نقشہ کھینچا تھا ان سے مجھے اس مکان کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ گورنر بمبئی کی حیثیت سے ڈپٹی ہائی کمشنر کے یہاں میں نے ڈنر اور پارٹیوں میں بارہا شرکت کی۔ واقعی یہ مکان بڑا شان دار ہے۔

مختلف رنگ کے سنگ مرمر سے فرش زمین کی سجاوٹ اعلا خوش مزاجی کا ثبوت دیتی ہے۔ بیرون مکان کے سامنے کا منظر ہی عجیب دلکش ہے اور ہر چیز کی نگہ داشت بہترین طریقے سے کی گئی ہے۔ مجھے ذرا بھی حیرت واستعجاب نہیں ہے اگر مسٹر جناح کی وابستگی

بجائے گورنمنٹ ہاؤس کراچی کے مالابار (بمبئی) کے مکان سے ہے۔

دہلی میں جو مکان مسٹر جناح کا تھا، جہاں تک مجھے معلوم ہے انھوں نے خود ہی اس کو فروخت کے متعلق گفت وشنید کر لی تھی۔ تارکین وطن کی جائیداد کے متعلق جو نئے قانون بنے تھے ان کی وجہ سے بیع نامہ کی رجسٹری کرانے میں کچھ رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی، جس سے مسٹر جناح کو بہت تردّد تھا اور مجھ سے اس کی شکایت بھی کی تھی۔ اگر میری قوت حافظہ غلطی پر نہیں ہے تو گورنمنٹ آف انڈیا نے چند ماہ کے بعد رجسٹری کی مخصوص اجازت دے دی تھی۔ میں نے مسٹر جناح کو اس سے مطلع کر دیا اور امید کرتا تھا کہ اس کا جواب خوش آیند ملے گا لیکن خلاف توقع یہ خشک جواب موصول ہوا کہ

''مجھے خوشی ہے کہ صحیح کام کیا گیا جو بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔''

(پاکستان- قیام اور ابتدائی حالات: ص ۷۸-۷۹)

شوقِ ناؤنوش:

مسٹر محمد علی جناح کے دوست ایم سی چھاگلا نے روز ز اِن ڈسمبر (Roses in December) کے نام سے اپنی خودنوشت لکھی ہے اور بھارتیہ ودیا بھون، بمبئی نے شایع کی۔ اس کی تیسری اشاعت ۱۹۷۴ء میرے سامنے ہے۔ خودنوشت میں جناح صاحب کا ذکر بہ کثرت آیا ہے۔ مصنف نے نہایت صفائی اور سچائی کے ساتھ ان کی زندگی کے واقعات، معمولات اشواق پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے بار کونسل کے لیے بڑی محنت کی اور ساتھیوں کے لیے دل چسپیوں کا بڑا سامان مہیا کیا۔ وہ وکلا اور بیرسٹر جنھیں فرصت نہ ملتی تھی اور بہت مصروف رہتے تھے ان کے لیے بار کا جم خانہ تھا، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا میں جناح کے ساتھ ان کی مجلسوں میں ہمیشہ شریک رہا۔ وہ شام کو وہاں مجھے لے جاتے اور جم خانہ کے ہم سب ممبر وہاں برج اور پوکر کھیلتے تھے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ہم وہاں پیتے پلاتے بھی تھے۔ ہم چھوٹے کھیل کھیلتے تھے جو بڑے دل چسپ اور مسرت انگیز ہوتے تھے۔ ہم جوئے میں ملوث نہیں ہوتے تھے..........'' (ص ۶۱،۶۲)

سؤر کے سینڈوچز:

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب جناح بمبئی کی سیٹ پر مجلس قانون ساز کا الیکشن لڑ رہے تھے۔ میں اور جناح ٹاؤن ہال میں تھے۔ جہاں پولنگ اسٹیشن تھا۔ دوسرا پولنگ اسٹیشن عمر خادی میں تھا۔ سہ پہر کو ایک سے دو بجے تک لنچ کے لیے وقفہ تھا۔ ایک بجے سے ذرا پہلے مسز جناح، جناح کی شان دار لموزن سے ایک ٹوکری میں کھانا لیے ہوئے اتریں اور ٹاؤن ہال کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جناح سے بولیں: جے! (وہ جناح کو اسی طرح پکارتی تھیں) بتاؤ میں تمہارے لنچ کے لیے کیا لائی ہوں؟ جناح نے کہا: بھلا! مجھے کیا معلوم کہ تم میرے لے کیا لائی ہو۔ وہ بولیں: میں تمہارے لیے بہت ہی عمدہ سور کے گوشت کے سینڈوچز لائی ہوں۔ جناح کی زبان سے نکلا: او میرے خدا! یہ تم نے کیا کیا؟ کیا تم چاہتی ہو کہ میں الیکشن ہار جاؤں؟ تمھیں اس بات کا احساس نہیں کہ میں ایک جداگانہ مسلم سیٹ سے الیکشن لڑ رہا ہوں؟ اگر میرے ووٹروں کو پتا چل گیا کہ میں سور کے سینڈوچ کھاتا ہوں تو کیا تم سمجھتی ہو کہ میں یہ سیٹ جیت جاؤں گا؟ یہ سن کر مسز جناح کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ تیزی کے ساتھ لنچ کی ٹوکری لے کر سیڑھیاں اُتریں اور یہ جا وہ جا۔

ان کے جانے کے بعد جناح میری طرف مڑے اور کہا آؤ! کہیں چل کر کچھ کھاتے ہیں۔ ہم نے کورنیکیا جانے فیصلہ کیا، جو کہ بمبئی کا ایک اچھا ریسٹورنٹ تھا اور ٹاؤن ہال سے زیادہ دور بھی نہ تھا۔ ہم وہاں جا کر بیٹھے تو جناح نے مجھ سے پوچھا: تم کیا لینا پسند کرو گے؟ میں نے کہا: میں کافی پیوں گا۔ جناح نے مزید مجھ سے پوچھا: کھانے میں تم کیا پسند کرو گے؟ میں نے انھیں بتایا یہاں سور کے گوشت کے ''ساسیج'' بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ چناں چہ جناح نے دو کپ کافی، ایک پلیٹ پیسٹری اور ایک پلیٹ ساسیج کا آرڈر دے دیا۔

ہوٹل کا واقعہ:

جناح ٹاؤن ہال میں کہہ آئے تھے کہ عمر خادی کے پولنگ اسٹیشن سے الیکشن کے بارے میں اگر کوئی شخص کوئی خبر لائے تو اس کارنیکیا ریسٹورنٹ بھیج دیا جائے۔ چناں چہ ابھی ہم کافی اور ساسیج سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک بوڑھے مسلمان جن کے چہرے پر

داڑھی تھی ایک دس سالہ لڑکے کے ساتھ اندر آئے اور جناح کے قریب بیٹھ گئے۔ میرا خیال ہے وہ لڑکا ان کا پوتا ہوگا۔ اس شخص کو ٹاؤن ہال سے بھیجا گیا تھا۔ جناح اس سے عمر خادی کے پولنگ اسٹیشن کی صورت حال کے بارے میں بات کرتے رہے۔ جناح نے ان سے پوچھا کہ آیا وہ کچھ پینا پسند کریں گے؟ بوڑھے شخص نے اپنے لیے ایک کپ چائے اور لڑکے کے لیے صرف سادہ پانی کا ایما ظاہر کیا۔ چناں چہ چائے منگوادی گئی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکے کا ہاتھ ایک جھجک کے ساتھ پلیٹ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بالآخر تھوڑی سی کش مکش کے بعد اس نے ایک ساس اٹھایا اور منہ میں رکھ لیا اور مزے لے لے کر کھا گیا۔

جناح کا غصہ:

کچھ دیر کے بعد وہ چلے گئے۔ جناح نے میری طرف رخ کیا اور غصے سے کہا: چھاگلا! تمھیں شرم آنی چاہیے! میں نے کہا: بھلا میں نے کیا کیا؟ جناح نے کہا: تم نے اس لڑکے کو سور کے ساسیج کیسے کھانے دیے۔ میں نے کہا: دیکھو جناح! اس وقت مجھے اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ بہت عجلت میں یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ آیا میں اسے سور کھانے سے روک کر ایک کرب میں مبتلا کروں اور تمہاری سیٹ ضایع ہو جانے دوں یا اسے سور کھانے سے نہ روکوں اور تمھیں جتوادوں؟ میرا فیصلہ تمہارے حق میں تھا۔ (ص ۱۹-۱۱۷)

یہ واقعہ اسی مصنف (ایم سی چھاگلا) کے حوالے سے اسٹینلے وولپرٹ نے اپنی کتاب ''جناح آف پاکستان'' میں نقل کیا ہے۔ اس پر اسی رائے کا اضافہ کیا ہے:

> ''جناح کھانے پینے کے معاملے میں مذہبی ممنوعات سے پرہیز کے قائل نہیں تھے، لیکن وہ کٹر اور قدامت پسند مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھتے تھے۔''

(ص ۷۹)

میز کی بے تکلفی اور آزاد خیالی:

ڈاکٹر سچدانند سنہا مرکزی دستور ساز اسمبلی میں ۱۹۱۰ء سے رکنیت کے زمانے سے مسٹر محمد علی جناح کے دوستوں میں سے تھے اور آخر تک دونوں کے تعلقات رہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون ''وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں'' کے عنوان سے خدا بخش لائبریری

جرنل میں چھپا تھا اور اسی ادارے کی طرف سے اس کا کتابچہ بھی بنا دیا گیا ہے۔ میرے سامنے یہی کتابچہ ہے۔ اس میں ڈاکٹر سچد انند نے اپنا مشاہدہ اور تجربہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگرچہ انھوں نے (یعنی مسٹر جناح نے) گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنا معیار بدل لیا تھا، انھوں نے کھانے پینے اور رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ جب میں ۱۹۴۶ء میں دلی میں ان سے ملا تو انھیں میز پر بے تکلف اور ہمیشہ کی طرح آزاد خیال پایا۔"

اظہار رائے کا کیا شریفانہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔ میز کی بے تکلفی اور آزاد خیالی کی وضاحت خود اپنے قلم سے کرنے کے بجائے جارج کاٹلن (George Catlin) کی کتاب "ان دی پاتھ آف مہاتما گاندھی" کی ایک عبارت مستعار لے کر کی ہے جس میں کہا گیا ہے:

"......وایسرائے ہاؤس کے لمبے کمرے کا عشائیہ ایک شان دار تقریب کا سماں باندھ دیتا تھا، جس میں شراب کا انتخاب رسم کے مطابق اور معقول کیا گیا تھا، جس سے جناح نے اجتناب نہیں کیا۔" (ص ۲۷۱)

اس عشائیے اور جناح صاحب کے ذوق وعقیدے کی تھوڑی سی وضاحت انھوں نے اپنے قلم سے کر دی ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہاں جس ڈنر کا ذکر کیا گیا ہے اس کا اہتمام اپریل ۱۹۴۷ء میں کیا گیا تھا، جب کہ لاوڈ ماؤنٹ بیٹن وایسرائے تھے۔ جناح کو منشیات سے کبھی پرہیز نہیں تھا اور نہ وہ کبھی شراب بندی کے حامی رہے۔ کیوں کہ وہ اسی حد تک صاحب عقل وفہم تھے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو ان ساری نعمتوں سے لطف اندوز ہونا چاہیے جنھیں خدا نے انسان کو بخشا ہے۔" (ص ۱۲)

مسٹر جناح اور میز بانی کے فرائض:

شری پرکاش جی لکھتے ہیں:

''میرے ساتھ مسٹر جناح بہت خوش خلق تھے۔ کافی دیر تک تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ یکایک انھوں نے کہا کہ

''میں مہمان نوازی کا فرض نہیں ادا کر رہا ہوں، کیا تمھیں ایک گلاس شراب پیش کروں؟''

میں نے شربت پر قناعت کی۔ بالآخر گفتگو ختم ہوئی۔ از راہ محبت وہ مجھ کو باہر تک رخصت کرنے آئے۔ چلتے وقت میں نے ان کے محبت آمیز برتاؤ کا شکریہ ادا کیا اور درد آمیز لہجہ میں کہا:

''مسٹر جناح! آپ کو پاکستان تو مل ہی جائے گا لیکن میرا اُتر پردیش برباد ہو جائے گا۔'' (پاکستان - قیام اور ابتدائی حالات: ص۱۸۴)

شوق اور صحبت:

فریڈم ایٹ مڈنایٹ کے مؤلفین - لیری کولنس اور دامنک لیپیر نے مسٹر محمد علی جناح کا گاندھی جی سے موازنہ کرتے ہوئے ان کی سیرت اور ان کے شوق و عادات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ عمدہ لباس پہنتے تھے، عمدہ کھانا کھاتے تھے، اچھی شراب پیتے تھے، سور کا گوشت انھیں مرغوب تھا، عوام سے دور رہتے تھے۔ ان میں سے عمدہ لباس اور عمدہ کھانا ہرگز قابل اعتراض نہیں ہوسکتا۔ شراب اور سور ان کے مذہب عمل میں حرام یا ناجائز نہ تھا۔ مذہب پر ان کا اعتقاد نہ تھا، اخلاقیات ان کی جدا تھیں، اس لیے کسی مسلمان کو اس پر اعتراض کیوں ہو؟ وہ دوسروں پر طنز کرنے اور ان کے نام رکھنے میں بھی ماہر تھے۔ گاندھی جی ''چالاک لومڑی'' تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو ''مغرور برہمن'' اور ''مکار ہندو'' تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ''کانگریس کے شوبوائے'' تھے۔ مولانا محمد علی ''شوٹنگ اسٹار'' تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ''مسلمانوں کے کوئسلز'' تھے اور مسلم لیگ کے چھوٹے درجے کے رہنما اور خود ان کے ساتھی ''کھوٹے سکے'' تھے۔ وہ مسلمان کہلانے کے باوجود قرآن گاندھی جی سے کم جانتے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر کے بقول سورۂ اخلاص بھی نہ پڑھ سکتے تھے۔ یہاں قارئین کرام ''فریڈم ایٹ مڈنایٹ'' کے مؤلفین کے تبصرے سے لطف اندوز ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

وہ ایک آنکھ پر چشمہ لگاتے تھے۔ اُن کے لینن کے سوٹ بہت اچھے سلے ہوئے ہوتے تھے۔ ہر وقت تر و تازہ دکھائی دینے کے لیے وہ دن میں تین چار بار سوٹ بدلتے تھے۔ وہ اچھی شراب اور اچھے کھانے کے شوقین تھے۔ وہ بے حد ایمان دار تھے۔ مالی معاملات میں اُن پر پورا بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ قانون اور اس کی حفاظت کے لیے وہ جان لڑا سکتے تھے۔ وکیل کی حیثیت سے انھوں نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

وہ سیاست میں داخل ہوئے۔ دس سال تک انھوں نے کانگریس کے ہندو مسلم لیڈروں کے درمیان اتفاق و اتحاد قائم رکھنے کے لیے کام کیا تاکہ انگریزوں کے خلاف مل کر سب جدوجہد کر سکیں۔ کانگریس کے اندر جب گاندھی جی کی طاقت اُبھرنے لگی تو جناح پیچھے ہٹنے لگے۔ وہ آدمی انگریزوں کی جیلوں میں ہوا کھانے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا تھا جس نے لینن کے سوٹ پر بھی کبھی ہلکا سا داغ نہ پڑنے دیا ہو۔ جناح نے گاندھی جی سے صاف کہہ دیا تھا:

> ''سول نافرمانی کی تحریک صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو موٹی کھال اور موٹے دماغ والے ہوں۔''

جناح کی سیاسی زندگی کا اہم موڑ اس وقت آیا جب ۱۹۳۷ء میں کانگریس پارٹی نے اُن صوبوں میں جناح اور اُن کے مسلم لیگ کا تعاون لینے سے انکار کر دیا، جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ جناح خود پسند اور خود دار تھے۔ کانگریس کا یہ قدم انھیں ایک ذاتی سانحہ جیسا معلوم ہوا۔ انھیں اسی دن سے ہمیشہ کے لیے یقین ہو گیا کہ کانگریس کی قیادت میں ہندوستان میں اُن کے اور اُن کے مسلم لیگ کے ساتھ کبھی انصاف نہ ہو سکے گا۔ ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کرنے کے بجائے وہ ایک ایسے سانچے میں ڈھل گئے کہ اُن کی ضد نے پاکستان بنوا کر ہی دم لیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے شاید یہ تصور نہ کیا ہوگا کہ اُن کا لیڈر کبھی ایسا آدمی بنے گا جس کا اسلام سے بس اتنا تعلق ہوگا کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا، ورنہ محمد علی جناح شراب پیتے تھے، سور کا گوشت کھاتے تھے، روز داڑھی بناتے تھے اور جمعہ کے دن بھی مسجد میں قدم نہیں رکھتے تھے۔ جناح کی زندگی میں خدا اور قرآن کے لیے شاید ہی کوئی جگہ رہی

ہو۔ سیاست میں ان کے رقیب مانے جانے والے گاندھی کو شاید ان کے مقابلے میں زیادہ آیتیں یاد رہتی ہوں۔

جناح کی کامیابی بے مثال تھی۔ انھوں نے حسن ہندوستانی مسلمانوں کا دل جیت لیا ان کی عام زبان اردو جناح ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتے تھے۔ جناح بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتے تھے۔ دھول اور دھوپ سے ان کی روح فنا ہوتی تھی۔ اس کے برعکس گاندھی جی ہمیشہ بھیڑ بھاڑ کے بیچ گرد و غبار کے درمیان اور تیسرے درجے کے ریل کے ڈبوں میں سفر کرتے تھے تاکہ عوام سے ربط قایم کر سکیں۔ جناح اول درجے میں سفر کرتے تھے تاکہ عوام انھیں پریشان نہ کریں۔

گاندھی جی کی زندگی سادگی اور غربت کا نمونہ تھی۔ جناح شاہزادوں جیسی ٹھاٹھ باٹ کی زندگی گزارتے تھے۔ ہندوستان کے اہم مسلم شہروں میں جب انھوں نے اپنا خیر مقدم کرایا تو ایسے جلوس نکلے جس میں چاندی کے ہودوں والے ہاتھی تھے، چمکتی ہوئی کاروں کی قطاریں تھیں، جو اس شہر کے صدر دروازوں سے گزرے، ڈھول تاشے باجے اور بینڈ والوں نے زور شور سے یہ دھن بجائی (گاڈ سیو دی کنگ) ''بادشاہ سلامت رہے۔''

جناح کا خیال تھا کہ یہ ایسی دھن ہے جسے ہندوستانی عوام پہچان سکتے ہیں۔

قانون اور وقت کی پابندی کے بغیر جناح زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

اخبار پڑھنے کا ان کا شوق عجب تھا۔ دنیا بھر کے اخبار وہ منگواتے تھے۔ اُن کے حاشیوں پر نہ جانے کیا کیا نوٹ کرتے۔ کترنیں کاٹتے چپکاتے۔

اپنے رقیبوں کے لیے جناح کے دل میں حقارت سی حقارت تھی۔ جواہر لال نہرو کے متعلق وہ کہا کرتے:

> ''یہاں سیاست میں نہرو کا کیا کام؟ انگریزی کے پروفیسر بنیں۔ ادب ہیں مگر سیاست میں گھسے آرہے ہیں۔ مغرور برہمن ہے۔ مغربی تعلیم کا لباس ضرور پہن لیا ہے لیکن اندر سے مکار ہندو ہے۔''

گاندھی جی کو جناح ''چالاک لومڑی'' اور ہر کسی کا مقابلہ کرنے والا ہندو کہتے تھے۔

ایک بار کسی مسئلے پر بات کرنے کے لیے گاندھی جی جناح کی رہایش گاہ پر گئے۔ واقعہ ہو تو

کاندھی جی جناح کے قیمتی ایرانی قالین پر لیٹ گئے اور اپنے پیٹ پر مٹی رکھ لی۔ اس منظر کو جناح کبھی فراموش نہ کر سکے اور اس بات کے لیے گاندھی جی کو کبھی معاف نہ کر سکے۔

مسلمانوں میں بھی جناح کا دوست کوئی نہیں تھا، ساتھی ضرور تھے۔

جناح کا شاگرد کوئی نہیں بن سکا، ساتھ کام کرنے والے ضرور تھے۔ بہن کے علاوہ جناح کے خاندان میں کوئی اور فرد نہیں تھا۔ دراصل جناح کے خاندان میں دو افراد تھے۔ ایک بہن اور دوسرا پاکستان کا خواب۔

جناح کا قد تقریباً چھ فٹ تھا لیکن ان کا وزن بہ مشکل ایک سو بیس پونڈ تھا۔ ان کے چہرے کی جلد اتنی کھنچی ہوئی تھی کہ گالوں کی دونوں ہڈیاں خوب ابھر آئی تھیں۔ جلد میں ایک عجب سی چمک تھی، ان کے بال سفید بھورے اور گھنے تھے۔

جناح نے اپنی زندگی کے سترہ سال ایک دانتوں کے ڈاکٹر کے ساتھ گذارے تھے۔ ان کی بہن دانتوں کی معالج تھیں۔ اس کے باوجود ان کے پیلے دانتوں کی سڑاند میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ جناح ہر وقت اتنے چوکس اور مستعد نظر آتے تھے جیسے وہ گوشت ہڈی کے بجائے فولاد کے بنے ہوئے ہوں، لیکن یہ فولادی وجود محض دکھاوا اور دھوکا تھا۔ اندر سے جناح کمزور، نازک اور بیمار آدمی تھے۔ ان کے ڈاکٹر نے ایک بار کہا تھا کہ زندگی کے آخری برس انھوں نے قوت ارادی، وسکی اور سگریٹوں پر گزارے۔" (ص:۹۶-۹۴)

۱۹۴۷ء کے اپریل کے مہینے میں۔

اگر مہاتما گاندھی، ماؤنٹ بیٹن یا جواہر لال نہرو کو ایک غیر معمولی راز معلوم ہوتا تو شاید ملک کے بٹوارے کو یقیناً ٹالا جا سکتا تھا۔

یہ راز فلم کے ایک ٹکڑے پر موجود تھا۔ وہ فلم کا ٹکڑا ہندوستان کی سیاست میں زبردست تبدیلی لا سکتا تھا۔ ایشیا کی تاریخ پر لافانی نقش قایم کرنے کی صلاحیت اس میں موجود تھی، لیکن اس راز کو اتنی احتیاط سے محفوظ رکھا گیا کہ برطانوی سی آئی ڈی کو بھی جو دنیا میں بڑی شہرت رکھتی ہے، اس کی کوئی بھنک نہ ملی۔ اس فلم پر انسانی پھیپھڑے کا ایکسرے موجود تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ پھیپھڑوں کا مالک بری طرح تپ دق کا شکار ہے اور

زیادہ سے زیادہ دو یا تین سال زندہ رہ سکے گا۔ وہ ایکسرے فلم ایک سادہ لفافے میں بند تھی۔ وہ لفافہ بمبئی کے ایک ڈاکٹر جے ایل پٹیل کے دواخانے کی مضبوط الماری میں بند تھا۔ یہ ایکسرے محمد علی جناح کے پھیپھڑوں کا لیا گیا تھا۔ نئے وائسرائے کے ہندوستان آنے سے نو مہینے قبل ڈاکٹر پٹیل نے وہ ایکسرے فلم ایکسپوز کی تھی، جس سے یہ ظاہر تھا کہ محمد علی جناح کے دونوں پھیپھڑوں پر تپ دق کا اثر ہے۔ اس وقت جناح کی عمر ستر سال تھی۔ پھیپھڑوں کی کم زوری کی وجہ سے جناح کی صحت پیدائش کے وقت سے ہی خراب تھی۔ لڑائی (جنگ عظیم) سے کافی پہلے پلوریسی کے حملے کی وجہ سے انھیں برلن میں علاج کرانا پڑا۔ اس کے بعد برانکائٹس کے حملے اُن پر بار بار ہوتے رہے۔ ان حملوں نے اُن کی جسمانی طاقت کو اس درجہ کم زور کر دیا تھا کہ اگر انھیں کوئی لمبی تقریر کرنا پڑتی تو وہ گھنٹوں ہانپتے رہتے تھے۔ مئی ۱۹۴۶ء میں جناح جب شملہ میں تھے ان پر برانکائٹس کا زبردست حملہ ہوا۔ ان کی بہن فاطمہ انھیں ساتھ لے کر بمبئی روانہ ہو گئیں۔ راستے میں ان کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ فاطمہ نے ڈاکٹر پٹیل کو ارجنٹ کال کی۔ بمبئی سے باہر ہی ڈاکٹر پٹیل ٹرین میں آ گئے۔ انھیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان کا معزز مریض موت کے کتنا قریب آ چکا ہے۔ بمبئی کے خاص ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال کرنے کی جو زبردست تیاریاں تھیں اُن کو جھیلنے کی سکت اس مریض میں نہیں تھی اس لیے اس سے پہلے ہی ڈاکٹر پٹیل نے جناح کو ٹرین سے اُتار کر ایک اسپتال میں داخل کرا دیا۔ اسی دوران میں ڈاکٹر پٹیل نے جناح کے پھیپھڑوں کا ایکسرے لیا اور انھیں وہ راز معلوم ہو گیا جسے آیندہ برسوں میں چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اگر جناح عام مریضوں کی طرح ہوتے تو انھیں اپنی بقیہ ساری زندگی کسی سینی ٹوریم میں گزارنے کا مشورہ دیا جاتا۔

صحت یاب ہونے کے بعد جب انھیں اسپتال سے چھٹی ملی تو ڈاکٹر پٹیل انھیں تنہائی میں اپنے دفتر لے گئے اور انھوں نے اپنے دوست اور مریض کو بتایا کہ وہ کس مہلک بیماری میں گرفتار ہیں۔ اگر انھوں نے تناؤ سے بچنے کی کوشش نہ کی، آرام کا پورا خیال نہ رکھا، شراب اور سگریٹ کو نہیں چھوڑا تو شاید ایک دو سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکیں۔ اس خبر کو سن کر جناح کے ماتھے پر شکن نہیں آئی۔ ڈاکٹر پٹیل سے انھوں نے صاف کہہ دیا کہ اپنی ہنگاموں بھری

زندگی کے بدلے سینی ٹوریم کا پلنگ وہ کبھی قبول نہ کریں گے۔ پاکستان کے قیام کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کی جدوجہد نازک دور سے گزر رہی ہے، ایسے آڑے وقت میں کھیل ادھورا نہیں چھوڑا جا سکتا۔

جناح کو بہ خوبی معلوم تھا کہ اگر ان کی بیماری کی خبر ہندوؤں کو مل گئی تو ان کا سیاسی محاذ بدل جائے گا، وہ جناح کی موت کا انتظار کرلیں گے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے نرم دل لیڈروں کو اس طرح متاثر کرلیں گے کہ پاکستان کا خواب ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔

ڈاکٹر پٹیل ہر دوسرے ہفتے خفیہ طور پر انھیں طاقت کا انجکشن لگا دیتے تھے۔ جناح اپنا فرض پورا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر کی صلاح ماننے کی انھیں کوئی فکر نہیں تھی۔ انھیں موت سے زیادہ تاریخ کی فکر تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے جناح سے کہا تھا: بڑی تیز رفتاری سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ دراصل جتنی تیزی سے موت جناح کی طرف بڑھ رہی تھی اس سے زیادہ تیز رفتاری سے جناح اپنے خواب کی طرف بھاگنا چاہتے تھے یا بھاگ رہے تھے۔ (آدھی رات کی آزادی: ص ۱۰۰-۹۸)

مذہب و سیاست:

آیندہ سطروں میں مرزا راشد علی بیگ کی تحریر کے جو اقتباسات پیش خدمت ہیں ان میں کئی باتیں لائق توجہ ہیں، مثلاً: مسٹر محمد علی جناح کے نزدیک مسلمانوں کے بجائے اصل اہمیت مسلم لیگ کی تھی، اس لیے کہ وہ پارلیمانی اقتدار کا ذریعہ تھی۔ ان کی لاادریت اور فکری سانچے کی طرف اشارہ، وہ مسلمانوں کو سیاست میں لائے اسلام کو نہیں، وہ اول و آخر ایک سیاسی مسلمان تھے۔ اسلام بہ حیثیت ایک مذہب کے ان کے دائرۂ فکر میں کم ہی آتا تھا۔ مشترک عقیدے کی بنیاد پر مختلف نسل کے لوگوں کی قومیت کی تشکیل، ہندو مسلم فسادات سے فایدہ اٹھانا، مسلمانوں کو خوف زدہ کر کے ان کی سیاست کا رخ بدلنا، ہندو راج کا ہوا وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ راشد صاحب کے خیالات سے لطف اندوز ہوں، لکھتے ہیں:

"جناح صاحب خالصتاً پارلیمانی سیاست میں دل چسپی رکھتے تھے اور مسلم لیگ بھی ان کے ذہن میں محض پارلیمانی اقتدار کے حصول کے لیے ایک ذریعے کے بہ طور تھی اور بس

وہ مسلم لیگ کے خالق اور پاکستان کے بانی کہے جاسکتے ہیں، لیکن ان کی لاادریت اپنی جگہ پر تھی۔ ان کی اپروچ اور فکری سانچہ خالص Synical اور سیاسی تھے اور وہ ان لوگوں پر سختی سے حملہ کرتے تھے جو مذہب میں سیاست کو آمیز کرتے تھے۔ یقیناً وہ مسلمانوں کو سیاست میں لائے لیکن اسلام کو نہیں۔ دوسری طرف گاندھی جی ہندومت کو سیاست میں لاتے رہے۔ ہریجن مسئلے پر ان کا مرن برت اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

جناح صاحب اوّل و آخر ایک سیاسی مسلمان تھے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان فرقے کا سیاسی لیڈر سمجھتے تھے۔ جب غیر منقسم ہندوستان ان کے ذہن میں تھا اور پھر مسلمان قوم کا سیاسی لیڈر جب وہ پاکستان کے بارے میں سوچنے لگے! اسلام ان کے فکری دایرے میں کسی جگہ کم ہی آتا تھا اور اگر کوئی پوچھتا کہ محض مشترک عقیدہ نسلی اعتبار سے مختلف لوگوں کو ایک قوم کیسے بنا سکتا ہے تو ان کا جواب یہ ہوتا کہ امریکا نے ثابت کر دیا ہے کہ قومیت تو محض اپنی اختیاری ہوتی ہے۔ اگر مسلمان ایسا سوچتے ہیں کہ وہ ایک قوم ہیں تو وہ ایک قوم ہیں اور یہی اس کے لیے کافی ہے۔

وہ اتنا ہندومت یا ہندوؤں کے خلاف نہ تھے جتنا کانگریس کے، جسے وہ مسلم لیگ کی سیاسی حریف سمجھتے تھے۔ ہندو مسلم فسادات سے اچھا خاصا فایدہ اٹھایا، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کانگریس حکومتیں مسلمانوں کی حفاظت کی اہل نہیں اور مسلمانوں کو خوف زدہ کر کے لیگ کی طرف رولنے کے لیے ہندوراج کا ہوا بھی کھڑا کرتے رہے، لیکن ان سے بے تعداد مرتبہ بات چیت میں مجھے مشکل ہی سے کوئی بات یاد آتی ہے جب انھوں نے ہندوؤں یا ہندو مذہب پر کوئی حملہ کیا ہو۔ ان کی مخالفت جو بعد میں نفرت میں ڈھلتی گئی کانگریس قیادت کی جانب مرکوز تھی اور اگر وہ گاندھی جی اور جواہر لال جی سے ٹکر لینا چاہتے تھے، تو اس میں دونوں کے ہندو پن سے زیادہ کانگریست کو دخل تھا۔ ان کے کتنے ہی ہندو دوست تھے......"

اور یہ کم اہم بات نہیں ہے کہ ایک بار اپنی نفرت انگیز کانگریس سے گلوخلاصی پانے کے بعد جناح صاحب نے اپنے بنیادی سیکولرازم کو پھر سطح کے اوپر اُبھر آنے دیا۔ تقسیم کی انتہائی ہول ناک فرقہ پرستی بھی بہ ظاہر ان کے بنیادی سیکولرازم کو نہ دبا سکی۔ یہ سچ ہے جیسا کہ

تفصیل آئے گی کہ غالباً ان کے محرکات ملے جلے تھے، لیکن اس سے زیادہ کون سی چیز نمونے کے سیکولرازم کے طور سے پیش کی جا سکتی ہے جو انھوں نے پاکستان آئین ساز اسمبلی کو ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے خطاب میں کہا، جب انھوں نے اعلان کیا کہ

> ''تم میں سے ہر ایک وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو، کسی بھی رنگ، ذات یا عقیدے کا ہو اولاً، ثانیاً اور آخراً اس ریاست کا شہری ہے۔ برابر کے حقوق، برابر کے امتیازات اور برابر کی ذمے داریوں کے ساتھ!...... تم کسی بھی مذہب، ذات یا عقیدے سے متعلق ہو، ریاست کے معاملے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول سے ابتدا کر سکتے ہیں۔ اسے ہمیں اپنے نصب العین کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ پھر جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی معنی میں نہیں کہ مذہب تو ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی معنی میں قوم کے شہری کی حیثیت سے!''

ان کا سخت ترین نقاد بھی یہ تو مانے گا کہ کسی اسلامی ریاست کی افتتاحی تقریر تو یہ ہونے سے رہی۔ ذہن عجیب فضاؤں میں پرواز کرنے لگتا ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کیا ہوتے اگر کشمیر بیچ میں ایک دیوار بن کر نہ اُبھرا ہوتا؟ کچھ بھی ہو بعد میں صورت حال جس طرح خراب ہوئی اور حتیٰ کہ باقاعدہ جنگ تک نوبت پہنچی اس کی ذمے داری ان کے سر نہیں ڈالی جا سکتی۔ جناح کچھ بھی رہا ہو مذہبی مجنوں ہرگز نہیں تھا! (محمد علی جناح: ص ۲۷-۲۵)

راشد صاحب کے مطالعے کا نچوڑ:

راشد صاحب کی کتاب سے ایک متعلقہ اقتباس اور پیش کرنا چاہوں گا، جو ان کے مطالعۂ جناح کا نچوڑ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناح صاحب کی نظر اور ان کے سیاسی لائحۂ عمل میں اسلام، مسلمانوں، مسلم لیگ اور پاکستان کی اصل حیثیت کیا تھی؟ مسلمان طبقہ ان کا حلقۂ انتخاب تھا، مسلمان ان کے سیاسی درکر اور ان کی جنگ سیاسی جنگ اور پاکستان ان کی سیاسی مانگ تھی۔ تاکہ ایک علاقے پر وہ مسلم لیگ کے ذریعے حکومت

کر سکیں۔ مسلمان اس اقتدار کی جنگ کا محض ایندھن تھے اور اس سب میں مذہب محض امر اتفاقی تھا۔ راشد صاحب لکھتے ہیں:

''جناح صاحب لاادریے تھے اور زندگی کے اخیر تک لاادریے رہے۔ جداگانہ انتخابات سیاسی اسباب کی بنا پر روشناس کیے گئے۔ جناح صاحب انھیں کے زائیدہ اور ایک سیاسی مسلمان تھے۔ مسلمان فرقہ ان کے لیے حلقۂ انتخاب کی جگہ حاصل کرتا گیا اور مسلمان قوم ان کے سیاسی ارادت مند۔ جنگ جو انھوں نے لڑی سیاسی تھی مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان! اور پاکستان ان کی سیاسی مانگ تھی، ایک الگ علاقے کے لیے جس پر وہ اور مسلم لیگ حکومت کر سکیں، اس سب میں مذہب محض امر اتفاقی تھا۔'' (ایضاً: ص ۲۸)

مجمع بیزار:

''اور دو ایک واقعہ یاد آرہے ہیں، شہر میں ایک شادی کی تقریب تھی جس میں یہ اور مولانا شوکت علی ایک صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے، دونوں بڑے دوستانہ ماحول میں ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے، اس لیے یہ موقع دونوں کے کرداروں کے عین مطابق اور خاصا مضحکہ خیز تھا۔ داڑھی سے بھرپور چہرہ، فربہ جسم، خوش طبع، بے حد باتونی، مولانا محفل سے خاصا لطف اندوز ہو رہے تھے اور جس حد تک ان کی آواز پہنچ رہی تھی سب کو مشغول کیے ہوئے تھے۔ دوسری طرف کلین شیو، منحنی، سمٹا سمٹایا اکہرا جسم لیے جناح بیٹھے تھے، خاموش اور کھنچے کھنچے چہرے پر کرخت سختی کے آثار ہویدا!! اور پہلی فرصت میں مجلس کو چھوڑنے پر آمادہ!!'' (محمد علی جناح، مرزا راشد علی بیگ: ص ۱۲)

ڈکیٹر نہ کہ لیڈر:

''اپنے اوپر بے پناہ اعتماد سے بھرپور جناح صاحب لیڈر سے زیادہ ڈکیٹر تھے۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی ممکن ہے کمیٹی ہو لیکن اس کا کام صرف اظہار رضامندی تھا، جس کی میٹنگ کی وہ اس طرح صدارت کرتے تھے جیسے کوئی جنرل اپنی فوج کی کمانڈ کر رہا ہے۔ ایک بار سر

سکندر حیات خاں اور لاہور والوں کا ایک گروپ بمبئی کسی میٹنگ کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے، ایک مشترک دوست نے ہمیں کھانے پر بلایا، جب تک کھانا چلتا رہا سر سکندر اور ان کے احباب ایک مسئلے پر جس کے وہ سب سختی سے مخالف تھے بحث کرتے رہے:

''اس کا مطلب پنجاب کی صورت حال کو قطعاً نظر انداز کرنا ہے، میں کبھی اسے قبول نہیں کروں گا۔''

سر سکندر نے انتہائی غصے میں کہا۔ شام کو وہ میٹنگ ہونا تھی، پھر دوسرے دن میں نے سر سکندر سے پوچھا کیا رہا؟ بھئی! میں نے وہ مسئلہ چھیڑا ہی نہیں۔'' حال آں کہ واقعہ یوں ہوا، جو ایک دوست نے جو موقع پر موجود تھے بعد میں بتایا کہ سر سکندر نے مسئلہ چھیڑا تھا، ''جناح صاحب میں اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا تھا کہ.....'' سر سکندر نے شروع کیا تھا کہ جناح صاحب نے آہستگی سے اپنی کرسی سر سکندر کی طرف موڑی اور ان کی طرف گھورا۔ سر سکندر بلبلے کی طرح بیٹھ گئے۔ (محمد علی جناح: مرزا راشد علی بیگ، ص ۱۴)

خاص کوالٹی کے لیڈر:

مسٹر محمد علی جناح ایک خاص کوالٹی کے لیڈر تھے۔ معتقدین سے وہ بیزار تھے۔ عوام کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ ان کا کام صرف ووٹ دینا تھا۔ مسلمانوں کی معاشی، تعلیمی ترقی کے کاموں کے لیے ان کے پاس وقت نہ تھا۔ وہ مسلمانوں پر مسلم لیگ کو ترجیح دیتے تھے اور عوام مسلم لیگ میں نہ تھے۔ مسلم لیگ جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور اہلِ مناصب اور خطاب یافتہ لوگوں کی جماعت تھی۔ مرزا راشد علی بیگ لکھتے ہیں:

(۱) ''مجھے بڑی حیرت ہوتی جب اپنے معتقدوں تک سے ان کا رویہ دیکھتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ نوکر نے آکر کہا کچھ مسلمان ملنے کے لیے آئے ہیں۔ بڑی افروختگی کے ساتھ کہنے لگے:

''بھیجو! سیدھے سادے کچھ لوگ ڈرے سہمے ہوئے اندر آئے۔ ''ویل وہاٹ ڈو یو وانٹ'' انھوں نے انگریزی میں کہا (کہیے آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟)

صاحب: ان میں سے ایک اردو میں بولا:

''آپ کے دیدار کرنے آئے ہیں۔''

''ویل! یو ہیو سین می'' انھوں نے انگریزی میں کہا (میرا دیدار کرلیا آپ نے)۔''

اور اپنی کرسی موڑ کر ہم سے بات چیت کرنے لگے۔''

(۲) ''ایک اور موقع پر ریلوے اسٹیشن پر ان کی پذیرائی کے لیے بڑی بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ ایسے موقع پر اکثر بدنظمی اور گڑبڑ ہوتی ہے۔ چناں چہ یہاں بھی کچھ شور شرا اور ہنگامہ سا تھا۔ سخت طیش کے عالم میں جناح صاحب نے کھڑکیاں بند کرلیں اور باہر نکلنے سے انکار کردیا، جب تک مجتمع بھیڑ منتشر نہ ہو جائے۔''

(۳) ''وہ ایسے عوامی لیڈر تھے جن کے پاس عوام کے لیے ذرا سا وقت بھی نہیں تھا۔ عوام کے لیے ان کا رویہ وہی تھا جو ٹینی سن کے مشہور مصرعوں میں ہے کہ

ان کا یہ کام نہیں کہ یہ کیوں؟ یہ کیا ہے؟

ان کو بس کرنا ہے یا مرنا ہے!

اس پر اضافہ کیجیے کہ ان کو بس ووٹ دیے جانا ہے اور مرنا ہے۔ میرا خیال ہے بعد میں انھوں نے اس کی بھی شعوری کوشش کی کہ کچھ بدلیں لیکن ہر ایسی کوشش مصنوعی تھی، تکلیف دہ حد تک!''

(۴) ''میں اپنے کام میں اب کچھ وسوسے محسوس کرنے لگا تھا۔ جب جناح صاحب نے مجھے اپنے ساتھ کام میں لگایا اس وقت سے وہ دو امور جو انھوں نے مجھے آمادہ کرنے کے لیے میرے سامنے رکھے تھے، میں نے اپنے پیش نظر رکھے تھے اور میں حسرت کے ساتھ یہ سوچتا رہتا کہ وہ کب معاشی، سماجی اور تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں کی تعمیر کا کام اپنے ہاتھ میں لیں گے تاکہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے ان کی تجویز عملی جامہ پہن سکے۔ دوسری طرف میں انھیں مسلمانوں میں آدھی دور تک ہی جاتے نہیں دیکھتا تھا بلکہ انھیں میں کھویا ہوا پاتا تھا، ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ اور ہو یہ رہا تھا کہ وہ انھیں کسی دوسری ہی سمت میں لے جارہے تھے جو اتحاد کی مخالف سمت تھی۔''

(۵) ''مجھے یہ بھی پتا لگا کہ معاشیات کے بارے میں وہ مجھ سے بھی کچھ کم ہی جانتے تھے، فرق یہ تھا کہ میں کچھ جاننے کے لیے آمادہ رہتا تھا۔

سماجی اور تعلیمی کاموں سے بھی انھیں کم ہی دل چسپی تھی۔ اسی زمانے میں ایک واقعے سے مجھے مجبوراً اس کا اندازہ کرنا پڑا۔ میونسپلٹی نے تعلیم بالغان کی مہم چھیڑ رکھی تھی اور سارے بمبئی میں نایٹ اسکول قایم کر دیے تھے۔ مسلمان علاقوں کے اسکول مسز کلثوم سیانی کی نگرانی میں دے دیے گئے تھے، جو بڑی باصلاحیت سیاسی اور سماجی کارکن تھیں، لیکن ایسے کاموں میں جس سے مسلمانوں کو فایدہ پہنچ رہا تھا اور کوئی اختلافی مسئلہ بھی نہ تھا، وہ مسلم لیگ سے بھی تعاون چاہتی تھیں۔ اس لیے ایک رات کو ہم نے ان اسکولوں میں جناح صاحب کی بھی گردش کرائی۔ اور وہ فرض کے طور سے ایسی تنگ و تاریک گلیوں، سیڑھیوں اور کمروں میں ہمارے ساتھ گھومتے رہے جن کے وجود تک سے ناواقف تھے، لیکن ہم اپنے مشن میں ناکام رہے۔ آخر میں انھوں نے بڑے اخلاق سے شکریہ ادا کیا اور کلثوم سے کہا وہ بہت اچھا کام کر رہی ہیں لیکن مسلم لیگ کو تعلیم بالغاں میں حصہ لینے کے لیے ہدایات جاری کرنے سے انکار کر دیا۔

اسباب صریح تھے، میونسپلٹی پر کانگریس کا قبضہ تھا اور مسلم لیگ یا جناح اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ کانگریس کی مدد کریں، جو مسلم عوام میں ہردل عزیزی یا کریڈٹ کا ایک موقع اور ڈھونڈ لے، مسلم عوام مستفیض ہو رہے تھے یا نہیں، اس بات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

اب مجھے صاف نظر آنے لگا کہ ہم دونوں کی باتوں میں بنیادی اختلاف کیا تھا۔ ان کی دل چسپی مسلم لیگ کے ساتھ تھی مسلمانوں کے ساتھ نہیں! مجھے مسلمانوں سے دل چسپی تھی۔ ہندوستانی جسم کے ایک کم زور بازو کی حیثیت سے! نہ کہ مسلم لیگ سے۔

(محمد علی جناح: ص ۱۶-۱۴)

بہترین ڈبیٹر:

جناح صاحب ڈبیٹر بہت اچھے تھے۔ ان کی تقریروں میں فلسفہ و تدبر کی کوئی بات ہو یا نہ ہو، کچھ جملے ایسے ضرور ہوتے تھے، جو سامعین کو خوش کرتے تھے اور جو لوگ انگریزی نہیں سمجھتے تھے، وہ حیرت زدہ ہوتے تھے اور اس سے پہلے کہ ان کی حیرت ختم ہو، تقریر ختم ہو جاتی

تھی۔ البتہ خاتمۂ تقریر پر تالیاں بجانے میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ ان پر جناح صاحب کی شخصیت اور لیڈر شپ کا رعب ایسا چھایا ہوتا تھا کہ سمجھتے تھے کہ اگر لوگ تالیاں بجا رہے ہیں تو کوئی اچھی بات ہی کہی ہوگی۔

وہ رائیٹر سے اور یٹر زیادہ اچھے تھے۔ ان کے بیانات اور مضامین ان کے سیکریٹری لکھتے تھے۔ علامہ اقبال کے خطوط بہ نام جناح کا پیش لفظ ایک سیکریٹری نے لکھا تھا اور دیگر مضامین و بیانات دوسروں نے! مرزا راشد علی بیگ نے اپنے سیکریٹری شپ کے زمانے کی دو ایسی تحریروں کا حوالہ دیا ہے؛

۱۔ مسلم مسئلے پر ''ٹائم اینڈ ٹائیڈ'' کے لیے ایک مضمون۔

۲۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفا پر ''یوم نجات'' کے لائحۂ عمل پر مشتمل مضمون۔

اس زمانے میں یا تو فون پر یا دو بہ دو فرینک موریس (انڈین ایکسپریس) سے قریب قریب روز ہی ملاقات ہوتی اور اس صورت حال پر بحث ہوتی۔ وہ متوازن معروضی ہونے کے ساتھ ساتھ تیز سیاسی ذہن کا مالک تھا اور میرے لیے تو گویا میرے ضمیر کا رکھوالا سا بن چکا تھا۔ فرینک کا خیال تھا کہ مجھے جس حد تک بھی ممکن ہو جناح سے قریب رہنا چاہیے اور یہ سلسلہ جاری رہنا اچھا ہے، ایسا نہ ہو تو جو اچھا اثر میرے ذریعے پڑ سکتا ہے وہ بھی ممکن نہ رہے گا۔ فرینک کو معلوم تھا کہ جناح کے نام سے میں جو بیانات نکالتا رہتا تھا، وہ جس قدر معتدل تھے اگر وہ خود لکھیں تو کبھی ایسے معتدل نہ ہوتے، لیکن گیند ڈنڈے پر آ رہی تھی۔ ایک برطانوی میگزین ٹائم اینڈ ٹائیڈ نے مسلم مسئلے پر جناح صاحب سے ایک مقالہ مانگا۔ مسئلہ مجھے ازبر تھا، مقالہ لکھ ڈالا، جس میں میں نے لکھا کہ

> ''ہندوستان رنگا رنگ مختلف لوگوں کا مجموعہ ہے اور اس لیے اس کے لیے وہ جمہوری اصول جو یک ساں انداز رکھنے والے ملک کے لیے بہتر ہیں موزوں نہیں ہوں گے۔ برطانیہ میں ایک نمائندہ حکومت کو تو وہاں کے لوگوں کی عددی اکثریت کی حمایت حاصل ہوا کرتی ہے مگر ہندوستان میں وہی حکومت نمائندہ کہلائی جا سکتی ہے جسے ہندو مسلمان دونوں کی حمایت حاصل ہو۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہندومت اور اسلام مذاہب نہیں ہیں جیسا کہ عیسائی

(انگریز) ان دونوں کو سمجھتے ہیں بلکہ زندگی گزارنے کے دو مختلف طریقے ہیں،
دو مختلف سماجی اُصول وقوانین کے ساتھ یا دو مختلف تہذیبیں کہلا سکتی ہیں۔''

یہ مسودہ میں نے فرینک (موریس) کو بھی سنایا اور ایک آدھ لفظ یا جملہ اِدھر اُدھر بدلا بھی، پھر جناح صاحب کے پاس لے گیا۔ جنھوں نے اسے پسند کیا لیکن ایک لفظ تبدیل کر دیا۔ میں نے لکھا تھا:

''ایسا آئین تشکیل دیا جائے جو یہ تسلیم کرتا ہو کہ ہندوستان میں دو فرقے ہیں۔
دونوں کو مشترک مادرِ وطن کی حکومت میں حصہ دار ہونا چاہیے۔ ایسا آئین تشکیل
دینے کے لیے مسلمان حکومت برطانیہ کانگریس یا کسی کے بھی ساتھ تعاون کے
لیے تیار ہیں، تا کہ موجودہ دشمنیاں ختم ہو سکیں اور ہندوستان دنیا کی بڑی قوموں
میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔''

انھوں نے لفظ فرقے، کھرچ کے اس کی جگہ قومیں لکھ دیا۔

یہ جنگ چھڑنے اور کانگریس حکومت کے مستعفی ہونے کے درمیانی زمانے کی بات ہے، اس لیے یہ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے آس پاس کا زمانہ ہونا چاہیے۔ یہ پہلی بار میرے سامنے ایسا ہوا تھا جب جناح صاحب۔ نے مسلمانوں کو قوم کہا تھا، لیکن چوں کہ ''مشترک اور وطن'' کے الفاظ جوں کے توں برقرار رہنے دیے تھے اس لیے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ شک نہیں ہوا کہ بالکل ہی غیر آمادہ ہندوستان کے لیے وہ جلد ہی دو قومی نظریۂ ہندو اور مسلم پیش کرنے والے ہیں۔ ہر اک نے اس نظریے کے بارے میں سنا ضرور تھا جو ایک صاحب چودھری رحمت علی نے سوچا تھا اور سر اقبال نے جس کی پر جوش وکالت کی تھی، لیکن اس اکیلے واقعے کے سوا جس کا ابھی ذکر ہوا جناح صاحب نے اس سے پہلے دو قوموں یا دو ریاستوں کا کبھی نام نہیں لیا تھا۔

دوسرا مضمون۔ یوم نجات کا مینی فیسٹو:

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑ گئی اور کانگریس اور وایسرائے میں کچھ ناکام گفتگوؤں کے بعد کانگریس نے اپنی صوبائی حکومتوں کو مستعفی ہو جانے کی ہدایات جاری کر دیں۔ نومبر کے

آخر تک استعفیٰ ہو گیا۔ کسی نے کہا ہے کہ موقع بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا مقصد، جناح صاحب نے موقع سے فایدہ اٹھانے کی اپنی اہلیت کا مظاہرہ کیا۔ کانگریس کے فیصلے کو لیگ کے فایدے کے لیے استعمال کرنے کے واسطے انھوں نے لیگ کو ہدایات جاری کر دیں کہ تمام ہندوستان میں اسے ''یوم نجات و شکرانہ'' کے طور سے منایا جائے اور حسب شدآمد قدیم مجھ سے اس کے لیے مینی فیسٹو تیار کرنے کے واسطے کہا، لیکن اب میرے رویے کا اندازہ ہو چکا تھا اس لیے مجھے یہ بتانے کی ضرورت بھی سمجھی کہ اس میں کیا کیا ہونا چاہیے۔ یہ ایسا کام تھا جس نے مجھے خلجان میں مبتلا کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ تو بات بالکل حدوں سے نکلی جا رہی ہے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ لیگ کی ایک کمیٹی نے کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے ''نام نہاد مظالم'' کے بارے میں ایک پیر پور رپورٹ تیار کرائی ہے جس میں شروع سے آخر تک ہندو مسلم فسادات بھرے ہوئے تھے۔ صوبائی کانگریس حتیٰ کہ افسران ضلع تک اس میں ملوث تھے۔ یہ صحیح ہے لیکن یہ بات کہ کانگریس حکومتیں بھی ان فسادات میں شریک تھیں، محض افترا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حکومتوں نے اپنے ووٹروں کے خلاف سخت ایکشن البتہ نہیں لیا اور جس حد تک ان کے بس میں تھا امن و امان کی بحالی کے لیے انھوں نے وہ بھی نہیں کیا......

کانگریس نے جب استعفا دیا تو کروڑوں لوگ جو کانگریس کے فدائی تھے اور اس کی حکومت بننے پر مفتخر تھے حیران و مضطرب رہ گئے اور جب مسلم لیگ نے اس اقدام پر خوشیاں منائیں اور چراغاں کیے تو اس نے جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔

یہ سب خیالات تھے جن کے تحت جناح صاحب کے کہنے کے مطابق مینی فیسٹو تیار کرنے سے صریح انکار کا ارادہ میرا سب سے پہلا ردعمل تھا، لیکن میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ مجروح اکثریت کہیں ایسے نقطے پر نہ کھینچ بلائی جائے جہاں ضبط و تحمل کی طنابیں ٹوٹ جائیں، اس لیے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آخر والی خطرناک صورت حال میرے ہاتھوں کم خطرناک ہی بنا دی جا سکے۔ یہ میں جانتا تھا کہ جناح صاحب جو مظاہرے کرانا چاہتے ہیں ان کی لے کو دھیما کرنے والا ان کے حواریوں میں کوئی نہیں اور اسے دھیما کرنا کسی قدر ضروری تھا ورنہ جیسا کہ پہلے کئی بار ہو چکا تھا اکثریت اس کا انتقام ضرور لیتی۔ یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ

خود اقلیتی فرقہ ظاہراً فتح مندی کے نشے میں سرشار، نہ معلوم کیا کچھ کر گزرے۔ ہندو مسلمان فسادات میں مسلمان ہمیشہ دفاعی پہلو پر رہے ہوں یا بے بس لاچار شکاری بنتے رہے ہوں، بات ایسی بھی نہیں تھی۔

اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ مینی فیسٹو میں ہی لکھوں گا اور میرے ذہن میں جو مقصد تھا وہ اس سے پورا ہوتا ہوا دکھائی دیا تو اسے جناح صاحب کے پاس لے جاؤں گا ورنہ ان سے معذرت چاہوں گا کہ یہ کام کسی اور سے کرالیں۔ پھر فرینک (مورلیس) کے ساتھ لفظ لفظ پر بحث ہوتی رہی کہ یہ رکھا جائے یا یہ؟ فرینک کو یوم نجات میں جو خوف ناک مضمرات تھے ان کا اندازہ تھا اور وہ بھی انھیں کم سے کم نقصان رساں بنانا چاہتا تھا، اس لیے میں نے اس کا خاص لحاظ رکھا کہ بیچ بیچ میں ایسے جملے بڑھاتا جاؤں جیسے:

> ''ہڑتال، جلوس یا اس قسم کے مظاہروں کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ صرف خاک سارانہ انداز پر اپنا ردِّعمل ظاہر کر دینا کافی ہے اور خصوصی طور سے میری اپیل یہ ہے کہ دعا کی جائے کہ ایسی سچی نمایندہ وزارتیں بنیں جو تمام فرقوں اور تمام مفادات کے ساتھ انصاف کر سکیں۔''

ہمیں شک تھا کہ جناح صاحب اپنے جارحانہ انداز میں، جیسے کہ اس وقت وہ تھے، ہمارے پیش کردہ مسودہ کو مان لیں گے، لیکن اگر انھوں نے مان لیا تو ہماری ترکیب کامیاب ہو جائے گی، کوشش کرنے میں کیا جاتا تھا۔ فرینک نے ضد کی کہ جاؤ اور دکھاؤ۔ میں مسودہ لے گیا تو جناح صاحب مشغول تھے، بولے، رکھ جاؤ۔ میں چھوڑ کے چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے اسے اخباروں میں دیکھا۔ (محمد علی جناح: مرزا اراشد علی بیگ، ص ۱۹-۱۶)

فرقہ پرستی کا پس منظر:

میں اس بارے میں بہت کچھ سوچتا رہا کہ جناح صاحب جیسا آزادانہ مذہبی اور سیاسی حریتِ فکر کے ایک طویل ریکارڈ کا مالک شخص مذہب اور سیاست میں فرقہ پرستوں کا امام بن گیا۔ اس ظاہری تضاد کو سلجھانے کے لیے ہمیں ان امور کو پیش نظر رکھنا ہوگا جنھوں نے ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کا کام انجام دیا تھا۔ ان کی شخصیت جو ان کے بنیادی کردار،

ان کے ،رجحانات، ان کی تعلیم و تربیت، ان کے تجربات اور تجربات کے ردِّ عمل اور اسی قسم کے عوامل کا مجموعہ تھی۔

معمولی سے گھر میں پیدا ہوئے لیکن اپنی محنت، قابلیت او صلاحیت سے بمبئی میں قانونی پیشے میں ممتاز ترین نام پیدا کیا۔ پیشے کی نام وری سے وافر آمدنی اور وافر آمدنی سے ایک اعلا معیار رہن سہن اور معیار زندگی ان کے یہاں ایسی ہی سہولت سے آتی چلی گئی جیسا کہ لوگ پیدائشی ہی رہے ہوں۔ بلندی پر پہنچ کر اپنے کم نصیب ساتھیوں سے انھوں نے بات بھی کرنا بند کردی۔ بہترین سے کم اب انھیں گوارا ہی نہ رہا تھا۔ بہترین دوست بہترین کپڑے، بہترین ہوٹل، بہترین کلب (میں اس زمانے میں ان سے قریب رہا تھا جب وہ مالابار ہل پر اپنا نیا شان دار محل بنوا رہے تھے اور اس لیے مستند گواہ ہوں کہ کس طرح وہ ذاتی نگرانی کر کے اپنے آرکیٹکٹ اور کنٹریکٹروں کو ذرا ذرا سی بات پر توجہ دیتے اور ہر وہ چیز جو بہترین نہ ہو، اسے ردّ کر کے، کیسا زچ اور عاجز کر دیتے تھے۔ وہ بالآخر سیاسی اور سماجی دونوں لحاظ سے شوں (Snob) ہوتے گئے۔ سماجی اعتبار سے وہ علاحدگی پسند ہوگئے، صرف ان لوگوں سے اور وہ بھی کلب اور ڈرائنگ روم میں ملنا پسند کرتے تھے جو ان کے اپنے ہم رتبہ اور ہم مذاق ہوں اور سیاسی لحاظ سے وہ کمیٹیوں والے آدمی (کمیٹی مین) ہوگئے، جو صرف اپنی ذہنی سطح کے لوگوں سے اور اپنے سے اتفاق رائے رکھنے والوں سے کانفرنس میں ملنا پسند کرتے تھے۔ عوامی مقرر لیڈر کی وہ عین ضد تھے۔ شاید کم لوگ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کی اتنی بڑی ضد ہوں، ان دونوں نے اپنی ساحرانہ خصوصیات کے باوجود تقریروں کے بل پر اتنے معتقد اور یہ قیادت حاصل کی تھی، جب کہ جناح صاحب کا انداز یہ تھا کہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں، جہاں مسلمانوں کے عوامی لیڈر انھیں کھوجتے پھر رہے ہیں کہ کسی طرح کھینچ کے باہر لائیں۔ اردو سے ناواقفیت کے سبب وہ پبلک میں بولنے سے کتراتے بھی تھے۔ سماجی لحاظ سے عام آدمی کے لیے ان کے پاس وقت بھی نہیں تھا اور سیاسی لحاظ سے عام سیاسی ورکر یا معمولی سیاست دانوں کے لیے ان کے پاس مطلق وقت نہیں تھا اور پھر بھی یہ سب ان کے مرید تھے۔

(محمد علی جناح: ایم آر اے بیگ، ص ۲۴-۲۳)

جداگانہ مخلوط انتخاب:

جداگانہ انتخاب کے مسئلے میں ان کا ذہن صاف نہیں تھا۔ انھوں نے جس حد تک اور جس صورت میں اسے قبول کیا تھا صرف اس لیے کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ ان کی منزل مخلوط انتخاب ہی تھا۔ مرراشد علی بیگ کا تجزیہ ہے:

''مذہب کا جہاں تک تعلق ہے پاکستان میں کوئی کچھ بھی کہا کرے لیکن وہ بنیادی طور سے سیکولر اور ناعقیدہ (اگناسٹک) تھے۔ ان کے انتہائی معتقد سوانح نگار کو بھی اس کی تلاش میں خاصی مشکل پڑے گی کہ ان کی تحریر و تقریر سے مذہب کی تبلیغ یا تشویق کے سلسلے میں ایک آدھ جملہ بھی مہیا کر سکے۔ مجھے ان کی کسی تحریر و تقریر میں ایسی کوئی چیز یاد نہیں آتی جس میں انھوں نے اسلام کی خوبیاں بیان کی ہوں اور وہ کبھی مسجد میں گئے ہوں، کم سے کم میری یاد میں ایسا کبھی نہیں ہوا، ہو تو وہ سیاسی ضرورت کے تحت ہوا ہوگا، اگر مولاناؤں سے انھوں کبھی کچھ تعلق رکھا ہو۔ کم سے کم مجھے ایسا یاد نہیں آتا، تو یہ محض ووٹوں کے سلسلے سے ہوا ہوگا۔ اگر وہ مجھے پسند کرتے تھے تو اس کا یہی مطلب تھا کہ میں ان کی مانند ماڈرن، مہذب اور ناعقیدہ تھا۔''

ایک سے زیادہ بار وہ مشترک انتخاب کو قبول کرنے کے حق میں رہے، لیکن قدامت پسند مسلمانوں میں اسے قابل قبول بنانے کے لیے وہ نشستوں کا ریزرویشن مانگتے تھے۔ کبھی اس کا کھلا اعلان تو نہیں کیا گیا، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ رعایت مکمل کھلے انتخابات کی جانب منزل کی طرف کوچ کا پڑاؤ تھی۔ مگر ہوا یہ کہ ایک آدھ نشست اِدھر ایک آدھ اُدھر، اس حقیر مطالبے پر بھی ان کی سرزنش کی جاتی رہی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ انھیں ذلیل کیا جا رہا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کو کانگریس سے انصاف نہیں مل سکے گا۔

قوم پروروں کی زبانوں سے جہاں ان کی اصلی جگہ تھی، یہ سرزنش -- اور وہ جن کے ساتھ کوئی قدرِ مشترک نہ تھی، مسلمان اعتدال پسندوں اور رجعت پرستوں کی طرف سے خود ان کی طرف جھکتا رجحان، ان کا رویہ اور خوف ناک حد تک آزاد، انگریزوں کے ساتھ چلنے کا

بھی کوئی سوال ہی نہ تھا۔ نتیجے میں وہ خود اپنے اوپر آپڑے۔ اس طرح وہ مشہور ''انا'' تکمیل پذیر ہوئی جس سے بعد کے ان کے اکثر اقدامات وابستہ کیے جاتے ہیں۔

جداگانہ انتخابات کی بدترین خرابی یہ تھی کہ انھوں نے سیاسی ہندو اور سیاسی مسلمان پیدا کر دیے جو مذہبی ہندو اور مذہبی مسلمان کے ہم معنی قطعی نہیں تھے۔ ان کی بہ دولت سیاست دو خانوں میں بٹ گئی۔ پارلیمانی سیاست، جس میں پنڈت نہرو، سی آر داس، پنڈت مدن موہن مالویہ اور جناح صاحب وغیرہ دخیل تھے۔ اور پارٹی پالیٹکس جس میں مثلاً جواہر لال جی، سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا آزاد وغیرہ کانگریس پارٹی کے سرگرم زعما تھے۔ کانگریس بہ حیثیت پارٹی کے تمام فرقوں کے لیے کھلی سہی، لیکن کسی قانون ساز مجلس کے لیے الیکشن بہ طور مسلمان یا بہ طور ہندو ہی کے ممکن تھا۔ بے حد غیر فرقہ پرست مسلماں کو بھی کوئی ہندو ووٹ نہیں کرسکتا اور موتی لال جی جیسے انتہائی سیکولر ہندو بھی بلا کسی ایک مسلم ووٹ کے منتخب ہوا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ کانگریسی مسلمان تک خالص مسلم حلقہ ہائے انتخاب سے کھڑے ہوتے تھے اور اس کے بہ موجب انتخابی مہم چلاتے تھے۔ یہی کانگریسی ہندوؤں کی صورت حال تھی۔ (محمد علی جناح: ص: ۲۵-۲۴)

جناح صاحب کا نظریۂ یرغمال:

لیکن آخر آخر ان میں اتنا ضرور ہو گیا تھا کہ وہ بے حد سخت دل ہو گئے تھے۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں پاکستان میں، ہندوؤں کے ٹھہرے رہنے کے وہ ممکن ہے دل سے خواہش مند رہے ہوں لیکن ان کے اندر کے سیاست داں نے یرغمال کا نظریہ محض ان کے سبب نہیں چلایا! ان کے اپنے اور کچھ گنے چنے انتہا پسند لیگیوں کے سوا مجموعی طور سے مسلمانوں نے پاکستان کو سودے بازی کے ایک نقطۂ آغاز سے بڑھ کر کچھ نہیں سوچا تھا۔ اسی لیے جب انھوں نے دیکھا کہ وہ تو سچ مچ ملنے لگا تو ہندو اکثریت کے علاقوں میں رہنے والے مسلمان حیران و پریشان رہ گئے۔ ان مسلمانوں کی ڈھارس کے لیے اور انھیں سیاسی حمایت مہیا کرنے کے لیے ہی جناح صاحب نے انھیں یہ یقین دہانی کی تھی کہ پاکستان میں ایک مطمئن ہندو اقلیت کا وجود ہندوستان میں باقی ماندہ مسلمانوں کے ساتھ اچھے سلوک

کی خود بہ خود ضمانت بن جائے گا۔

ان کے اس استدلال میں ایک Cynicism تھا جس پر یونہی تنقید کے تیر نہیں برستے رہے ہیں۔ جناح جس کا نام تھا وہ ایسا کوئی کند ذہن شخص نہیں تھا کہ اسے اپنے ان عقیدت گذاروں کے ذہنی رخ کا اندازہ نہ ہو جنھیں اس نے خود ہندوؤں سے کٹ کے ایک الگ ریاست بنانے کے راستے پر ڈالا تھا۔ یہ ذہنی رخ کہ وہ اپنے درمیان ہندوؤں کو کس حد تک گوارا کر سکیں گے اور اگر کانگریس اور ہندوان کے پروپیگنڈا کیے ہوئے پیمانے کا دسواں بیسواں حصہ بھی اپنی مسلم تھے تو اپنے ملک کو منقسم دیکھنے کے بعد اس میں کسی قسم کی کمی آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندو اقلیت پاکستان سے نکالی جارہی ہے یا انھیں مسلمان بنایا جارہا ہے۔ ادھر ہندوستان میں کتنے ہی فرقہ وارانہ فسادات ہوتے چلے آرہے ہیں اور جتنے پتا چلتے ہیں اس سے کہیں زیادہ تعداد میں مسلمان مارے جاچکے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ کتنے ہندو اور مسلمان اب تک اس پُرخون نظریہ کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ (محمد علی جناح: مرزا راشد علی بیگ، ص ۲۷)

لوئی فیشر کا انکشاف:

روزنامہ "ہندوستان اسٹینڈرڈ- کلکتہ" نے اپنی اشاعت مورخہ ۲ ر ستمبر ۱۹۴۶ء میں امریکن مصنف "مسٹر لوئی فیشر" کا ایک بیان شائع کیا تھا۔ یہ بیان بہت طویل ہے، ہم اس کا اہم اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں:

> "ونسٹن چرچل ہندوستان کی آزادی کے سخت دشمن رہے ہیں۔ خود ان کی پارٹی کے بہت سے مسر آزادی ہند کے متعلق اختلاف رکھتے ہیں، لیکن چرچل کی شاہیت پسند پالیسی اپنی جگہ پر قایم ہے۔ مسٹر محمد علی جناح اور ان کی لیگ نے جس کے وہ صدر ہیں، گذشتہ چند سالوں میں آزادیٔ ہند کے بارے میں کسی خلوص کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ زمین داروں کا طبقہ جس کی لیگ کی کونسل اور کمیٹیوں میں بھاری اکثریت ہے، نئے ہندوستان کی تعمیر کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اس میں ان کا نقصان اور غریب کسانوں کا فایدہ ہے۔ اس لیے اس

سے زیادہ قدرتی بات کیا ہو سکتی ہے کہ چرچل اور جناح کے درمیان گزشتہ مہینوں میں ہندوستان کی قسمت سے متعلق نامہ و پیام ہوتا رہا ہے اور ان دونوں نے نہایت رازدارانہ طور پر آپس میں خط و کتابت اور راز و نیاز کی باتیں کی ہیں۔ برطانوی وزارتی وفد (کیبنٹ مشن) کی تجاویز اور دستور ساز اسمبلی میں شرکت کو منظور کر لینے کے بعد مسلم لیگ کا ان تجاویز پر دوبارہ غور کرنا اور کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی سے مقاطعے کا فیصلہ کر دینا چرچل کے ایک خفیہ خط کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے۔ برطانوی مشن نے انتھک کوشش کی کہ سیاسی طاقت برطانیہ کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کو منتقل کر دینے کا راستہ صاف کر دے۔ مگر چرچل اور جناح دونوں ان کوششوں کو ناکام کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔

مسٹر جناح کے نئے طرزِ پالیسی کا ایک پھل کلکتہ میں قتل و غارت گری کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ جو شخص اپنے پیروؤں کو قابو میں نہیں رکھ سکتا وہ انھیں ضرور بے لگام کر دے گا۔ طویل المیعاد تجاویز کو رد کر دینے میں مسٹر جناح نے انتہائی غیر ذمے داری سے کام لیا ہے، لیکن چرچل کی غیر ذمہ داری اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہے، کیوں کہ وہ بہت اونچے عہدے پر رہ چکے ہیں اور غالباً وہ امن و قانون کے مغربی اصول سے واقف ہوں گے۔ شاید جناح کو معلوم نہ ہو کہ چرچل کا اثر برطانیہ میں اور ٹوری پارٹی میں بڑی حد تک زایل ہو چکا ہے، لیکن چرچل شاید یقین کرتا ہے کہ جناح کے روڑے مزدور حکومت کو ہندوستان آزاد کرنے سے باز رکھیں گے......

درحقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جناح اور اس کی مسلم لیگ (یعنی زمین داروں کی انجمن) چرچل کی شاہیت پسند ٹوری پارٹی کی طرف جھکی ہوئی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے سمجھ دار اور روشن خیال مسلمان جناح کی رہنمائی میں چل رہے ہیں۔"

(ہندوستان اسٹینڈرڈ: ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء: ص ۴، کالم ۴ و ۵)

مسٹر جناح صاحب نے ۳۱ر اگست ۱۹۴۶ء کو ایک بیان کے ذریعہ اس الزام کی تردید

کرنی چاہی مگر اس تردید کو اعتراف بھی کہا جا سکتا ہے۔

مسٹر جناح کے مکمل بیان کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''میری توجہ اس پریس نوٹ کی طرف مبذول کرائی گئی جو کہ مسٹر مائیکل فوٹ ممبر پارلیمنٹ نے (لیبر حکومت کے سرکاری ترجمان) ڈیلی ہیرالڈ میں شایع کی ہے کہ ایک زمانے سے میرے اور چرچل کے درمیان خط و کتابت ہو رہی ہے۔ یہ غلط اور شرارت آمیز ہے۔ میں نے مسٹر ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ کو ۶/ جولائی ۱۹۴۶ء کو لکھا کہ کس طرح وزارتی وفد اور وایسرائے نے مسلم لیگ کو نظر انداز کیا ہے اور اس کے ساتھ میں نے اپنے بیانات مورخہ ۲۷، ۲۸/ جون مع چند دیگر ضروری کاغذات کے شامل کر دیے تھے۔ یہ خط وزارتی وفد کی روانگی کے وقت لکھا گیا تھا، کیوں کہ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہ تمام معاملات پارلیمنٹ کے سامنے رکھے جائیں گے۔ اسی قسم کا ایک خط میں نے مسٹر چرچل کو بھی لکھا جس میں چند ضروری کاغذات اور تفاصیل شامل تھیں۔ اس کے بارے میں ایٹلی کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ مجھے دونوں کے جوابات موصول ہوئے ہیں، پھر دونوں کو تفصیلی حالات سے مطلع کیا جو نازک صورت اختیار کرنے والے ہیں۔''

(روزنامہ ہندوستان اسٹینڈرڈ: ۲/ ستمبر ۱۹۴۶ء: ص ۴، کالم ۵)

مولانا سید محمد میاںؒ نے جناح صاحب کے اس بیان پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

''ممکن ہے بہ قول مسٹر جناح ''ایک زمانہ'' سے چرچل جناح خط و کتابت کا سلسلہ نہ رہا ہو، لیکن اس الزام کے جواب سے مسٹر جناح نے پہلو بچالیا کہ جب کہ وسط جون میں وزارتی مشن کی تجاویز کو منظور کر چکے تھے تو اواخر جولائی میں ان سے انکار کرنا چرچل کے کسی خفیہ خط یا اشارے سے نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں دسمبر ۱۹۴۶ء اور مارچ ۱۹۴۷ء میں پارلیمنٹ میں مسٹر چرچل نے جو تقریر کی وہ ''کنزرویٹو'' اور ''لیگ''، ''چرچل'' اور ''جناح'' اتحاد نظر اور قدرتی تعاون اور اشتراک کا بین ثبوت اور شاہد عدل ہے۔''

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ج ۲، ص ۹۳-۴۹۰)

جنگ میں برطانیہ کی مدد اور مسلمانوں کی تدفین:

مسٹر محمد علی جناح نے ڈیلی میل کے نمایندے کو ایک انٹرویو دیا تھا، اب انھوں نے اس انٹرویو کی بعض تفصیلات شایع کی ہیں۔ انٹرویو میں وزارتی مشن کی مسلم لیگ کے ساتھ نا انصافی، عارضی حکومت کے قیام کے سلسلے میں پنڈت نہرو کی تقریر اور بمبئی میں ان سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ سے تعاون، فوج میں مسلمانوں کی بھرتی کے سلسلے میں مسلم لیگ کی خدمات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''جب ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے برطانیہ کے خلاف طوفان بدتمیزی برپا کر دیا تھا اور یہ وقت تھا کہ دشمن ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، مسلمانوں نے اس خطرناک تحریک (کانگریس کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک) میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت میں نے دیہات کا دورہ کر کے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ قبریں بھی عورتیں کھودا کرتی تھیں۔ کیوں کہ مسلم مرد جنگ میں برطانیہ کی حفاظت کے لیے جانیں لڑا رہے تھے۔''
>
> (گفتار قاید اعظم: مرتبہ احمد سعید، اسلام آباد، ۱۹۷۶ء: ص ۳۰۲)

جنگ میں برطانیہ کی مدد مسلم لیگ کا بڑا کارنامہ ہے لیکن اس اظہار میں کوئی حقیقت نہیں کہ جناح صاحب نے کبھی دیہات (پنجاب) کا کوئی دورہ بھی کیا ہو! آخر اس جرأت اظہار کو کیا عنوان دیا جائے؟

بے اُصولی۔ پس پائی:

جناح صاحب نے کہا:

مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہے، اسی کا حق ہے کہ وہ مسلمان نمایندوں کو مقرر کرے۔ کانگریس کو اپنی طرف سے کسی مسلمان نمایندے کو منتخب کرنے کا حق نہیں، لیکن! شملہ کانفرنس اور کیبنٹ مشن سے کانگریس کے نمایندے کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد نے گفتگو میں حصہ لیا اور قاید اعظم نے اسے گوارا کیا۔ قاید اعظم نے فرمایا کہ

عارضی حکومت میں کانگریس کا مسلمان وزیر مقرر کرنا انھیں ہرگز منظور نہیں۔ کیبنٹ کے لیے مسلم ارکان مسلم لیگ نامزد کرے گی اور وہ صرف مسلم لیگی ہوں گے، لیکن حکومت میں پہلے تین مسلمان وزیر کانگریس نے نامزد کیے (سید ظہیر حسن، مسٹر آصف علی، یعقوب مراد آبادی) تینوں غیر لیگی تھے اور جنوری ۱۹۴۷ء میں جب کابینہ میں رد و بدل ہوئی تو مولانا ابوالکلام آزاد کو شامل کیا گیا تو ان کے ساتھ پانچ لیگی ارکان بھی شامل تھے اور ان پانچ میں ایک رکن جوگندر ناتھ منڈل تھے جو نہ صرف لیگی نہ تھے بلکہ مسلمان ہی نہ تھے۔

قاید اعظم نے نہایت شد و مد کے ساتھ مغربی اور مشرقی پاکستان کو ملانے کے لیے راستے (کوریڈور) کا مطالبہ کیا۔ پھر خود ہی اس سے دست بردار ہو گئے۔

قاید اعظم نے کراچی کی سندھ سے علاحدگی کے مسئلے پر سندھ حکومت کے اختلاف پر حکومت سندھ کو برخواست کر دیا تھا، جس کے لیے کوئی جواز نہ تھا۔ یہ ایک صوبے کی خود اعتمادی پر پہلا حملہ تھا۔

۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخابات تقسیم ملک، قیام پاکستان کے اصول پر ہوئے تھے اور صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گار جیتے تھے اور قیام پاکستان کے بعد نئے انتخاب تک حکومت چلانا انھیں کا حق تھا، لیکن اسے برخواست کر دیا تھا۔ اس کا کوئی جواز نہ تھا۔

مسٹر جناح کا مطالبہ راہ داری:

۲۲ر مئی ۱۹۴۷ء: رائٹر کے حوالے سے قاید اعظم محمد علی جناح کا ایک بیان شایع ہوا، جس میں مطالبہ کیا گیا کہ مشرقی و مغربی پاکستان کو ملانے کے لیے آٹھ سو میل کا راستہ ملنا چاہیے۔ (روزنامہ ''زمین دار'' لاہور: ۲۳ر مئی ۱۹۴۷ء)

مسٹر محمد علی جناح کے اس بیان پر مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور لیگ کونسل کے رکن چودھری خلیق الزماں نے اس بیان پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا:

''ماؤنٹ بیٹن کی عدم موجودگی میں مسٹر جناح کا ایک بیان اخبارات میں شایع ہوا کہ وہ پاکستان کے دونوں حصوں کے لیے ایک گزرگاہ چاہتے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ تو اس پر کیا توجہ دیتی خود مسلم لیگ والوں نے اس کو ایک سیاسی شوشہ

سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔ جب ہم پنجاب کا بٹوارا منظور کر چکے تھے تو گزرگاہ کون دیتا؟'' (شاہراہِ پاکستان: ص ۱۰۴۹)

''عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن'' کے مؤلف کیمبل جانسن نے اس بیان پر یہ تبصرہ کیا ہے:

جناح نے سیاست کی فضا میں زبردست بم پھینکا جو موقع محل کے لحاظ سے موزوں اور مناسب ثابت ہوا۔ انھوں نے مطالبہ پیش کیا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کو ملانے کے لیے آٹھ سو میل طویل قطعہ زمین دی جائے۔ اس نوعیت کے مطالبے کو پیش کرنے کا فن غالباً انھوں نے اسٹالن سے سیکھا ہے۔''

(عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن: ص ۱۲۵)

یہی مؤلف اس بیان پر ''ہندوستان ٹائمز'' کے اداریے کا ایک جملہ نقل کرتا ہے جو بہت تیکھا ہے، حقیقت پر مبنی ہے، لیکن اشتعال انگیز بھی نہیں۔ اخبار لکھتا ہے:

''پاکستان کے وجود کا انحصار اگر اس قطعہ زمین پر ہے تو پاکستان ہرگز وجود میں نہیں آسکتا۔'' (عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن: ص ۱۳۶)

مسٹر جناح کی سیرت پر ایک گہری نظر:

مرزا ارشد علی بیگ اپنی تصنیف ''محمد علی جناح'' میں اپنے مطالعہ وفکر کا نچوڑ یہ بیان کرتے ہیں:

''جو ہوا سو ہوا، لیکن غیر منقسم ہندوستان میں جناح صاحب کی موجودگی مسایل کو حل کم کرتی پیدا زیادہ کرتی۔ وہ خوجہ فرقے میں پیدا ہوئے مگر خوجوں کے امام آغا خان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ معمولی حالات سے ابھرے ایسے کہ کوئی اثر دار آدمی انھیں مدد دینے والا نہ تھا اور بڑے سخت مقابلے کے میدان میں وہ اپنی ذاتی جدوجہد سے بمبئی کے وکلا میں بلند ترین حیثیت پر پہنچ گئے۔ باغیانہ سرشت کے ایک نوجوان مسلمان کی حیثیت سے انھوں نے تن تنہا پرانے قدامت پرست اور وفادار مسلمان لیڈروں کی مخالفت کو اپنا شیوہ بنایا۔ کانگریس کی پالیسیوں کے بعض پہلوؤں سے نامطمئن اور غیر متفق ہوئے تو

انھوں نے اس سے استعفیٰ دے دیا۔ مجلس قانون ساز میں منتخب ہونے کے بعد وہ ہمیشہ حزبِ مخالف کے ممتاز لیڈر رہے۔ کسی دوسرے کی بانسری کی لے میں اپنی لے ملانے کے وہ اہل ہی نہ تھے۔ وہ اسی سے مطمئن ہو سکتے تھے کہ اپنی پارٹی کے خود مختار لیڈر ہوں اور اپنے گھر کے بلاشرکت غیرے مالک۔ پاکستان ہی انھیں وہ سب کچھ دے سکتا تھا جو ان کی سرشت کے مطالبے تھے۔ اگر جناح صاحب پاکستان کی تشکیل کے لیے ضروری تھے تو پاکستان جناح صاحب کی تکمیل کے لیے ناگزیر تھا۔"

(محمد علی جناح: مرزا راشد علی بیگ۔ خدا بخش لائبریری جنرل، پٹنہ۔ ص ۴۲، ۴۳)

قایدِ اعظم کی نازک مزاجی:

۱۹۴۷ء: سری پرکاش لکھتے ہیں:

"اصل دقت ان تارکانِ وطن کو قیام کراچی کے دوران پیش آتی تھی۔ یہ ایک بڑا اہم مسئلہ تھا۔ ہائی کمیشن نے اربابِ حکومت سے اجازت حاصل کر کے ایک کھلے میدان میں ان کو ٹھہرانے کا بندوبست کیا تھا۔ تقریباً پچیس ہزار رُپے پانی کے نل لگوانے اور دوسری ضروریات کے مہیا کرنے میں صرف ہوئے۔ یہ قریب قریب ناممکن تھا کہ کراچی پہنچتے ہی ان کو جہاز مل جائیں، اس وجہ سے جہاز کے انتظار میں ان کو کراچی میں چند روز ٹھہرنا پڑتا تھا۔ اس بنا پر انتظامات بڑے وسیع پیمانے پر کرنے پڑے۔ میں سندھی بھائیوں کو خراجِ تحسین و آفرین پیش کرنے پر مجبور ہوں۔ ان کو یہ نہیں پتا تھا کہ وہ اپنے گھربار سے محروم ہو کر کہاں جا رہے ہیں پھر بھی ان کے چہروں پر شکن نہ تھی اور بشاش نظر آتے تھے۔ انھیں کوئی اندازہ نہ تھا کہ وہ کہاں رکھے جائیں گے اور وہاں صورت حالات کیا ہوگی۔ اس پر بھی انھوں نے سکون اور خوش مزاجی نہیں چھوڑی۔ میں اکثر شام کو ان کے کیمپ میں جایا کرتا تھا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ موسیقی کی آواز ہر طرف سے سنائی دیتی تھی اور یہ لوگ گا بجا کر اپنا وقت گزار رہے تھے۔ میرا گمان تھا کہ یہ مہاجر دونوں جانب کے نام نہاد لیڈروں کو برا بھلا کہیں گے اور ان کے چہرے غم ناک اور افسردہ ہوں گے اور غصہ و خوف و ہراس ان پر

چھایا ہوا ہوگا۔ مگر واقعہ بالکل اس کے برعکس تھا، بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ لوگ کہیں زیارت کی نیت سے جا رہے ہیں۔ ان انتظامات میں مسٹر منگھا تاہل رہنی نے بالخصوص بڑی معاونت کی۔ یہ کئی سال تک یہاں رہے لیکن یہ دیکھ کر کہ حالات ناسازگار اور ناقابل برداشت ہیں بالآخر وہ بھی ہندوستان چل دیے۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ حکام ضلع سے باقاعدہ اجازت لے کر میں نے یہ کیمپ قایم کیا تھا۔ پھر بھی ایک روز مجھے یہ نوٹس ملا کہ اس مجمع سے ایسی بدبو پھیلتی ہے کہ جس سے گورنر جنرل قاید اعظم مسٹر محمد علی جناح کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس نوٹس میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ کیمپ بلا اجازت قایم کیا گیا ہے، ان وجوہ سے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ یہ فوراً ہٹا لیا جائے۔ گورنمنٹ ہاؤس جہاں قاید اعظم رہتے تھے وہاں سے بہ خطِ مستقیم یہ کیمپ دو میل کے فاصلے پر تھا۔ اتنی دوری پر بھی ان بدنصیبوں کی بدبو ان کو تکلیف پہنچا رہی تھی۔ حکام کو میں نے کلکٹر کا اجازت نامہ دکھایا جس کی بنا پر زرِ کثیر صرف کر کے یہ کیمپ کھولا تھا اور اس کو ایسا بنایا تھا جہاں تارکانِ وطن مسلسل آ رہے تھے عارضی طور پر رہ سکیں، لیکن مطلق العنان گورنر جنرل ہی کو ہندوؤں کی موجودگی برداشت نہ تھی تو کس کلکٹر میں یہ ہمت تھی کہ کیمپ برقرار رکھنے کی اجازت دیتا؟ آخر کار ہمیں وہ جگہ چھوڑنا ہی پڑی اور ہر امکانی کوشش کام میں لا کر دوسری جگہ ان مردوں اور عورتوں کے رہنے کا انتظام کیا جو جانے کے لیے بے چین تھے۔ یہ امر قابل افسوس تھا اور مجھے اس کا رنج ہوا کہ بجائے اس کے اُنکھڑوں کے ساتھ ہمدردی کی جاتی مسٹر جناح نے ان کے مصایب میں اضافہ کر دیا۔ ان مہاجرین کو ڈسپلن کی حدود میں رکھنا بڑا مشکل تھا۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ اس کا جلد تر وہاں سے روانگی کا پرمٹ مل جائے۔ ان حالات میں اگر انسان خودغرض ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جان کی حفاظت کے لیے ہندوستان پہنچ جانے کے لیے مضطرب تھا۔''

تارکینِ وطن کا اضطراب:

ہائی کمیشن کو بہت سوچ کر قدم اٹھانے پڑتے تھے اور ہر پہلو کو مدنظر رکھنا پڑتا تھا۔ نہ یک وقت اتنے ہی لوگوں کو پرمٹ دیے جا سکتے تھے جن کے نقل و حمل کا بندوبست ممکن تھا۔

ان دل خراش لمحات میں بعض دل چسپ واقعات بھی پیش آئے۔ ایک روز میں بہ ذات خود انتظامات کی دیکھ بھال کر رہا تھا کہ ایک عورت میرے قریب آئی اور خاموشی سے کہا کہ ''میری فیملی میں ایک نوجوان عورت کے وضع حمل کے دن پورے ہو گئے ہیں اور کسی وقت بھی ولادت ہو سکتی ہے۔ کیا ایسی حالت میں آپ ہم کو سفر کا پرمٹ دے دیں گے؟'' میں نے اس کی فرمایش پوری کر دی۔ دوسرے دن ایک عجیب منظر سامنے تھا، یعنی ''سب عورتوں کے وضع حمل کے دن پورے ہو گئے تھے۔'' سب کو یہ خبر مل گئی تھی کہ ایسی عورتوں کے ساتھ ہائی کمیشن کی خاص رعایت اور جانب داری ہوتی ہے۔ چناں چہ اس حیلے سے فایدہ اٹھانے کی نیت سے ہر ایک عورت کے ''کسی بھی لمحے وضع حمل'' کی رپورٹیں آنے لگیں۔ ہائی کمیشن کے لیے یہ ناممکن تھا کہ سب کا ڈاکٹری معاینہ کرائے۔ میں مسکرا کر یہی جواب دے دیتا تھا کہ یہ ناممکن ہے کہ تمام عورتیں بہ یک وقت اس حالت میں ہوں۔ اب بالکل قاعدے کے مطابق میں پرمٹ جاری کرنے لگا اور امتیاز و مراعات سے دست کشی کر لی۔

سندھی ہندوؤں کی مہاجرت کے بارے میں چند خاص باتیں، وہ کتنی ہی پر ہول کیوں نہ ہوں بتا دینا ضروری ہے۔ اُتر پردیش بالخصوص اس کے مشرقی اضلاع سے ہمیشہ سے لوگ بڑی تعداد میں تلاش روزگار میں بمبئی ہندوستان جاتے رہے ہیں۔ سلطان پور، کان پور، غازی پور، بنارس اور دوسرے اضلاع سے ہزاروں افراد احمد آباد، بمبئی اور دوسرے شہروں میں جاتے رہتے ہیں۔ جہاں وہ کارخانوں اور دوسرے اداروں میں کام کرتے ہیں۔ ان کو سال میں ایک ماہ کی رخصت ملتی ہے، تب یہ اپنے اپنے گھر آ کر بال بچوں میں اپنی چھٹیاں کاٹتے ہیں۔ یہ لوگ خود تو دور دراز شہروں میں تکلیف سے اپنے دن گزارتے ہیں اور ان کے اہل و عیال اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ اپنی کمائی سے جو کچھ بچا سکتے ہیں گھر بھیجتے ہیں۔ لگان اور مہاجن کے قرض ادا کر دیے جائیں اور خاندانی جائیداد محفوظ رہے۔ کراچی میں بھی ایسے لوگوں کی بڑی تعداد تھی۔

اہم خدمات کے قانون کا نفاذ:

''جب ایک ایک ہندو گھر بار چھوڑ کر ہندوستان جانے کی تیاری کر رہا تھا تو ''اہم

خدمات کا قانون'' نافذ کر دیا گیا کہ کوئی مزدور سرکاری ملازمین کے ذاتی خدمت گار اور اسی نوعیت کے دوسرے لوگ ملک سے باہر نہیں جا سکتے۔ مجھے اس حکم سے سخت صدمہ پہنچا۔ وزیر اعظم پاکستان نواب زادہ لیاقت علی خاں سے میں نے جا کر کہا کہ قدیم رواج کے مطابق یہ لوگ سال میں ایک مہینہ گھر پر گزارتے تھے، اب اس کی اجازات ان کو نہ دینا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ نواب زادہ نے جواب دیا کہ سال ہائے پیوستہ میں چھٹی ختم ہونے پر لوگ واپس آ جاتے تھے، مگر اب گئے تو یہاں پلٹ کر نہ آئیں گے، اسی وجہ سے گھر جانے کی چھٹی جوان کو ملا کرتی تھی منسوخ کر دی گئی۔ میں نے کہا کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنے وطن جانا چاہتا ہے تو اس کی جانے کی ممانعت کیوں کی جائے اور اس سے یہاں جبراً کیوں کام لیا جائے؟ خود آپ بھی تو اتر پردیش کے رہنے والے ہیں، آپ کی ہمدردی تو انھیں لوگوں کے ساتھ ہونی چاہیے۔ نواب زادہ نے کہا کہ اگر یہ افراد واپس نہ آئے تو سڑکوں اور بیت الخلا کی صفائی کون کرے گا؟ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا کہ خدا نے اتر پردیش کے ہندوؤں کو کراچی کی سڑکیں اور بیت الخلا صاف کرنے کے لیے نہیں پیدا کیا۔ کم از کم آپ کو تو اس ظلم و ناانصافی کی تائید نہ کرنی چاہیے، لیکن میری کون سنتا، میں نے وزیر اعظم ہندوستان کو ان واقعات سے آگاہ کیا اور انھوں نے وزیر اعظم پاکستان سے مراسلت بھی کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ان میں سے جتنوں کو بھی ہندوستان بھیج سکا روانہ کر دیا، باقی ماندہ پر کیا گزری اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔'' (پاکستان - قیام اور ابتدائی حالات: ص ۷۲-۷۰)

سیرت اور فکر کے چند گوشے:

سری پرکاش جی نے گورنر جنرل پاکستان کی دعوت اور اس میں میزبان سے اپنی گفتگو کی جو تفصیل بیان کی ہے اس میں میزبان کی سیرت اور فکر کے کئی گوشے قابل غور ہیں۔ ان پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ یہ بیان اپنی شرح آپ ہے۔ سری پرکاش جی لکھتے ہیں:

> ''ستمبر ۱۹۴۷ء میں دورہ کرتا ہوا میں ایک روز حیدر آباد (سندھ) پہنچا۔ یہ سندھ کا سب سے بڑا شہر ہے اور سندھیوں کی نظروں میں اس شہر کی بڑی اہمیت ہے اور ہر سال لازماً تقریباً مذہبی جوش کے ساتھ ایک بار یہاں ضرور آتے تھے۔

سادھو دسوانی کا یہی مستقر تھا۔ ان کی ایک مرید عورت کو کسی نے قتل کر ڈالا۔
میں تعزیت کرنے گیا تو دیکھا کہ وہ سامان سفر کی تیاری میں مصروف ہیں اور
کسی قیمت پر یہاں رہنے پر راضی نہ تھے۔''

قایداعظم گورنر جنرل پاکستان کی دعوت:

یہیں مجھے ایک ضروری پیغام بہ ذریعہ ٹیلی فون ملا کہ گورنر جنرل مسٹر جناح مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور فلاں تاریخ کو کھانے کے لیے مدعو کیا ہے۔ صدر سلطنت کا دعوت نامہ دراصل ایک قسم کا حکم ہوتا ہے۔ چوں کہ ڈپلومیٹک زمرے میں میں بھی تھا اور اس گروہ سے توقع کی جاتی ہے کہ ایسی بڑی ہستی کے ساتھ انتہائی خوش خلقی سے ملے۔ اس لیے میں اپنا دورہ منسوخ کر کے کراچی واپس گیا۔ مسٹر جناح نے گورنمنٹ ہاؤس کا نظم ونسق بالکل یوروپین طرز معاشرت کے مطابق رکھا تھا جس سے میں ہنوز یک لخت نابلد تھا، وہاں کی ہر چیز میرے لیے نئی تھی۔ اولاً تو میں بنارس کے ایسے قدیم تہذیب وتمدن والے شہر کا باشندہ تھا۔ ثانیاً پچھلی تیس سالہ سیاسی زندگی کانگریس میں گزری جو حکومت برطانیہ سے ترک موالات کر رہی تھی۔ ان حالات میں گورنمنٹ ہاؤس کے معاملات سے میں مطلقاً ناآشنا تھا۔

میرا گمان تھا کہ یہ پرائیویٹ دعوت ہوگی لیکن وہاں پہنچنے پر پتا چلا کہ اور بہت سے حضرات مدعو تھے۔ ڈنر سے پہلے سب مہمان ایک صف میں کھڑے ہوئے۔ مسٹر جناح اور ان کی بہن مس فاطمہ جناح آئیں اور سب سے مصافحہ کیا۔ چوں کہ میں صرف ترکاری کھاتا ہوں اس لیے میرے لیے ذرا دقت تھی۔ اعلا قسم کی شرابیں خوب صورت بوتلوں میں تھیں۔ شرابوں کے نام چاندی کی چھوٹی چھوٹی تختیوں پر کھدے ہوئے تھے۔ یہ تختیاں چاندی کی زنجیروں میں بوتلوں پر لٹک رہی تھیں۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ کچھ مہمانوں نے تو اپنے گلاس بھر لیے اور نہ پینے والے آگے بڑھا دیتے تھے۔ یہ چیز پہلی بار میرے دیکھنے میں آئی۔ کھانے سے فراغت کر کے ہم لوگ ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہوئے۔

سری پرکاش کی ملاقات:

مسٹر جناح اپنے مہمانوں سے ملنے کے لیے خود نہیں اٹھے۔ وہ ایک گدے دار صوفے

پر بیٹھے ہوئے تھے اور فرداً فرداً ان لوگوں کو بلاتے جو ان کے منظور نظر تھے۔ ان لوگوں کی فہرست ایک یورپین افسر کے ہاتھ میں تھی جو غالباً ان کا ملٹری سیکریٹری تھا۔ دیگر حضرات اِدھراُدھر کھڑے تھے۔ سب سے پہلے مجھے باریابی ہوئی اور میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ انھوں نے بڑے اخلاق سے پوچھا: مسٹر سری پرکاش کیسے ہو؟ تم سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی۔ پہلے تو میں نے ان کی عنایت کا شکریہ ادا کیا پھر بتایا کہ میں ایک دل چسپ دورہ پر تھا اور ضلع لاڑکانہ میں موہنجوداڑو تک گھوم آیا، جہاں ہماری چھ ہزار سال قبل تہذیب و تمدن کے آثار پائے جاتے ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ مشہور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر بینرجی جنھوں نے اس کا پتا لگایا تھا ان کا لیکچر میں نے بنارس میں سنا تھا، جس سے پہلی بار مجھے اس تہذیب و تمدن کا علم ہوا۔ پھر میں نے خود مسٹر جناح کا شکریہ ادا کیا۔ نیز دوسرے حکام کا جنھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ بہت خوش خلقی کا برتاؤ رکھا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ تم جہاں بھی جانا چاہو جا سکتے ہو اور حکومت تمہارے لیے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کر دے گی۔ میں نے کہا اگرچہ یہ ہم لوگوں کی بدقسمتی ہے لیکن جب تک میں زندہ ہوں دونوں ریاستوں کو ہرگز الگ الگ نہ سمجھوں گا۔ میں ہمیشہ ''انڈیا'' کو ایک ہی ملک کہوں گا اور باشندگان پاکستان کو اپنے بھائی اور ہم وطن۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ آپ کا کانگریس سے تعلق ایک ممتاز لیڈر کی حیثیت سے رہ چکا ہے اور میرے دل میں آپ کا احترام جیسا پہلے رہا ہے ویسا ہی ہمیشہ رہے گا۔

پاکستان! اسلامی یا مسلم ریاست:

پھر میں نے کہا کہ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں بہ شرطے کہ آپ برا نہ مانیں اور قبل اس کے کہ میں جو کہنا چاہتا ہوں آپ سے خواستگار عفو ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں؟ انھوں نے کہا: ضرور کہو۔ ہر وقت تو مجھ کو چاپلوس گھیرے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی دوست تو ملے جو صاف گو ہو۔ جو کہنا چاہتے ہو ضرور کہو۔ اس جواب سے میری ہمت بڑھی۔ پھر بھی اپنے ڈپلومیٹک عہدے کو مدنظر رکھتے ہوئے میں متردد تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ میں آپ کا بہی خواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو غلط فہمی نہ ہوگی۔

ان کے دوبارہ یقین دلانے پر میں نے کہا کہ (اور اتنی مدت گزر جانے کے بعد وہ الفاظ ہنوز مجھے یاد ہیں) کہ

''میں یہ جانتا ہوں کہ مذہبی اختلافات کی بنیاد پر یہ بٹوارہ ہوا ہے۔ اب اس تقسیم کی تکمیل ہو جانے پر اس بات پر کیوں زور دیا جائے کہ یہ اسلامی حکومت ہے۔''

میں نے یہ کہنے کی بھی جرأت کی کہ

''اگر اس پر زور نہ دیا جائے کہ یہ اسلامی حکومت ہے تو غیر مسلم یہاں سے نہ بھاگیں گے۔''

پھر میں نے اپنے تاثرات اور چشم دید حالات کا تذکرہ کیا کہ ملک کے اندرونی حصے کیسے ویران پڑے ہیں اور خود ایسے ہزاروں آدمیوں سے میرا سابقہ پڑا ہے جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں۔

لفظ ''اسلامی'' کے استعمال سے گریز:

اس پر انھوں نے کہا کہ

''میں نے لفظ ''اسلامی'' کبھی نہیں استعمال کیا ہے۔ تم ایک ذمے دار افسر ہو اور یہ بتانا تمہارا فرض ہے کہ میں نے کہاں ایسا کہا ہے؟''

میں نے جواباً کہا کہ

''وزیر اعظم پاکستان نواب زادہ لیاقت علی خاں نے کہا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے۔''

مسٹر جناح نے کہا کہ

''تب تم لیاقت علی سے نمٹو۔ مجھ سے کیوں جھگڑ رہے ہو؟''

میں خاموش نہیں رہا بلکہ کہا کہ

''خود آپ نے اپنے نشریے میں ۳۱ر اگست کو لاہور میں کہا تھا کہ پاکستان اسلامی حکومت ہے۔''

مسٹر جناح کو کامل یقین تھا کہ انھوں نے پاکستان ''اسلامی ریاست'' کبھی نہیں کہا تھا۔ چناں چہ انھوں نے جواب دیا کہ

''تم اصل بیان مجھے دکھاؤ۔''

یہ کہہ کر فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور چہرہ غضب ناک ہو گیا اور نہایت معمولی طریقے سے مجھے رخصت کر دیا۔ مجھے امید ہے کہ میرے بعد جو لوگ ملے ہوں گے انھوں نے سلامت روی کا راستہ اختیار کیا ہوگا۔

سری پرکاش جی کی تحقیق:

میری بدقسمتی کہ مجھے کامل وثوق تھا کہ انھوں نے اپنے نشریے میں لفظ ''اسلامی'' استعمال کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں کراچی کے ایک مشہور اخبار کے ہندو ایڈیٹر کے پاس جن سے میں خوب شناسا تھا، پہنچا۔ ان سے شروع ستمبر کے اخبار کی کاپی مانگی جس پر وہ پورا نشریہ شایع ہوا تھا۔ ایڈیٹر ٹوہ لگانے لگا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ تب میں نے بہ صیغۂ راز شب گزشتہ مسٹر جناح سے انٹرویو کا تذکرہ کر دیا۔ یہ بھی سوئے اتفاق ہے کہ بعض اخبار نویس اس نوعیت کے معاملے کو ہضم نہیں کر سکتے۔ چناں چہ اس نے اپنے اخبار میں میرا انٹرویو شایع کر دیا۔ اس کے بعد مجھے مسٹر جناح کا خط ملا جس میں انھوں نے حق بہ جانب شکایت کی تھی کہ میں نے ڈنر کے بعد کی گفتگو اخبار میں شایع کرا دی۔ مجھے خود بھی ایڈیٹر پر بہت غصہ تھا لیکن میرے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔ میں نے مسٹر جناح سے بہت معافی چاہی اور اخبار کا وہ تراشا بھی ملفوف کر دیا (جس میں ان کی نشریہ چھپی تھی)۔

سری پرکاش کی عفو خواہی:

اس اخبار کا میں نے بہت غور سے مطالعہ کیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ لفظ ''اسلامی'' کا استعمال مسٹر جناح نے ایک بار بھی نہیں کیا تھا۔ ہاں لفظ ''مسلم'' کا پانچ چھ بار اعادہ کیا تھا۔ میں نے اپنی غلطی پر اظہار افسوس کیا۔ ''مسلم'' اور ''اسلامی'' میں مجھے تشابہ ہو گیا تھا اور عوام کی نظروں میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بالخصوص جب کہ وزیر اعظم (پاکستان) اپنی

تقریروں میں دونوں لفظ استعمال کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر مسٹر جناح نے کوئی مداخلت نہیں کی۔

مسٹر جناح نے میرے اس خط کا جواب ہی نہیں دیا لیکن میں اپنے دل میں دونوں کا فرق سمجھ رہا تھا۔ اب بھی میں اپنے دعوے کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکتا لیکن ایک ممتاز قانون دان ہونے کی وجہ سے مسٹر جناح ان دونوں لفظوں کا نازک فرق سمجھ رہے تھے۔ میں نے یہ راے قایم کی اور ہنوز اس پر قایم ہوں کہ مسلم حکومت وہ ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور عنان سلطنت اسی مذہب کے متبعین کے اختیار و اقتدار میں ہو۔ دوسری صورت ہے کہ اسلامی قوانین کے مطابق نظم و نسق ہو اور انھیں احکام کی پابندی بھی کی جاتی ہو۔ یہ ریاست ''ریاست اسلامی'' ہوگی خواہ وہاں غیر مسلم آبادی کی اکثریت ہو۔ مسٹر جناح کا یہ نظریہ ہوگا کہ چوں کہ پاکستان میں مسلم آبادی بڑی اکثریت رکھتی ہے اس لیے یہ ''مسلم ریاست'' ہے اور انتظام سلطنت مسلمانوں ہی کے قبضۂ قدرت میں رہنا چاہیے۔ چوں کہ ان کی تعلیم و تربیت جدید حالات اور قوانین کے ماحول میں ہوئی تھی اس وجہ سے انھوں نے یہ سمجھا کہ موجودہ نظام سلطنت میں تیرہ چودہ سو برس پیشتر کے احکامات نئے ملک اور فضا میں سازگار ثابت نہ ہوں گے۔ یہ میرا ذاتی نظریہ ہے اور ہنوز مجھے اس پر کامل اعتماد نہیں ہے۔

مسٹر جناح کی راے میں ''مسلم'' اور ''اسلامی'' میں کوئی فرق ہو یا نہ ہو اور ممکن ہے اس کی تمام پیچیدگیوں پر انھوں نے غور بھی نہ کیا ہو، لیکن انھوں نے نہ تو کوئی مداخلت کی اور نہ اپنے پیروؤں کو بتایا کہ یہ ''مسلم'' ریاست کہی جائے یا ''اسلامی''۔ حکومت پاکستان کے دستور العمل (آئین) میں اس سلطنت کا ذکر ''اسلامی ریاست'' کے نام سے آیا ہے۔ بہ ہر حال یہ مسئلہ مع اپنی تمام پیچیدگیوں اور نتایج کے جہاں تھا ہنوز وہیں باقی ہے۔

(ص ۵۶-۹)

جناح صاحب کی ایک نئی سوانح:

مسٹر محمد علی جناح کی ایک نئی سوانح ایک انگریز اہل قلم اسٹینلی وولپرٹ (Stanley Wolpert) کے قلم سے ''جناح آف پاکستان'' کے نام سے شایع ہوئی ہے، اس پر معاصر اسٹیٹمین کے سنڈے ایڈیشن میں مفصل تبصرہ نکلا ہے، جس میں اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا

ہے کہ جناح صاحب اپنی زندگی کے بڑے حصے میں ہندو مسلم اتحاد کے سب سے سرگرم حامی اور مخلص سفیر رہے تھے۔

سوانح نگار نے جناح صاحب کی شادی کا بھی ذکر کیا ہے جو ایک اٹھارہ سالہ پارسی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس شادی کے وقت وہ لڑکی جناح صاحب کے کہنے پر مسلمان ہوگئی تھی اور اس کے تعلقات اپنے پارسی خاندان والوں سے بالکل منقطع ہوگئے تھے۔ اس کے صرف ایک لڑکی ہوئی تھی جس نے بڑے ہوکر جناح صاحب کی مرضی و اجازت کے بغیر ایک پارسی نوجوان سے شادی کرلی تھی۔ جناح صاحب نے شادی سے قبل بیٹی کو خط اس مضمون کا لکھا تھا کہ مسلمانوں میں لاکھوں قابل نوجوان موجود ہیں، ان کو چھوڑ کر کسی پارسی نوجوان سے کیوں شادی کررہی ہو؟

بیٹی نے اس کا برجستہ جواب دیا کہ باجان! ملک میں لاکھوں مسلمان لڑکیاں موجود تھیں، ان کو چھوڑ چھاڑ کر آپ نے ایک پارسی لڑکی سے کیوں شادی کی تھی؟ جناح صاحب نے اس شادی کے بعد اپنی لڑکی سے جو ان کی اکلوتی اولاد تھی، بالکل قطع تعلق کرلیا تھا اور جب کبھی اس کو لکھتے تو بجائے بیٹی یا پیار کے کسی لفظ کے اسے ''مسز واڈیا'' کے لقب سے مخاطب کرتے اور زندگی بھر اپنی اس بیٹی کا ذکر اپنے کسی ملنے والے سے بھی نہیں کیا۔

سوانح نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ جناح صاحب عرصۂ دراز سے برانکائیٹس (حلق کے درد و سوزش) میں مبتلا تھے۔ اس مرض نے آگے بڑھ کر پھیپھڑے کی دق نیو برکلوسس کی شکل اختیار کرلی تھی۔ آخر نوبت کینسر کی آ کر رہی اور وہی سبب موت ہوا۔

سوانح میں یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ انگلستان میں جب وہ طالب علم کی حیثیت سے مقیم تھے تو انھیں تھیٹر میں اداکاری کا شوق بھی پیدا ہوگیا ہے۔ کچھ عرصے اس کی ٹریننگ حاصل کرتے رہے تھے، لیکن اس زمانے میں کسی خانگی ضرورت سے انھیں وطن واپس جانا پڑا اور وہاں سے انگلستان واپس آنے کے بعد ان کا وہ شوق ختم ہوگیا اور انھوں نے پھر کبھی اسٹیج کا رُخ نہیں کیا۔ تبصرہ نگار نے لکھا کہ اگر وہ اس وقت اس شوق کے زیر اثر تھیٹر کے اسٹیج کی رنگینی اختیار کرلیتے تو اس کے نتیجے میں ہندوستان کے سیاسی اسٹیج کا نقشہ بالکل مختلف نظر آ کر رہتا۔ (صدق جدید۔ لکھنؤ، ۲۴ راگست ۱۹۸۴ء: ص ۳)

وصیت کی تنسیخ:

سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی عدالت نے حال میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی وصیت کے ایک جزو جس پر اب تک عمل نہیں ہوسکا تھا کی تنسیخ کا فیصلہ ان کی جائیداد کے ٹرسٹی صاحبان کی درخواست پر کردیا۔ مرحوم نے ایک بڑی رقم اپنے وصیت نامے میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے لیے مخصوص کی تھی۔ معلوم نہیں کیوں اب تک اسے وہاں پہنچایا نہیں گیا اور اب تقریباً ۳۴ سال کی مدت گزرنے کے بعد اس کی عدالتی تنسیخ اس بنا پر کرائی گئی کہ اب حالات تبدیل ہوگئے ہیں، اس لیے بہتر ہوگا کہ یہ رقم پاکستان میں مصارف خیر میں دے دی جائے۔ مدعیوں کی طرف سے یہ بھی کہا گیا کہ جناح صاحب نے بیس ہزار کی جو رقم اپنی وصیت کی رو سے بمبئی یونی ورسٹی کو دلوائی تھی اس یونی ورسٹی والوں نے وہ رقم تو لے لی لیکن اس سلسلے میں مسٹر جناح کا نام مطلق درج نہیں کیا گیا اور یہ عذر بھی پیش کیا گیا کہ حکومت پاکستان کے قواعد کی رو سے کوئی بڑی رقم ہندوستان منتقل نہیں کی جاسکتی۔

پاکستان اسلامی مملکت ہونے کا دعوے دار ہے اور شریعت اسلام کے احکام کے مطابق وصیت کرنے والے کی وصیت لازمی طور سے پوری ہونی چاہیے۔ کسی دنیاوی عدالت کو اس وصیت میں تبدیلی کا اختیار نہیں۔ رہا حالات میں تبدیلی کا عذر سو وہ بھی صحیح نہیں۔ مسلم یونی ورسٹی بحمداللہ اب بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، اس کا اقلیتی کردار عرصے کی جدوجہد کے بعد بڑی حد تک بحال ہوچکا ہے اور وہ مسلمانان ہند کے اہم ترین تعلیمی ادارے کی حیثیت رکھتی اور ہر قسم کی امداد کی مستحق ہے وہ بمبئی یونی ورسٹی سے کہیں زیادہ جناح صاحب کی وصیت کردہ رقم کی مستحق تھی۔ علاوہ ازیں یہ عذر بھی صحیح نہیں کہ حکومت پاکستان کی عاید کردہ پابندیوں کے باعث کوئی رقم کسی حال میں وہاں سے ہندوستان منتقل نہیں ہوسکتی۔ حکومت پاکستان کی مرضی اور حکومت ہند کی اجازت سے گزشتہ چند برس میں بعض بڑی رقمیں وہاں سے یہاں منتقل ہوچکی ہیں۔ مثلاً دارالعلوم دیوبند کے پاکستانی چندوں کی ایک بڑی رقم عرصہ ہوا آچکی تھی۔ اگر کوشش کی جاتی تو حکومت پاکستان جناح صاحب کی اس رقم کو بھی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ پہنچانے کی اجازت میں تامل نہ کرتی۔

(صدق جدید۔ لکھنؤ، ۱۴؍دسمبر ۱۹۸۴ء: ص ۲و۳)

پاکستان

آغازِ تصور سے تشکیل و قیام تک

پاکستان کی تجویز سے مسٹر جناح کا انکار:

مسلمانوں کے قاید اعظم سے ملاقات کے بعد جب ماؤنٹ بیٹن نے اپنی مطالعہ گاہ سے باہر قدم رکھا تو ایک لمبی گہری سانس لی اور اپنے پریس اتاشی کی طرف دیکھ کر بولے:

"یاخدا! میری ساری طاقت تو اس پتھر سے لڑنے میں لگ گئی، جس شخص کو "بابائے پاکستان" کے خطاب سے نوازا جانے والا تھا۔ اسی محمد علی جناح نے ۱۹۳۳ء میں رحمت علی کی پاکستان کی تجویز کو ایک ناممکن خواب کہہ کر رد کر دیا تھا۔ پاکستان کے قیام کا تصور تحریری صورت میں پہلی بار پیش کرنے والا آدمی رحمت علی ہی تھا۔

وہ طالب علم تھا۔ لندن میں رہتا تھا، اپنی تجویز جناح کے سامنے پیش کرنے کے لیے اس نے وولڈرف ہوٹل میں ڈنر پارٹی دی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان سیاست دانوں کے درمیان جناح نے اس وقت اپنی جگہ بنالی تھی۔ رحمت علی اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی ذمے داری جناح کو سونپ دینا چاہتا تھا۔ اس وقت جناح نے اس کام کو ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیا، لیکن بالآخر مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ کرنے کا کام ان کے ہاتھوں ہی پورا ہوا......

وہ سیاست میں داخل ہوئے۔ دس سال تک انھوں نے کانگریس کے ہندو مسلم لیڈروں کے درمیان اتفاق و اتحاد قایم رکھنے کے لیے کام کیا تاکہ انگریزوں کے خلاف مل کر سب جدوجہد کر سکیں۔ کانگریس کے اندر جب گاندھی جی کی طاقت ابھرنے لگی تو جناح پیچھے ہٹنے لگے۔ وہ آدمی انگریزوں کی جیلوں میں ہوا کھانے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا تھا جس کے لینن کے سوٹ پر کبھی ہلکا سا داغ بھی نہ آیا ہو۔ جناح نے گاندھی جی سے صاف کہہ دیا تھا:

''سول نافرمانی کی تحریک صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو موٹی کھال اور
موٹے دماغ والے ہوں۔''

سیاسی زندگی کا اہم موڑ:

جناح کی سیاسی زندگی کا اہم موڑ اس وقت آیا جب ۱۹۳۷ء میں کانگریس پارٹی نے ان صوبوں میں جناح اور اُن کی مسلم لیگ کا تعاون لینے سے انکار کر دیا، جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ جناح خود پسند اور خود دار تھے۔ کانگریس کا یہ قدم انھیں ایک ذاتی سانحہ جیسا معلوم ہوا۔ انھیں اسی دن سے ہمیشہ کے لیے یقین ہو گیا کہ کانگریس کی قیادت ہندوستان میں اُن کے اور ان کی مسلم لیگ کے ساتھ کبھی انصاف نہ ہو سکے گا۔ ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کرنے کے بجائے وہ ایک ایسے سانچے میں ڈھل گئے کہ ان کی ضد نے پاکستان بنوا کر ہی دم لیا۔

> ''ہندوستان کے مسلمانوں نے شاید یہ تصور نہ کیا ہوگا کہ ان کا لیڈر کبھی ایسا آدمی بنے گا جس کا اسلام سے بس اتنا تعلق ہوگا کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا ورنہ محمد علی جناح شراب پیتے تھے، سور کا گوشت کھاتے تھے، روز داڑھی بناتے تھے اور جمعہ کے دن بھی مسجد میں قدم نہیں رکھتے تھے۔ جناح کی زندگی میں خدا اور قرآن کے لیے شاید ہی کوئی جگہ رہی ہو۔ سیاست میں ان کے رقیب مانے جانے والے گاندھی کو شاید اُن کے مقابلے میں زیادہ آیتیں یاد رہی ہوں۔''

جناح کی کامیابی بے مثال تھی۔ انھوں نے جن ہندوستانی مسلمانوں کا دل جیت لیا اُن کی عام زبان اردو جناح ٹھیک سے بول نہیں سکتے تھے۔ جناح بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتے تھے۔ دھول اور دھوپ سے ان کی روح فنا ہوتی تھی۔ اس کے برعکس گاندھی جی ہمیشہ بھیڑ بھاڑ کے بیچ گرد و غبار کے درمیان تیسرے درجے کے ریل کے ڈبوں میں سفر کرتے تھے تاکہ عوام سے ربط قایم کر سکیں۔ جناح اول درجے میں سفر کرتے تھے تاکہ عوام انھیں پریشان نہ کریں۔

گاندھی جی کی زندگی سادگی اور غربت کا نمونہ تھی۔ جناح شہزادوں جیسی ٹھاٹھ باٹ کی

زندگی گزارتے تھے۔ ہندوستان کے اہم مسلم شہروں میں جب انھوں نے اپنا خیر مقدم کرایا تو ایسے جلوس نکلے جس میں چاندی کے ہودوں والے ہاتھی تھے، چمکتی ہوئی کاروں کی قطاریں تھیں۔ جلوس شہر کے صدر دروازوں سے گزرے۔ ڈھول تاشے باجے اور بینڈ والوں نے زور شور سے یہ دھن بجائی (گاڈ سیو دی کنگ) ''بادشاہ سلامت رہے۔''

جناح کا خیال تھا کہ یہ ایسی دھن ہے جسے ہندوستانی عوام پہچان سکتے ہیں۔ قانون اور وقت کی پابندی کے بغیر جناح زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اخبار پڑھنے کا ان کا شوق عجب تھا۔ دنیا بھر کے اخبار وہ منگواتے تھے، ان کے حاشیوں پر نہ جانے کیا کیا نوٹ کرتے، کترنیں کاٹتے، چپکاتے۔

اپنے رقیبوں کے لیے جناح کے دل میں حقارت ہی حقارت تھی۔ جواہر لال نہرو کے متعلق وہ کہا کرتے ''یہاں سیاست میں نہرو کا کیا کام، انگریزی کے پروفیسر بنیں، ادیب رہیں، مگر سیاست میں گھسے آرہے ہیں۔ مغرور برہمن ہے، مغربی تعلیم کا لباس ضرور پہن لیا ہے لیکن اندر سے مکار ہندو ہے۔''

گاندھی جی کو جناح ''چالاک لومڑی'' اور ہر کسی کا مقابلہ کرنے والا ہندو کہتے تھے۔ ایک بار کسی مسئلے پر بات کرنے کے لیے گاندھی جی جناح کی رہائش گاہ پر گئے۔ وقفہ ہوا تو گاندھی جی جناح کے قیمتی ایرانی قالین پر لیٹ گئے اور اپنے پیٹ پر مٹی رکھ لی۔ اس منظر کو جناح کبھی فراموش نہ کر سکے اور اس بات کے لیے گاندھی جی کو کبھی معاف نہ کر سکے۔

مسلمانوں میں بھی جناح کا دوست کوئی نہیں تھا۔ ساتھی ضرور تھے۔ جناح کا شاگرد کوئی نہیں بن سکا، ساتھ کام کرنے والے ضرور تھے۔ بہن کے علاوہ جناح کے خاندان میں کوئی اور فرد نہیں تھا۔ دراصل جناح کے خاندان میں دو افراد تھے، ایک بہن اور دوسرا پاکستان کا خواب۔

جناح کا قد تقریباً چھ فٹ تھا لیکن ان کا وزن بہ مشکل ایک سو بیس پونڈ تھا۔ ان کے چہرے کی جلد اتنی کھنچی ہوئی تھی کہ گالوں کی دونوں ہڈیاں خوب اُبھر آئی تھیں۔ وہاں کی جلد میں ایک عجیب سی چمک تھی، اُن کے بال سفید بھورے اور گھنے تھے۔

جناح نے اپنی زندگی کے سترہ سال ایک دانتوں کے ڈاکٹر کے ساتھ گزارے تھے۔

ان کی بہن دانتوں کی معالج تھیں، اس کے باوجود ان کے پیلے دانتوں کی سڑاند میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ جناح ہر وقت اتنے چوکس اور مستعد نظر آتے تھے جیسے وہ گوشت ہڈی کے بجائے فولاد کے بنے ہوئے ہوں، لیکن یہ فولادی وجود محض دکھاوا اور دھوکا تھا۔ اندر سے جناح کم زور، نازک اور بیمار آدمی تھے۔ اُن کے ڈاکٹر نے ایک بار کہا تھا کہ زندگی کے آخری برس انھوں نے قوت ارادی، وہسکی اور سگریٹوں پر گزارے۔

(آدھی رات کی آزادی: ص ۹۴ تا ۹۶)

پاکستان ریزولیوشن۔ مسئلے کا واقعی حل یا سودے بازی:

یہ مسئلہ کئی حوالوں سے زیر بحث آیا ہے کہ کیا پاکستان ریزولیوشن ہندوستان کے فرقہ وارانہ یا ہندو مسلم مسئلے کا واقعی حل تھا اور کیا اسے سوچ سمجھ کر اور مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈال کر سنجیدگی اور دیانت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا یا اسے محض سودے بازی کے لیے پیش کیا گیا تھا؟ کیا کسی نے یہ سوچا تھا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ ایک انگریز صحافی پنڈرال مون کے حوالے سے اس مسئلے کے بارے میں مرزا راشد علی بیگ صاحب لکھتے ہیں:

ایک انگریز پنڈرال مون نے جو پنجاب کے مسلمان لیڈروں سے کافی قریب اور ان کا معتمد تھا اپنی کتاب ''ڈوائیڈ اینڈ کویٹ'' میں لکھا ہے:

''نجی طور سے جناح نے لاہور میں ایک دو لوگوں سے کہا کہ یہ ریزولیوشن محض ایک شاطرانہ چال ہے اور یہ امر کہ وہ چھ برس بعد تقسیم سے کچھ کم پر بھی راضی نظر آتا تھا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں وہ حقیقتاً اس مسئلے پر آخری فیصلہ کن موڑ پر نہیں پہنچے تھے۔ اس لیے ایک حد تک یہ ایک شاطرانہ چال بھی ہو سکتی تھی جس کا مقصد کانگریس سے ایسی رعایتیں حاصل کرنا ہو جو پارٹنر شپ کو گوارا بنا دیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ریزولیوشن کے نتائج پر مجوزہ آزاد ریاستوں کی ہیئت ترکیبی پر اور ان کے باہمی روابط کے بارے میں اس مرحلے پر پوری طرح غور و خوض قطعی نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں بعض اُمور بعد میں صاف ہوئے، لیکن جناح صاحب پاکستان کے واقعی خدوخال کی وضاحت دینے کے سلسلے

میں بہت زیادہ مشتاق نہیں رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء تک بھی اس بارے میں کچھ شکوک رہے کہ بالآخر جناح صاحب اپنے تصورات کو عملی جامے میں کس انداز پر دیکھنا پسند کریں گے؟''

مون کا اس نتیجے پر پہنچنا کہ قوی امکان ہے کہ ریزولیوشن محض سودے بازی کے نقطۂ نظر سے منظور کیا گیا ہو، اس میں ان بیانات سے خاصی مطابقت ہے جو لاہور سے واپسی پر لیگی دوستوں نے میرے سامنے رکھے۔ تم بھی عجیب عقل مند آدمی ہو جو ریزولیوشن پر سنجیدگی سے غور کرنے بیٹھ گئے۔ ان لوگوں نے مجھ سے کہا تمھیں یہ نہیں معلوم کہ ہندو تو بنیے ہیں اور بنیا صرف یہی زبان سمجھ سکتا ہے؟ اور خود جناح صاحب؟ ان کے مقصد کی غیر لچک داری اور ارادے کی پختگی وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے، لیکن ۱۹۴۶ء کی جولائی کے پہلے ہفتے تک کی صورت حال یہ تھی کہ وہ ایک غیر متحدہ مرکز (یونین سینٹر) قبول کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ تھے۔ آخری فیصلہ تو جولائی ۱۹۴۶ء ہی کے دوسرے ہفتے میں انھوں نے کیا کہ پاکستان سے کم اب کچھ بھی نہیں اور اس کے اسباب تھے جن پر پھر گفتگو ہوگی۔

(محمد علی جناح: ص ۲۴-۲۳)

سودے بازی یا اصولی مانگ:

یکم مارچ ۱۹۳۹ء: سر محمد یامین خاں نے اپنی آپ بیتی، ''نامۂ اعمال'' میں ایک دعوت کی روداد لکھی ہے۔ یہ دعوت سر ضیاء الدین خاں نے کی تھی اور اس میں مسٹر محمد علی جناح، چودھری ظفر اللہ خاں، سید محمد حسین اور صاحبِ ''نامۂ اعمال'' کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس روداد کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جناح نے پاکستان کو مسلم لیگ کا کریڈ کب، کن حالات اور کس پس منظر میں بنایا تھا اور اس کا مقصد کیا تھا؟ نامۂ اعمال کا یہ ''سولھواں باب'' ہے اور اس کا عنوان ہے: ''پاکستان کو مسلم لیگ اپنا اصول بنائے'' اور ذیلی عنوان ہے: ''پاکستان کا خیال'' (ص ۲۶-۲۵۷) سر یامین خاں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ضیاء الدین نے لنچ پر مجھ کو، مسٹر جناح، سر ظفر اللہ خاں، سید محمد حسین بیرسٹر الہ آباد کو بلایا۔ میرے ایک طرف مسٹر جناح بیٹھے تھے اور دوسری طرف سر ظفر اللہ خاں۔ مسٹر جناح کے دوسری طرف سید محمد حسین تھے اور سر ظفر اللہ

خاں کے دوسری طرف ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔ لنچ کھاتے میں سید محمد حسین نے چیخ چیخ کر جیسی کہ ان کی عادت ہے کہنا شروع کیا کہ چودھری رحمت علی کی اسکیم کہ پنجاب، کشمیر، صوبۂ سرحد، سندھ و بلوچستان ملا کر بقیہ ہندوستان سے علاحدہ کر دیے جائیں۔ ان سے پاکستان اس طرح بنتا ہے کہ پ سے پنجاب الف سے افغان یعنی صوبۂ سرحدی، ک سے کشمیر، س سے سندھ، تان بلوچستان کا آخیر ہے۔ چوں کہ سید محمد حسین زور زور سے بول رہے تھے سر ظفر اللہ خاں نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ اس شخص کا حلق بڑا ہے مگر دماغ چھوٹا ہے۔ سر ظفر اللہ خاں ان کی مخالفت کرتے رہے کہ یہ ناقابل عمل ہے۔ مسٹر جناح دونوں کی تقریر غور سے سنتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے کہ اس کو ہم کیوں نہ اپنا لیں اور اس کو مسلم لیگ کا کریڈ بنائیں، ابھی تک ہماری کوئی خاص مانگ نہیں ہے۔ اگر ہم اس کو اٹھائیں تو کانگریس سے مصالحت ہو سکے گی، ورنہ وہ نہیں کریں گے۔ میں نے کہا کہ مغربی علاقے کے واسطے یہ کہہ رہے ہیں، مشرقی علاقہ کا کیا ہوگا؟ مسٹر جناح نے ذرا غور کیا اور بولے کہ ہم دونوں طرف کے علاقوں کو علاحدہ کرنے کا سوال اٹھائیں گے، بغیر اس کے کانگریس قابو میں نہ آئے گی۔ میں نے کہا ابھی کئی دن ہوئے کہ بھائی پرمانند نے یہی اندیشہ ظاہر کیا تھا اور آپ نے جواب ٹھیک دیا تھا۔ اگر بارگیننگ یعنی سودے بازی کے لیے یہ مسئلہ لیگ کا کریڈ یعنی اصولی مانگ بنا کر اٹھایا جائے تو پھر ہٹنا مشکل ہوگا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ ہم کانگریس کا ردعمل دیکھیں گے۔ اس پر یہ معاملہ ختم ہو گیا، چوں کہ یہ کھانے کی میز کی گفتگو تھی۔"

جنوری ۱۹۴۷ء: یہ روایت راجہ صاحب محمود آباد کی ہے جسے مختار مسعود نے "آواز دوست" میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جنوری ۱۹۴۷ء میں راجہ صاحب نے دل لگی میں قاید اعظم سے پوچھا کہ اگر پاکستان نہ بن سکا تو پھر کیا ہوگا؟"

قاید اعظم نے بہ قول راجہ صاحب جواب دیا کہ آسمان تو گرنے سے رہا۔

راجہ صاحب نے کہا: میں مذاق نہیں کر رہا!

قاید اعظم نے فرمایا: میں بھی مذاق نہیں کر رہا۔ جانتے ہو انگریزی میں دو حرف ہیں ایم اور ایل، ان سے لفظ مسلم لیگ بنتا ہے اور مائنارٹیز (اقلیت) لیگ بھی (لیکن یہاں نہ مسلم لیگ رہی اور نہ مائنارٹیز لیگ بنی البتہ ایم ایل سے مارشل لا ضرور مستقل شکل اختیار کر گیا) ہندوؤں کی قیادت برہمن اور بنیے کے ہاتھ میں ہے۔ ہم سب مل کر انھیں ناک چنے چبوا دیں گے۔

مسلم لیگ نے پاکستان نہیں بنایا۔ مسلم لیگ کہاں اتنی منظم تھی کہ اتنا بڑا کارنامہ سر انجام دے سکتی۔ اس ملک کی تعمیر کے عوامل کچھ اور ہی تھے۔ ہندوؤں کا زور اور ظلم، دفاتر کے مسلم عملے کی طلب جاہ و مرتبہ اور مسلم تاجر کی حرص و ہوا۔

راجہ صاحب اب کہانی کے آخری حصہ پر پہنچ چکے تھے۔ یہ حصہ ان کی اپنی ذات کے متعلق تھا۔ آواز آہستہ آہستہ اونچی ہوتی گئی اور نہایت سخت اور درشت لہجے میں وہ بعض معاملات میں اپنی ناراضگی کا اظہار فرمانے لگے۔ میں واقف حال ہوں، کچھ کہنا چاہتا ہوں تو میرا منہ نوچ لیا جاتا ہے۔

پاکستان کا نہ کوئی حامی تھا نہ خواہاں:

مسٹر سری پرکاش پاکستان کی نئی مملکت میں ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر مقرر ہوئے تھے۔ وہ یہاں دو برس تک اپنے ملک، ہندوستان کے لیے سفارتی خدمات سر انجام دیتے رہے۔ اس عہدے سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے واپس ہندوستان جا کر اپنے قیام پاکستان کے مشاہدات، تجربات اور واقعات پر مبنی مضامین کا ایک طویل سلسلہ روز نامہ ''ہندوستان ٹائمز'' میں لکھا تھا، بعد میں یہ انگریزی، ہندی اور اردو زبانوں میں کتابی شکل میں شایع ہوا۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کا اردو نسخہ ہے، جس میں مسٹر محمد ایوب کھوڑو صوبہ سندھ کے پہلے وزیر اعظم کے حوالے سے حیرت انگیز انکشاف کیا گیا ہے۔ مسٹر سری پرکاش نے صوبہ سندھ میں اقلیتوں کے حالات جاننے کے لیے سندھ کے وزیر اعظم کے ہم راہ صوبے کے اندرون کا تفصیلی دورہ کیا تھا۔ اس دوران ان کی گفتگو کے بعض متعلقہ حصے

یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

’’میں نے اور مسٹر کھوڑو نے یہ دورہ بہت دور تک کیا اور باہم دل کھول کر باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے کہا در اصل نہ تو کوئی تقسیم ملک کا حامی تھا اور نہ مستقل پاکستان کا خواہاں۔ وہ کہنے لگے کہ میں خود مسلم لیگ کے اندرونی حلقے کا ممبر تھا اور اصل واقعہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ پاکستان کا مطالبہ محض سودے بازی تھا تاکہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کو مزید حقوق و مراعات حاصل ہوجائیں۔‘‘

پاکستان - دور تشکیل

دو اور تین جون ۱۹۴۷ء

۲/جون ۱۹۴۷ء صبح کا وقت ہندوستان کے سات لیڈروں نے وایسرائے کی مطالعہ گاہ میں قدم رکھا۔ وہ سات لیڈر اس مسودے کا جایزہ لینے آئے تھے جس کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن خود لندن جا کر اٹلی حکومت اور ونسٹن چرچل کی رضامندی حاصل کر کے آئے تھے۔ اس مسودے کی بنیاد پر ملک کو دو ٹکڑوں میں بانٹ کر ایک ٹکڑا اس کو اور ایک ٹکڑا اس کو دیا جانا تھا۔ صرف ۴۸ گھنٹے قبل وایسرائے لندن کی منظوری حاصل کر کے دہلی واپس آئے تھے۔

کمرے کے درمیان رکھی گول میز کے چاروں طرف لیڈر ایک ایک کر کے بیٹھنے لگے۔ کانگریس کی نمایندگی کر رہے تھے نہرو، پٹیل اور صدر کی حیثیت سے آچاریہ کرپلانی۔ مسلم لیگ کے نمایندے تھے جناح، لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن دیوار کی طرف بیٹھے تھے۔ ان کے دو مشیر ساتھ تھے، لارڈ اسے اور اریک سیلویل۔ سرکاری فوٹوگرافر اس تاریخی موقع کی تصویریں بڑی تیزی کے ساتھ لے رہا تھا۔

سب کے چہروں پر گہری سنجیدگی تھی، فضا پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا، وایسرائے بن کر دہلی آنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے پہلی بار بند کمرے میں لیڈروں سے الگ الگ ملنے اور دوستانہ انداز میں بات کرنے کے بجائے کھلی گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے باوجود ماؤنٹ بیٹن نے طے کیا تھا کہ جو کچھ کہا جانا ہے وہ خود کہیں گے۔ اگر ہر آدمی کو بولنے کا موقع دیا گیا تو یہ مجلس شور مچانے کا مقابلہ بن جائے گی۔ ماؤنٹ بیٹن اس خطرے سے دور رہنا چاہتے تھے۔

انھوں نے مختصراً یہ بتایا کہ تقسیم کی اس تجویز کے بارے میں انگلستان کے کس لیڈر سے کیا بات ہوتی؟ انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اس پر انتہائی عجلت سے کام کرنا

ہے، وقت بہت کم ہے، ہر شخص کو اس تجویز میں کوئی نہ کوئی ایسا حصہ ضرور مل جائے گا جس سے اسے اتفاق نہ ہو لیکن غور کرتے وقت ہمیں حصوں کے بجائے مجموعی طور پر تجویز ذہن میں رکھنا چاہیے۔ تب ہی تجویز کا مقصد ابھر کر ہمارے سامنے آئے گا اور ہم فضول بحثوں میں الجھنے کے بجائے تیزی سے آگے بڑھ سکیں گے۔

کل صبح میں آپ سے پھر ملنا چاہوں گا۔ وائسرائے نے کہا:

"اس سے پہلے آدھی رات تک اگر آپ تینوں پارٹیاں مجھے یقین دلا دیں کہ آپ اسے قبول کرنے کو تیار ہیں تو آخری سمجھوتے کی بنیاد بن جائے گی۔ اس کے بعد میری تجویز یہ ہے کہ اس بات کی خبر دنیا کو دینے کے لیے آل انڈیا ریڈیو سے اعلان کر دیا جائے۔ اُدھر لندن ریڈیو سے کلیمنٹ اٹیلی ہمارے فیصلے کی منظوری کا اعلان کر دیں گے۔"

ماؤنٹ بیٹن نے اپنی بات ختم کی، کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔

اس سکوت کو ماؤنٹ بیٹن نے توڑا۔

حضرات! میں آدھی رات تک آپ کے ردِ عمل کا انتظار کروں گا۔

(آدھی رات کی آزادی: ص ۳۰-۱۲۹)

کانگریس نے اپنا پیغام بھجوا دیا کہ انھیں ملک کے بٹوارے کی تجویز منظور ہے۔ سکھوں کی منظوری بھی وائسرائے کو حاصل ہو چکی تھی۔ معاملہ اگر اٹکا تو کہاں اٹکا؟ محمد علی جناح پر۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جناح کا بھی آج مون برت ہے۔

برس ہا برس سے جناح نے جو خواب دیکھے تھے ان کے پورے ہونے میں اب صرف اتنی دیر تھی کہ وہ "ہاں" کہہ دیں، لیکن نہ جانے وہ کون سی پراسرار وجہ تھی جس کی بہ دولت وہ تقسیم کی اس تجویز پر "ہاں" نہیں کہہ پا رہے تھے۔ ان کی ساری زندگی "نہیں" کہنے میں گزری تھی اور "نہیں" ان کے دماغ میں اس حد تک بیٹھ چکی تھی کہ اب جب سب کچھ ان کے حق میں تھا تو جناح کے ہونٹوں سے "ہاں" نہیں نکل رہا تھا۔

ان کا ایک ہی کہنا تھا کہ تقسیم کے اس مسودے پر جب تک مسلم لیگ کی کونسل میں غور نہیں ہو جاتا میں اکیلا اسے منظور نہیں کر سکتا اور کونسل کے اراکین کو دہلی بلانے کے لیے کم

سے کم ایک ہفتے کا وقت چاہیے۔

اس وقت تک جناح کے ساتھ جتنے مذاکرات ہوئے تھے ان میں وایسرائے کو ہمیشہ مایوسی ہوئی تھی۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ جناح پاکستان چاہتے تھے وہ ان کو دیا جا رہا تھا۔ کانگریس نے مان لیا۔ سکھوں نے اسے حلق کے نیچے اتار لیا۔ عین وقت پر جناح کی طرف سے اڑنگا ڈالنے کا کیا مطلب؟

کانگریس اور سکھوں کو اگر ذرّہ برابر شبہ ہوا کہ جناح صرف اس لیے ٹال مٹول کر رہے ہیں کہ انھیں اپنی ایک آدھ شرط منوانی ہے تو سمجھوتے کی اتنی بڑی عمارت جو اتنی پریشانیوں کے بعد کھڑی کی گئی ہے اسے زمین دوز ہونے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگے گا۔

جناح اپنی بات پر اڑے ہوے تھے، مگر مسلم لیگ کی طرف سے میں اکیلا کیسے حامی بھر سکتا ہوں، میں تنہا تو مسلم لیگ نہیں ہوں؟

ماؤنٹ بیٹن کے لیے اپنی مایوسی اور غصے کو دبانا مشکل ہو گیا۔ انھوں نے صفائی سے کہا:

''دیکھیے مسٹر جناح! دنیا میں آپ کہیں بھی جایے اور کچھ بھی کہیے، مجھے کوئی سروکار نہیں، لیکن کم سے کم میرے سامنے ایسا مت کہیے کہ آپ ہی مسلم لیگ نہیں ہیں۔''

جناح اپنی ضد سے ہلے نہیں۔ یہ معاملہ قانون کا ہے اور میں غیر قانونی ''ہاں'' نہیں کہہ سکتا۔

اب ماؤنٹ بیٹن نے اپنے تیور بدل لیے۔

''مسٹر جناح! اب میں آپ سے ایک خاص بات کہنے جا رہا ہوں۔ اس ٹال مٹول سے پاکستان کا آپ کا خواب ہمیشہ کے لیے ٹوٹ سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اتنا زبردست نقصان آپ صرف اس لیے اٹھائیں کہ آپ کے منہ سے ایک چھوٹا سا لفظ ''ہاں'' نہیں نکل سکا۔ جس چیز کو پانے کے لیے آپ نے اپنی تمام عمر داؤں پر لگا دی اسے آپ پانے سے پہلے پھینک دینا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ اس تجویز کو آپ کی طرف

سے میں خود منظور کر دوں۔"

کس طرح؟ جناح نے حیرت سے پوچھا:

"کل جب جلسہ ہوگا تو میں یہ کہوں گا کہ کانگریس کا جواب چند برائے نام ترمیمات کے ساتھ مل گیا ہے۔ جن کے بارے میں انھیں مطمئن کر دوں گا۔ سکھوں نے تجویز منظور کر لی ہے۔ اس کے بعد یہ کہوں گا کہ کل رات مسٹر جناح کے ساتھ میری بہت طویل دوستانہ گفتگو ہوئی۔ ہم نے تجویز کی باریکیوں پر تفصیل سے غور کیا اور مسٹر جناح نے مجھے ذاتی طور پر پورا یقین دلایا کہ تجویز انھیں پسند ہے۔ اس جملے کے ساتھ میں آپ کی طرف گھوم کر دیکھوں گا اور مجھ سے نظر ملنے کے بعد میں نہیں چاہتا کہ آپ کچھ بولیں، میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ کانگریس آپ کو کچھ بولنے کے لیے مجبور کرے، آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے، مجھ سے نظر ملنے کے ساتھ آپ کو سر ہلا کر "ہاں" کہہ دینا ہے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔ کانگریس اور سکھوں کے دل میں آپ کے متعلق شکوک پیدا ہوں گے اور وہ اس تجویز کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں گے، پھر میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ سب خاک میں مل جائے گا۔ یہ دھمکی نہیں میری پیش گوئی ہے۔" (ایضاً: ص ۱۳۳-۱۳۲)

یہ بات بہت کم لوگوں نے سوچی ہے کہ مسٹر محمد علی جناح کو تقسیم کے عمل سے اب ٹال مٹول کیوں تھی؟ صوبوں کی تقسیم کے اصول کو انھوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ ۲۲ رمئی کو مسٹر ماؤنٹ بیٹن انگلینڈ گئے تھے تو تقسیم کے منصوبے سے ان کی رضامندی معلوم کر کے گئے اور ان کے جانے کے چند ہی دن بعد ان کے سکریٹری نے منصوبے سے جناح صاحب کی تحریری منظوری حاصل کر کے ماؤنٹ بیٹن کو بہ ذریعہ ڈاک انگلینڈ بھیجی تھی۔ یہ رائے اور رضامندی انھوں نے لیگ کی عاملہ اور کونسل کو اعتماد میں لیے بغیر ظاہر کر دی تھی اور اب جب کہ وہ انڈیا آفس اور گورنمنٹ کی منظوری لے کر آئے تھے تو جناح صاحب اسے ماننے سے انکار کر رہے تھے اور کاروبارِ سیاست کو آگے بڑھانے کی اجازت دینے میں کونسل کی اجازت کی رکاوٹ کا عذر پیش کر رہے تھے۔ حال آں کہ دنیا جانتی ہے کہ کسی فیصلے کے لیے وہ کبھی کونسل

کی اجازت کے پابند نہیں رہے تھے۔ ہمیشہ کونسل ہی نے ان کے فیصلے اور اقدام کی پیروی کی تھی اور ایک بار نہیں بار بار ایسا ہوا کہ ورکنگ کمیٹی اور کونسل نے تفصیلی بحث میں جانے اور مشترکہ، متفقہ فیصلے کی مضبوط بنیاد تلاش کرنے سے پہلے ہی اپنے رہنما کو مزید اقدامات کی اجازت دے دی تھی۔ یہاں بھی انھوں نے کونسل میں اپنے اقتدار اور امر کی قوت سے انکار نہیں کیا، البتہ ضد پر اڑے رہے اور جب انھوں نے یہ کہا تھا کہ ''پاکستان میں نے اور میرے ٹایپ رائٹر نے بنایا ہے۔'' تو اس کا مطلب یہی تھا کہ مسلم لیگ کی کل سیاست ان کی زبان، ان کے حکم کا کرشمہ اور اس کی نام نہاد تحریک پاکستان اور اس کا کارنامہ۔'' پاکستان کا قیام' ان کے ٹایپ رائٹر کا رہینِ منّت ہے! مسٹر ماؤنٹ بیٹن کا یہ کہنا: دیکھیے مسٹر جناح! دنیا میں آپ کہیں بھی جایے اور کچھ بھی کہیے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، لیکن میرے سامنے ایسا مت کہیے کہ آپ ہی مسلم لیگ نہیں ہیں!

مسٹر محمد علی جناح آخر تک اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اگرچہ ماؤنٹ بیٹن نے جو فیصلہ کرلیا تھا اس نے وہی کیا اور وہ کیا چیز تھی جس نے مسٹر محمد علی جناح کو اپنی اس درجے بے عزتی برداشت کرنے پر مجبور کردیا تھا؟ ماؤنٹ بیٹن نے اگرچہ کہا یہی تھا کہ یہ دھمکی نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ دھمکی ہی تھی اور جناح صاحب جو اس وقت تک نہ کسی قوت کے سامنے جھکے تھے نہ کسی سے دبے تھے ماؤنٹ بیٹن سے ایسے متاثر ہوئے کہ جس طرح اس نے کہا تھا ٹھیک اسی طرح ایک عظیم الشان مجمع کے سامنے انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کے حکم کے مطابق سر ہلا کر قیام پاکستان کی منظوری دی۔ اگرچہ سر کی وہ جنبش اتنی خفیف تھی کہ موجود افراد کو بہ مشکل اس کا اندازہ ہوسکا، لیکن بعدازاں تو دنیا میں اسی کی شہرت ہوئی اور تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ ہمیش کے لیے اس بے عزتی کا نقش ثبت ہوگیا۔

مسٹر جناح کی غیرت، خودداری، احساس خودی، عزت نفس، بے خوفی، بہادری، حق گوئی، حقیقت شعاری، نہ دبنے اور لچکنے اور کسی سے متاثر نہ ہونے والی شخصیت کے جو انمنٹ محاسن ہمیشہ سنے گئے تھے اس تمام شہرت کے باوجود آزمائش کے اس خاص مقام پر وہ شخصیت دہکتے ہوئے انگارے سے یک دم راکھ کا ڈھیر بن گئی کہ بس سمجھ میں نہ آنے والا ایک معمہ ہے، جسے ۶۳ برس کے بعد حل تو نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ذہن میں

سوالات اُٹھتے ہیں۔

(۱) شاید امت مرحومہ اور پاکستان کے مطالبے کے خلاف جب کہ اس کا حصول صرف ان مرحوم کے ''ہاں'' کہہ دینے پر موقوف تھا، سبوتاژ کرنے کی کوئی سازش ہوئی تھی، جسے وہ اپنی خاموشی، عدم تعاون سے ناکام بنادینا چاہتے تھے اور کونسل کے ارکان پہلے اغوا کر لیے گئے تھے، جن سے تعاون اور نصرت کی انھیں کوئی امید نہ تھی۔

(۲) اس مقام تک پہنچتے پہنچتے مسٹر ماؤنٹ بیٹن کی سیرت منافقت اور سازشی رویہ جناح صاحب پر واضح ہو گیا اور وہ اس کی اعانت سے یک سر الگ ہو جانا چاہتے اور اس کی اسکیم کو ناکام بنادینے کا عزم کر لیا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ لیگ کی کونسل پر اعتماد نہ تھا، عام مسلمانوں میں شعور نہ تھا۔ اور کانگریس پہلے ہی سے دشمن بنی ہوئی تھی۔ وقت نکلا جا رہا تھا اور سر رشتۂ فکر ہاتھ میں نہ تھا۔

(۳) یہ خیال بھی ذہن میں آیا کہ ساٹھ سالہ سیاسی زندگی میں کتنے ہی نشیب و فراز آئے، کئی موقع پر خیالات میں تبدیلی رونما ہوئی، انداز سیاست بدلا۔ ایک اعلا دماغ، مفکر و مبصر شخصیت کے لیے جس کا ذریعۂ معاش سیاست یا کوئی اور شغل نہ ہو، خیالات کے بدلنے کا اعلان کر دینے میں اسے کیا باک ہو سکتا ہے۔ جس کے قوم و ملت اور ملک وطن کا مفاد ہو وہ اسی مفاد کی خاطر کسی نئی فکر اور نئی منزل کے سفر میں اس کے لیے کیا چیز رکاوٹ بن سکتی ہے اور کسی راہ حق کا دکھادینا تو خدا کا کام ہے اور وہی تغیر و انقلاب کی ہمت اور کسی عمل کی توفیق بھی دیتا ہے۔ یہ کیوں نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ کسی غلط راہ پر چلنے سے قدم کو روک کے اور نئی دریافت ہونے والی راہ حق و سعادت پر دوڑا دے!

(۴) کہیں ایسا تو نہ تھا کہ جناح صاحب کی عاملہ اور کونسل کا ان پر سے اعتماد اُٹھ گیا ہو۔ انھوں نے ہمیشہ ان پر حکم ہی چلایا تھا۔ اپنے رفقاے سیاست کی حیثیت سے انھیں کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ ان کی رائے کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ ان کی شخصیت کا کسی درجے میں کبھی احترام نہیں کیا۔ ان کی پذیرائی کے لیے اپنے دل کے دروازے ہی کو نہیں گھر کے دروازے کو بھی نہیں کھولا۔ ان کی ڈائننگ ٹیبل پر کبھی ان کا کوئی دوست نہیں دیکھا گیا۔ اپائنٹمنٹ کے بغیر کسی کو دروازے پر دستک دینے کی اجازت نہ تھی۔ اب ملک کی قسمت کا

فیصلہ لکھا جا رہا تھا۔ تقسیم پنجاب و بنگال سے مشروط آزادیٔ وطن کے منصوبے کی منظوری لینے کے لیے ماؤنٹ بیٹن انگلینڈ روانہ ہو چکے تھے۔ لیگ کے صدر اس کی منظوری دے چکے تھے اور ضرورت محسوس ہوئی تو ماؤنٹ بیٹن کے سیکریٹری نے جناح صاحب کو اپنے دفتر میں بلا کر ان سے تحریری منظوری حاصل کی اور دوسرے روز ہی اس کارروائی کی تشہیر کے لیے نیوز اخبارات کو جاری کر دی گئی تھی۔

گویا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جس قسم کی تقسیم کو اپنے خیال و مفاد میں ضروری سمجھتے تھے اس کے لیے مسٹر جناح کو مجبور کر دیا گیا تھا۔

ایک ضمنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا پنڈت نہرو اور بلدیو سنگھ سے بھی تحریری منظوری لی گئی تھی؟ اگر سفر اختیار کرنے سے پہلے ان کی منظوری حاصل کر لی گئی تھی تو اسی وقت لیگ کے صدر کی منظوری بھی کیوں نہ حاصل کر لی تھی؟ اور اگر ان کی تحریری منظوری کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی تو پھر مسٹر جناح کی تحریری منظوری کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ پھر یہ کہ سیکریٹری کا اپنے دفتر میں بلا کر منظوری حاصل کرنا تو سراسر ان کی توہین کے مترادف تھا، پھر منصوبے کو عوام سے چھپایا گیا تھا اور مسٹر جناح سے تحریر حاصل کرنا اور اسی راز کا ایک حصہ تھا تو پھر اس کی تشہیر کا کیا مقصد تھا؟ اور سیکریٹری کو کیوں کر یہ جرأت ہوئی کہ وہ اسے نیوز بنا کر اخبار کو جاری کر دے؟ کیا حکومت کو شبہ ہو گیا تھا اور ماؤنٹ بیٹن کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ مسٹر جناح اپنی زبانی منظوری سے پھر بھی جائیں گے، اس لیے تحریر حاصل کر لینا چاہیے؟ اگر جناح صاحب کی ذات سے ایسا خطرہ پیدا ہو گیا تھا تو اس کے اسباب کیا تھے؟ یہ ایسے راز ہیں جن سے ابھی پردہ نہیں اٹھا ہے اور شاید یہ پردہ کبھی اُٹھ بھی نہ سکے! بہ ہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ

(۱) جناح صاحب سے تحریری اجازت لینا۔
(۲) اس کارروائی کے لیے انھیں سیکریٹری کے دفتر میں بلایا جانا۔
(۳) اور اس کارروائی کی اخبارات کے ذریعے تشہیر کرنا۔

مسلم لیگ کے صدر کی کھلی اور دانستہ توہین تھی، لیکن کیا اس وقت کسی لیگی کے ذہن میں یہ بات بھی آئی تھی کہ لیگ کے سب سے اہم اور محترم ادارے کی بھی یہ توہین ہے کہ

لیگ کا سربراہ ضابطے کی کارروائی کی تکمیل کے لیے بھی جھوٹے منہ ان سے منظوری نہ لے اور اتنے اہم مسئلے پر جناح صاحب کو بھی اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب ماؤنٹ بیٹن نے ان کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھ دی تھی!

اگر ایسا ہوا ہوتا تو کیا ایک ضابطے کی کارروائی سے روکنے کی ماؤنٹ بیٹن جرأت کر سکتے تھے؟ ذرا آپ ماؤنٹ بیٹن کے اس جملے کی کاٹ پر تو غور فرمایے:

''دیکھیے مسٹر جناح! دنیا میں آپ کہیں بھی جایے اور کچھ بھی کہیے، مجھے کوئی سروکار نہیں، لیکن کم سے کم میرے سامنے ایسا مت کہیے کہ آپ ہی مسلم لیگ نہیں ہیں۔''

کیا یہ حقیقت نہیں تھی؟ کیا یہ خیال کمیٹی اور کونسل والوں کے دل میں نہیں آیا ہوگا کہ جناح صاحب نے انھیں ''لیس مین'' سمجھ رکھا ہے اور وہ انھیں کھوٹے سکے کہتے ہیں اور جیسا کہ بعد میں انھوں نے دو روایات کے مطابق کہا کہ ''پاکستان میں نے اور میرے ٹایپ رائٹر نے بنایا!'' تو کیا یہ ان مشارالیہم کے لیے کچھ کم توہین آمیز ہے؟ حقیقت یہی معلوم دیتی ہے کہ پہلے ماؤنٹ بیٹن کو زبانی تقسیم کی اجازت دینا اور پھر تحریر میں اجازت دینا ان بزرگوں کو ناگوار اور حد درجے ناقابل برداشت گزری اور اس حلقے میں اس پر غم و غصہ کی خبر مسٹر جناح کی سماعت سے دور نہ رہی ہوگی۔ اب وہ چاہتے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن کو جواب دینے اور منصوبے کے اعلان سے پہلے کونسل سے منظوری حاصل کر کے اپنے ناراض اور بگڑے ہوئے رفقائے سیاست کو منالیں! لیکن ماؤنٹ بیٹن کی مجبوری یہ تھی کہ یہ ۲رمئی کی بات ہے اور ۳رمئی کو وہ منصوبے کے اعلان کا فیصلہ کر چکے تھے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ مسٹر ماؤنٹ بیٹن کو فتح ہوئی، اس کا جبر غالب آیا، اس نے من مانی کی اور مسٹر محمد علی جناح کو شکست کا، ذلت کا اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر ماؤنٹ بیٹن چاہتے تو اس اعلان کو ہفتے عشرے بعد بھی کر سکتے تھے۔ کوئی قیامت ٹوٹ نہیں پڑ رہی تھی۔

ایک تاریخی کانفرنس — ۳رجون ۱۹۴۷ء:

ہندوستان میں انگریزی راج کی تاریخ میں یہ دوسرا موقع تھا جب وایسرائے نے

پریس کانفرنس کی تھی، اس میں تین سو اخبار نویسوں نے شرکت کی۔ ان میں دنیا کے تمام ملکوں کے اخبار نویس شامل تھے۔

ماؤنٹ بیٹن نے مشکل سے دو مہینوں کے مختصر عرصے میں ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا، اس لیے ان کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔

وایسرائے کی تقریر ختم ہوتے ہی ہال تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔

سوالوں کی جھڑی لگ گئی۔ ہر سوال کا جواب ماؤنٹ بیٹن کی زبان پر تھا۔

آخری سوال ایک ہندوستانی اخبار نویس نے کیا: ''کیا آپ نے اختیارات منتقل کرنے کی کوئی تاریخ سوچ رکھی ہے؟''

بے شک! ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا۔ کیا وہ تاریخ آپ ہمیں بتا سکتے ہیں؟

وایسرائے کے دماغ میں کئی تاریخیں گھوم گئیں۔ وہ صرف یہ جانتے تھے کہ جو کچھ ہونا ہے جلد سے جلد ہونا ہے۔ کوئی تاریخ انھوں نے طے نہیں کی تھی۔ وہ سوچنے لگے کہ اخبار نویسوں کو کون سی تاریخ بتائی جائے؟ اچانک ایک تاریخ وایسرائے کے سامنے اُبھر آئی۔ اس تاریخ کو حکومت جاپان نے بلاشرط ہتھیار ڈالے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کے نزدیک اس سے بہتر کوئی تاریخ نہیں ہو سکتی تھی۔

ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کر دیا کہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو اختیارات ہندوستانیوں کو منتقل کر دیے جائیں گے۔

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کا اعلان کر کے ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ یہ اعلان اتنے ڈرامائی انداز سے ہوگا۔

۲، ۳/جون کی تاریخی کارروائی

مسٹر جناح کے مصنف ہیکٹر بولائیتھو کی تائید:

۲/جون ۱۹۴۷ء: پاکستان کی سرکاری تالیف ''محمد علی جناح'' از ہیکٹر بولائیتھو میں ۲/جون کی کارروائی کو کیمپ بیل جانسن کے حوالے سے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

دوسری جون کو وایسرائے اور ہندوستانی لیڈروں کی ملاقات دو گھنٹے تک جاری رہی۔

وہاں ان سب نے حکومت کے منصوبے کا مطالعہ کیا اور ان پر اس کا جو اثر ہوا وہ کیمپ بیل جانسن نے اپنی کتاب میں یوں بیان کیا ہے:

''پنڈت نہرو نے کہا کہ کانگریس اس تجویز سے پوری طرح متفق نہیں، لیکن اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد وہ اسے قبول کر لے گی۔''

قاید اعظم نے کوئی قطعی بات نہ کی اور یہ شرط لگائی کہ انھیں یہ تجویز مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور (مسلمان) قوم کے سامنے منظوری کے لیے پیش کرنا ہوگی۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ان کا منشا یہ نہیں کہ حکومت کا منصوبہ ناکام ہو جائے، بلکہ ان کی دلی خواہش ہے کہ اپنی مجلس عاملہ کو یہ تجویز قبول کرنے پر آمادہ کر لیں۔ انھوں نے وایسرائے کو یقین دلایا کہ وہ اس مقصد کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اب ایک دفعہ پھر کپلنگ کی نصیحت کو نظر انداز کر دیا اور اس مشرقی قوم کو تیزی سے آزادی کی منزل کی طرف بڑھانا چاہا۔ اس مرتبہ بھی وہ کامیاب رہے۔ انھوں نے کانگریس، لیگ اور سکھوں کے نمایندوں کو ہدایت کی کہ وہ آدھی رات تک وایسرائے کو اپنی اپنی جماعت کے فیصلے سے مطلع کر دیں۔ تینوں جماعتوں کے رہنماؤں نے وایسرائے کی ہدایت کی تعمیل کی۔ جناح بہ ذاتِ خود وایسرائے محل پہنچے، لیکن وہاں انھوں نے جو گفتگو کی اس سے خاصی مشکل پیدا ہو گئی۔ کیمپ بیل جانسن لکھتے ہیں کہ وایسرائے کے انتہائی اصرار کے باوجود قاید اعظم اپنی اس بات پر اڑے رہے کہ جب تک مسلم لیگ کوئی فیصلہ نہ کرے وہ منصوبے کی منظوری کا پکا وعدہ نہیں کر سکتے۔ اس موقعے پر پھر انھوں نے اسی طرح احتیاط سے اور نپی تلی بات کی، جیسے وکالت کے زمانے میں ججوں کے سامنے کیا کرتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مسلم لیگ کے آئین کی رو سے کونسل کی منظوری کے بغیر وہ اس معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں۔

جناح کا یہ رویہ دیکھ کر ماؤنٹ بیٹن نے بھی ذرا سخت لہجہ اختیار کیا اور کہا:

''اگر آپ اسی وقت کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتے تو کانگریس اور سکھوں کے نمایندے بھی کل صبح کے اجلاس میں ہمارا منصوبہ مسترد کر دیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو تمام ملک میں ابتری پھیل جائے گی اور مجھے ڈر ہے کہ اس افراتفری میں کہیں

آپ پاکستان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔"

اس پر قاید اعظم نے اپنے شانوں کی جنبش سے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا

"ہر چہ بادا باد"

اس کے بعد وایسرائے نے قاید اعظم سے ایک آخری استدعا کرتے ہوئے کہا:

"مسٹر جناح! اس منصوبے کی تیاری پر بہت محنت کی گئی ہے اور میں آپ کو یہ اختیار نہیں دے سکتا کہ آپ بنا بنایا کھیل بگاڑ دیں اور یہ ساری محنت رائیگاں جائے۔ اگر آپ مسلم لیگ کی طرف سے منصوبہ منظور نہیں کرتے تو میں خود اپنی ذمے داری پر یہ اعلان کردوں گا کہ منصوبہ مسلم لیگ کو بھی قبول ہے۔ اگر بعد میں آپ کی کونسل نہ مانے تو آپ سارا الزام میرے سر ڈال دیں، میں بھگت لوں گا۔"

پھر ماؤنٹ بیٹن نے سختی سے جناح کو ہدایت کی کہ

"کل صبح کے اجلاس میں میں سب کے سامنے کہوں گا کہ مسٹر جناح نے لیگ کی طرف سے مجھے پورا اطمینان دلایا ہے اور مجھے یقین ہے کہ لیگ کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی اور جب میں یہ کہوں تو آپ ہرگز میری تردید نہ کریں۔ پھر جب میں آپ کی طرف دیکھوں تو آپ سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کریں۔"

قاید اعظم نے یہ تجویز مان لی اور اس پر ماؤنٹ بیٹن نے ان سے یہ آخری سوال پوچھا:

"کیا میں مسٹر ایٹلی کو یہ مشورہ دے دوں کہ وہ پارلیمنٹ میں منصوبے کی منظوری کا اعلان کردیں؟"

جناح اس پر بھی راضی ہو گئے۔ (محمد علی جناح: ہیکٹر بولا ئیتھو، ص ۸۲-۲۸۰)

.....اور پاکستان بن گیا!

تقسیم پنجاب و بنگال کا فیصلہ اور اس پر ردِ عمل

تقسیم پنجاب سے مسٹر جناح کی رضامندی:

۲۲ر مئی ۱۹۴۷ء: جیسے کہ لندن روانگی سے پیشتر وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خاں سے کہا تھا کہ لیگ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بارے میں اپنی رائے سے میرے سیکرٹری کو مطلع کر دے، وہ مجھے لندن بھیج دے گا۔ ۲۲ر مئی کو قاید اعظم نئی دہلی وائسرائے کے سیکرٹری سے ملے۔ دونوں کے درمیان ملاقات پر کیا طے ہوا؟ وائسرائے کے سیکرٹری نے جواب میں کیا کہا؟ یہ سب صیغۂ راز میں رہا۔ البتہ سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور نے دوسرے روز انکشاف کیا کہ وائسرائے کے سیکرٹری سر ایرک میویل نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمایندے کو بتایا کہ مسٹر جناح سے ملاقات کا مقصد ماؤنٹ بیٹن کے دستوری پلان پر مسٹر جناح کے دستخط حاصل کرنا تھا۔ اس گفتگو کے دوران وائسرائے کے سیکرٹری نے کہا کہ مسٹر جناح نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے اتفاق کر لیا ہے۔

(روزنامہ آزاد: ۲۳ر مئی ۱۹۴۷ء)

پنجاب کی تقسیم اور لیگ کی رضامندی پر پنجاب کا ردِ عمل:

۳۱ر مئی ۱۹۴۷ء: احرار، سوشلسٹ پارٹی پنجاب اور کسان ورکرز نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے فیصلۂ تقسیم پنجاب اور بنگال کی تجویز کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ یہ تجویز کانگریس کے اصولوں کے منافی ہے۔

مجلسِ احرار کے ترجمان اخبار نے ''پنجاب کو تقسیم سے بچاؤ'' کے زیرِ عنوان مقالہ سپرد قلم کرتے ہوئے تقسیم ہند منصوبے کے اعلان سے صرف تین یوم قبل انتباہ کیا:

''.....ہمیں تقسیم پنجاب اور بنگال میں سخت خسارہ نظر آ رہا ہے۔ جہاں تک

پنجاب کا تعلق ہے ہمارے حصے میں پس ماندہ اور ریگستانی علاقے آ رہے ہیں اور ہمارا بہترین خطہ ہم سے زبردستی چھینا جا رہا ہے۔
تقسیم کے رد و قبول کا مسئلہ میز پر بیٹھ کر طے نہ ہو سکے گا۔ مسلمانانِ ہند عموماً اور مسلمانانِ پنجاب خصوصاً معاملے کی نزاکت کو سمجھ لیں۔ انھیں اپنے دل کی بات رہنماؤں کے سامنے کہہ دینی چاہیے۔ ہمارے رہنما مانیں یا نہ مانیں، وہ اس وقت دوراہے پر کھڑے ہیں۔ رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ جھوٹے وقار اور سابقہ اعلانات کو پس پشت ڈال کر معاملے کی نوعیت کو از سرِ نو سمجھیں۔ کروڑہا مسلمانوں کی تقدیر بننے اور بگڑنے کا آخری مرحلہ آن پہنچا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مسلمان قوم کسی ایسے خسارے میں پڑ جائے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو۔"

لاہور کے ایک اور روزنامہ "انقلاب" نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں صوبائی تقسیم کے مہیب خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے تین اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ معاصر مذکور نے لکھا:

"(الف) پاکستان مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ آبادی کی آزادی پر مبنی ہے، لیکن پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے کم و بیش ایک کروڑ سے زاید مسلمان پاکستان سے منقطع ہو جائیں گے۔
(ب) سترہ اور بارہ ضلعوں کے علاقے اقتصادی، انتظامی، دفاعی اور ارتقائی نقطۂ نگاہ سے بالکل بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔
(ج) اس طرح فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہ ہوگا بلکہ اس صورت میں بہ درجہا خراب تر صورت اختیار کر لے گا۔"

۳ر جون پلان تقسیم ہند منصوبے پر مجلسِ احرار نے ۱۲ر جون ۱۹۴۷ء کو ایک متفقہ قرار داد میں اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا:

"آل انڈیا مجلسِ احرار کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس ۳ر جون کے برطانوی اعلان کو اقوام ہند خصوصاً مسلمانانِ ہند کے لیے انتہائی خطرناک تصور کرتا ہے۔ یہ اسکیم ہندوستان میں رہ جانے والے کروڑوں مسلمانوں کے لیے

نہایت نقصان دہ ثابت ہوگی اور پاکستان کو فوجی اور اقتصادی اعتبار سے
یورپین اقوام کا محکوم بنا دے گی۔
تقسیم پنجاب اور بنگال کا مسئلہ پاکستان اور ہندوستان کی مملکتوں کے درمیان
ہمیشہ تنازعات پیدا کرتا رہے گا اور دونوں مملکتوں میں فرقہ وارانہ کش مکش
جاری رہے گی۔
اندریں صورت مجلسِ احرار کی یہ رائے ہے کہ برطانوی حکومت کی اس اسکیم کے
خلاف جدوجہد جاری رکھی جائے۔"

(ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: ص ۳۴-۶۳۲)

تقسیم ہند کے پلان سے وزیر اعظم برطانیہ کا اتفاق:

۳۱ مئی ۱۹۴۷ء: لارڈ ماؤنٹ بیٹن وزیر اعظم برطانیہ سے تقسیم ہند کے پلان کی منظوری لے کر لوٹ آئے۔ انھوں نے ہندوستانی زعما کو اپنی اپنی تجاویز سے اس شرط کے ساتھ مطلع کیا ہے کہ جب تک وہ اپنی اپنی پارٹیوں سے اس پلان کی منظوری حاصل نہ کرلیں اس وقت تک وہ صیغۂ راز میں رہیں گی۔

بنگال و پنجاب کی تقسیم پر مسلم لیگ کی رضامندی:

۲ جون ۱۹۴۷ء: ہندوستان کی سرزمین پر مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا آخری جلسہ ۲ جون ۱۹۴۷ء کو ہوا، جس میں ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ پنجاب اور بنگال کی تقسیم بھی مسلم لیگ نے قبول کرلی۔ برٹش گورنمنٹ کی تقسیم کے مطابق پنجاب اور بنگال کے جو اضلاع جن میں ضلع کے ساتھ تحصیلوں میں بھی مسلمانوں کی کھلی اکثریت تھی، پاکستان کا حصہ قرار دیے گئے ہیں، مگر دوسرے اضلاع کے مطابق فیصلہ کمیشن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ کمیشن بعد میں اپنا کام شروع کرلے گا اور حد بندی قایم کرے گا۔

ورکنگ کمیٹی کے اس فیصلے پر چودھری خلیق الزماں نے جو خود بھی اس کے ایک رکن تھے اور فیصلے میں ان کی رائے بھی شامل تھی، لکھا ہے:

"لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۳۱ رمئی ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ سے تقسیم ہند کے لیے رضامندی حاصل کر کے ہندوستان لوٹ آئے اور ہندوستانی زعما کو اپنی تجاویز سے اس شرط کے ساتھ مطلع کر دیا کہ وہ جب تک اپنی اپنی انجمنوں سے ان پر رضامندی نہ حاصل کر لیں اس وقت تک وہ صیغۂ راز میں رہیں۔
مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا ہندوستان کی سرزمین پر آخری جلسہ ۲؍ جون ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوا، جس میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تقسیم بھی مسلم لیگ نے قبول کی۔ برٹش گورنمنٹ کی تقسیم کے مطابق پنجاب اور بنگال کے ان اضلاع جن میں ضلع اور تحصیلوں میں بھی کھلی ہوئی مسلم اکثریت تھی، پاکستان کے حصے قرار دے دیے گئے، مگر دوسرے اضلاع کے متعلق فیصلہ کمیشن پر چھوڑ دیا گیا جو بعد میں اپنا کام شروع کرے گا اور حد بندی قایم کرے گا۔"

اس کے بعد چودھری صاحب لکھتے ہیں:

"جس حشر سے میں ڈرتا تھا بالآخر میرے نقطۂ نظر سے میرے سامنے پیش تھا، ہندوستان کی مسلم سیاست برٹش دور میں توازن کے اصول پر برابر قایم رہی تھی۔ جداگانہ انتخاب اسی توازن کے سلسلے کی ایک کڑی تھی، مگر جب مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ ۱۹۳۵ء کے دستور میں برٹش نے اپنے سرکاری بلاک کو خارج کر کے سات صوبوں میں مسلم قلیل اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے تو انھوں نے پاکستان کے مطالبے کے ذریعے اس توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، مگر صوبہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم نے اس توازن کو بالکل غتر بود کر دیا، کیوں کہ اس سے مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے اور ان دونوں حصوں میں پاکستان اور اقلیتی صوبوں میں کم از کم تین سو میل کا فصل حایل ہو گیا، جس کی وجہ سے دس بارہ کروڑ مسلمان تقریباً نصف نصف ہندوستان اور پاکستان میں بٹ گئے اور ہندوستان میں ان کی چار پانچ کروڑ آبادی بے یار و مددگار رہ گئی اور پھر یہ بھی ایک سانحہ ہے کہ پاکستان کے مغربی اضلاع اور مشرقی اضلاع میں ایک ہزار میل کا فصل ہو گیا۔ نیز یہ خطرہ بھی پیش نظر تھا کہ پنجاب کے اضلاع کی تقسیم کہیں ایسی نہ ہو جائے کہ

ہندوستان کو کشمیر کے لیے راستہ مل جائے، یہ تمام مسایل مجھے عرصہ سے پریشان کیے ہوئے تھے، جن کا مفصل ذکر میں نے مسٹر جناح سے اپنے ۱۷؍۱۰؍اکتوبر ۱۹۳۹ء کے خط میں کر دیا تھا۔ مگر اس وقت وہ لاہور کی پاکستان کی تجویز کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ اس تجویز میں پنجاب اور بنگال کے پورے صوبوں کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس میں صوبوں کی تقسیم کے لیے کھلا ہوا مواد موجود تھا۔

اکثر سمجھ دار اور فہیم سیاست داں آج اٹھارہ برس بعد بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کو مل سکتا تھا وہ مل گیا اور اس سے زاید وہ برٹش گورنمنٹ سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۱۹۴۰ء کے پاکستان ریزولیوشن میں مسلم لیگ نے اسی قدر طلب کیا جس کو وہ ضروری سمجھتی تھی کہ انگریز کے ذریعے حاصل کر لے گی۔ پھر اگر دینا انگریز ہی کے ہاتھ میں تھا تو ہم اس سے کم از کم مکمل پاکستان مانگتے اور جنگ میں اس کی پوری مدد کر کے ان کی خوش نودی حاصل کرتے، جس کو میرے اصرار کے باوجود انھوں نے منظور نہ کیا۔ اب تقسیم کے بعد خود مسٹر جناح نے پاکستان میں اپنی ایک تقریر میں کہا کہ انگریز نے ہم کو ایک کٹا پٹا مجروح اور پاش پاش پاکستان دیا ہے۔ پنجاب تقسیم ہو رہا تھا، بنگال بھی تقسیم ہو رہا تھا، کشمیر پر بھی ہمارا قبضہ نہ تھا، لہٰذا اس کو کٹا پٹا کہنا بھی غلط تھا، کیوں کہ ''ک'' جو کشمیر کی علامت تھی وہ بھی غایب تھی اور ہمیں صرف ''پالستان'' مل رہا تھا۔

جب مکمل پاکستان کا مسلم لیگ کی طرف سے مطالبہ ہی نہیں ہوا تو پھر انگریزوں پر یہ الزام لگانا کس طرح جایز ہو سکتا ہے؟

میرا اپنا نظریہ یہ تھا کہ باوجود ہمارے پاکستان کی تجویز کے انگریز ہم کو پورا پاکستان دے کر جاتا، بہ شرطے کہ ہم اپنی وار پالیسی سے اس کو یہ موقع نہ دیتے کہ وہ کانگریس اور لیگ کی وار پالیسیوں میں کوئی تفریق نہ کر سکے اور نہ امریکا اور مغربی دنیا کو یہ گمان دلا سکے کہ ہندوستان کی دونوں پارٹیوں کو جنگ سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ اس وقت ہندوستان کی سیاست کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ کانگریس نے ہمارے اس رویے سے پورا فایدہ اٹھایا اور موقع پاتے ہی ۸؍مارچ ۱۹۴۷ء کو تقسیم پنجاب کا مطالبہ کر دیا جس میں وہ سو فیصدی کامیاب ہو گئی۔

ان سب تخیلات کے ساتھ ورکنگ کمیٹی میں میں نے کس دل سے تقسیم پنجاب کی حمایت کی اس کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے دل میں صرف ایک جذبہ یہ تھا کہ بہرنوع ایک چھوٹا پاکستان بھی پاکستان نہ ہونے سے یقیناً بہت بہتر ہے، اس لیے میں نے بھی دوسروں کی طرح تقسیم پنجاب اور بنگال کی تائید کی، مگر اس کو میں قطعی مسلم لیگ کی شکست سمجھا، کیوں کہ جن اقلیتوں کے تحفظ کے لیے ہم ۱۹۳۷ء میں مجتمع ہوئے تھے۔ ان اقلیتوں کو تو ہم اور بدتر حالت میں چھوڑ رہے تھے اور خود اکثریتی صوبوں کی تقسیم کر رہے تھے اور یہ تقسیم ہمارے لیے کسی طرح فخر و مباہات کی وجہ نہیں بن سکتی تھی؟ اس دن کے جلسے میں کوئی اور مسئلہ سوائے کراچی کو پاکستان کا کیپٹل بنانے کے پیش نہیں ہوا۔ شہید سہروردی نے اپنی یونائیٹیڈ بنگال کی تحریک کے متعلق بھی کچھ نہیں کہا۔ عام طور پر ہم سب یہ سمجھے کہ تقسیم ہند کے تمام سوالات ۱۶/ جون ۱۹۴۸ء تک طے ہو جائیں گے اور اس عرصے میں اور اس کے بعد کچھ عرصے تک گورنر جنرل دونوں ملکوں کا ایک ہی رہے گا، تا آں کہ نیا دستور نافذ نہ ہو۔ ۸/ جون ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کونسل نے ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کی تائید کردی۔ دوسرے دن جب جلسہ ہوا تو ”خاک سار والنٹیر“ امپیریل ہوٹل میں جہاں جلسہ ہو رہا تھا گھس آئے اور اس کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی، جن کو بڑی مشکل سے وہاں سے نکالا گیا۔ اس مظاہرے سے ان کا کیا مقصد تھا؟ علامہ مشرقی مرحوم ہی بتا سکتے تھے۔“

(شاہراہ پاکستان: ص ۵۳-۱۰۵۰)

بنگال کو متحد رکھنے کے لیے سمجھوتا اور مسٹر جناح کی منظوری:

۲۴/ مئی ۱۹۴۷ء: دو قومی نظریے کے زبردست پشتی بان ”ڈائریکٹ ایکشن ڈے“ کے مسلم لیگی ہیرو مسٹر حسین شہید سہروردی اور بنگال مسلم لیگ کے دیگر قایدین قیامِ پاکستان کے لیے مصروف جہد تھے لیکن جب قرارداد لاہور کو عملی جامہ پہنانے کا وقت قریب آیا تو یہ حضرات اس سے فرار اختیار کر گئے اور بنگال کو پاکستان میں شامل ہونے سے روکنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ بنگال تقسیم ہو کر پاکستان میں شامل نہ ہو بلکہ متحد رہے اور خود مختار و آزاد ہو جائے۔ انھوں نے ان منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے

لیے بنگال کانگریس اور ہندو سبھا کی حمایت بھی حاصل کرلی۔ اس سلسلے میں جو سمجھوتا طے پایا اس کی خبر ایسوسی ایٹیڈ پریس آف انڈیا نے (۱۴ر مئی ۱۹۴۷ء) اخبارات کو مہیا کی جس میں سمجھوتے کی تفصیلات درج تھیں:

مسٹر سرت چندر بوس اور ممتاز کانگریسی و مسلم لیگی رہنماؤں میں مذاکرات نے واضح شکل اختیار کرلی ہے۔ چناں چہ آیندہ کی صوبائی وزارت کی تشکیل اور دستور کے اصول اور شرایط طے پا گئی ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) بنگال آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کرلے گا تو باقی ہندوستان کے ساتھ تعلقات کا فیصلہ کرنے کا مجاز و مختار ہوگا۔

(۲) بنگال کے آیندہ دستور میں انتخاب مشترکہ نیابت کی بنیاد پر ہوں گے اور ہر بالغ مرد و عورت کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا..... ہندوؤں اور مسلمانوں کو نمایندگی آبادی کی بنیاد پر ملے گی۔

(۳) جب برطانوی حکومت بنگال کی آزاد ریاست کا اعلان کردے گی تو موجودہ وزارت فی الفور ختم ہوجائے گی اور اس کی جگہ نئی مشترکہ وزارت قایم کردی جائے گی۔ اس میں وزیر اعظم کو چھوڑ کر مسلمانوں اور ہندوؤں کے نمایندے برابر تعداد میں شامل ہوں گے۔

(۴) وزیر اعظم مسلمان ہوگا اور ہوم منسٹر ہندو۔

(۵) پولیس اور فوج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی بھرتی کیا جائے گا اور تمام افسران بنگالی نژاد ہوں گے۔

مسٹر حسین شہید سہروردی نے ۲۶ر اپریل کو ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی اور اسے کہا تھا کہ اگر اسے مناسب وقت دیا جائے تو وہ بنگال کو اس پر راضی کرائے گا کہ بنگال متحد رہے اور آزاد ہو اور وہ مسٹر جناح کو بھی اس پر آمادہ کرلیں گے، اس صورت میں بنگال پاکستان میں شامل نہ ہو۔ مسٹر حسین شہید سہروردی نے وایسرائے کے سامنے جس عزم کا اظہار کیا تھا اسے واقعی پورا کر دکھایا۔ مسٹر جناح اسی دن وایسرائے سے ملنے گئے تو ماؤنٹ بیٹن نے بالکل سیدھے طور پر سہروردی کی ملاقات اور تجویز کا ذکر کیا اور ان کی رائے دریافت کی تو

مسٹر جناح نے بغیر ہچکچاہٹ کے جواب دیا:

''.....میں خوش ہوں گا، کیوں کہ کلکتہ کے بغیر بنگال کا کیا فایدہ؟ ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ متحدر ہیں اور آزاد رہیں۔''

یقین ہے ان کے ہمارے ساتھ دوستانہ تعلقات ہوں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کہتا ہے کہ سہروردی نے مجھ یقین دلایا ہے کہ اگر بنگال متحد رہا اور آزاد ہو تو وہ برطانوی دولت مشترکہ میں شامل ہوگا۔ اب بنگال کو راضی کرنا باقی رہ گیا تھا۔ یہ کام مسٹر سہروردی نے ایک ماہ سے کم عرصے میں کر دکھایا۔ متذکرہ بالا مشترکہ اعلامیہ اس کا ثبوت ہے۔ چودھری محمد علی نے اس پہلو پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وزیر اعظم بنگال حسین شہید سہروردی نے سبھاش چندر بوس کے بھائی سرت چندر بوس کی تائید سے ایک آزاد اور خود مختار بنگال کی آواز اٹھائی اور انگریز گورنر بھی اس کا حامی تھا..... کلکتہ میں گاندھی جی سے سرت چندر بوس سہروردی اور دوسرے لیڈروں نے ملاقات کی جن میں بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم بھی شامل تھے۔ موخر الذکر کی گفتگو سے گاندھی جی کو خوش گوار حیرت ہوئی کیوں کہ وہ متحدہ بنگال کی حمایت مشترکہ زبان، مشترکہ ثقافت اور مشترکہ تاریخ کی بنیاد پر کرتا تھا۔ جس نے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک وحدت میں پرو رکھا تھا۔''

دو قومی نظریے کے بنگالی علم بردار مسٹر حسین شہید سہروردی کے بارے میں ایک اور مصنف رقم طراز ہے کہ سہروردی کا مؤقف یہ تھا:

''.....ہم بنگالی مشترکہ مادری زبان رکھتے ہیں اور ہمارے اقتصادی مفادات مشترکہ ہیں..... بنگال کی پنجاب کے ساتھ بہت معمولی مماثلت ہے۔ بنگال آزاد ریاست ہوگا اور اس کا فیصلہ خود کرے گا کہ کیا اس نے پاکستان کے ساتھ ناتہ رکھنا ہے؟ جناح متحدہ آزاد بنگال کے قیام کا کھلے دل سے خیر مقدم کرے گا۔''

تو یہ تھا مسلم لیگ کے قایدین کا انداز سیاست، انھی تضادات سے بھرپور سیاست کے

باعث مسلمانوں کو خسارے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مسٹر جناح نے تو مشن سے کہا تھا:

''ایک مرتبہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرلیا جائے تو اس کی سرحدات کے تعین پر گفتگو ہو سکتی ہے۔''

مسٹر جناح نے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی تو اس کا تاثر یہ تھا:

''مسٹر جناح نے اپنے منصوبے کے کسی پہلو پر غور ہی نہیں کیا، اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگے گا جب وہ حقیقت کی دنیا میں قدم رکھے گا۔'' (ابوالکلام آزاد اور......: ص ۶۵-۵۶۴)

کونسل کا اجلاس اور فیصلے کی توثیق:

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۹ر جون ۱۹۴۷ء کو صبح ساڑھے دس بجے امپیریل ہوٹل نئی دہلی میں ہوا۔ اجلاس کی صدارت مسٹر ایم اے جناح نے کی۔ مولانا عبدالحامد بدایوں۔ یوپی نے قرآن (پاک) کے چند حصے تلاوت کیے، اس کے بعد مسٹر لیاقت علی خاں نے بیگم محمد علی اور مسٹر اسماعیل کی وفات پر تعزیتی قراردادوں کی منظوری حاصل کی۔

اس کے بعد مسٹر جناح نے ملک معظم کی حکومت کے منصوبے کے حصے پڑھ کر سنائے اور کہا کہ منصوبہ کونسل کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ کونسل اگر اسے قبول کرنا چاہتی ہے تو وہ ایسا کرسکتی ہے اور اس کے خلاف بھی فیصلہ کرسکتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا ''جو اس منصوبے کے کسی پہلو کی وضاحت چاہتے ہیں انھیں سوالات کرنے کی اجازت ہے۔'' اس پر اوڑیسہ، یوپی، بنگال اور بمبئی کے نمایندوں نے مسٹر جناح سے حد بندی کمیشن کے اختیارات اور مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں سوالات کیے۔ ان سوالات کے جواب میں مسٹر جناح نے کہا کہ وہ اپنی ذاتی رائے کے علاوہ کچھ بھی افشا نہیں کرسکتے۔ مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کا انحصار ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات پر ہے۔

کونسل نے مسٹر جناح سے استدعا کی کہ اگر (کوئی) ممبر منصوبے کی منظوری یا استرداد کے لیے ریزولیوشن پیش کرنے کا خواہش مند ہو تو اسے اجازت دی جائے۔ مسٹر جناح نے

جواب دیا کہ ریزولیوشن پیش کرنے اور ان پر بحث کرنے کا قطعاً سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایوان کے سامنے مسئلہ یہ پیش ہے کہ آیا اسے یہ منصوبہ مجموعی طور پر قبول ہے؟ اگر ایوان کو اس سے اتفاق ہے تو ایک متفقہ ریزولیوشن پاس کیا جائے جس میں منصوبے کی قبولیت کا ذکر ہو۔

اس جلسے کی روداد، جو مسلم لیگ کے سیکریٹری لیاقت علی خاں نے وائسرائے لوئیس ماؤنٹ بیٹن کو ضابطے کے مطابق پیش کی تھی، وہ ان کے فارورڈنگ لیٹر کے ساتھ یہ ہے:

ڈاکومنٹ نمبر ۱۲۷: ریئرایڈمرل وائکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن کے نام مسٹر لیاقت علی خاں کا مراسلہ۔ آر/۳/۱/۱۵۶: ایف۔ ایف ۴۹-۵۰

آل انڈیا مسلم لیگ - دہلی

۱۰رجون ۱۹۴۷ء

ڈیئر لارڈ ماؤنٹ بیٹن!

میں اس خط کے ساتھ آپ کی اطلاع کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کے منظور کردہ ریزولیوشن کی نقل ارسال کررہا ہوں، جو اس نے اپنے اجلاس ۹رجون ۱۹۴۷ء میں منظور کیا اور اس ریزولیوشن کا تعلق ملک معظم کی حکومت کے اعلان مورخہ ۳رجون ۱۹۴۷ء سے ہے۔

آپ کا مخلص

لیاقت علی خاں

(ڈاکومنٹ نمبر ۴۵)

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس

۹رجون ۱۹۴۷ء بہ روز پیر میں منظور کردہ ریزولیوشن:

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بحث ومباحثہ اور غوروخوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ملک معظم کی حکومت کے اعلان نامہ ۳رجون ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے عوام کو انتقال اقتدار کا جو منصوبہ پیش کیا گیا ہے اطمینان بخش ہے اور کونسل اس پر مطمئن ہے کہ کابینہ مشن منصوبہ ۱۶رمئی ۱۹۴۶ء پر پیش رفت نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اسے ترک کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم ہی واحد حل رہ جاتا ہے جسے ملک معظم کی حکومت نے ۳رجون کے منصوبے میں تجویز

کر دیا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی رائے ہے کہ ہندوستان کو درپیش مسایل کا حل ہندوستان دو حصوں پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کرنا ہے۔ اس بنیاد پر کونسل نے ملک معظم کے اعلان نامے پر پوری توجہ دی اور غور کیا ہے۔ اگر چہ کونسل بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے اتفاق نہیں کرسکتی اور نہ ہی ان صوبوں کی تقسیم پر رضا مندی ظاہر کرسکتی ہے، لیکن اس نے ملک معظم کی حکومت کا منصوبہ برائے انتقال اقتدار کا بہ طور مجموعی جایزہ لیا ہے۔ اس لیے کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر قاید اعظم محمد علی جناح کو مکمل اختیار دیتی ہے کہ منصوبے میں مندرج بنیادی اصولوں کو سمجھوتے کے طور پر قبول کرلیں۔ اس کے ساتھ ہی صدر کو مکمل اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی تقسیم کو ان اصولوں کی بنیاد پر پایۂ تکمیل تک پہنچائیں جن کا ذکر ملک معظم کی حکومت نے منصوبے میں کیا ہے اور اس میں ڈیفنس، مالیات اور مواصلات وغیرہ کے شعبہ جات بھی شامل ہیں۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے تفصیلات طے کرنے میں مساوات اور انصاف سے کام لیا جائے۔

کونسل صدر (مسلم لیگ) قاید اعظم محمد علی جناح کو مزید اختیارات دیتی ہے کہ وہ منصوبے کے سلسلے میں ہر قسم کا قدم اٹھا سکتے ہیں اور فیصلہ کرسکتے ہیں۔

لیگ کونسل کا اجلاس اور تقسیم کی منظوری — اعلان کے بعد:

۹ جون ۱۹۴۷ء: کانگریس نے ۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند منصوبے کی منظوری دے دی۔ مسلم لیگ کو فکر دامن گیر تھی کہ

> ''.....آدھا پنجاب، آدھا بنگال، ایک سلہٹ کا ضلع اور سندھ و سرحد کے دو دیوالیہ صوبے لے کر کیا کریں گے؟ جو پہلے ہی مرکز کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔''

یہ درست تھا کہ انگریز کسی ایک فریق کو حکومت دے کر نہیں جا سکتا تھا، لیکن تحریک چلانا، لاٹھیاں کھانا، آنسو گیس کا سامنا کرنا اور جیل جانا مسلم لیگ کی روایات اور سیاسی اسلوب کے بالکل برعکس تھا۔ اتنے بڑے فیصلے کے لیے نواب زادہ لیاقت علی خاں پارٹی کے صدر کو کس طرح آمادہ کرسکتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کو بھی خوش فہمی تھی:

''لیاقت علی خاں Mad Pakistan کے بجائے کوئی زیادہ معقول حل تلاش کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔''

نواب زادہ لیاقت علی خاں جب اگلے روز وایسراے سے ملے تو انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کو جو جواب دیا اسے سن کر سب حیران رہ گئے:

''اگر عزت مآب مسلم لیگ کو صرف سندھ کا صحرا دینے پر راضی ہوں تو میں پھر بھی قبول کرلوں گا۔''

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس (۱۰-۹ رجون ۱۹۴۷ء) دہلی کے امپیریل ہوٹل میں ہوا۔ جس میں ۴۲۵ کونسلروں نے شرکت کی۔ اب تقسیم عملی صورت میں سامنے تھی۔ اس کے اثرات نے کونسلروں کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ خاص کر اقلیتی صوبوں کے مسلمان بہت زیادہ پریشان تھے اور اپنے مستقبل کے بارے میں اب ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم ہندو اکثریتی علاقوں کے مسلمانوں کو اب احساس ہوا تھا جب ان کے علاقے ہندوؤں کے پاس چلے گئے تھے۔ امپیریل ہوٹل کے بال روم میں یہ عناصر نہایت غضب ناک ہو کر تقسیم کے خلاف چیخ رہے تھے۔ منصوبے کو ''بے وفائی'' اور 'سانحہ' سے تعبیر کرتے تھے۔

قاید اعظم نے منصوبے کے حق میں تقریر کی۔ قیام پاکستان پر حکومت برطانیہ اور کانگریس کی رضامندی پر اطمینان کیا۔ جن حالات میں منصوبے کو موجودہ شکل میں منظور کیا جا رہا تھا اس پر بھی تنقید کی۔ قاید اعظم کی تقریر کے خاتمے پر مولانا حسرت موہانی نے بڑی بے باکی، استغنا اور بے نیازی کے ساتھ منصوبے کی مخالفت میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا:

''.....اب جب کہ قاید اعظم پلان کو وایسراے کے سامنے منظور کر چکے ہیں اور ریڈیو پر اس کے لیے پسندیدگی کا اظہار کر چکے ہیں تو پھر اسے کونسل میں لانے کا کیا فایدہ.....''

قاید اعظم نے جواب دیا:

''پلان کو مشروط طور پر قبول کیا گیا ہے، کونسل کی منظوری لازمی ہے، میری راے وزنی نہیں۔ مولانا کو اختلاف کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اگر وہ ہاؤس کو

اپنا ہم نوا بنالیں تو میں اپنی رائے کے باوجود ایوان کی رائے کا پابند ہوں گا۔"
مولانا مزید کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن انھیں زبردستی بٹھا دیا گیا۔ "کونسل نے قاید اعظم کو مکمل اختیار دے دیا کہ وہ پلان کے بنیادی اصولوں کو مفاہمت کے جذبے کے تحت منظور کرلیں اور پلان کی تفصیلات مساویانہ اور منصفانہ طور پر طے کریں۔"

قاید اعظم نے مولانا حسرت موہانی کے جواب میں جو پہلا جملہ ارشاد فرمایا تھا۔ اس میں کوئی صداقت موجود نہیں تھی۔ اب تک جو مراحل پیش آئے تھے:

(۱) ماؤنٹ بیٹن کے سفر کے وقت زبانی رضامندی۔

(۲) ان کے سیکریٹری کے سامنے ان کے ڈیکلیریشن پر دستخط کے موقع پر۔

(۳) ۲ر مئی کی گفتگو میں اور ۳ر جون کے اعلان کے وقت! حال آں کہ ریڈیو پر خود قاید اعظم کی تقریر بھی کونسل کی منظوری پر فیصلے کے دار و مدار کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔

دیگر حضرات جنھوں نے اس موقع پر تقاریر کیں اور جن کے اہم نکات کی صراحت رپورٹ میں کی گئی تھی، یہ ہیں:

(۱) پروفیسر عبدالرحیم (بنگال) (۲) غلام حسین ہدایت اللہ (وزیر اعظم سندھ)،
(۳) ظہیر الدین لاری (یوپی)، (۴) غلام نبی ملک (امرتسر)،
(۵) مظہر اسماعیل (مدراس)، (۶) مولوی عبدالرحمٰن (سی پی)،
(۷) عبدالحمید (آسام) اور (۸) جناح صاحب۔

۱۔ پروفیسر عبدالرحیم (بنگال): انھوں نے ریزولیشن کی شدید مخالفت کی۔ اس منصوبے سے ہندوستان کے مسلمان تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اس کے نتیجے میں ملک میں کبھی بھی پائیدار امن قایم نہیں ہو سکے گا۔ اس سے مسلمانوں کو فایدہ حاصل نہ ہوگا۔ پنجاب اور بنگال کی مجوزہ تقسیم سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہمیشہ جھگڑا ہوتا رہے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب اقتصادی اور صنعتی اعتبار سے کم زور ہوں گے۔ مغربی بنگال کی کل آمدن مشرقی بنگال کی نسبت تین گنا زیادہ ہوگی۔ انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مشرقی پنجاب کے حصے میں نہایت کارآمد اضلاع آئیں گے۔ انھوں نے مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ اصلی پاکستان حاصل کرنے کے لیے جنگ جاری

رکھیں اور مطالبہ کیا کہ منصوبہ مکمل طور پر مسترد کر دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ کرم خوردہ پاکستان جواب پیش کیا جا رہا ہے کانگریس کے لیڈروں نے چار سال قبل پیش کیا تھا اور اگر مسلمان اب اسے قبول کرنے پر رضا مند ہیں تو اب تک جو خون ریزی ہو چکی ہے اس میں کوئی ہوش مندی نہ تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر منصوبہ مسترد کرنے کی اپیل دل سوزی سے کی۔

یو پی کے نمائندے جسٹس ظہیر الدین لاری نے مفصل و مدلل تقریر کی اور منصوبیت کو قطعی رد کر دینے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا:

''ہمارے سامنے جو منصوبہ رکھا گیا ہے، انتہائی مایوس کن ہے۔ ہم اسے کبھی قبول نہیں کریں گے اور اگر ہم نے اسے قبول کر لیا تو اس سے بڑی تباہی ہوگی۔ ہم نے بمبئی کے اجلاس (ڈاکومنٹ نمبر ۸۶ جلد ہشتم) میں کابینہ مشن منصوبہ مسترد کر دیا تھا، کیوں کہ کانگریس نے صوبوں کی گروپ بندی کی مخالفت کی تھی اور اس نے گروپ بندی اسکیم کو اس انداز میں تسلیم نہیں کیا تھا جس طرح کابینہ مشن اسے نافذ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کانگریس نے آسام کو پاکستان میں شامل نہ کرنے پر اصرار کیا تھا اور ہم نے کبھی نہیں چاہا کہ آسام پاکستان سے علاحدہ ہو۔ جب ہم نے ایک مرتبہ کابینہ مشن منصوبہ اس وجہ سے مسترد کر دیا تو اب سوال پیدا ہوتا ہے آیا ملک معظم کے منصوبے کے مطابق آسام ہمیں ملے گا یا نہیں؟ میں کونسل کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہم کو نہ صرف آسام ہی سے محروم نہیں ہونا پڑے گا بلکہ بنگال اور پنجاب کے وسیع علاقوں کو تقسیم کر دیا جائے گا اور یہ پاکستان کا نقصان ہوگا۔ اس سے مجوزہ نئی مملکت بہت زیادہ کم زور ہو جائے گی۔ درحقیقت حکومت برطانیہ نے ہمارے مطالبات میں سے ایک بھی منظور نہیں کیا۔ انھوں نے تمام کوششیں ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لیے کیں۔ مثال کے طور پر گاندھی جناح بات چیت (ڈاکومنٹ نمبر ۳۰ جلد نہم) راج گوپال اچاریہ فارمولا (ڈاکومنٹ نمبر ۵۷۶ جلد نہم) ڈاکٹر راجندر پرشاد کی کتاب ''انڈیا ڈیوائیڈڈ'' میں ہندوستان کو انھی خطوط پر تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی جو اب ملک معظم کی حکومت کی تجاویز میں پیش کیے گئے ہیں۔ جو پاکستان ہمیں پیش کیا جا رہا ہے ہر نقطۂ نظر سے اس قدر کم زور ہوگا کہ اس سے ہمارے لیے شدید مشکلات پیدا ہوں گی۔

میرا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر اصول کی بنا پر بنگال اور پنجاب کی تقسیم درست ہے تو بمبئی پریذیڈنسی اور یوپی کے جن مسلمانوں نے کانگریس کی حکومت کی مخالفت کی ان کو بھی علاحدہ وطن دیا جائے، کیوں کہ ان کی تعداد سکھوں سے زیادہ ہے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم مُبادلہ آبادی اس طریقے سے کریں گے کہ یوپی کو تقسیم کر کے جو اضلاع ہمیں دیے جائیں ان میں ہم اپنی آبادی اکثریت میں بنالیں گے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قایم ہے کہ منصوبے کے ذریعے حکومت برطانیہ نے کانگریس کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب ہم نے کابینہ مشن منصوبہ مسترد کیا تھا تو اس سے حکومت برطانیہ نے کوئی اثر قبول نہ کیا تھا، لیکن جوں ہی کانگریس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کیا حکومت برطانیہ نے فوراً ایسی تجاویز پیش کر دیں جن میں کانگریس کے مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے شامل کیا گیا ہے۔ حکومت برطانیہ نے کانگریس کے اس مطالبے کو اس حقیقت کے باوجود تسلیم کیا ہے جب کہ بنگال کے چند ذمے دار ہندو لیڈر بنگال کو متحد رکھنے کے لیے سرگرم ہیں۔ بہ ہر حال برطانیہ نے ان کے ایجی ٹیشن کو اس لیے لایق اعتنا نہیں سمجھا کیوں کہ وہ کانگریس کو خوش کرنے کی فکر میں تھی۔ مسلمانوں کو ادنا قوم بنایا جارہا ہے۔ اگر آپ ایسا ہی کٹا پھٹا پاکستان قبول کرنے پر رضا مند ہیں تو میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ملک میں اس قدر ایجی ٹیشن کیوں کیا؟ آپ اب جو کچھ قبول کرنے پر آمادہ نظر آرہے ہیں یہی کچھ آپ کانگریس سے سمجھوتا کر کے حاصل کر سکتے تھے۔ برطانیہ نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے۔ مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کیا تحفظات حاصل کیے گئے ہیں؟ کیا اب ہم کو دو مسلم لیگیں بنانا پڑیں گی؟ جن میں سے ایک کا تعلق پاکستان سے ہوگا اور ایک کا ہندوستان سے؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی علاحدہ مسلم لیگ قایم کریں گے، انھوں نے جس قوت اور قربانی کی بنا پر آپ کو پاکستان لے کر دیا ہے اسی بل پر اپنے حقوق کی حفاظت کریں گے۔ میں اس منصوبے کی شدید مخالفت کرتا ہوں۔

دیگر حضرات نے بھی منصوبے کو مسلمانوں کے لیے شدید نقصان رساں بتایا۔ مسئلے کے حل کے لیے ناکافی بتایا، لیکن اس کو منظور کر لینے کی تائید کی کہ اب کوئی اور آپشن ان کے

سامنے نہیں ہے۔

اجلاس کی کارروائی شام ساڑھے سات بجے مسٹر ایم اے جناح کی صدارت میں دوبارہ شروع ہوئی۔ انھوں نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ منصوبے کے حق اور مخالفت میں کئی پہلو اجلاس کے سامنے پیش کیے گئے۔ ابھی سولہ مقررین کو تقریر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر آپ نے مسئلے کا فیصلہ آج ہی کرنا ہے تو بحث کا سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ بہ صورت دیگر اجلاس کل بھی جاری رہے گا۔ میں اس مسئلے پر آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ اس پر ایوان کی اکثریت نے بحث بند کرنے کے حق میں رائے دی۔ اس کے بعد منصوبہ منظوری کے لیے پیش کیا گیا۔ مولانا حسرت موہانی سمیت آٹھ کونسلروں نے منصوبے کے خلاف ووٹ دیا، جب کہ ۴۶۰ ووٹ منظور کرنے کے حق میں ڈالے گئے۔ اس طرح منصوبہ منظور کرلیا گیا۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے ریزولیوشن پڑھا اور صدر کی توثیق حاصل کی۔ اس ریزولیوشن کی رو سے منصوبہ احتجاج کے ساتھ منظور کیا گیا اور مسٹر جناح کو مزید اقدامات کے لیے اختیار سونپا گیا۔

آخر میں مسٹر جناح نے مسلم اقلیتی صوبوں (کے مسلمانوں) سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ صرف آپ کی قربانیوں کا ثمر ہے کہ آج پاکستان کی حقیقت کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ جہاں تک مسلم اکثریتی صوبوں کا تعلق تھا ان کا مسئلہ زیادہ لائق توجہ نہ تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ سندھی، پنجابی اور دیگر صوبائی امتیازات ختم کردیے جائیں اور مسلمان مجتمع ہوکر اپنا وزن ڈالیں۔ انھوں نے کہا کہ اب ان کا کام ختم ہوگیا ہے۔ ان کا اصلی کام ہندوستان کے مسلمانوں کی علاحدہ سلطنت قایم کرنا تھا، علاحدہ مسلح افواج بنانا تھا اور علاحدہ ملک حاصل کرنا تھا۔ آپ کی ترقی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔

اس موقع پر خاک ساروں نے امپیریل ہوٹل میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد بیس تھی، پولیس اور مسلم نیشنل گارڈ نے انھیں روک دیا۔

تقسیم پنجاب و بنگال پر ردِ عمل:

جلسہ کونسل کی روداد میں گزر چکا ہے، پنجاب و بنگال کی تقسیم کی شرط کا پتا چلا کے ارکان

پریشان ہوگئے۔ ہوٹل میں ہنگامہ برپا تھا۔ تقسیم کی صورت حال نے دل ودماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ خاص کر اقلیتی صوبوں کے مسلمان بہت پریشان تھے۔ ان کی آنکھیں اب کھلی تھیں، ایک بھیانک مستقبل ان کے سامنے تھا اور فرار کی کوئی راہ نہ تھی اور بہ قول رپورٹر یا روداد نویس کے:

''امپیریل ہوٹل کے بال روم میں یہ عناصر نہایت غضب ناک ہو کر تقسیم کے خلاف چیخ رہے تھے۔ منصوبے کو ''بے وفائی'' اور ''سانحہ'' سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے خواب چکنا چور ہوگئے۔ جو سبز باغ انھوں نے دیکھے تھے ان کے لیڈر کے سر کی ایک جنبش نے انھیں تباہ کر دیا تھا اور اپنے تصورات میں جو عیش وعشرت تعمیر کیے تھے انھیں تاریخ کے ایک جھٹکے نے زمین بوس کر دیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی اپنی بات پوری نہیں کر سکے، وہ حضرات جن سے خطرہ تھا ان کو پہلے ہی ایجنڈے میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور جن سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا انھیں آخر میں رکھا تھا اور اجلاس کو اس سے پہلے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ جلسے کا اختتام ایک ہنگامے پر ہوا تھا۔ وائسرائے کو خط لکھ کر بھیج دیا گیا کہ کونسل نے فیصلہ منظور کر لیا ہے۔ صحافیوں کے قلم کو کون پکڑ سکتا تھا؟ تقسیم کے فیصلے سے کوئی متفق نہ تھا۔ پارٹیوں کی ہائی کمانڈ نے معذرت کے ساتھ ملک کی تقسیم کو تسلیم کر لیا تھا۔ عام بے غرض اور مخلص رہنماؤں کی زبانوں کو کون بند کر سکتا تھا۔ مسلم لیگ کے فیصلے سے تو تمام پنجابی و بنگالی بھی متفق نہ تھے، باہر کا کوئی لیگی متفق نہ تھا۔ عام کانگریسی، لیگی، نیشنلسٹ، چھوٹی بڑی پارٹیوں کے رہنما اور کارکن سبھی مخالف تھے۔ کچھ محتاط ضرور تھے لیکن بیشتر منہ بے باک تھے۔ ان کی زبانوں کے لیے کوئی روک نہ تھی۔ یہ داستان بڑی طویل ہے اور اس کو سمیٹنا ناممکن! میں یہاں غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب جنھوں نے بہت خلوص سے تحریک پاکستان کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کی کوشش کی تھی، انھوں نے دو مواقع پر مسلم لیگ کے فیصلوں کے خلاف اپنی بہترین ذہنی و فکری اور قلبی صلاحیتوں کا استعمال کیا تھا۔ پہلے قاید اعظم کے کیبنٹ مشن پلان منظور کر لینے پر جو تقسیم ملک کی نفی پر مبنی تھا، ناراضگی تھی اور اب پنجاب و بنگال کی تقسیم پر ناخوش تھے، لیکن دونوں بار اپنے نقطۂ نظر سے سچائی کے مضبوط پتھر پر قایم تھے۔ ہم یہاں ان کے مقالوں پر جو ایک ہی تاریخ کو لکھے گئے، اس بحث کو ختم کرتے ہیں:

مولانا غلام رسول مہر کے دو لیڈنگ ارٹیکل:

(۱) ۷؍جون ۱۹۴۷ء: آج کی اشاعتِ انقلاب-لاہور میں ان کا پہلا مقالہ یہ ہے:

"ہمارے بعض بھائیوں نے بڑے شد و مد سے فرمایا کہ مسلمانوں نے پاکستان حاصل کرلیا، لیکن جب اس شے کو پاکستان بنانے کا فیصلہ کرلیا گیا ہو جو حسن اتفاق سے میسر آجائے تو ہمارے لیے اس معاملے پر بحث کی کون سی گنجایش ہے؟ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ایسی ڈھٹائی کی جسارت ہم میں اب تک پیدا نہیں ہوئی اور خدا نہ کرے کبھی پیدا ہو۔ جو لوگ مسلمانانِ ہند کے بنیادی قومی مقاصد سے بے تکلف اس قسم کا استہزا کر سکتے ہیں وہ قوم کی جو خدمت انجام دے سکیں گے اس کے متعلق کچھ عرض کرنا فضول ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ایسا پاکستان لینے کے لیے اٹھے تھے جو ہندوستان کے پورے چھ صوبوں پر مبنی تھا۔ دو بڑے صوبے یعنی پنجاب اور بنگال اور چار چھوٹے صوبے یعنی آسام، سرحد، سندھ اور برطانوی بلوچستان۔ اس غرض کے لیے انھوں نے مسلم اقلیت کے صوبوں کو یہ سمجھ کر نظر انداز کیا تھا کہ مسلم اور غیر مسلم اقلیتوں کا معاملہ اسلامی اور غیر اسلامی خطوں کے نمایندوں کی رضامندی سے باہم طے ہو جائے گا، لیکن جو کچھ ہوا اس کو مسلمان جو چاہیں کہیں، جو چاہیں سمجھیں، وہ اپنی کامل شکست کو بھی فتح و کامرانی، فیروز مندی اور کار برآری قرار دینا چاہیں تو کوئی انھیں روک نہیں سکے گا، لیکن اگر وہ اپنے مقصد و نصب العین اور پیش نظر فیصلے کا موازنہ کریں گے تو ہمیں یقین ہے کہ ان کو خوشی اور شادمانی کا کوئی بعید سا امکان بھی نظر نہ آئے گا۔ بلکہ اس حالت پر انھیں ماتم کی صفیں بچھانی چاہئیں۔ اسے پاکستان کہنا ایک پاک تصور کی کھلی ہوئی ہتک ہے۔ نعرہ بازیوں کا وقت گزر چکا ہے، اب عقل مندی اور ذی فہم انسانوں کی طرح حقایق پر غور کا وقت ہے۔

اس خطرے سے عام مسلمانوں کو آگاہ کرنے کے لیے ہم نے ہزار کوششیں کیں، لیکن اس بات کی خوشی نہیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے تھے وہ درست ثابت ہوا، انتہائی رنج و قلق ہے، لیکن اب بھی ہمارے نزدیک صحیح راہ عمل یہی ہے کہ اس مصیبت کو روکا جائے اور اس افتاد کا دروازہ بند کیا جائے۔"

(۲) اسی اشاعت میں مولانا مہر صاحب کا دوسرا آرٹیکل یہ ہے:

’’پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہوگیا اور حد بندی کے کمیشن مقرر کر دیے گئے۔ اب اس بحث سے کیا حاصل ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں لیگ کے سامنے جو پیش کیا گیا تھا وہ وہی تھا جو آج قبول کیا گیا ہے۔ اگر یہ ثابت بھی کر دیا جائے کہ حقیقت یہی ہے تو کیا لیگ موجودہ فیصلے کو بدل دے گی؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا یہ بحث اب بداہتہً فضول اور عبث ہے۔ تاہم واقعہ یہی ہے کہ اب جو قبول کیا گیا ہے وہ وہی ہے جو ۱۹۴۴ء میں کانگریس دے رہی تھی۔ ہمارے ایک لیگی معاصر کو خدا جانے کیوں اصرار ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ جھوٹ ہے۔ اس غلط فہمی کے سدِباب کے لیے ضروری ہے کہ حقیقت حال پھر واضح کی جائے اور جھوٹ کو اس کے اصل مرجع در آب تک چھوڑ دینا چاہیے۔

۱۰ر اپریل ۱۹۴۴ء کو مسٹر راج گوپال اچاریہ نے ایک خط کے ذریعے چند تجاویز مسٹر جناح کے پاس بھیجی تھیں۔ یہ چھ دفعات پر مشتمل تھیں۔ مقصود یہ تھا کہ انھیں کانگریس اور لیگ کے درمیان سمجھوتے کی بنیاد قرار دیا جائے۔ دوسری اور چوتھی دفعہ کا متن یہ تھا:

’’جنگ کے خاتمے پر ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرق میں ان متصل اضلاع کا تعین کرے گا جن میں مسلمانوں کو مطلق اکثریت حاصل ہے۔ اس طرح متعین شدہ علاقوں کے تمام باشندوں سے بالغوں کے حق رائے (دہی کے اُصول پر) یا کسی دوسرے ذریعے لیکن اصل حق رائے کی بنا پر استصواب کیا جائے گا۔ اگر اکثریت کا فیصلہ ہو کہ ہندوستان سے الگ ایک خود مختار اسٹیٹ بنائی جائے تو اس فیصلے کو عملی جامہ پہنا دیا جائے گا۔ علاحدگی کی حالت میں دفاع، تجارت و سایل حمل و نقل اور دوسرے ضروری مقاصد کے تحفظ کے لیے باہمی معاہدے ہو جائیں گے۔‘‘

مسٹر راج گوپال اچاریہ کے دعوے کے مطابق گاندھی جی ان تجاویز کے حامی تھے۔ مسٹر جناح نے ۲ر جولائی ۱۹۴۴ء کو جواب دیا کہ میں خود ان کے قبول یا عدم قبول کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ البتہ گاندھی جی یہ تجاویز براہِ راست میرے پاس بھیج دیں تو انھیں مجلسِ عاملہ لیگ کے سامنے پیش کر دوں گا۔

مسٹر راج گوپال اچاریہ نے سمجھا کہ جب مسٹر جناح خود ان کی حمایت کے لیے تیار نہیں ہیں تو انھیں مجلسِ عاملہ کے سامنے پیش کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ اس طرح یہ معاملہ

التوا میں پڑ گیا۔ مسٹر راج گوپال کے نزدیک لیگ کی قرار داد لاہور کے تمام مطالبات ان تجاویز میں آ گئے تھے۔

۳۰ر جولائی ۱۹۴۴ء کو لاہور میں لیگ کونسل کا اجلاس ہوا، جس میں مسٹر جناح نے ایک لمبی تقریر فرمائی۔ ان کا خاص موضوع یہی تجاویز تھیں۔ ہم پوری تقریر کو یہاں پیش نہیں کر سکتے، لیکن اس کے دو فقرے خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ یعنی ان کا (راجہ جی کا) فارمولا لیگ کی مارچ ۱۹۴۰ء والی قرارداد کا غلط چربہ ہے، یہ اس کی نفی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ قرار دار مذکور کو تارپیڈو مار کر فنا کر دیا جائے اور جب وہ کہتے ہیں کہ ان کے فارمولے میں لیگ کے تمام مطالبات آ گئے ہیں جو مسلم لیگ نے اپنی قرارداد میں پیش کیے تھے تو یہ اس قرارداد کی بدترین تخریب ہے۔ چوں کہ گاندھی جی بھی ان تجاویز کے حامی تھے۔ لہٰذا مسٹر جناح نے آخر میں فرمایا:

جس حد تک تجاویز کی حقیقی حیثیت کا تعلق ہے میں کہتا ہوں کہ گاندھی جی جو کچھ پیش کر رہے ہیں یہ محض سایہ ہے، چھلکا ہے، پولا ہے، لنگڑا، اپاہج اور کرم خوردہ پاکستان ہے۔

آپ سوچیں اور غور کریں کہ کیا اس شدید مذمت کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ پنجاب اور بنگال کے مقطوع حصوں کو یا آسام کے پورے صوبے میں سے ایک ضلع سلہٹ کو لینے کی حامی تھی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ دنیا کے کسی ہوش مند آدمی کی رائے یہ ہو سکتی ہے، لیکن ذرا ٹھہریے! اس سے واضح تر اور روشن ثبوت آگے آتا ہے۔

اس کے بعد گاندھی جی اور مسٹر جناح میں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو ستمبر ۱۹۴۴ء میں تین ہفتے تک بمبئی میں جاری رہا۔ ۲۴ر ستمبر کو گاندھی جی نے مندرجۂ ذیل تجویز پیش کی تھی۔

(۱) میں اس بنیاد پر چلتا ہوں کہ ہندوستان میں دو یا اس سے زیادہ قومیں آباد نہیں ہیں بلکہ اسے ایک ایسا گھرانا سمجھنا چاہیے جس کے کئی ممبر ہوں۔

(۲) ان میں سے وہ مسلمان باقی ہندوستان سے الگ رہنا چاہتے ہیں جو شمالی و مغربی حلقے یعنی بلوچستان، سندھ، صوبہ سرحد میں رہتے ہیں یا پنجاب کے ان اضلاع میں جہاں انھیں دوسرے عناصر پر مطلق اکثریت حاصل ہے یا مشرقی حلقے میں بنگال و آسام کے

ان اضلاع میں جہاں وہ مطلق اکثریت کے مالک ہیں۔

(۳) ان علاقوں کا تعین ایک کمیشن کے ذریعے کیا جائے۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی منظوری حاصل ہو۔ ان کے باشندوں کی مرضی بالغوں کی حق رائے دہندگی یا کسی دوسرے ذریعے سے معلوم کرلی جائے۔

(۴) اگر اکثریت کی رائے علاحدگی کے حق میں ہو تو ہندوستان جوں ہی غیر ملکی اقتدار سے نجات پائے جلد از جلد علاقوں کو آزاد اور خود مختار بنا دیا جائے۔

(۵) علاحدگی کا ایک معاہدہ ہو جائے جس کے مطابق امورِ خارجہ، دفاع، داخلی وسایل حمل و نقل، کسٹم، تجارت وغیرہ کا اطمینان بخش انتظام ہو اور ان معاملات سے معاہد فریقوں کا یک ساں مفاد وابستہ ہو۔

فرمایئے! اب جو حاصل کیا گیا ہے وہ اس سے کس بنا پر مختلف ہے۔ کیا پنجاب و بنگال کے اضلاع کا فیصلہ اسمبلی کے ممبروں نے نہیں کیا؟ کیا سرحد اور سلہٹ میں استصواب رائے عامہ پر عمل نہیں رہا؟ کیا بلوچستان والوں کی رائے نہیں لی گئی اور وہی علاقے جو علاحدہ نہیں ہوئے تھے اب علاحدہ کیے جا رہے تھے؟ یہاں تک کہ پنجاب کا وہ ضلع ہی مسلمانوں کے حصے میں آرہا ہے جہاں کی آبادی پچاس اور اکیاون فیصدی کے درمیان ہے۔ یہی حالت بنگال میں کھلنا اور دیناج پور کے متعلق پیش آئی۔

اس تجویز کے علاوہ گاندھی جی نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر یہ منظور نہ ہو تو فرما دیجیے کہ ۱۹۴۰ء والی قرارداد کے مطابق مجھے کیا کچھ ماننا چاہیے تاکہ اس کو کانگریس سے منوانے کی کوشش کروں؟

اس کے جواب میں مسٹر جناح نے کیا فرمایا؟ یہ کہ آپ (گاندھی جی) نہیں مانتے کہ پاکستان دو حلقوں پر مشتمل ہوگا۔ شمال مغربی، شمال مشرقی۔

یہ حلقے چھ صوبوں پر مشتمل ہوں گے یعنی سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد، پنجاب، بنگال اور آسام اور ان میں صرف اس حد تک خفیف علاقہ جاتی ترمیم ہو سکتی ہے جس پر اتفاق ہو جائے، جیسا کہ قرارداد لاہور میں کہا گیا ہے۔

محض یہی نہیں بلکہ پنجاب، بنگال اور آسام میں سے صرف مطلق اسلامی اکثریت

والے اضلاع کو حق علاحدگی دینے کی تجویز کے متعلق فرمایا:

اگر اس کو مان لیا جائے اور اس پر عمل ہو تو صوبوں کی موجودہ حدیں کٹ جائیں گی۔ ان پر ناقابل تلافی انقطاع کا عمل جاری ہوگا اور ہمارے پاس پاکستان کا (محض چھلکا) رہ جائے گا۔ یہ تجویز قرارداد لاہور کے سراسر خلاف ہے۔

ان واضح اور روشن الفاظ کو سامنے رکھ کر بتائیے کہ کیا وہ ناشدنی بات بے تکلفی سے قبول نہ کی گئی؟ اور مصیبت یہ ہے کہ اس پر اظہار ماتم یا اعتراف مجبوری کے بجائے یوں خوشیاں منائی جاری ہیں کہ گویا مقصود حقیقی یہی تھا۔ کیا دو بڑے صوبوں میں سے بارہ بارہ اضلاع اور ایک صوبے میں سے ایک کے سوا سب کاٹ کر علاحدہ کر دینے کو ''خفیف علاقہ جاتی ترمیم'' کہا جا سکتا ہے؟ اور اگر ''یہ خفیف علاقہ جاتی ترمیم'' ہے--- تو اس کو ۱۹۴۴ء میں کیوں نہیں منظور کر لیا گیا تھا اور آج بے شمار جانی اور مالی نقصان کے بعد کیوں اس حقیقت کا انکشاف ہو رہا ہے کہ یہ خفیف علاقہ جاتی ترمیم ہے؟

(انقلاب: ۷ر جولائی ۱۹۴۷ء، بہ حوالہ کاروانِ احرار: ج ۸: ص ۱۸-۳۱۱)

چودھری رحمت علی کا ردِ عمل:

۱۹ر جون ۱۹۴۷ء کو چودھری رحمت علی نے پنجاب کی تقسیم کی بنیاد پر قایداعظم کے قیامِ پاکستان کو قبول کر لینے پر ایک سخت بیان جاری کیا ہے۔ بعد میں یہ بیان نظر ثانی کے بعد کتابچے کی شکل میں (The Greatest Betrayal) عظیم غداری سے ملت کو کیسے بچایا جائے؟ کے عنوان سے شایع کیا گیا۔ اس طرح پنجاب سے اس کے آدھے حصے کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے برطانیہ اور ہندوؤں کی سازش ہے اور ملت کے ساتھ عظیم غداری اور بے وفائی ہے۔ (نقاش پاکستان، چودھری رحمت علی از محمد اعظم چودھری، ۱۹۹۲ء: ص ۲۶)

محمد فاروق قریشی ایڈووکیٹ لاہور نے اس کا ایک طویل اقتباس ''مولانا ابوالکلام آزاد اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی سیاست'' میں نقل کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:-

> ''یہ مکمل بے وفائی ہے، سودے بازی ہے اور مسٹر جناح نے ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے، جس نے برطانوی منصوبے کو مان کر تمام قوموں اور ملکوں کی بنیاد کو بکھیر دیا

ہے اور برعظیم کے دس کروڑ مسلمانوں کا مستقبل سبوتاژ کردیا ہے..... ہم آخر وقت تک جنگ جاری رکھیں گے۔ ہم نہ چھوڑیں گے نہ ہی ہتھیار ڈالیں گے...... ہمارے متعلق یہ کبھی نہیں کہا جائے گا جب ملّت کے لیے عظیم تر معرکہ آرائی اور عظیم تر بے وفائی کے درمیان انتخاب کا موقع آیا..... ہم نے بھی غداروں کی تقلید کی اور بے وفائی کی۔'' (ص ۶۷-۵۶۶)

جناح صاحب کی تقسیم پر رضامندی سے سر یامین کا اختلاف:

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر سر محمد یامین اپنی کتاب ''نامۂ اعمال'' حصۂ دوم کے ص ۱۲۹۱ پر لکھتے ہیں:

''شملہ میں ایک اخباری نامہ نگار (مسٹر شرما) نے مجھے یہ خبر سنائی کہ پنجاب کی تقسیم کا معاملہ انگریز گورنر سر ایون جینکس کی اسکیم کے مطابق طے پاچکا ہے۔ یعنی سترہ ضلع پاکستان کو اور بارہ ضلع ہندوستان کو ملیں گے۔ یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ قائداعظم اس پر کیوں کر رضا مند ہو سکتے ہیں؟ یہ تو اقتصادی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہے اور مشرقی جالندھر کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ یہاں کے مسلمان لاہور کے علاوہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور اس سے ملحق کپورتھلہ ریاست میں پچہتّر فیصد مسلمان ہیں اور مالیرکوٹلہ ریاست مسلمانوں کی ہے اور وہاں کی آبادی سب مسلمان ہے۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ قائداعظم نواب ممدوٹ سے مشورہ کیے بغیر ایسی تقسیم کو کیسے منظور کریں گے؟''

لیکن بعد میں نامہ نگار کی اطلاع درست نکلی۔

باؤنڈری کمیشن کا تقرر:

باؤنڈری کمیشن کا قیام مسٹر محمد علی جناح کی رضامندی سے اور اس کے سربراہ ریڈکلف کا تقرر ان کی تجویز پر کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ماؤنٹ بیٹن کی منشا اور ہندو سازش کے تحت بعض علاقے پاکستان کو دینے کے بجائے ہندوستان کے نقشے میں شامل کردیے

تھے، لیکن ایسی کوئی شکایت اور احتجاج کمیشن کے سامنے کیا گیا تھا، نہ اخبارات میں کیا گیا تھا۔ جناح صاحب نے کمیشن کے مغربی پاکستانی دو ممبران نے ان سے شکایت ضرور کی تھی۔ بلکہ انھوں نے کمیشن سے الگ ہو جانے کا ارادہ بھی کیا تھا، لیکن جناح صاحب نے ان کی ہمت افزائی نہیں کی تھی اور اپنے کھوے سکوں اور غیر مخلص دوستوں پر عدم اعتماد کا اظہار کر کے بات کو اٹھانے اور آگے بڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ افواہ درست نہیں۔ کمیشن کے بعض مسلمان ممبران کی شکایت غلط اور اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کی پیش بندی ہو سکتی ہے۔ اور اگر صحیح ہوئی تب بھی جناح صاحب کیا کر لیتے؟ نتیجہ یہ ہوتا کہ سارا کھیل بگڑ جاتا، جواب وہ نہیں چاہتے تھے جو منصف انھیں کا انتخاب تھا اس پر کیوں کر عدم اعتماد اور بد دیانتی کا اعزام لگاتے! انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے کو سر ہلا کے جس طرح قبول کر لیا تھا اب بھی اس کی رائے سے سرِ مو انحراف نہ کرتے۔

تقسیم کے عمل کے لیے ریڈ کلف کا تقرر:

ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے کے مطابق پنجاب اور بنگال کا بٹوارہ ہونا تھا، لیکن تقسیم کی لکیر کہاں سے گزرے، اس کا فیصلہ وایسرائے نے نہیں کیا تھا۔ نہرو اور جناح کو احساس تھا کہ اگر اس مسئلے کو انھوں نے خود حل کرنا چاہا تو کسی بات پر اتفاق نہ ہو سکے گا۔ بہتر یہ ہوگا کہ نئی سرحدیں قایم کرنے کا کام باؤنڈری کمیشن کو سونپ دیا جائے، جس کے چیرمین کے منصب کو کوئی مشہور انگریز سنبھالے جو ہندوستان کی سرزمین اور تہذیب اور موجودہ سیاست سے پہلے سے واقف نہ ہو اور فریق نہ بن سکے!

چناں چہ انگلستان کے لارڈ چانسلر نے سر سایرل ریڈ کلف کو بلوا کر ان سے کہا: بیرسٹر کی حیثیت سے آپ کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان سے آپ کا کبھی واسطہ نہیں رہا۔ اس کام کے لیے آپ سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

ریڈ کلف یہ جانتا تھا کہ علاقوں کو بانٹنے کا کام کتنا مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ ایسا کام خواہ کتنی ہی خوبی سے کیوں نہ کیا جائے دونوں طرف سے گالیاں اور کوسنے ہی سننے کو ملتے ہیں۔

بہ ہر حال ریڈکلف انگریز تھا اور جب اسے ملک وقوم کا واسطہ دیا گیا تو اس نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔

اس ملاقات کے صرف ایک گھنٹہ کے بعد وہ انڈیا آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ انڈر سیکریٹری نے ہندوستان کا نقشہ پھیلایا اور انگلی کے اشارے سے بتایا کہ دریائے گنگا کہاں سے نکلا اور کہاں گیا۔ پنجاب کہاں ہے اور بنگال کہاں؟ ہمالیہ پہاڑ کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ریڈکلف کو پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ جن صوبوں کو انھیں تقسیم کرنا ہے، وہ کتنے بڑے ہیں۔ آٹھ کروڑ اسّی لاکھ کی آبادی......ان کے گھر، کھیت، رشتے، کارخانے، ریلیں اور سڑکیں سب کو کاٹ کر الگ کر دینا تھا۔ ایک لاکھ پچھتر ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے دو عظیم صوبے، ان کی دھڑکنیں، تہذیب، امنگیں، پیار ومحبت کی رسمیں، فصلیں، ندیاں، نالے، میدان اور دلدل اور ان کا سب کچھ جو اس وقت میز پر ایک نقشے کی صورت میں سمٹا ہوا تھا، اسے ایک سفید لکیر کے ذریعے الگ ہونا تھا۔

ساری ذمہ داری سمجھ لینے کے بعد ریڈکلف کی ملاقات برطانیہ کے وزیر اعظم اٹیلی سے کرائی گئی۔ ہندوستان سے روانہ ہونے سے قبل آخری ہدایات ان سے مل جانے کے بعد وہ نئی دہلی سے پرواز کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے......

دلّی آتے وقت ریڈکلف کو بہ خوبی اندازہ تھا کہ جو کام اُسے سونپا گیا ہے وہ آسان نہیں ہے، لیکن سب سے بری مشکل یہ تھی کہ اس مشکل کام کو پورا کرنے کے لیے وقت بہت کم تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے واضح کر دیا تھا کہ بٹوارے کی لکیر کو ۱۵ راگست تک متعین ہو جانا چاہیے۔

ریڈکلف نے وایسرائے کو خبردار کر دیا تھا کہ اتنی عجلت کرنے سے غلطیاں ہونے کا اندیشہ رہے گا۔

وایسرائے نے جواب دیا کہ دونوں ملکوں کو پندرہ اگست تک بٹوارے کی لکیر کی اتنی سخت ضرورت ہے کہ اس میں خواہ کتنی ہی خرابیاں ہوں وہ جہاں سے گزرے گی وہ اسے منظور کر لیں گے۔

ریڈکلف منکسف مزاج تھا، وایسرائے کی یقین دہانی کے باوجود اس نے الگ الگ

نہرو اور جناح دونوں سے ملاقات کی اور پوچھا کہ کیا واقعی پندرہ اگست ۱۹۴۷ء تک بٹوارے کی لکیر کھینچ جانا چاہیے، خواہ اس میں کتنی خرابیاں ہوں؟

دونوں کے جواب میں الفاظ کا فرق تھا مگر مفہوم ایک تھا۔

خرابیاں ہم نبھالیں گے لیکن تاخیر کا علاج ہمارے پاس نہیں۔

ریڈکلف جہاں بھی جاتا ہندو اور مسلمان اُسے گھیر لیتے اور اسے متاثر کرنے کی کوشش کرتے، ریڈکلف کے ایک قلم کی جنبش انھیں جما سکتی تھی یا اُکھاڑ سکتی تھی۔ اس بات سے وہ بہ خوبی واقف تھے، اس لیے اُسے خوش کرنے کے لیے وہ کسی حد تک جانے کو تیار رہتے تھے۔ فضول بحثیں سن سن کر ریڈکلف کا دماغ پک جاتا تھا۔ لوگوں سے دور رہنے کا موقع صرف رات کو ملتا تھا جب وہ پنجاب کلب میں آ پہنچتا تھا۔ جو صرف گوروں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں بیٹھ کر اپنے آئی سی ایس افسروں کی مدد سے وہ جیسا بن پڑتا، فیصلہ کرتا۔

اب ڈسپیچ باکس سے کاغذات نکالنے کا وقت آ گیا تھا۔ دونوں فیلا لفافے ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھ میں تھے، ہر لفافے میں برصغیر ہند کے نئے نقشوں کا ایک ایک سیٹ تھا۔ اس کے ساتھ تقریباً دس ٹایپ شدہ صفحات پر مشتمل ایک مسودہ تھا۔ یہ انگلستان کی طرف سے ہندوستان کو دیا جانے والا آخری دستاویز تھی۔

ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خاں دونوں کو ایک ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ دونوں الگ الگ کمروں میں بیٹھ کر ان نقشوں کا مطالعہ کیجیے اور تقریباً دو گھنٹے بعد مشترکہ جلسے کے لیے واپس آ جایئے۔

دونوں لیڈر جب واپس آئے تو ان کے چہرے پر غصے اور بیزاری کے آثار تھے۔ یہ حال دیکھ کر ماؤنٹ بیٹن کو یقین ہو گیا کہ سر سیریل ریڈکلف نے اپنا تکلیف دہ کام مکمل غیر جانب داری کے ساتھ انجام دیا ہے، اسی لیے دونوں لیڈر یک ساں برہم ہیں۔

بٹوارے کی لکیر کھینچتے وقت سایرل ریڈکلف کو جن باتوں کو ذہن میں رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی، ان سب باتوں کا اس نے بڑی ایمان داری سے لحاظ رکھا تھا۔ اِکّے دُکّے جھگڑوں کو چھوڑ کر اس نے سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی تھی کہ آبادی کی اکثریت کا مذہب کیا ہے؟.........

پنجاب کے بٹوارے کی لکیر کھینچتے وقت ریڈکلف کو سب سے زیادہ تکلیف اُٹھانی پڑی۔ یہ سرحد، کشمیر کے قریب ایک جنگل سے شروع ہوتی تھی اور جہاں جہاں ممکن تھا سرحد نے راوی اور ستلج کا پیچھا کیا۔ لاہور پاکستان کو ملا اور امرتسر اپنے سنہرے مندر کے ساتھ ہندوستان کے حصے میں آیا۔

جیسا کہ شروع سے ظاہر تھا کہ بٹوارے کی لکیر نے سکھوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

جہاں جہاں ریڈکلف نے کسی وجہ سے آبادی کی اکثریت کے مذہب کا لحاظ نہیں رکھا تھا وہاں بٹوارے کی لکیر نے جھگڑے کھڑے کیے۔ پنجاب کے شمال میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے گورداس پور، وہاں ریڈکلف نے راوی ندی کی حد کو بٹوارے کی سرحد مانا۔ جس کی وجہ سے گورداس پور اور اس سے ملحق کئی مسلمانوں کے گاؤں ہندوستان میں آگئے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو پاکستان کا ایک چھوٹا سا حصہ خنجر کی شکل میں ہندوستان کے اندر آجاتا۔ یہ بات ریڈکلف نے مناسب نہیں سمجھی۔

لیکن ریڈکلف کا یہ وہ فیصلہ تھا جس کے لیے پاکستان کے لاکھوں لوگوں نے ریڈکلف کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اگر ریڈکلف نے گورداس پور پاکستان کو دے دیا ہوتا تو جناح کو ایک چھوٹا سا گندا شہر ہی نہ مل جاتا بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ سوغات مل جاتی جسے جنت نظیر کہا جاتا ہے۔ گورداس پور ہندوستان کو ملا۔ اگر وہ نہ ملتا تو کشمیر سے آمد و رفت کا کوئی راستہ ہندوستان کے پاس نہ ہوتا۔ ایسی صورت میں کشمیر کے ہندو راجہ ہری سنگھ کے پاس پاکستان سے انضمام کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ریڈکلف کے دل میں جانب داری یا شرارت کا جذبہ نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے بٹوارے کی لکیر جس طرح کھینچی اس کی وجہ سے کشمیر کی کنجی گورداس پور ہندوستان کے ہاتھ میں آگئی۔ اس بنیاد پر کشمیر پر دعویٰ جتانے کی خواہش ہندوستان کے دل میں جاگ سکتی تھی۔

سائرل ریڈکلف زبردست حفاظتی انتظامات کے ساتھ انگلستان واپس جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے آئی۔ سی۔ ایس افسروں نے اس کی آخری خدمت یہ کی کہ ریڈکلف کے ہوائی جہاز کی مکمل تلاشی لی گئی تاکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ اس میں کوئی بم تو نہیں چھپا ہے۔

ریڈکلف کو بہ خوبی یہ معلوم تھا کہ اس نے جو سرحدیں قایم کی ہیں ان کی وجہ سے مصیبتیں آئیں گی اور خون خرابے کی نوبت آئے گی۔ وہ بے حد اُداس تھا، لیکن وہ اپنے آپ کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔ بٹوارے کی لکیر جہاں سے بھی گزرتی انجام وہی ہونا تھا۔

سایرل ریڈکلف کے تقرر کے وقت نہرو اور جناح دونوں نے یقین دلایا تھا کہ اس کے فیصلے نہ صرف وہ آخری مانیں گے بلکہ اسے بہ خوبی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے، لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد اس کے جو حصے ان لیڈروں کو پسند نہیں آئے ان پر انھوں نے کڑی نکتہ چینی شروع کر دی۔

لندن لوٹ کر ریڈکلف نے وکالت شروع کر دی، لیکن بہ طور احتجاج اس نے دو ہزار پاؤنڈ کی وہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا جو سرحدیں قایم کرنے کے لیے اس کا محنتانہ مقرر ہوا تھا۔

ریڈکلف نے جو سرحدیں قایم کی تھیں وہ شایع ہو چکی تھیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ بے سہارا لوگوں کی ٹولیاں پگڈنڈیوں سے، نہروں کے کنارے، کھیتوں کے منڈیروں سے سڑکوں اور ریلوے لائنوں سے چل پڑیں۔

جن مسلمانوں نے پاکستان کے قیام پر خوشی کے مارے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا انھیں معلوم ہوا کہ ان کے گاؤں ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ جن سکھوں نے ہندوستان کی آزادی کا جشن منایا تھا انھیں اچانک یہ پتا چلا کہ جن کھیتوں کو وہ پیڑھیوں سے جوتتے چلے آئے ہیں وہ اب پاکستان کا حصہ بن چکے ہیں اور اب انھیں جلد از جلد اپنا گھر بار چھوڑ کر ہندوستان جانا ہے، کیوں کہ پاکستان میں اب ان کے لیے خطرہ تھا۔

بٹوارے کی حدیں قایم کرنے کی عجلت کے بارے میں ریڈکلف نے جن خطرات کی طرف اشارہ کیا تھا ان کا بھیانک روپ سامنے آ رہا تھا۔ کئی نہریں ایسی تھیں کہ جو ایک ملک سے نکلتی تھیں، لیکن ان کی دیکھ بھال کا دفتر دوسرے ملک میں تھا۔ کئی مقامات ایسے تھے جہاں بٹوارے کی لکیر گاؤں کے بیچ سے ہو کر گزرتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں کی کچھ جھونپڑیاں ایک ملک میں رہ گئیں اور کچھ دوسرے ملک میں چلی گئیں۔ ایک دو بار ایسا بھی

ہوا کہ بٹوارے کی لکیر نے کسی مکان کو بیچ سے کاٹ دیا۔ صدر دروازہ ایک ملک میں اور پچھواڑے دوسرے ملک میں۔ پنجاب کے سارے جیل خانے پاکستان میں آ گئے اور وہاں کا واحد پاگل خانہ بھی۔

ڈاکومنٹ نمبر ۱۰۱ (ٹرانسفر آف پاور: جلد ۱۱)

۷ رجون ۱۹۴۷ء: مسٹر جناح نے تجویز پیش کی کہ حد بندی کمیشن کا چیئرمین ایسے شخص کو ہونا چاہیے جسے حد بندی کے اصولوں کا وسیع تجربہ ہو۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ میں کانگریس کے لیڈروں کو تجویز دوں گا کہ حد بندی کمیشن کے تینوں ممبر یو این او کی طرف سے مہیا کیے جانے چاہییں۔ کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری متعلقہ پارٹیوں کے نمایندے ماہر اسیسر کے طور پر موجود ہوں گے۔ اغلباً تقسیم کی زد میں آنے والے ہر صوبے کے تین نمایندے۔ میں نے مسٹر جناح سے کہا کہ مغربی حد بندی کمیشن کے دائرۂ کار کے بارے میں پیراگراف تجویز کریں جو سکھوں کے حوالے سے ہو۔

میں نے تجویز پیش کی کہ ملک معظم کی حکومت اور دونئی ڈومینینز کے درمیان ایک سہ فریقی معاہدہ طے پانا چاہیے۔ مسٹر جناح نے ''سہ فریقی'' معاہدے پر اعتراض کیا۔ انھوں نے ''دوطرفہ معاہدات...کے مترادف'' الفاظ استعمال کرنے کو ترجیح دی۔

میں نے مسٹر جناح سے کہا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا جو اجلاس ۹ رجولائی کو ہو رہا ہے اس میں جو قرارداد پیش کی جائے گی مجھے اس کے نکات دکھائیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ قرارداد اغلباً مختصر ہوگی اور اس میں مندرجہ ذیل نکات شامل ہوں گے۔

(الف) ہم اس منصوبے کو مسئلے کا واحد حل جان کر قبول کرتے ہیں۔

(ب) ہم نے متحدہ ہندوستان پر کبھی اتفاق نہیں کیا۔

(ج) ہم پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ ہم جب منصوبے پر غور کرتے ہیں تو اسے مجموعی طور پر پیش نظر رکھنا پڑے گا۔

اس موقعے پر بھاول پور کے دیوان بھی آ گئے اور انھوں نے پنجاب کی تقسیم کی صورت میں ریاست کو پیش آ سکنے والی مشکلات کی تفصیل بتائی۔ یہ دشواریاں زرعی ضروریات کے لیے پانی کی سپلائی سے متعلق تھیں۔ میں نے سر ایرک میویل سے کہا کہ وہ ان سے رابطہ

رکھیں۔ انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ریاست کے ساتھ موجودہ معاہدات مزید پانچ سال کی مدت تک قایم رہنے چاہییں۔

مسٹر جناح کی بچی تلی رائے تھی کہ جانشین اتھارٹیز ریاست کے ساتھ موجودہ معاہدات پر قایم رہنے کی قانونی طور پر پابند ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس پر کانگریس کے رہنماؤں سے گفتگو کروں گا اور اس مسئلے پر رولنگ کے لیے سیکرٹری آف اسٹیٹ سے کہوں گا۔ (تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: ص ۲۸-۲۷)

محمد علی جناح - گورنر جنرل پاکستان

ایک غلط اقدام:

جون ۱۹۴۷ء کے آخر تک گورنر جنرل کے مسئلے پر کسی لیگی نے غور نہ کیا تھا کہ پاکستان کا گورنر جنرل کون ہوگا؟ چودھری خلیق الزماں لکھتے ہیں:

''شروع جولائی میں میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مسٹر گورمانی نے مجھے نواب بھوپال کے یہاں ڈنر پر بتایا کہ مسلم لیگ کے مطالبے کی وجہ سے مسٹر جناح پاکستان کے گورنر جنرل ہوں گے اور جب یہ خبر عام طور پر مشہور ہوگئی تو مسلمانوں نے بھی عام طور پر یہی محسوس کیا کہ مسلم لیگ کا یہ بہت غلط اقدام ہے اور مسٹر جناح کو کسی حالت میں ایسا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے تھا...... میں اس نظریے کے اس وقت بھی خلاف تھا اور آج بھی ہوں! کیوں کہ اس ہول ناک دور میں اتنی عظیم ذمے داری اپنے سر لے کر مسٹر جناح نے برٹش حکومت کے امن وامان کے قیام کے بار کو ان کے سر سے اٹھا کر اپنے سر لے لیا۔''

(شاہراہ پاکستان: ص ۱۰۵۹)

ماؤنٹ بیٹن کو وایسرائے شپ کی پیش کش:

جواہر لال نہرو نے جو تجویز ماؤنٹ بیٹن کے سامنے رکھی اس سے بہتر تجویز کسی انگریز کے سامنے کسی ہندوستانی نے نہ رکھی ہے نہ رکھی جاسکے گی۔ سامراج کی تاریخ میں اس کی مثال ڈھونڈھے سے نہیں ملے گی۔

وایسرائے کی مطالعہ گاہ میں جہاں دونوں نے کتنی ہی کش مکش کی گھڑیاں ساتھ گزاری تھیں، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کو وہ منصب پیش کیا تھا جس سے بڑا عہدہ آزاد ہندوستان پیش نہیں کرسکتا تھا۔ یعنی ہندوستان کے گورنر جنرل کا عہدہ!

دیگر الفاظ میں آزاد ہندوستان نے وائسرائے کے جو اختیارات چھینے تھے وہ دوسری صورت میں اسے واپس کیے جا رہے تھے۔

اس معاملے میں صرف پنڈت نہرو نے ہی پہل نہیں کی تھی بلکہ ان کے سیاسی رقیب جناح نے بھی ماؤنٹ بیٹن سے اصرار کیا تھا کہ وہ پندرہ اگست کے بعد ایک اعلا منصب کی حیثیت سے ہندوستان میں رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جناح کے دل میں یہ شبہ تھا کہ تقسیم کے بعد ہندوستان سے پاکستان کو اپنا حق اور حصہ ملنے میں دشواری ہوگی، اس لیے وہ یہ چاہتے تھے کہ سارا حساب کتاب اور لین دین ختم ہونے تک اگر ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان میں موجود رکھا جا سکے تو یہ اندیشہ دور ہو جائے گا۔.......

دوسری بات یہ تھی کہ جب تک ایسی ہی پیش کش جناح کی طرف سے بھی نہ ہو وہ اپنے منصب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تھے، لیکن جناح یہ جانتے تھے کہ ان کی زندگی بہت تھوڑی رہ گئی ہے، وہ خود اس ریاست کے اعلا ترین منصب کو حاصل کرنے کے خواہش مند تھے جس کے قیام کے لیے انھوں نے جان توڑ محنت کی تھی۔

انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کو بتایا کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل وہ خود بننا چاہتے ہیں۔

ماؤنٹ بیٹن نے کہا:

> ''لیکن یہ آپ کی بھول ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں نے انگلستان کے نمونے کا جمہوری نظام اختیار کیا ہے، اس میں حکومت کے سارے اختیارات وزیراعظم کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، گورنر جنرل تو برائے نام اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔''

اس دلیل کا جناح صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انھوں نے سرد مہری کے ساتھ جواب دیا:

> ''پاکستان کا گورنر جنرل میں بنوں گا اور وزیراعظم کو وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔''

لیکن نہرو کی پیش کش اتنی عظیم تھی کہ اس سے صرف ماؤنٹ بیٹن کی نہیں بلکہ سارے انگلستان کی عزت افزائی ہوتی تھی۔ ایٹلی اور چرچل کے علاوہ انگلستان کے شہنشاہ نے بھی ماؤنٹ بیٹن کو یہ پیغام بھجوایا کہ ماؤنٹ بیٹن کو نہرو کی پیش کش قبول کر لینا چاہیے۔ جناح نے

بھی اس کی تائید کی۔ (آدھی رات کی آزادی: ص ۴۳-۱۴۱)

گورنر جنرل پاکستان کا تقرر:

ڈاکومنٹ نمبر ۵۰۰: ریئر ایڈمرل واسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کا مراسلہ مسٹر جناح کے نام۔ آر/۳/۱/۱۶۲: ایف ۲۷

۴ر جولائی ۱۹۴۷ء

ڈیئر مسٹر جناح!

میں آپ کا ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے جانشین اتھارٹی کی طرف سے گورنر جنرل پاکستان کے نام کی تحریری سفارش کریں، تاکہ میں اسے باقاعدہ طور پر بادشاہ کے سامنے پیش کر سکوں۔

جیسا کہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں یہ نام لازمی طور پر آج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں گا اگر آپ مجھے اس کا جواب فوراً ارسال فرمائیں۔

آپ کا مخلص

ماؤنٹ بیٹن آف برما

ڈاکومنٹ نمبر ۵۰۶: وائسرائے کی ذاتی رپورٹ نمبر ۱۱

ایل/پی. او/۶/۱۲۳: ایف ایف ۶۳-۱۰۰ (انتہائی خفیہ)

۴ر جولائی ۱۹۴۷ء:

(اس میں سے پاکستان کے گورنر جنرل کے تقرر کے بارے میں حصے دیے جا رہے ہیں)

۲۱۔ لارڈ اسمے کے آنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ وزیر اعظم اور کابینہ کمیٹی کے سامنے مشترکہ گورنر جنرل کے مسئلے کو رکھیں، جس کی وجہ سے میں اپنے آپ کو بڑی مشکل میں گرفتار محسوس کرتا ہوں۔ یہ یاد ہوگا کہ میں نے کابینہ کمیٹی کو لکھا تھا (ڈاکومنٹ نمبر ۴۹۴ جلد دہم) کہ نہرو نے مجھ سے تحریری استدعا کی ہے کہ میں ہندوستان کا بدستور گورنر جنرل رہوں، اسی طرح مسٹر جناح مسلسل مجھ پر زور دیتے رہے کہ جب تک تقسیم کا کام مکمل نہیں ہوتا میرا اس عہدے پر فائز رہنا بہت ضروری ہے۔ میں کانگریس کو رضامند کر سکتا ہوں (اگرچہ یہ کام

مشکلات کے بغیر ممکن نہیں)۔ مجھے پاکستان کی طرف سے ایسی ہی پیش کش کی لازمی توقع تھی تاکہ میں تقسیم کے دوران کے عرصے میں دونوں ڈومینز کے مفادات کی نگہبانی غیر جانب دارانہ طور پر کرسکوں۔

۲۲۔ میرے لندن جانے سے پہلے مسٹر جناح نے مجھ سے کہا تھا کہ اگرچہ ان کا خیال تھا کہ ایک کی بجائے دو گورنرز جنرل زیادہ بہتر طور پر کام کرسکیں گے، لیکن انھوں نے مجھے بہ طور خاص کہا تھا کہ میں ان دونوں گورنرز جنرل کے اوپر ایک سپریم گورنر جنرل کا منصب سنبھالوں۔ (ڈاکومنٹ نمبر ۴۷۳ جلد دہم)۔ اس دن سے آج تک انھوں نے مجھ پر اور میرے عملے پر بار بار زور دیا کہ ہم سب یہاں رہ کر تقسیم کا کام منصفانہ طور پر طے پانے کی نگرانی کریں اور ہم سب نے مسلسل ان کو جواب دیا کہ یہ کام اسی صورت میں اطمینان بخش طریقے سے انجام پاسکتا ہے جب کہ میں خود مشترکہ گورنر جنرل کے طور پر فرائض ادا کروں اور آپ کی خوش قسمتی ہے کہ کانگریس پہلے ہی اس طریقے سے اتفاق کرچکی ہے۔

۲۳۔ گذشتہ تین ہفتوں سے ہم مسٹر جناح سے جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر میں انھوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ جب تک وہ بل کو دیکھ نہیں لیتے اس وقت تک کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ جب انھوں نے بل دیکھ لیا تو بھی جواب نہیں دیا اور کہا کہ وہ اپنے دو دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیں گے اور یہ دونوں اس وقت ریفرنڈم میں مصروف ہونے کی وجہ سے یہاں موجود نہیں ہیں۔ آخرکار وہ میرے پاس آئے ''تاکہ مجھ سے مشورہ حاصل کریں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔'' انھوں نے کہنا شروع کیا کہ وہ پاکستان کے ہر صوبے میں برطانوی گورنر رکھنے کے خواہش مند ہیں، سوائے سندھ کے۔ یہاں کا گورنر مسلمان ہوسکتا ہے، کراچی میں جس کی وہ خود ذاتی طور پر نگرانی کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ وہ پہلے ہی تینوں (بری، بحری اور ہوائی) افواج پاکستان کے سربراہان انگریز بنا چکے ہیں اور کہا کہ انگریز افسروں کو ملازم رکھنے پر پاکستانیوں کو مطمئن کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ خود گورنر جنرل بنیں۔

۲۴۔ انھوں نے کہا کہ وہ یہ قدم اٹھانے کے خواہش مند نہ تھے لیکن ان کے تین چار گہرے دوستوں اور ہم کاروں نے جن سے انھوں نے مشورہ کیا تھا، اس پر مجبور کیا۔ جیسا

کہ نواب بھوپال ان کے اصلی دوست اور مشیر ہیں، انھوں نے تین یوم قبل مجھے بتایا کہ جناح نے اس مسئلے پر بہ طور خاص ان سے مشورہ کیا اور نواب بھوپال نے ان سے کہا تھا کہ ان کے خیال میں مشترکہ گورنر جنرل اور ان کے ساتھ برطانوی ٹیم کی تجویز کو مسترد کرنا حماقت ہوگی، جو ۳۱ر مارچ ۱۹۴۸ء تک تقسیم کے کام کی تکمیل کی نگرانی کرے گی (جو کہ تقسیم کا کام مکمل ہونے پر ختم ہو جائے گی) اور یہ بالکل واضح ہے کہ اس سے لیاقت علی خاں کو بھی پورا اتفاق تھا۔ میں یہ سوچ کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ مسٹر جناح جس مشیر کی بات پر کان دھرتے ہیں وہ صرف جناح ہی ہے۔

۲۵۔ وہ بڑائی کے خبط میں بری طرح مبتلا ہیں۔ جب میں نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ اگر وہ آئینی گورنر جنرل بنتے ہیں تو ان کے اختیارات محدود ہوں گے، لیکن وزیرِ اعظم بن کر پاکستان کو اچھے طریقے سے چلا سکیں گے۔ تو انھوں نے اس حقیقت کو بیان کرنے میں ذرہ برابر پس و پیش سے کام نہیں لیا کہ ان کا وزیرِ اعظم وہی کچھ کرے گا جس کا وہ کہیں گے۔ ''میری پوزیشن یہ ہے کہ میں مشورہ دوں گا اور دوسرے اس پر عمل کریں گے۔''

۲۶۔ تب مجھے یہ خیال آیا کہ بل میں ایک شق شامل کی جائے، جس کی رو سے پاکستان میں ایک قایم مقام گورنر جنرل مقرر کرنے کی گنجایش رکھی جائے کہ جب گورنر جنرل اس ڈومینین کی حدود میں نہیں ہوگا تو قایم مقام گورنر جنرل کام کرے گا۔ کانگریس کی میٹنگ بل پر غور کرنے کے سلسلے میں ہو رہی تھی، اس میں یہ تجویز منظور کر لی گئی، تب مسلم لیگ کے نمایندوں کی میٹنگ میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔

۲۷۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر جناح نے مجھ پر اس مسئلے پر وار کیا کہ اگر ہندوستان ثالثی ٹربیونل کے ایوارڈ پر عمل نہ کرے تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے اور پاکستان کو اثاثہ جات میں سے منصفانہ حصہ دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اتفاق کی بات ہے کہ تقریباً تمام اثاثہ جات انڈین یونین کی سرزمین پر پڑے ہوئے ہیں۔ اس پر مسٹر جناح کے معتمد خاص کی موجودگی میں مجھے یہ کہنے کا اچھا موقع مل گیا کہ تقسیم کے منصوبے میں پاکستان کے مفادات کے تحفظ کے لیے مشترکہ گورنر جنرل اور برطانوی عملے کی تدبیر رکھی گئی ہے، اس پر دونوں بھروسا کر سکتے ہیں کہ کام انصاف کے ساتھ ہوگا۔

۲۸۔ میں نے ان کو بتایا کہ کانگریس نے اس سسٹم سے اتفاق کیا تھا اور مجھے گورنر جنرل نام زد کر دیا تھا۔ میں نے اور میرے برطانوی عملے نے ۳۱ر مارچ تقسیم کی مدت کے اختتام تک کام کرنے پر رضا مندی ظاہر کردی تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے خوشی تھی کہ تقسیم کا زیادہ تر کام دہلی میں بیٹھ کر سرانجام پائے گا اور کراچی جانے کے لیے میں بہت کم وقت نہ نکال سکوں گا، اس لیے میں نے ساڑھے سات ماہ کے لیے قایم مقام گورنر جنرل کی تقرری پر کانگریس کو رضا مند کرلیا تھا اور یہ کہ میں پاکستان کا دورہ قایم مقام گورنر جنرل کے ساتھ باہمی بندوبست سے کروں گا۔

۲۹۔ جناح نے اس تجویز کو قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔ اس کا میں مشکل سے یقین کرسکا تھا کہ اثاثہ جات کی بہ حفاظت تقسیم کے لیے اس قابل عمل طریقے کو مسترد کرنا جناح کا......... ❶ تھا اور طریقے پر کانگریس کو اتفاق تھا کہ ۳۱ر مارچ تک ایک مستقل گورنر جنرل کی بجائے کراچی میں قایم مقام گورنر جنرل مقرر کردیا جائے اور اس کے بعد بہ ہر حال وہ اپنا گورنر جنرل مقرر کریں گے۔

۳۰۔ جناح نے مجھے پختہ یقین کے ساتھ کہا کہ مشترکہ گورنر جنرل کے عدم تقرر کی بنا پر تمام نقصانات کا انھیں پورا ادراک ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں بہ طور وایسرائے یا بالا گورنر جنرل کی حیثیت میں تقسیم کے کام کی نگرانی کروں، لیکن وہ ۱۵ر اگست کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل کے علاوہ کوئی بھی پوزیشن قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

۳۱۔ میں نے ان سے کہا ''آپ کو اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی؟'' انھوں نے افسردہ لہجے میں کہا ''ہوسکتا ہے کہ اس سے مجھے چند کروڑ رُپوں کے اثاثہ جات سے محروم ہونا پڑے۔'' اس پر میں نے کچھ تلخی آمیز جواب دیا ''اس کی آپ کو بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑسکتی ہے جو پورے اثاثہ جات اور پاکستان کے مستقبل کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

۳۲۔ میٹنگ کے سیکرٹری محمد علی نے میرے پی. ایس. وی. (جارج ایبل) کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ اس نے بتایا کہ میٹنگ کے بعد اگلا گھنٹہ میرے بم شیل پر گفتگو پر صرف ہوا، لیکن وہ جناح کو ان کے مؤقف سے دست بردار کرانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد لیاقت علی خاں میرے پاس آئے اور مجھ سے استدعا کی کہ میں دونوں گورنرز جنرل سے بالا گورنر جنرل بننا قبول کرلوں اور یہ جناح کے لیے قابل قبول ہوگا، لیکن مجھے توقع نہیں کہ مسٹر جناح پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بننے کی بڑی خواہش سے دست کشی اختیار کرسکتے ہیں۔ ''خواہ اس کا مطلب یہ کیوں نہ ہو کہ وہ اس کے آخری گورنر جنرل ہوں گے؟'' میں نے لیاقت کو بتایا، انھوں نے اپنے کندھے اُچکائے اور افسردہ لہجے میں کہا ''ہم اپنی بساط کے مطابق قدم اٹھائیں گے، جو کچھ بھی ہو لیکن مجھے توقع ہے کہ آپ ہندوستان میں قیام ضرور کریں گے۔ بہ صورت دیگر صورت حال بڑی خراب ہوگی اور اس کا خمیازہ پاکستان کو بہت زیادہ بھگتنا پڑے گا۔'' اسی طرح جناح نے نہایت خلاف معمول مجھ سے استدعا کی کہ میں ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر حالات پر اثر انداز ہوتا رہوں، انھیں تشویش تھی ہندوستان کی حکومت پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔

۴۳۔ میں اب بڑے گومگو کی حالت میں ہوں۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا تھا کہ میرا ناتہ دونوں مملکتوں سے رہے گا یا پھر کسی سے بھی نہیں۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا کہ دونوں مجھ سے کسی ایک کے ساتھ ناتہ رکھنے کا مشورہ دیں گے۔

۴۴۔ میرا اپنا خیال یہ ہے اور میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اخلاقی طور پر یہ درست نہ ہوگا۔ میں دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ناتہ رکھوں، لیکن بدقسمتی سے مجھے اندیشہ ہے کہ میں نہرو اور کانگریس کی ساری قیادت کو اس راہ پر لگانے میں کامیاب رہا اور وہ مجھے اس پر کبھی معاف نہیں کریں گے کہ جناح کو ایک مرتبہ پھر اپنی ڈگر پر چلنے کی اجازت دے دی۔ اس لیے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے لیے مجھے بہت زیادہ رہنمائی کی ضرورت ہے، میں اسے کو وطن بھیجنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں تاکہ رہنمائی حاصل کی جاسکے۔

ایم.اف برما

(تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار: لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۷ء: ص ۸۴-۷۸۱)

حاشیہ ⓿: اس مقام پر شاید فیصلے کی صفت کے طور پر ایک لفظ تھا جو ماؤنٹ بیٹن کے اشتعال اور غصے کا غماز تھا۔ مترجم و مرتب یا ناشر نے حذف کردیا۔

گورنر جنرل کون؟

اندر خانے یہ بات اپریل ۱۹۴۷ء سے چلی آ رہی تھی کہ ہندو پاک کا گورنر جنرل مشترک ہو یا علاحدہ علاحدہ۔ ماؤنٹ بیٹن کا ارادہ بھانپ کر ۷ رمئی ۱۹۴۷ء کو جواہر لال نہرو نے وایسرائے کو خط لکھا کہ

''کانگریس کو یہ تجویز منظور ہے کہ عبوری دور کے لیے دونوں مملکتوں کا ایک ہی گورنر جنرل ہو۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ آپ یہ عہدہ سنبھال کر اس مشکل دور میں ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے۔''

اس کے جواب میں ماؤنٹ بیٹن نے جواہر لال اور سردار پٹیل کو یقین دلایا کہ اُن کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُن کی تجویز کو منظور کرتا ہوں۔

اس روز ماؤنٹ بیٹن نے محمد علی جناح اور لیاقت علی خاں کو وایسرائے ہاؤس بلا کر اُن کی رائے معلوم کرنی چاہی کہ گورنر جنرل مشترک ہو یا الگ الگ۔ اس کا جواب میں فوری چاہتا ہوں اور ابھی۔ اس پر قایداعظم نے کہا:

''میں ذاتی طور پر تو دونوں آزاد مملکتوں کے لیے دو الگ الگ گورنر جنرل پسند کروں گا۔ باقی فیصلہ مسلم لیگ کونسل کرے گی۔''

کانگریس اور قایداعظم کا ارادہ معلوم کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن لندن چلا گیا۔

لندن سے واپسی پر ماؤنٹ بیٹن کے عملے کے دو ذمے دار افراد لارڈ مے اور سر جوٹل ۲۰ رجون کو اس مسئلے پر بات چیت کے لیے لیاقت علی خاں سے ملے اور انھیں بتایا کہ

''قانونِ آزادی ہند کا مسودہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور آیندہ ہفتے تک ہمیں مل جائے گا۔ دریں اثنا ملک معظم کی حکومت نے ہمیں لکھا ہے کہ ہم آزادی کے بل پر ہندوستان کے لیڈروں کی رائے معلوم کریں گے۔''

(۱) کیا دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل ایک ہی ہوگا؟

(۲) صوبائی گورنروں کے تقرر کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

لیاقت علی خاں نے جواب میں کہا کہ میں جلد ہی اس پر مسٹر جناح سے بات کر کے جواب دوں گا، لیکن ۲۳ رجون تک قایداعظم یا لیاقت علی خاں کی طرف سے کوئی جواب

وصول نہیں ہوا۔ اِسی روز (۲۳ رجون) کو وایسرائے نے قاید اعظم کو گورنر ہاؤس بلا کر بتایا:

''میں ذاتی طور پر آپ کو مجبور نہیں کر رہا، بلکہ مجھے آئینی تقاضوں کی بنا پر یہ دریافت کرنا پڑ رہا ہے کہ گورنر جنرل کے تقرر کے سوال پر مسٹر جناح کا قطعی فیصلہ کیا ہے؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میری ذاتی طور پر یہ طے شدہ رائے ہے کہ ابتدائی ایام کے لیے پاکستان اور ہندوستان کا گورنر جنرل ایک ہی شخص کو ہونا چاہیے، کیوں کہ اس سے بٹوارنے کے کام کرنے میں آسانی ہوگی، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے لیے یہ عہدہ چاہتے ہیں۔
مشترک گورنر جنرل کون ہوگا؟ اس کا فیصلہ پاکستان اور ہندوستان کے لیڈر باہم مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ مگر اس مسئلے کا فوراً فیصلہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اس کا قانونِ آزادی کی ایک دفعہ سے گہرا تعلق ہے۔ اور یہ بل برطانوی پارلیمنٹ میں بحث کے لیے پیش ہو چکا ہے اور اس بل کی منظوری کے بغیر پاکستان اور ہندوستان کو اختیارات منتقل نہیں ہو سکتے۔''

اس مرحلے پر مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح نے جواب میں کہا:

''آپ نے بل کا مسودہ مجھے دکھایا ہی نہیں، لہٰذا اسے دیکھے بغیر میں اپنی رائے کا اظہار کیسے کروں؟ میں سب سے پہلے مسودہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ماؤنٹ بیٹن:

''وہ عن قریب اس بل کا مسودہ دکھا دیں گے، لیکن سوال دونوں ملکوں کے مشترک گورنر جنرل کا ہے۔''

قاید اعظم:

''جہاں تک ذاتی فیصلے کا تعلق ہے اس کا مطلب یہ نہیں لیا جائے گا کہ میں ایکسی لنسی کو گورنر جنرل کی حیثیت سے نہیں چاہتا، لیکن لیگ کونسل کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا، اور میں بہت جلد آپ کو آخری فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔''

چناں چہ ۲ رجولائی ۱۹۴۷ء کو قاید اعظم نے ماؤنٹ بیٹن کو اپنے ارادے سے مطلع کرتے ہوئے کہا کہ

''میں نے خود گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ البتہ حکومت برطانیہ کا دونوں حکومتوں پر ایک مشترک نمایندہ ہونا چاہیے جو مشترک اثاثوں کا منصفانہ فیصلہ کرسکے اور اس کے لیے ہز ایکسی لینسی ماؤنٹ بیٹن ہی بہتر ہے اور انھیں مقرر کرنا چاہیے۔''

نیز قایداعظم نے ماؤنٹ بیٹن سے اپنے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ

''میں نے تین برطانوی آفیسروں کو پاکستانی مسلح افواج کا چیف مقرر کیا ہے اور میری خواہش ہے کہ تمام صوبوں میں بھی برطانوی گورنرز ہوں، لیکن پاکستانی عوام ان برطانوی لوگوں کو اُسی صورت میں قبول کرسکتے ہیں جب کہ میں بہ ذات خود گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال لوں۔''

قایداعظم کے اس فیصلے کو ماؤنٹ بیٹن نے اپنی توہین سمجھتے ہوئے نظر انداز کردیا اور کہا آپ (قایداعظم) اپنی رائے خط کے ذریعے تحریر کردیں۔ نیز خط میں یہ وعدہ بھی کریں کہ اگر ان کی اس تجویز سے برطانیہ کی شاہی حکومت نے اتفاق نہ کیا تو پھر وہ اور ان کی جماعت مشترک گورنر جنرل کی تجویز کو تسلیم کرلے گی؟

(یہ خط تاریخ ماضی سے تلاش کرنے پر بھی نہ مل سکا)

قایداعظم کے اس فیصلے کی رپورٹ جو سیکریٹری آف اسٹیٹ کو لندن بھیجی گئی اس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن لکھتا ہے:

''میں نے جناح سے پوچھا: کیا تمھیں اس بات کا علم ہے کہ اس فیصلے کی قیمت کیا ہوگی؟''

اس پر جناح نے بڑی افسردگی سے کہا:

''ہاں! میں جانتا ہوں۔ اس فیصلے کی قیمت کئی کروڑ کے اثاثے ہیں۔''

جناح کی اس بات کا جواب میں نے یہ دیا کہ اس فیصلے کی قیمت آپ کے تمام اثاثے اور پاکستان کا مستقبل۔

یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر آگیا۔

قایداعظم کے اس فیصلے پر ماؤنٹ بیٹن نے اپنے عملے کی کانفرنس طلب کی جس میں

قایداعظم کے فیصلے پر غور کیا گیا۔ اور کئی گھنٹوں کی بحث کے بعد یہ مان لیا گیا کہ ماؤنٹ بیٹن کو بھارت کے گورنر جنرل کی حیثیت سے یہیں رہنا چاہیے۔ اسٹاف کانفرنس نے اس کی تفصیل میں حسب ذیل بیان دیا:

(۱) اگر وایسرائے واپس چلے گئے تو سپریم کمانڈ فیلڈ مارشل آکینگ مستعفی ہو جائیں گے اور مسلح افواج میں انگریز آفیسر بھی یہاں رہنے سے انکار کر دیں گے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ تقسیم کے ساتھ فوج کو تو میانے کی مہم شروع ہو جائے گی، جس کے نتایج بہت ہی برے ہوں گے۔ انڈین آرمی اس کو تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ فوج کے منتشر ہو جانے سے خون خرابہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ہز ایکسی لینسی ہندوستان میں رہیں تو بیشتر انگریز شہری اور فوجی آفیسر بہ طور رضا کارانہ کچھ عرصے کے لیے ہندوستان میں رہ جائیں گے اور پاکستان میں بھی مسلح افواج کی تقسیم پرامن ماحول میں ہوگی۔

(۲) ہز ایکسی لینسی کی موجودگی میں تقسیم پُرامن طور پر ہوگی اور دونوں ملک علاحدگی کا منصفانہ فایدہ اٹھا سکیں گے، جس سے دونوں ملکوں میں دوستانہ تعلقات رہیں گے۔ اس مرحلے پر ضروری ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کو خوش گوار رکھا جائے۔ اگر ہز ایکسی لینسی چلے گئے تو کانگریس یہ سمجھے گی کہ آپ کو مسٹر جناح کی وجہ سے جانا پڑا۔ کشیدگی پیدا ہوگی اور ممکن ہے کانگریس آخر وقت میں اس بات کا بہانہ بنا کر پورے منصوبے سے ہی منحرف ہو جائے۔

(۳) کانفرنس نے اپنی رائے یہ بھی ظاہر کی کہ اگر ماؤنٹ بیٹن یہاں موجود رہے تو مملکت ہندوستان کی حالت بہت مستحکم رہے گی۔ اگرچہ فرقہ وارانہ کشیدگی موجود ہے تاہم گذشتہ تین ماہ سے حالات خاصے سدھر گئے ہیں اور یہ سب کچھ یہاں ماؤنٹ بیٹن کی موجودگی کا نتیجہ ہے۔

(۴) تقسیم ملک اور آزادی کے نتیجے میں ہندوستان اور ریاستی حکمرانوں کے درمیان اختلاف کا ہونا لازمی ہے اور ماؤنٹ بیٹن ہی ان اختلاف کو دور کر سکیں گے اور حکومت کو مشورہ دے سکیں گے کہ انھیں ریاستی حکمرانوں سے کس طرح نپٹنا ہے۔

(۵) برطانوی پارلیمنٹ سے آنے والی خبروں سے ظاہر ہے کہ وہاں چرچل کی مخالف

پارٹی قانونِ آزادیٔ ہند کی مخالفت نہیں کرے گی، لیکن ممکن ہے کسی وقت چرچل پارٹی لیبر حکومت کو ناکام بنانے کے لیے کوئی مخالفانہ محاذ قایم کردے اور قانونِ آزادیٔ ہند کی منظوری کو خطرے میں ڈال دے۔ اگر انھیں معلوم ہوگیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بدستور ہندوستان میں موجود رہیں گے تو وہ ہرگز مخالفت نہیں کریں گے۔

اسٹاف کانفرنس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے حالات کو سدھارنے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے نواب آف بھوپال کو وائسرائے ہاؤس طلب کیا اور انھیں کہا گیا کہ وہ مسٹر جناح کو سمجھائیں اور اس کے نتایج سے آگاہ کریں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور نواب بھوپال کے مابین گفتگو کا نتیجہ تھا کہ روزنامہ انقلاب لاہور کے ۴ر جولائی کے پرچے کی پہلی چھ کالمی سرخی تھی۔

"پاکستان کے پہلے گورنر جنرل نواب آف بھوپال اور وزیر اعظم مسٹر جناح ہوں گے۔"

اس پر یہ اطلاع بھی شایع ہوئی کہ نواب آف بھوپال نے اپنی ریاست کی ذمے داریاں اپنی بیٹی کو سونپ دیں۔

(اگر یہی فیصلہ بحال رہتا تو لیاقت علی خاں درمیان میں اپنا سامنہ لے کر رہ گئے تھے کیوں کہ قایداعظم کے معتمد ساتھی ہوتے ہوئے وہ یہ تمنا کیے بیٹھے تھے کہ پاکستان کا پہلا وزیراعظم انھیں ہونا چاہیے۔ غلام نبی جاں باز)

چناں چہ ماؤنٹ بیٹن اور نواب بھوپال کے درمیان فیصلے کی سیاسی ہنوز خشک نہ ہونے پائی تھی کہ لیاقت علی خاں نے ماؤنٹ بیٹن کو خط لکھا کہ

"مسلم لیگ کے فیصلے کے مطابق قایداعظم محمد علی جناح ہی مملکت پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔ آپ اس کی اطلاع رسمی طور پر ملک معظم کو دیں کہ قایداعظم کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر کریں۔"

آخر ۷ر جولائی ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے یہ تجویز لندن بھیج دی گئی کہ پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر جناح ہوں گے اور ہندوستان کے لارڈ ماؤنٹ بیٹن رہیں گے۔

مذکورہ بالا تمام کارروائی کا ماخذ سید یعقوب حسن (سابق نامہ نگار روزنامہ زمین دار۔ لاہور کا مضمون ہے۔ جو نوائے وقت لاہور میں ۱۲راگست ۱۹۷۲ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا) اور پروفیسر ایس ایم برق (پروفیسر منی سوٹا یونی ورسٹی۔ امریکا) سابق سفیر متعینہ کینڈا تھائی لینڈ کا مضمون ہے جو ہفت روز ''اخبار جہاں'' کراچی کے ۲۲ر دسمبر ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں شایع ہوا ہے۔

مندرجہ بالا واقعات کی تائید میں روزنامہ ''جنگ'' لاہور کا نمایندہ مقیم لندن آصف جیلانی اخبار مذکور کو اطلاع دیتے ہوئے لکھتا ہے:

''غیر منقسم ہندوستان کے وایسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برطانیہ کے وزیراعظم لارڈ اٹیلی کو ایک خط میں لکھا کہ قایداعظم محمد علی جناح بڑائی کے شدید خبط میں مبتلا ہیں۔ جب میں نے ان سے کہا کہ آپ پاکستان کے آئینی گورنر جنرل بن کر بے اختیار ہو جائیں گے جب کہ بہ حیثیت وزیراعظم وہ خود ملک کو سنبھال سکیں گے تو قایداعظم نے کہا:

''جب میں گورنر جنرل بن جاؤں گا تو میں ہدایات دوں گا، دوسرے لوگ ان پر عمل کریں گے۔''

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لارڈ اٹیلی کو بتایا کہ پھر میں نے قایداعظم کو ایک قایم مقام گورنر جنرل مقرر کرنے کا مشورہ دیا مگر انھوں نے اس خیال کو بھی مسترد کر دیا۔ یہ انکشاف ''ہندوستان میں انتقال اقتدار ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۷ء کی دستاویزات کی نئی جلد میں کیا گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بہ ذریعہ تار وزیراعظم اٹیلی کو گورنر جنرل کے مسئلے پر پیدا ہونے والی صورتِ حال بتا کر ہدایات مانگی تھیں۔ نتیجتاً جب برطانوی وزیراعظم لارڈ اٹیلی قایداعظم کو اس بات پر آمادہ کرنے میں ناکام رہے کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان اور بھارت دونوں کا گورنر جنرل قبول کرلیں تو پھر انھوں نے ہندوستان کے آخری وایسرائے ماؤنٹ بیٹن کو ہدایت کی وہ بھارت کا گورنر جنرل بننے کی کانگریسی لیڈروں کی دعوت قبول کرلیں۔ اس کتاب میں ۷ر جولائی ۱۹۴۷ء کو منعقدہ برطانوی کابینہ کے اجلاس کی کارروائی بھی شامل ہے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو قایداعظم کے انکار پر سخت صدمہ مایوسی اور حیرت ہوئی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے قایداعظم کے انکار کے بعد اپنے چیف آف اسٹاف لارڈ اسے کو لندن بھیجا تا کہ وہ وزیراعظم

اٹیلی سے ہدایت حاصل کر کے آئیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وزیراعظم اٹیلی سے بہ ذریعہ تار یہ کہا:

''انھیں اس اہم مسئلے کے بارے میں مشورہ دیا جائے کہ آیا وہ بھارت کا گورنر جنرل رہنے کی نہرو کی دعوت قبول کرلیں یا ۱۵ راگست کو واپس آجائیں۔''

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لکھا ہے کہ میں گزشتہ تین ہفتوں سے یہ کوشش کر رہا ہوں کہ قاید اعظم سے کوئی حتمی جواب حاصل کرسکوں۔ بعدازاں انھوں نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کر کے مجھے گورنر جنرل کے سلسلے میں اپنا جواب دینے کا وعدہ کیا، پھر انھوں نے مجھے کہا کہ میں سندھ کے سوا ہر صوبے میں انگریز گورنر مقرر کرنے پر رضا مند ہوں۔ انھوں نے کہا کہ وہ تینوں افواج کے سربراہ بھی انگریز مقرر کرنے پر رضا مند ہیں، تاہم انھوں نے (کہا) یہ تمام باتیں اسی صورت میں ممکن ہیں کہ وہ فوراً گورنر جنرل بنیں۔ بعد میں قاید اعظم نے قایم مقام گورنر جنرل کی تجویز کو بھی مسترد کردیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے لکھا ہے کہ میں نے انھیں بتایا کہ مجھے اس بات کا قوی یقین ہے کہ اس طرح اثاثوں کی تقسیم کے تحفظ کو قابل عمل بنایا جاسکتا ہے اور کانگریس ۳۱ر مارچ تک گورنر جنرل کی سرکاری تقرری سے پہلے اس عہدے کو پر کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے۔ اور اس کے بعد وہ اپنا ذاتی گورنر جنرل مقرر کرسکیں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ مسٹر جناح نے مجھے کہا کہ وہ اس قسم کی پوزیشن تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی؟ تو مسٹر جناح نے افسردگی سے جواب دیا کہ اس کی قیمت متعدد کروڑ رُپے کے اثاثوں کی صورت میں ادا کرنا پڑے گی۔ تو میں نے جواب دیا کہ پھر آپ کو اس کی قیمت اپنے تمام اثاثوں اور پاکستان کے مستقبل کی صورت میں ادا کرنا پڑے گی، پھر میں اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ میں اس وقت تذبذب کی کیفیت میں ہوں۔ میرا خیال تھا کہ میں دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل بنوں گا۔

گورنر جنرل جیسے اہم مسئلے پر مسلم لیگ کے رہنما شوکت پنجاب سردار شوکت حیات کے دو بیان درج ذیل ہیں:

راول پنڈی۔ ۲۰؍جنوری: سردار شوکت حیات نے کہا کہ ان کے ذاتی خیال میں قاید اعظم کو پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ قبول نہیں کرنا چاہیے تھا اور یہ عہدہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ جب قاید اعظم گورنر جنرل بن گئے تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی توہین محسوس کی اور وہ پاکستان کے دشمن بن گئے۔

قاید اعظم نے یہ عہدہ اپنے مشیروں کے مشورے پر قبول کیا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر وجوہات بھی تھیں جن کا تذکرہ میں اپنی کتاب میں کروں گا۔

(روزنامہ نوائے وقت۔ لاہور، ۲۱؍جنوری ۱۹۸۲ء)

بزرگ سیاست داں سردار شوکت حیات نے کہا ہمیں ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا قاید اعظم کی شخصیت کا جہاں تک تعلق ہے وہ نڈر بے باک اور نہ خریدے جانے والے تھے، اپنی انھیں خصوصیت کی وجہ سے وہ حصول پاکستان میں کامیاب ہوئے۔ تاہم قاید اعظم تمام تر خصوصیت کے باوجود ایک انسان تھے۔

ہمیں مرحوم سیاسی لیڈروں کو معصوم کے طور پر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ معصوم پیغمبر ہوتے ہیں۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پہلا گورنر جنرل بنایا جاتا تو تقسیم کے وقت پچیس لاکھ افراد شہید نہ ہوتے۔ پورا پنجاب پاکستان کا حصہ ہوتا اور مسئلہ کشمیر پیدا نہ ہوتا۔ (روزنامہ جنگ- لاہور، ۲۳؍جنوری ۱۹۸۲ء)

پروفیسر ایس ایم برق جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، وہ اپنے مضمون (گورنر جنرل کے انتخاب کے بارے میں) کے آخر میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مالی طور پر اس وقت جو نقصان ہوتا وہ تو پورا ہو جاتا مگر کچھ ایسے مسئلے تھے مثلاً کشمیر کا مسئلہ باؤنڈری ایوارڈ کمیشن کا مسئلہ وغیرہ۔ اس طرح ہونے والے فیصلے پاکستان کے خلاف جاسکتے تھے۔ جس سے ایک مستقل تنازعات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو کیا کچھ ہوتا یا نہ ہوتا؟......''

تاہم کچھ باتیں ایسی ہیں جو جایز طور پر کہی جانے کی مستحق ہیں، اس بات کو دو ایسی مثالوں سے شروع کرتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کی مشکل صورت حال میں مدد کی، باوجود اس کے کہ وہ اس ملک کے رہنماؤں سے ذاتی طور پر

ناراض تھے۔

(۱) جنوری ۱۹۴۸ء میں انھوں نے (ماؤنٹ بیٹن نے) نہرو اور پٹیل کی یہ باتیں روکنے کی کوشش کی کیوں کہ وہ پاکستان کے پچپن کروڑ رُپے نہیں دینا چاہتے تھے جو کہ برطانوی ہند کے نقد اثاثوں میں پاکستان کا حصہ بنتے تھے۔

بھارت کے رہنماؤں نے اس رقم کی ادائیگی کشمیر کے تنازعے کے تصفیے کے ساتھ منسلک کرنے کی کوشش کی تھی اور پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تصادم چل رہا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے اس مؤقف کی مہاتما گاندھی نے حمایت کی۔ گورنر جنرل نے کہا کہ بھارت کا ادائیگی سے انکار غیر عاقلانہ اور بدیانتی پر مبنی فیصلہ ہے۔

(۲) ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کی دوسری مرتبہ حمایت مئی ۱۹۴۸ء میں کی، جب کہ ہندوستان نے اُن نہروں کا پانی پاکستان میں آنے سے روک دیا جو کہ مغربی پاکستان کی زمین کو زرخیزی اور شادابی مہیا کرتا تھا۔

پاکستان کی طرف سے اس سلسلے میں ایک وفد نے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی تھی، جس میں وزیر خزانہ غلام محمد بھی شامل تھے۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے پنڈت نہرو کو فون کیا اور اس اقدام پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے کاشت کاروں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کیوں کہ پانی کا مسئلہ مذاکرات کے دوران طے ہو چکا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے اس فون کے بعد پانی کی فراہمی جاری کر دی گئی۔

(۳) برطانوی گورنر جنرل نے دونوں ریاستوں کے درمیان لڑائی کے امکان پر بھی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ جب پٹیل نے جونا گڑھ کے مسئلے پر طاقت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی تو اس مسئلے پر ماؤنٹ بیٹن نے اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ دونوں ملکوں کے درمیان اگر کوئی طاقت کا مظاہرہ ہوا تو اس سے دونوں ہی کو برابر کا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ (اخبار جہاں۔ کراچی: ۲۲ر دسمبر ۱۹۸۰ء، ص ۱۱)

نوٹ: جیسے کہ لیاقت علی خاں نے ۵ر جولائی کے خط کے ذریعے ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کیا کہ مسلم لیگ کے فیصلے کے مطابق قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے، لیکن ۹ر جون ۱۹۴۷ء کے بعد (جیسے کہ چودھری خلیق الزماں متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ کی ۹ر جون کی میٹنگ کو آخری قرار دیتے ہیں اور جس

میں مسلم لیگ نے برطانوی پلان کو منظور کیا) مسلم لیگ کا کوئی دوسرا اجلاس نہیں ہوا جس میں قایداعظم کے گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ نیز ۲/ جولائی کو ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے دوران قایداعظم نے کہا کہ میں نے خود پاکستان کا گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اگر کوئی اجلاس ہوتا تو وہ کہتے کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ لہٰذا اس ساری کارروائی میں لیاقت علی خاں کا ذاتی عمل دخل معلوم ہوتا ہے۔

(غلام نبی جان باز)

یہ سب کیوں؟

بات کبھی اقتدار کی پالیسی سے اور کبھی اقتدار کی خواہش پر بگڑتی ہے۔ اگر دونوں مقابل میں ہوں تو اس کی زد میں آنے والی ہر چیز اپنے ساتھ اپنا تشخص بھی لے ڈوبتی ہے۔

دوسری بڑی لڑائی (جنگ عظیم دوم) کے بعد برطانوی وقار اس طرح ہلاک ہو چکا تھا کہ مالٹا میں امریکن پریزیڈنٹ اتحادیوں کی سربراہ کانفرنس میں اس طرح چپ بیٹھا رہا جیسے یہ گونگا یا بہرہ ہے، لیکن نہیں! وہ مصلحتاً خاموش تھا۔ اس نے نہ تو برطانیہ سے کوئی مطالبہ کیا اور نہ اس سے کچھ چاہا، وہ جانتا تھا کہ برطانیہ کی تباہی کے بعد مشرق کی تمام تجارت کے لیے امریکن وسایل اپنا کام شروع کرسکیں گے۔ اسی پالیسی کے تحت امریکا نے برطانیہ سے مطالبہ کردیا کہ جو ملک اب تک انگریزوں سے منسلک رہے ہیں انھیں فوراً آزاد کردیا جائے۔ امریکا کے اس مطالبے کے پیچھے مشرقی عوام کی ہمدردی یا اُن کی آزادی کا حقیقی جذبہ کارفرما نہیں تھا بلکہ امریکی سامراج کی خواہش تھی کہ انگریز سے گلوخلاصی کے بعد یہ ممالک اپنی معاشی ضرورت کے لیے کسی دولت مند ملک کی تلاش کریں گے، جو اُن کی غربت کا ہمدرد ہو۔ چناں چہ انھیں دنوں امریکا نے برطانیہ کی مالی امداد سے بھی ہاتھ کھینچ لیا تھا، جس کے باعث برٹش ایمپایر بالکل دیوالیہ ہوکر رہ گئی۔ ان حالات میں برطانیہ کو صرف اپنی افواج کا سہارا تھا تاکہ وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت اور اپنی تجارت کو بحال رکھ سکے۔

ہندو پاک کو چوں کہ ابھی مکمل آزادی حاصل نہیں تھی، بنابریں برطانیہ اپنا آئینی حق سمجھتا تھا کہ وہ ان ممالک سے اپنی مرضی کا کام لے، لیکن قایداعظم نے فوج کی تقسیم کا بھی مطالبہ کردیا تھا، لہٰذا انگریز کی یہ اسکیم فیل ہوکر رہ گئی تھی۔ دوسرے نمبر پر وایسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے جو برطانیہ کی شاہی فیملی کا عزیز ترین ممبر تھا، قایداعظم سے بگاڑ پیدا ہوگیا۔

اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کا بھی گورنر جنرل ہوتا، مگر قاید اعظم کے نزدیک ایک آدمی کا دونوں ممالک کا گورنر جنرل بننے سے وفاداریاں تقسیم ہونے پر جو آئینی مشکلات آتیں وہ خاصی پریشان کن تھیں۔ تاہم برطانوی سلطنت کی سیاسی خواہش اور ماؤنٹ بیٹن کی ذاتی ناراضگی سے پاکستانی رقبے اور مسلمانوں کو جو نقصانِ عظیم ہوا۔ میں نے بہ حیثیت مورخ یہ واقعات جمع کر دیے ہیں۔ چوں کہ مورخ کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ لہٰذا مذکورہ بالا واقعات کا فیصلہ آیندہ نسل کرے گی کہ یہ سارا کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟

(غلام نبی جاں باز، کاروانِ احرار: ج ۸، ص ۴۳-۳۳۲)

قاید اعظم کے لیے ایک خطرہ:

۵/اگست: لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قاید اعظم سے ایک نجی ملاقات کی۔ اس ملاقات میں قاید اعظم کے علم میں یہ بات بھی لائی گئی کہ آزادی کی تقریبات کے موقع پر کراچی میں قاید اعظم پر قاتلانہ حملے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ الانا صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ سننے کے باوجود قاید اعظم کے اطمینان و سکون میں فرق نہ آیا اور انھوں نے فرمایا کہ "یوم آزادی کا جلوس پروگرام کے مطابق نکلے گا، کیوں کہ یہ دن سرکاری تقریبات میں سب سے اہم اور مبارک ہے۔" (جی الانا)

قاید اعظم کا آخری سفر دہلی تا کراچی:

۷/اگست: قاید اعظم بہ ذریعہ طیارہ دہلی سے ایک بجے دوپہر روانہ ہوئے اور ۵ بجے شام کو کراچی ائیر پورٹ پر اُترے۔ ہوائی اڈے پر قاید اعظم کا زبردست استقبال کیا گیا۔

(رحمت فرخ آبادی)

محمد علی جناح نے آج وہ پوشاک پہنی تھی جو وہ بہت کم پہنتے تھے۔ وہ چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی میں تھے۔ آج وہ کراچی پرواز کرنے والے تھے۔ ان کی پرواز کے لیے وائسرائے نے انھیں چاندی کے رنگ کا خوب صورت ڈی سی-۳ طیارہ پیش کیا تھا۔

ڈی سی-۳ کی ساری سیڑھیاں چڑھنے کے بعد انھوں نے اچٹتی ہوئی نظر اس شہر پر ڈالی جہاں انھوں نے پاکستان کے خواب کو حقیقت بنانے کے لیے برس ہا برس صرف کیے

تھے۔ ان کے ذہن میں یہ خیال آیا: ''شاید میں دہلی کو دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔''

۱۰- اورنگ زیب روڈ کا ان کا مکان فروخت ہو چکا تھا۔ اسے سیٹھ ڈالمیا نے خریدا تھا۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ جس مکان میں پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا وہ اس مکان میں گاؤ کشی کے خلاف تحریک کا صدر دفتر بنانا چاہتے تھے۔

جناح نے کراچی تک اپنی پرواز بہت خاموشی سے طے کی۔ ان کا چہرہ اس طرح پتھرایا ہوا تھا کہ کامیابی کے کسی ردِعمل کی کوئی پرچھائیں ان کے چہرے پر نظر نہیں آتی تھی۔

کراچی آنے پر جناح کے اے ڈی سی سید احسان نے دیکھا کہ ہوائی جہاز کے نیچے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے آس پاس ساری زمین آدمیوں سے پٹی ہوئی ہے۔ لوگوں کے سفید کپڑے دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری زمین سفید جھیل بن گئی ہے۔

جناح کی بہن نے خوش ہو کر کہا: جن! دیکھو تو!

جناح نے ٹھنڈی نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ جن عوام کے لیے انھوں پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور حاصل کر لیا تھا ان کا لہراتا ہوا سمندر واقعی دل کو خوش کرنے والا منظر تھا۔

جناح نے مدھم لہجے میں کہا: ہاں! بہت سارے لوگ ہیں۔

ڈی سی-۳ اُڑان پٹی پر دوڑ کر رک گیا۔ فضائی سفر نے جناح کو اس درجے تھکا دیا تھا کہ انھیں اپنی سیٹ سے اٹھنے میں تکلف ہو رہا تھا۔ ایک ساتھی نے انھیں بانہوں کا سہارا دینا چاہا، جناح نے فوراً مخالفت کی۔ انھوں نے دل میں کہا:

''کراچی تو اپنا گھر ہے، اپنے گھر لوٹتے وقت قاید اعظم کو کسی سہارے کی ضرورت پڑے؟ ناممکن!''

جناح کے اندر جسمانی قوت کی کمی ضرور تھی، لیکن قوت ارادی نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ اسی کے سہارے وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ بغیر کسی کا سہارا لیے وہ ہوائی جہاز کی سیڑھیاں اُترے۔ ان کو دیکھتے ہی لوگ خوشی سے جھومنے اُچھلنے لگے۔ بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے وہ انتظار میں کھڑی اپنی کار تک پہنچے۔ راستے میں بھی انھوں نے کسی کا سہارا نہیں لیا۔

ہزاروں کی اس بھیڑ کی زبان پر بس ایک ہی نعرہ تھا، جسے وہ پورے جوش و خروش سے لگا رہے تھے۔ ''پاکستان زندہ باد!''

گورنمنٹ ہاؤس کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی سرکاری رہائش گاہ بنایا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پہلی بار جناح کے چہرے سے خوشی کے تاثرات ظاہر ہوئے۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے اپنے اے ڈی سی سید احسان سے کہا:

''جانتے ہو؟ مجھے امید نہیں تھی کہ میں جیتے جی پاکستان کو دیکھ سکوں گا۔''

جناح صاحب اپنے وطن میں:

۹؍اگست: کراچی میں سر غلام حسین ہدایت اللہ نے کراچی کلب میں قایداعظم کے اعزاز میں ڈنر دیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے قایداعظم نے اپنے بچپن، تعلیم، سفر لندن، سیاسی زندگی کے مختلف واقعات اور پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس تقریر میں اپنی بہن مس فاطمہ جناح کو بھی زبردست الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا اور بتایا کہ انھوں نے کس طرح مشکلات میں ان کی حوصلہ افزائی کی اور کس طرح امید کی شمع روشن رکھی اور کس طرح وہ قایداعظم کی صحت کے بارے میں فکرمند رہتی ہیں۔ (جی الانا)

۱۱؍اگست: کراچی میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا جلسہ جوگندر ناتھ منڈل کی صدارت میں ہوا۔ قایداعظم کو متفقہ طور پر صدر منتخب کرلیا گیا۔ قایداعظم نے اس انتخاب پر تقریر میں فرمایا:

''آپ نے مجھے اپنا پہلا صدر منتخب کر کے جس طرح میری عزت افزائی کی ہے اس کے لیے میں آپ کا صدق دل سے شکرگذار ہوں۔ یہ خودمختار اور صاحب اقتدار اسمبلی جو اعزازات دے سکتی ہے ان میں یہ سب سے بڑا اعزاز ہے۔''

یہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی تھی جس کا قایداعظم کو صدر منتخب کیا گیا تھا۔

۱۳؍اگست: لارڈ ماؤنٹ بیٹن دہلی سے کراچی پہنچے۔ قایداعظم نے گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت سے ان کے اعزاز میں پارٹی دی۔ اس موقعے پر باؤنڈری کمیشن کے ایک رکن جسٹس دین محمد نے مسلم لیگی لیڈروں کی غفلتوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کی۔ اس موقع پر قایداعظم ایک منٹ خاموش رہے اور پھر لمبا سانس بھر کر کہا:

''مسٹر دین محمد! جب اپنوں کا یہ کردار ہے تو پھر میں غیروں سے کیا شکوہ کرسکتا ہوں۔''

اس سے قبل دین محمد مرحوم جولائی میں دہلی میں قاید اعظم سے مل کر بعض باتیں ان کے علم میں لا چکے تھے اور انھوں نے اپنے دوسرے رکن جسٹس محمد منیر کے ساتھ مل کر یہ طے کرلیا تھا کہ وہ دونوں کمیشن سے استعفے دے کر الگ ہو جائیں گے، لیکن قاید اعظم ان کی اس رائے سے متفق نہیں ہوئے تھے اور انھوں نے دونوں ممبران کمیشن کو کام جاری رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ (صحیفہ-لاہور: ص ۱۷۳)

۱۴/اگست: اسمبلی چیمبرز میں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس میں شرکت کی اور اقتدار کی منتقلی کے بارے میں بادشاہ جارج ششم کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ قاید اعظم نے رسمی شکریے کی تقریر کی۔ (العلم-کراچی: ص ۱۵۳)

۱۵/اگست: اس تاریخ کو قاید اعظم نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ (سندھی ادب)

۱۸/اگست: عید الفطر کے موقع پر قوم کے نام پیغام جاری کیا۔ (سندھی ادب)

۲۱/اگست: قاید اعظم نے گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت سے صوبۂ سرحد میں ڈاکٹر خان کی وزارت کو برطرف کر دیا۔ (جی الانا)

(علم و آگہی-کراچی، قاید اعظم محمد علی جناح (خصوصی شمارہ): ص ۳۵-۲۳۴)

چند دیگر مسایل پاکستان کے حوالے سے

پاکستان کا قیام انگریز کا قیام تھا:

چودھری خلیق الزماں اعتراف کرتے ہیں:

بہ ہر نوع اچودھری خلیق الزماں کے ایک بیان سے اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ صوبوں کی تقسیم ہندو انگریز ملی بھگت یا ہندوؤں کی سازش اور ماؤنٹ بیٹن کی جناح دشمنی کا ہرگز نتیجہ نہ تھی، وہ لکھتے ہیں:

''بہ ہر نوع پاکستان کی تقسیم کی پالیسی گورنمنٹ کی پالیسی تھی جس کو کامیاب بنانا اس کا (ماؤنٹ بیٹن کا) فرض تھا، یہ سوچنا یا سمجھنا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن پنڈت جواہر لال کے ساتھ خلوص اور مسٹر جناح کے ساتھ مغایرت کی بنا پر وہ پاکستان کو دیدہ و دانستہ نقصان پہنچانے کے درپے تھا بالکل قابل اعتماد نہیں ہو سکتا۔''

(شاہراہ پاکستان: ص ۱۰۶۰)

مسٹر جناح کا بیان:

۳۰ رجون ۱۹۴۷ء: مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے آج لاہور میں ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے ۳رجون کے تقسیم ملک کے پلان کے بارے میں کہا:

''بعض لوگ یہ سوچتے ہوں گے کہ ۳رجون کے منصوبے کو قبول کرنا مسلم لیگ کی غلطی تھی۔ میں انھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی اور اقدام اتنا زیادہ خطرناک اور تباہ کن ثابت ہوتا کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

(بہ حوالہ روزنامہ ''انقلاب'' لاہور: مورخہ ۱۸رنومبر ۱۹۸۰ء)

دارالعوام میں آزادئ ہند کا بل پاس ہو گیا:

۱۰رجولائی ۱۹۴۷ء: انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں آزادئ ہند کا بل پاس ہو گیا۔ ۱۵راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان سے انگریزی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا اور دو ڈومینین قایم ہو جائیں

گی، جن کا نام ہندوستان اور پاکستان ہوگا۔ ان کو اختیار ہوگا کہ وہ سلطنت برطانیہ سے تعلق رکھیں یا نہ رکھیں، تاہم لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے عارضی طور پر اور مسٹر جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔ (مولانا آزاد۔ ایک سیاسی ڈائری: ص ۴۱۴)

اشیا کا بٹوارا:

جیسا کہ بٹوارے کے زیادہ تر معاملوں میں ہوتا ہے دونوں فریقوں میں زیادہ تر بحثیں مال کے متعلق ہوتی تھیں۔ سب سے نازک مسئلہ اس قرضے کا تھا جسے انگریزوں سے وصول کرنا آسان نہیں تھا، کیوں کہ ان کا خزانہ خالی تھا۔ صدیوں سے انگریزوں پر الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ ہندوستان کا معاشی استحصال کر رہے ہیں، لیکن جب وہ ہندوستان چھوڑنے والے تھے تو اس کے پانچ سو ارب ڈالر ان کی طرف نکلتے تھے۔ قرض کا یہ زبردست بوجھ انگلستان پر دوسری جنگ عظیم کے درمیان چڑھ گیا تھا۔ لڑائی جیتنے کی اتنی بڑی نوبت انگلستان کو چکانی پڑی تھی کہ قرض کے بوجھ سے وہ کچلا جا چکا تھا۔ برطانیہ کے تاریخی سامراج کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

مال و متاع کی فہرست بڑھتی جا رہی تھی۔ بحث و مباحثوں کے خاتمے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بالآخر ایچ ایم پٹیل اور چودھری محمد علی دونوں کو سردار پٹیل کی خواب گاہ میں بند کر دیا گیا تاکہ وہ کسی سمجھوتے پر پہنچنے کے بعد ہی باہر نکلیں۔ آخر طے ہوا کہ پاکستان کو بینکوں میں رکھی نقدی کا اور اسٹرلنگ بیلنس کا ساڑھے سترہ فیصد حصہ حاصل ہوگا، لیکن اس کے عوض اسے ہندوستان کے ملکی قرض کا ساڑھے سترہ فیصد ادا کرنا پڑے گا۔

دونوں افسروں نے سفارش کی کہ سارے ملک میں جو چیزیں تقسیم ہو سکتی ہیں ان کا اسی فیصد حصہ ہندوستان کو اور بیس فیصد حصہ پاکستان کو ملے گا۔ چناں چہ سارے ملک کے سرکاری دفتروں میں کرسیوں، میزوں، نبوں، ربروں اور ٹائپ رائٹروں وغیرہ کا جلدی جلدی شمار ہونے لگا۔ بٹوارے بھی ساتھ ساتھ ہونے لگا۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ایسے جھگڑے ہوئے کہ کوئی اجنبی دیکھتا تو اس کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا۔

کسی ملک کی شناخت کے لیے ڈاک ٹکٹوں اور کرنسی نوٹوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔

ہندوستان میں صرف ایک پریس ایسا تھا جہاں ٹکٹ اور نوٹ چھپ سکتے تھے، ہندوستانیوں نے اس کا کوئی حصہ اپنے پڑوسیوں کو دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں مسلمان ربر کی مہریں لے کر بیٹھے اور انھوں نے نوٹوں کی گڈیوں پر پاکستان کے نام کے ٹھپے لگا کر انھیں اپنے نئے ملک کی کرنسی کی شکل دی......

وائسرائے کے اصطبل کی بارہ خوب صورت بگھیوں کا بٹوارہ سکہ اچھال کر ہوا اور سونے کے کام والی بگھیاں ہندوستان کے حصے میں آئیں۔ بات صرف نوٹوں، کرسیوں اور کتابوں کے بٹوارے کی نہیں تھی، گرمی اور عجلت کے ان ہفتوں میں اعلا سرکاری افسروں، فوج کے عہدے داروں، چپراسیوں، بابوؤں اور بھنگیوں کا بھی بٹوارا کیا گیا۔

(آدھی رات کی آزادی: ص ۳۸-۱۳۷)

تقسیم ملک اور فوج کی تقسیم:

۱۶ر جولائی ۱۹۴۷ء: سب سے زیادہ تباہ کن پوزیشن یہ اختیار کی گئی تھی کہ صوبائی اصول کے بجائے فرقہ وارانہ اصول پر فوج کی تقسیم کر دی گئی تھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی اس خواہش کو کہ فوجوں کی تقسیم صوبہ جاتی اصول پر ہونی چاہیے اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے اس اصرار کو کہ کم از کم بیس فیصدی مسلمان انڈین یونین کی فوجوں اور مرکزی دفاتر میں باقی رہنے دیے جائیں، پائے حقارت سے ٹھکرا دیا گیا تھا۔ چناں چہ مہاتما گاندھی نے اپنی عبادتی تقریر میں فرمایا تھا:

> ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم غیر ملکی جارحانہ حملے کے مقابلے میں متحد کیوں نہیں ہو سکتے؟ تقسیم کے موجودہ طریقے سے یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہو جائے، کیوں کہ ممکن ہے وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے کا حریف سمجھنے لگیں۔ اس دردناک سانحہ کی تلافی صرف آنسوؤں سے نہیں ہو سکتی۔''
>
> (قومی آواز: ۱۶ر جولائی ۱۹۴۷ء بہ حوالہ علمائے حق اور.....: ج ۲، ص ۶۳۰)

انتقالِ آبادی کی ہول ناکی:

اسی بیان میں پنڈت سندر لال نے ''انتقالِ آبادی'' کی ہول ناکی پر بھی روشنی ڈالی

ہے۔ وہ اسے ایک گناہِ عظیم قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس گناہ عظیم کی ذمے داری کسی ایک قوم، کسی ایک سیاسی جماعت یا کسی ایک رہنما پر نہیں ڈالی۔ انسانیت کو اس ہول ناک تباہی کی طرف لے جانے میں بہت سے رہنماؤں اور ان کی پارٹیوں کا حصہ تھا۔ پنڈت جی کے نزدیک جو اس گناہِ عظیم کے مرتکب اس ہول ناکی کے مجرم ہیں، ان پر مقدمہ چلانا چاہیے تھا۔ وہ اپنے بیان میں کہتے ہیں:

> ''انتقالِ آبادی کی کارروائی انسانیت کے ساتھ ایک گناہِ عظیم ہے۔ شاید اس سے تاریک تر گناہ انسانی تاریخ میں نہ ہوا ہوگا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا ذمے دار کون ہے۔ مجھے تو اکثر خیال آتا ہے کہ کم از کم ہمارے ایک درجن چوٹی کے لیڈر جن میں سب پارٹیوں کے لیڈر شامل ہونے چاہییں اور برطانوی قوم کے سیاسی لیڈروں پر اس جرم کا مقدمہ انھیں پناہ گزینوں کے سیدھے اور غیر جانب دار نمایندوں کی عدالت میں چلایا جانا چاہیے، جن پر ان مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا ہے۔'' (قومی آواز: ۳۰ رنومبر ۱۹۴۷ء بہ حوالہ حیات شیخ الاسلام: ص ۱۸۸)

پاکستان، اسلام اور مسلمان:

کیا اب بھی کسی کو شبہ ہے کہ پاکستان اسلام یا مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ خالص دنیاوی حکومت کے قیام کے لیے بنا تھا اور ایک ایسی قوم کی تخلیق کا تصور پیش نظر تھا جہاں نہ کوئی ہندو ہو نہ مسلمان، نہ عیسائی ہو نہ کسی اور مذہب کا ماننے والا۔ مملکت کی نظر میں سب برابر ہوں۔ سب کی یک ساں ذمے داریاں ہوں اور سب کے فرایض ہوں گے۔ اگر آپ کے ذہن میں اب بھی کوئی ایسی بات ہو تو بانیٔ پاکستان کی ہدایت کے مطابق ''اپنے دماغوں سے یہ خرافات نکال دیجیے۔'' اگر یقین نہ آئے تو زیر نظر حوالہ جات پر ایک نظر ڈال لیجیے، شک دور ہو جائے گا:

پاکستان کا نظامِ حکومت، دنیاوی - جمہوری:

۹ رستمبر ۱۹۴۵ء: ڈان کے ایڈیٹر نے مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کے ایک بیان کی وضاحت میں ایک اداریہ لکھا ہے۔ اس میں لکھا ہے:

''مسٹر جناح نے پاکستان کو ایک دنیاوی اسٹیٹ قرار دیا ہے اور ہمیشہ اس بات کی سختی کے ساتھ مخالفت کی ہے کہ اس میں مسلمانوں کی حکومتِ الٰہیہ قایم ہوگی۔ وہ لوگ جو پاکستان کو پان اسلام ازم (اتحاد اسلامی) کا مرادف قرار دیتے ہیں، اتحاد کے دشمن ہیں۔''

(ڈان۔ دہلی ۹ر ستمبر ۱۹۴۵ء وزمزم۔ لاہور۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

مسلم لیگ کے صدر نے جو یہ فرمایا کہ

''وہ لوگ جو پاکستان کو پان اسلام ازم (اتحاد اسلامی) کا مرادف قرار دیتے ہیں، وہ اتحاد کے دشمن ہیں۔''

تو یہاں اتحاد سے مراد ہندو مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، برصغیر ہندو پاکستان میں بسنے والی قوموں کا اتحاد ہے نہ کہ وہ اسلامی اتحاد! موصوف کے نزدیک اصل اہمیت ہندوستانی اقوام کے اتحاد کی ہے۔ اسلامی اتحاد کی نہیں!

اس اداریے میں مسلم لیگ کے صدر کے جس بیان کی وضاحت کی گئی ہے وہ موصوف نے نیوز کرانیکل (بمبئی) کے نمایندے کو دیا تھا اور چند روز قبل ڈان۔ دہلی ہی میں شایع ہوا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

''پاکستان کی حکومت یورپین جمہوریت کے طریقے پر ہوگی۔ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی آبادی اور مردم شماری کی حیثیت سے راے شماری کر کے فیصلہ صادر کریں گے۔ وزارتوں اور لیجس لیچروں میں سب حصے دار ہوں گے۔''

پاکستان۔ ایک جمہوری اسٹیٹ ہوگا:

۲۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء: آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکریٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''ہم سے سوال کیا جاتا ہے کہ پاکستان کا دستور اساسی کیا ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان ایک جمہوری اسٹیٹ ہوگا اور اس کے دستور اساسی کی تشکیل ان علاقوں کے تمام باشندگان (مسلم، سکھ، ہندو، عیسائی وغیرہ) ایک مجلس منتخبہ

ان کے تو سلطنت نے خود ہی کر دیں گے۔" (روزنامہ ڈان - دہلی، ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۵ء و منشور ۲۶ ستمبر ۱۹۴۵ء، ص ۲۲۔ نیز دیکھیے: پاکستان کی حقیقت از محمد ابرار جنید یقی، سیو ہار وی)

پاکستان۔ بلا لحاظ مذہب، عوام کی حکومت

مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی برابری:

۲ر نومبر ۱۹۴۵ء: آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ایک رکن میاں بشیر احمد نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہمارے قائداعظم بار بار کہہ چکے ہیں کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب عوام کی حکومت ہوگی۔ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو برابری اور آزادی دی جائے گی۔"

پاکستان۔ جمہوری سوشلسٹ حکومت:

۸ر نومبر ۱۹۴۵ء: مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے بمبئی میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکا کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے کہا:

"پاکستان میں ایک جمہوری حکومت ہوگی اور مجھے امید ہے کہ پاکستان کی بڑی بڑی صنعتیں اور کارخانے سوشلسٹ اصول پر قوم کے قبضے میں دے دیے جائیں گے۔" (منشور: ۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء، ص ۳۰)

مسلم لیگ کے ترجمان ڈان نے اس بیان کو قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مسٹر جناح نے کہا:

"پاکستان سیاسی طور پر ایک جمہوری اسٹیٹ ہوگا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ہندوؤں کی راہ میں کوئی معاشی رکاوٹ پیدا نہیں کی جائے گی۔ میں اس عقیدے کا قایل نہیں ہوں کہ پاکستان میں ایک جماعت یا ایک پارٹی (مسلمانوں) کی حکومت ہو۔ میں اس ایک جماعت کی مخالفت کروں گا جو تنہا

حکومت کرے۔ پاکستان کی ہندو اقلیتوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ان کے حقوق کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ کیوں کہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کیے بغیر کوئی مہذب حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔'' (روز نامہ ڈان - دہلی، ۱۰ر نومبر ۱۹۴۵ء)

منشور، مورخہ ۱۱ر نومبر ۱۹۴۵ء میں مسٹر جناح کے وہ ارشادات شایع ہوئے ہیں جو آپ نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکا کے نمایندے کے سوالات کے جواب میں صادر فرمائے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

پاکستان ایک جمہوری حکومت ہوگی۔ (منشور: کالم ۲: ص ۳)

پھر ارشاد فرماتے ہیں:

''پاکستان کے متعلق میرا گمان نہیں کہ وہ ایک پارٹی کی حکومت ہوگی بلکہ میں ایک پارٹی کی حکومت کے قانون کی مخالفت کروں گا۔''

پھر آپ غیر مسلم اقلیت کے متعلق فرماتے:

''انھیں یہ محسوس کرا دینا چاہیے کہ حکومت میں ان کا بھی ہاتھ ہے اور اس کے لیے انھیں حکومت میں مناسب نمایندگی دی جانی چاہیے۔''

اس تمام تشریح کے باوجود مسٹر جناح صاحب کا ارشاد ہے:

''یہ حکومت مسلمانوں کی ہوگی۔''

کیا اسلامی حکومت زمانۂ حاضر کی جمہوری حکومتوں کی تعریف میں آ سکتی ہے؟ جب مذہبی نقطۂ نگاہ سے حکومت قایم ہو اور ہندو مسلم ملک کی پارٹیاں تسلیم ہوں تو کیا ''اسلامی حکومت'' پارٹی کی حکومت نہ ہوگی؟

حضرات علما توجہ فرمائیں اور جمہوری حکومت کے متعلق تھانہ بھون کے علمائے کرام کے جو بیانات شایع ہوئے ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

لیگ کا مجوزہ پاکستان - اسلامی حکومت کی نفی:

۱۵ر نومبر ۱۹۴۵ء: لاہور کے لیگی اخبار روز نامہ انقلاب نے جس کے مدیر چودھری غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک ہیں، پاکستانی جمہوریت کی تشریح کرتے ہوئے

ایک مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے:

''لیگ کی قرارداد میں بالتصریح مذکور ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اس کے ہر حصے کی حکومت متعلقہ آبادیوں کی رائے اور مشورے سے بنے گی........''

اس کے آگے اخبار لکھتا ہے:

''ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قایم ہو جائے گی۔ جو شخص ایسا خیال ظاہر کرتا ہے وہ لیگ کے مجوزہ پاکستان سے بالکل بے خبر ہے۔'' (روزنامہ انقلاب-لاہور: ۱۵ر نومبر ۱۹۴۵ء)

پاکستان کا نظام حکومت:

آل انڈیا مسلم لیگ کے ذمے دار رکن راجہ امیر احمد خان جو سیاسی حلقوں میں راجہ محمود آباد کے نام سے معروف تھے، ان کا ایک مضمون لندن یونی ورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقی کے ڈایریکٹر پروفیسر فلپ کی ایک کتاب میں شایع ہوا۔ راجہ صاحب لکھتے ہیں کہ

''مجھ میں اور قاید اعظم میں ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان اسلامی ریاست کے مسئلے پر اختلاف رائے ہو گیا تھا۔ میں پاکستان میں ''اسلامی ریاست'' کے قیام کا حامی تھا اور قاید اعظم سیکولر ریاست کے حق میں تھے (جیسی دنیا کے اکثر ترقی یافتہ جمہوری ملکوں میں ہے)۔ چناں چہ قاید اعظم نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ان خیالات کا اظہار نہ کروں، ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ قاید اعظم ان خیالات سے اتفاق کرتے ہیں اور ان کی ہدایت پر میں ان کے خیالات عوام تک پہنچا رہا ہوں۔''

راجہ صاحب لکھتے ہیں کہ

''اس اختلاف رائے کی وجہ سے میں دو سال تک قاید اعظم سے دور چلا گیا تھا۔ راجہ صاحب نے تسلیم کیا کہ قاید اعظم کا نقطۂ صحیح تھا اور میرا غلط تھا۔ راجہ صاحب نے لکھا کہ میں ان دنوں یونی ورسٹی کے بعض اساتذہ کے زیر اثر آ گیا تھا جو اسلامی ریاست کے حامی تھے۔ راجہ صاحب نے یہ تسلیم کیا کہ اس وقت مسلم

لیگ ہائی کمان عام طور پر سیکولر خیالات کی حامی تھی۔"

(ہفت روزہ "صدائے وطن" - لاہور: ۲۲ر فروری ۱۹۷۹ء) (کاروانِ احرار: ج ۵: ص ۳۶۴)

پاکستان کا مطلب - سب کے لیے آزادی، سب کی ترقی اور برابری:

۲۷ر مارچ ۱۹۴۷ء: میمن چیمبر آف کامرس بمبئی کے اجتماع میں محمد علی جناح نے ایک تقریر کی، جسے رئیس احمد جعفری مرتب "خطبات قایداعظم" نے "قایداعظم کی حیات آفریں تقریر" قرار دیا ہے۔ اس تقریر میں انھوں نے فرمایا:

"ہمیں پاکستان قایم کرنا ہے اور اس میں صرف مسلمانوں کی بھلائی ہی نہیں ہوگی۔ پاکستان کا مطلب ہے آزادی۔ کسی خاص اور ایک قوم کے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے۔ آزادیٔ پاکستان کا مطلب دونوں کے لیے آزادی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں عظیم الشان ہندو قوم کی بہت عزت ہے، ان کا اپنا دھرم ہے، اپنا فلسفہ ہے، وہ اپنا تمدن رکھتے ہیں، عین اُسی طرح جس طرح مسلمان اپنا ایمان، فلسفۂ حیات اور تمدن رکھتا ہے، لیکن دونوں الگ الگ قومیں ہیں۔"

آگے چل کر اپیل کی ہے کہ

"آیے! اب عملی آدمیوں کی طرح قدم اٹھائیں اور اس اصول کو تسلیم کرلیں۔ ہم پاکستان میں رہیں گے اور آپ ہندوستان میں۔ ہم ہم سائیوں کی طرح زندگی بسر کریں گے، ہمیں غیر ملکیوں کی ضرورت نہیں، ہم دوستوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔ ہم صنعت و تجارت میں دوست رہیں گے اور دو بھائیوں کی طرح رہیں گے۔ یہی پاکستان ہے۔"

آخر میں پاکستان کی حکومت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"پاکستان ایک ایسی حکومت ہوگی جس میں سب قوموں کو زندگی کی تمام آسایشوں کا حصہ ملے گا، اس لیے اب تمام مسایل حل کرلیجیے۔ پاکستان ایک ایسی حکومت ہوگی جہاں ذات پات کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ آخر مجھے کسی

فرقے کے خلاف جو اپنے افراد کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لیے کوشاں ہے کیوں شکایت ہونی چاہیے؟ ایسی کوششوں کو فرقہ واریت کہنے کا کوئی فایدہ نہیں، جتنی جلدی آپ حقایق کا سامنا کرنا کی کوشش کریں گے اتنی ہی جلدی آپ موجودہ مسایل کا حل تلاش کرلیں گے۔"

اگر بانی پاکستان پاکستان میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر اہل مذاہب پر مشتمل ایک پاکستانی قوم بنا سکتے تھے اور پھر سب بھائیوں کی طرح مل جل کر رہ سکتے تھے تو ہندوستان میں صدیوں سے رہتے چلے آتے ہوئے اپنے اپنے خصایص مذہبی اور قومی کو قایم رکھتے ہوئے اب ایک قوم کی طرح مل جل کر کیوں نہیں رہ سکتے تھے؟

۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء: آج صبح قایداعظم محمد علی جناح نے ایک پریس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے "پاکستان کی اقلیتوں کو یقین دلایا کہ ان کے مذہب، کلچر و زندگی اور جائیداد کی پرامن حفاظت کی جائے گی وہ پاکستان کے پورے شہری ہوں گے اور اس سلسلے میں کسی سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ انھیں بھی دوسروں کی طرح ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا پڑے گا جو ہر شہری پر عاید ہوتی ہیں۔ اقلیتوں کو حکومتوں کا وفادار بننا پڑے گا اور حکومت کی اطاعت قبول کرنا پڑے گی۔ کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ اقلیتیں حکومت کی وفادار نہ ہوں یا تخریبی اقدامات شروع کردیں، کیوں کہ ہر شہری کے لیے ضروری ہے کہ وہ حکومت کا وفادار بنے۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان صمیمانہ اور دوستانہ تعلقات قایم رہیں۔ پاکستان یقیناً اپنی خیر سگالی کے اظہار میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔"

آگے چل کر اسی تقریر میں انھوں نے کہا:

"میں نے آج تک ان کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس پر میں آج بھی قایم ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں کیا کہتا رہا ہوں اور اب بھی جانتا ہوں کہ میں ان کے متعلق کیا کچھ کہہ چکا ہوں۔ اقلیتوں کی پاکستان میں ہر ممکن حفاظت کی جائے گی۔ ان کی جان و مال، دین اور مذہب کی حفاظت ہوگی، نیز ان کی جائیداد اور کلچر کی حفاظت ہوگی۔ وہ پاکستان کے پورے شہری ہوں گے اور پاکستان

کے شہریوں میں مذہب، ملت کا کوئی امتیاز نہ ہوگا۔ ہر حکومت کے شہری پر خاص ذمے داریاں عاید ہوتی ہیں، لہٰذا اقلیتوں کو بھی اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہوں گی۔ انھیں حکومت کے ایثار میں حصہ لینا ہوگا اور جب تک اقلیتیں حکومت کی وفادار رہیں گی میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

ایک نامہ نگار نے کہا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کی اقلیتیں حکومت کی وفادار اور اطاعت گزار رہیں، آپ ہندوستان کی اقلیتوں کے بارے میں بھی یہی کچھ کہیں گے؟ قاید اعظم نے جواب دیا کہ یہ تمام اقلیتوں کے بارے میں ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں۔ کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اقلیت حکومت کی وفادار نہ ہو اور حکومت کے خلاف تخریبی اقدام شروع کر دے تو ان کا یہ رویہ حکومت کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں ہر مسلمان اور ہندو شہری سے اپیل کروں گا کہ وہ اپنی حکومت کا وفادار رہے۔

ایک نامہ نگار نے پوچھا کہ کیا آپ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں اسی طرح دل چسپی لیتے رہیں گے جس طرح کہ آج لے رہے ہیں؟ قاید اعظم نے فرمایا کہ میں جس طرح آج ہندوستان کے شہریوں بالخصوص مسلمانوں کے معاملات میں دل چسپی لے رہا ہوں اسی طرح آیندہ بھی دل چسپی لیتا رہوں گا۔

سوال: آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانان ہندوستان کے تحفظ کے لیے کیا اقدامات اختیار کرنا چاہتے ہیں؟

قاید اعظم نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ مسلمانان ہندوستان سے بھی ایسا ہی منصفانہ سلوک کیا جائے گا جیسا کہ ہم غیر مسلم اقلیتوں سے کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے پالیسی کا بڑا اصول بتا دیا ہے، لیکن دونوں قوموں کی اقلیتوں کی حفاظت کا مسئلہ آئین ساز اسمبلی ہی حل کر سکتی ہے۔" (روزنامہ پیسہ اخبار لاہور، بحوالہ گفتار قاید اعظم، ص ۳۱۲)

مسٹر محمد علی جناح پوری تحریک پاکستان میں کہتے رہے تھے کہ ہندو مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، ان کا مذہب، تہذیب، تاریخ، ذوق و مزاج الگ الگ ہیں۔ اور یہ ہندو متعصب ہیں، تنگ نظر ہیں۔ وہ اسلام، مسلمانوں کی تہذیب، زبان کے دشمن ہیں۔ ہندو

مسلمان ایک ساتھ رہ نہیں سکتے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کا حصہ دے دو اور خود جیسی چاہو حکومت قایم کرلو، لیکن اب وہ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ ''اپنی حکومت کے وفادار بن جاؤ۔'' کیا کسی نے تحریک پاکستان کے رہنما کے افکار و سیرت کے تضاد کے بارے میں سوچا جائے تو ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ تاریخ انسانی کا کتنا بڑا افراڈ معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ۲۷ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو فرمایا: ''ہم ہندو راج کے ماتحت یا حاشیہ بردار رعایا بن کر نہیں رہ سکتے۔'' (گفتار قایداعظم: ص ۱۸۷)

(۲) ۴ر جنوری ۱۹۳۸ء کو فرمایا: ''ہم ہندو راج کے حاشیہ بردار غلام بن کر نہیں رہ سکتے۔'' (گفتار قایداعظم: ص ۱۸۹)

(۳) ۷ر جنوری ۱۹۳۸ء کو فرمایا: ''میں مسلم قوم کو ہندوؤں یا کانگریس کا حاشیہ بردار نہیں بنا سکتا۔'' (گفتار قایداعظم: ص ۱۹۲)

(۴) ۳۰ر جنوری ۱۹۳۸ء کو فرمایا: ''کانگریس کے ہاتھوں میں مسلمانوں کے حقوق محفوظ نہیں۔'' (گفتار قایداعظم: ص ۱۹۶)

(۵) ۱۵ر اگست ۱۹۳۸ء کو فرمایا: ''کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔'' (گفتار قایداعظم: ص ۲۱۷)

(۶) ۷ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو فرمایا: ''مسلمان ہندوستان میں غلام بن کر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔'' (گفتار قایداعظم: ص ۲۴۰)

(۷) ۶ر مارچ ۱۹۴۶ء کو فرمایا: ''مسلم لیگ انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کر کے ہندو کا غلام بننے پر تیار نہیں۔'' (گفتار قایداعظم: ص ۲۹۴)

اب جب کہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرلیا گیا تو ہندوستان کی مسلمان اقلیت کو نہ صرف یہ کہ پرامن زندگی کا اصول بتلایا بلکہ انھیں تنبیہ کی کہ کوئی حکومت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اقلیت حکومت کی وفادار نہ ہو اور حکومت کے خلاف تخریبی اقدام شروع کر دے، تو اس کا یہ رویہ حکومت کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اب وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ''اپنی حکومت کے وفادار رہیں۔''

حال آں کہ یہ وہی ہندو اور کانگریسی حکومت ہے جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک تھی جس کا وفادار رہنا اور جس کے تحت پُرامن زندگی گزارنا ہندوؤں کی غلامی اور حاشیہ برداری تھا، جس کے لیے وہ تیار نہ تھے، لیکن اب خود حکومت مل رہی ہے اور غیر مسلم اقلیتوں کی وفاداری کی ضرورت ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ''اپنی حکومت کے وفادار رہیں'' اور تنبیہ کی جاتی ہے کہ اگر انھوں نے رسم وفاداری ادا نہ کی اور کسی قسم کی گڑبڑ کی تو حکومت ان پر سختی کرنے اور تشدد کرنے میں حق بہ جانب ہوگی اور اس کی ذمے داری خود ان پر ہوگی!

۱۱/اگست ۱۹۴۷ء: پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا۔ پاکستان کے گورنر جنرل اور صدر دستور ساز اسمبلی مسٹر محمد علی جناح نے افتتاحی تقریر کی اور اس میں نظام حکومت، دستور سازی، اقلیتوں کی حیثیت، قومیت کے نظریے، پاکستان میں مذہب کے مقام پر روشنی ڈالی اور حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا۔ حکومت کی سیکولر پالیسی کے اظہار کے لیے ایک غیر مسلم اچھوت جوگندر ناتھ منڈل کو پہلے ہی قانون کا بستہ دے دیا گیا تھا۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا چیرمین بھی منڈل تھا اور اسی کی صدارت میں یہ اجلاس ہو رہا تھا۔ حکومت کی سیکولر پالیسی کے اظہار کے لیے اجلاس کے آغاز میں قرآن حکیم کی تلاوت نہیں کی گئی تھی۔

گورنر جنرل کی تقریر پاکستان میں نسل و رنگ اور عقیدہ و مذہب کے امتیاز کے انکار، حقوق، مراعات اور فرائض میں برابری، ہندو مسلم فرقہ وارانہ امتیازات کے خاتمے، مذہب اور عقیدہ و مسلک کا ریاست کے امور سے عدم تعلق، مذہب اور عقیدے کی بنیاد پر تفریق کی نفی اور ریاست کا شہری ہونے کے تعلق سے مسلم اور غیر مسلم کی یک ساں حیثیت، سیاسی معنوں میں آیندہ ہندو کے ہندو اور مسلمان کے مسلمان نہ رہنے کا ادعا اور مذہب کو ہر فرد کا نجی معاملہ قرار دینے کا اعلان وغیرہ مضامین سے پر تھی۔ اس میں کئی باتیں سیاسی لحاظ سے اچھی اور مذہبی اعتبار سے کئی باتیں شرم ناک ہیں!

افسوس کہ تحریک کے جس بانی نے پچھلے دس سال تک مذہب اسلامی تہذیب اور مسلم مفاد سے ادنا واقفیت و تعلق نہ ہونے کے باوجود سب سے زیادہ مذہب اور انھیں کے افکار و

مسایل کا نام استعمال کیا تھا اور مذہبی منافرت پھیلا کر ملک کی فضا کو اس درجے مسموم کر دیا تھا کہ اس فضا میں سانس لینا دشوار ہو گیا تھا، مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو اتنا بھڑکا دیا تھا کہ عقل و ہوش کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا، مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی امتیازات و خصایص اور مسلم مفاد کے تحفظ و بقا کے لیے پاکستان بنانے کی تحریک چلائی تھی اور جن کے نزدیک ہندو اور مسلمان کا یک ساں شہری ہونا اور مذہبی اعتبار سے اپنے اپنے دایروں میں زندگی بسر کرنا ممکن ہی نہ تھا، انھوں نے بہ یک جنبش لب تمام امتیازات مٹا دیے، مذہب کو نجی معاملہ قرار دے دیا اور قانون اور ریاست کی نظر میں دونوں کو ایک سطح پر لا کھڑا کیا، جن کے حقوق و فرایض میں نہ کوئی فرق تھا، نہ ایک کو دوسرے پر کوئی ترجیح تھی۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے لیے برٹش استعمار کے خلاف مشترکہ جدوجہد بھی جایز نہ تھی، پاکستان میں عام زندگی میں حقوق و مراعات و فرایض سے لے کر اسلامی مملکت کی دستور سازی کے فرایض اور ذمے داریوں تک سب برابر کے شہری ہو گئے۔ یاللعجب! گورنر جنرل پاکستان کی اس تاریخی تقریر کے اہم نکات یہ ہیں:

> ''پاکستان کی عظیم ریاست کو اگر ہم آسودہ، خوش حال اور ثروت مند بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں عوام کی فلاح پر تمام تر توجہ مرکوز کرنی پڑے گی اور ان میں بھی عام لوگوں بالخصوص نادار آبادی کی فلاح مقدم ہے۔ اگر آپ نے ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر کے اور ناگواریوں کو دفن کر کے باہم تعاون سے کام کیا تو آپ کی کامیابی یقینی ہے، اگر آپ نے ماضی کی روش بدل دی اور آپس میں مل جل کر اس منصوبے کے ساتھ کام کیا کہ آپ میں سے ہر شخص خواہ وہ کسی بھی فرقہ سے ہو، خواہ ماضی میں آپ کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو، اس کا رنگ ذات پات یا مسلک خواہ کچھ بھی ہو، وہ شخص اول و آخر اس ریاست کا شہری ہے اور اس کے حقوق، مراعات اور فرایض برابر کے ہیں، تو یاد رکھیے کہ آپ کی ترقی کی کوئی حد و انتہا نہ ہو گی۔
>
> میں اپنی بات اس سے زیادہ شد و مد سے نہیں کہہ سکتا، ہمیں اسی جذبے کے ساتھ اپنا کام شروع کرنا چاہیے اور وقت گزرنے کے ساتھ اکثریتی اور اقلیتی

فرقے، ہندو فرقے اور مسلمان فرقے کے یہ سارے امتیاز ختم ہو جائیں گے، کیوں کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں بھی آپ کے درمیان پٹھان، پنجابی، سنی اور بہت سے امتیاز اور ہندوؤں میں برہمن، وشنو، کھتری، اس کے علاوہ بنگالی اور مدراسی وغیرہ کے اختلاف موجود ہیں۔ دراصل آپ اگر مجھ سے پوچھیں تو میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان کے لیے آزادی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے اور اگر یہ امتیاز نہ ہوتے تو ہم لوگ مدتوں پہلے آزاد ہو گئے ہوتے۔ کوئی طاقت کسی قوم کو اور وہ بھی چالیس کروڑ باشندوں کی قوم کو غلام بنا کر نہیں رکھ سکتی۔ کوئی فرد آپ کو فتح نہیں کر سکتا تھا اور اگر یہ حادثہ ہو بھی چکا تھا تو کسی بھی عرصے کے لیے وہ اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ بہ شرطے کہ تفرقے کی یہ صورت نہ ہوتی، لہٰذا اس تجربے سے ہمیں سبق سیکھنا چاہیے۔ آپ آزاد ہیں، آپ کا ملأ آزاد ہیں کہ اپنے مندروں میں جائیں، آپ کو پوری آزادی حاصل ہے کہ اپنی مساجد کا رخ کریں یا پاکستان کی ریاست میں جو بھی آپ کی عبادت گاہیں ہیں ان میں آزادی سے جائیں، آپ کا کوئی بھی مذہب، ذات یا مسلک ہو سکتا ہے، ریاست کے امور سے اس کو کوئی بھی تعلق نہیں۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے تاریخ سے ظاہر ہے کہ کچھ عرصے پہلے برطانیہ میں بھی اس ملک کے حالات ہندوستان کے موجودہ حالات سے کہیں بدتر تھے۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں ایک دوسرے پر عذاب توڑتے تھے، حتیٰ کہ اب بھی بعض ریاستیں موجود ہیں جہاں کسی خاص طبقے کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے اور اس پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اپنا آغاز اس دور میں نہیں کیا بلکہ ہم نے ابتدائے کار اس دور سے کی ہے جب دو فرقوں کے درمیان کوئی تخصیص اور کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ ایک مذہب یا ایک عقیدہ اور دوسری ذات یا دوسرے عقیدے کے لوگوں میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی۔ ہم اپنے معاملات کا آغاز اس بنیادی اصول کے ساتھ کر رہے ہیں کہ ہم سب

ایک ریاست کے شہری ہیں اور برابر کے شہری ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت کو ہمیں بھی بہ طور مثال پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ میں یہ بات مذہبی معنوں میں نہیں کہہ رہا ہوں، کیوں کہ یہ تو ہر فرد کے نجی عقیدے کا معاملہ ہے، بلکہ ریاست کے باشندے ہونے کی بنا پر سیاسی معنوں میں۔''

اقلیتی صوبوں کے مسلمان اور مسٹر محمد علی جناح:

ابھی تک میری نظر سے مسٹر جناح کا کوئی بیان ایسا نہیں گزرا جس میں اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں کوئی بات کہی ہو۔ بنگال، بہار، یوپی، مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے تحفظ جان و مال کے لیے کوئی کلمہ خیر کہا ہو۔ ان کو بچانے کے لیے کوئی تجویز سوچی ہو اور کسی قسم کا کوئی انتظام کیا ہو۔ ہمیشہ انھیں اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں پر قربان ہو جانے کی دعوت دی۔ کلکتہ و بہار کے قتل عام، لوٹ مار، آتش زدگی، مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ جانے اور مغربی پنجاب اور سرحد کے بعض علاقوں میں برادارن وطن کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے اور مسلمانوں کو اپنے دست ستم کو کھینچ لینے کے لیے اپنی زبان سے دو لفظ بھی ادا کیے ہوں۔ ان کے رویے کے مطالعے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا یہ تمام باتیں ان کی مرضی کے مطابق ہو رہی تھیں اور گڑھ مکتیشر کے فساد سے تو انھوں نے پاکستان کے قیام کے لیے استدلال فراہم کیا ہے۔ اگر چار کروڑ مسلمانوں کے تحفظ اور سر بلندی کے لیے چار کروڑ کی قربانی لازمی ٹھہرے تو یہ قدیر اور سیاسی قیادت کی قبول کہاں ہوئی؟ یہ تو کوئی دیوانہ بھی کر سکتا تھا۔ اس میں لیگ کی قیادت عظمیٰ کی خصوصیت کیا ہوئی؟ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو تو وہ پاکستان کا ایندھن سمجھتے تھے!

اقلیتی صوبوں کے مسلمان
اور دوقومی نظریے کی ہلاکت خیزی

سیاسی عقاید جب رنگ پکڑ لیتے ہیں تو عوام اور خواص دونوں کے دماغ سے ٹھوس حقیقتیں بے گانہ ہو جاتی ہیں اور وہ بہت سی ایسی باتوں کو قبول کرتے چلے جاتے ہیں جو ان کے اصل نظریات سے قطعی مختلف ہوتی ہیں۔ مسلم اقلیتیں جس پاکستان کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار تھیں اس پاکستان میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا کوئی سوال نہ تھا، مگر جب ان کو صحیح حالات کا اندازہ ہوا (تو) وہ مستقبل کے افکار میں گرفتار ہو گئے۔ وہ یاد کرتے تھے کہ پاکستان کا عقیدہ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے قایم کیا گیا تھا۔ کیوں کہ شمال مغربی اور مشرقی مسلم حصوں میں تو یوں بھی مسلمان کہیں ستر کہیں پچپن فیصدی تھے، جن کے لیے تحفظات کی ضرورت نہ تھی، پھر جب ان حصوں سے مسلم اقلیتوں کا کوئی سلسلہ یا سروکار نہ رہ جائے گا تو وہ اقلیتیں بالکل بے بس ہو جائیں گی۔ اسی لیے ۳ر جون (کے اعلان) کے بعد ان کے ذہن پر ایک بڑا بوجھ پڑ گیا اور وہ اس کے نیچے دبنے لگے اور ان پر یاس طاری ہونے لگا۔ دوسری طرف پاکستانی حصوں کے ہمارے ساتھی اپنا اپنا مستقبل بنانے کی فکر میں لگ گئے اور قدرتاً ان کو ہم سے صلاح و مشورہ کرنے میں دقتیں محسوس ہونے لگیں، جو کل تک ہمارے ساتھی سپاہی تھے وہ آج کچھ بے گانے سے ہو گئے! ادھر ملک میں دو قومی نظریے نے بڑا تفرقہ ڈال دیا تھا، جو لوگ پاکستان بنانے کی سعی میں پیش پیش تھے ان سے سخت عناد پیدا ہو گیا تھا۔ (شاہراہ پاکستان: ص ۵۸-۱۰۵۷)

۲۸ر دسمبر ۱۹۴۰ء: احمد آباد میں مسٹر جناح نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہندوستان کو تقسیم کر دینا چاہیے تا کہ ہندو اور مسلمان اچھے پڑوسیوں کی طرح رہ سکیں۔ اگر ہندوؤں نے سارا ہندوستان لینے کی کوشش کی تو وہ سارے کا سارا کھو دیں گے، لیکن اگر انھوں نے ایک تہائی مسلمانوں کو دے دینے پر رضا

مندی ظاہر کی تو انھوں دو تہائی مل جائیں گے۔ ہندو صوبوں کی مسلم اقلیتیں اپنی تقدیر پر شاکر رہیں، لیکن وہ مسلم اکثریتی صوبوں کی آزادی میں کبھی مزاحم نہ ہوں! قیام پاکستان کے بعد میں ہندو اکثریتی صوبوں کی مسلم اقلیتوں کو ہجرت عام کی رائے نہیں دوں گا۔"

(خطبات قاید اعظم از رئیس احمد جعفری، لاہور (بار دوم): ص ۲۶۱)

مسٹر جناح کا فلسفۂ پاکستان اور اقلیتی صوبوں کے مسلمان:

۳ر جنوری ۱۹۴۱ء: نوجوانانِ بمبئی کے ایک اجتماع میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"حضرات! ہمارے مطالبۂ پاکستان کے ضمن میں اہم ترین سوال یہ ہے: کیا یہ ممکن ہے کہ سارے ہندوستان کے لیے ایک وحدانی مرکزی حکومت قایم کی جا سکے؟ جو چالیس کروڑ انسانوں پر حکومت کرے۔ اس قسم کے نظامِ حکومت کے ماتحت آبادی تین ہندوؤں اور ایک مسلمان کی نسبت سے ہوگی۔ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہندوؤں کے حکم اور فرمان کی تعمیل پر سب مجبور ہوں گے۔ اس ملک کے اندر جمہوریت اور جملہ بالغان کے لیے حق رائے دہندگی سے ہندو راج مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی ضرورت لاحق ہوئی، مگر اس سے مسلمانوں کا یہ مقصد نہیں کہ فریب کاریوں اور حیلوں کے ذریعے سے سارے ملک پر فوقیت حاصل کریں۔ مسلم لیگ فقط یہ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو ان دو طبقات ملک میں حکم رانی اور اپنی تہذیب و تمدن کے نشو و نما کا موقع مل جائے، جنھیں وہ اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ چناں چہ ہم ہندوؤں کو کہتے ہیں کہ دوسرے حصوں میں آپ اپنی حکومتیں قایم کیجیے اور اپنی فطرت و جبلت کے مطابق ترقی کیجیے۔ خدا آپ کی کوششوں کو بار آور کرے۔

ان مسلمان بھائیوں کے متعلق ہمیں کوئی تشویش نہ ہونی چاہیے جو اقلیت کے صوبوں میں رہتے ہیں۔ غور طلب یہ مسئلہ ہے کہ اگر ساڑھے چھ کروڑ

مسلمانوں کو جو اکثریت کے منطقوں میں ہیں ایک کل ہند متحدہ حکومت کے تابع کر دیا جائے تو باقی ماندہ ڈھائی کروڑ مسلمانوں کے جو دیگر صوبہ جات میں ہیں کیا فایدہ پہنچ سکتا ہے؟

میں جس صوبے میں اقلیت میں ہوں وہاں اپنی قسمت پر شاکر ہو کر اپنا فرض ادا کروں گا، لیکن میں ان مسلمانوں کو جو اکثریتی صوبوں میں ہیں دوامی اقلیت اور ہندوؤں کے اقتدار سے آزاد کراؤں گا۔

مسٹر گاندھی کانگریس اور ہندو مہاسبھا سارا ہندوستان حاصل کر لینا چاہتے ہیں، لیکن انھیں یہ کبھی نہ ملے گا! البتہ انھوں نے زیادہ حرص و ہوس سے کام نہ کیا اور ہمیں ایک تہائی دے دیا تو پھر شاید انھیں دو تہائی ملے گا اور قضیہ ختم ہو جائے گا۔" (خطبات قایداعظم: مرتبہ رئیس احمد جعفری)

تدبر کی ایک عبرت ناک مثال:

اقلیت والے صوبوں پر جو گزرتی ہے گزر جانے دو، لیکن آؤ ہم اپنے اُن بھائیوں کو آزاد کرا دیں جو اکثریت کے صوبوں میں ہیں تاکہ شریعت اسلامی کے مطابق وہاں آزاد حکومت قایم کر سکیں۔

(تقریر احمد آباد: از مسٹر جناح، ایمان - لاہور (پاکستان نمبر): ۲۸ر فروری ۱۹۴۱ء)

اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی فاتحہ اور مسٹر جناح:

مارچ ۱۹۴۱ء: مارچ ۱۹۴۱ء کا مہینہ ہے، کان پور کے مسلم طلبہ فیڈریشن کے اجلاس میں مسٹر جناح نے تقریر کی اور کہا کہ

"وہ اکثریت والے سات کروڑ مسلمانوں کو آزاد کرانے کے لیے دو کروڑ مسلمانوں کی شہادت کی آخری رسوم ادا کرنے کو تیار ہیں۔ سات کروڑ مسلمانوں کی آزادی کی خاطر دو کروڑ مسلمانوں کے جام شہادت پی لینے کا جس لیڈر کو کوئی افسوس نہ ہو اس کی ذہانت اور دور اندیشی کی تعریف کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ...... برین عقل و دانش بباید گریست۔

(از ابن یحییٰ انصاری، حسرت موہانی - ایک سیاسی ڈائری: ص ۱۹۹)

میں مسلم اکثریت کے ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کی آزادی کی خاطر مسلم اقلیت والے صوبوں کے ڈھائی کروڑ مسلمانوں کو قربان کر کے ان کے مراسم تجہیز و تکفین ادا کرنے کو تیار ہوں۔ (مدینہ۔ بجنور: ۹ر جولائی ۱۹۴۴ء) نیز دیکھیے: گفتار قائد اعظم: مرتبہ پروفیسر احمد سعید: ص ۲۵۴، وخطبات وتقاریر و بیانات: مرتبہ سید رئیس احمد جعفری، ص ۲۷۹)

لیگ کا عاقبت نااندیشانہ بیان:

۱۱ر نومبر ۱۹۴۶ء: بہار میں فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کو سخت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ بہار کے مسلمانوں کی مدد کے لیے سرحد کے خدائی خدمت گاروں کا وفد بادشاہ خان کی سربراہی میں، پنجاب نے مجلسِ احرار کے رضا کاروں اور ان کے رہنما، دہلی و یو پی سے جمعیت علمائے ہند کے رہنما اور کارکن، لکھنؤ سے ندوۃ العلماء کے طلبہ اور بہار کے کانگریسی اور جمعیت کے لیڈر اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر، جانوں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے بہار کے قصبات و قریات میں مارے مارے پھر رہے تھے، لیکن بہار کے لیگی رہنماؤں نے جو صوبے سے فرار اختیار کرلیا تھا یا محفوظ مقامات پر چھپے بیٹھے تھے کسی نے میدان میں نکل کر مظلومین کی دست گیری کی ہمت نہ کی۔ تحریک پاکستان کے قائد اعظم اور مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے مسلمانانِ بہار سے اپیل کی ہے، اس میں انھیں تسلی دینے اور ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کا کیسا حق ادا کیا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے ان جملوں سے کیا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ہیں، جو بے گناہ مسلمان شہید کیے گئے ہیں یا زخمی ہوگئے ہیں یا مال و اسباب لوٹا گیا ہے ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ یہ سمجھ لیں کہ انھوں نے جنگ پاکستان اور آزادی کے لیے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔'' (خطبات قائد اعظم: مرتبہ رئیس احمد جعفری)

اقلیتی صوبوں کے مسلمان اکثریتی صوبوں کے مفادات کا ایندھن:

۱۱ر نومبر ۱۹۴۶ء: کلکتہ، نواکھالی، بہار اور گڑھ مکتیسر کے فسادات سے اپنے مقصود کو

پورا کرنے میں مسٹر جناح نے کوتاہی نہیں کی۔

چناں چہ گڑھ مکتیسر کے فساد (۶ر نومبر ۱۹۴۶ء) کے فوراً بعد مسٹر جناح نے ۱۱ر نومبر کو نئی دہلی سے ایک بیان جاری کیا، جس میں آپ نے ارشاد فرمایا:

''اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے بے پناہ مصایب اور ان کا جو قتل عام ہوا ہے اور جس طرح ان پر سفا کانہ اور بہیمانہ مظالم ہوئے وہ رایگاں نہ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قربانی ہمارے مطالبۂ پاکستان کو ''مسلّمہ'' کر دے گی۔ جو لوگ مارے گئے یا مجروح ہوئے یا جن کا مالی نقصان ہوا ان سب کو تسلی دینی چاہیے کہ انھوں نے ہماری آزادی اور حصول پاکستان کے سامنے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔''

(روز نامہ منشور-دہلی: ۱۴ر نومبر ۱۹۴۶ء / ۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ: ج۹: ص ۳۶۰)

کاش! جناح صاحب نے ان پر ظلم کے مداوے میں ان کی کوئی مدد کی ہوتی، ان کے زخموں پر کسی قسم کی مالی امداد سے، زبانی تسلی سے ان کے زخموں کے لیے کوئی مرہم بھی فراہم کیا ہوتا۔ افسوس! انھوں نے ان پر ظلم کو بھی پاکستان کے الاؤ بھڑکانے کے لیے بہ طور ایندھن کے استعمال کیا؟

ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کی شدھی:

پٹنہ ۲۱ر فروری: بہ ذریعۂ ڈاک آج مسٹر شرما کی دعوت پر ''آزاد ہند'' اخبار کا افتتاح میجر شاہ نواز نے ادا کیا۔ اس موقع پر احرار کارکنوں اور آئی این اے کے افسروں میں بہار اور کلکتہ کے ریلیف کاموں کے سلسلے میں گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو میں میجر جنرل شاہ نواز، میجر اسحاق، میجر قادر، کرنل محبوب، سالار عبد الستار اور سید مخدوم شاہ بنوری، احرار لیڈر سید محمد یوسف اور کئی اور ورکر موجود تھے۔

میجر شاہ نواز نے سہروردی وزیر اعظم سے اپنی بات چیت کے متعلق فرمایا کہ

''جب میں نے وزیر اعظم صاحب سے کہا کہ بنگال اور بہار کی ساری مصیبت تمہارے پاکستان اور نفرت کے نعروں کی پیداوار ہے تو وزیر اعظم نے نہایت

اطمینان سے جواب دیا کہ ہمیں اس سے کیا غرض ہے۔ ہم تو پاکستان بنائیں گے، خواہ اقلیت کے ساڑھے چار کروڑ مسلمان اچھوت اور شدھی ہو جائیں۔"

(انصاری۔ دہلی: مورخہ ۲۶ر فروری ۱۹۴۷ء: ص ۳، کالم ۵، ج ۱۸ نمبر ۵۶)

ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی اور لیگ:

ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے مسٹر جناح نے آئی آئی چندریگر کو بمبئی میں اور چودھری خلیق الزماں کو لکھنؤ میں چھوڑا تھا۔ چودھری صاحب نواب محمد اسماعیل خاں کو ذمے دار بنانا چاہتے تھے۔ حسن شہید سہروردی کو بنگال کو پاکستان سے الگ متحد رکھنے کی تحریک کی رہنمائی کے لیے کلکتہ میں چھوڑا تھا اور خود اپنی بہن کے ساتھ ۷ر اگست کو کراچی تشریف لے آئے تھے۔ انھیں دنوں میں آگے پیچھے لیاقت علی خاں اور دوسرے رہنما و سرکاری ملازمین پاکستان آگئے تھے، چندریگر اگست سے پہلے ہی کراچی آگئے اور ۵ر اگست کو آزاد ہندوستان کا جھنڈا بلند کر کے اور اپنی وفاداری کا اعلان کر کے چودھری صاحب بھی کراچی آگئے۔ ان کے آنے پر مسٹر جناح ناراض ہوئے۔ شہید سہروردی کو آنے میں قدرے تاخیر ہوئی تو پاکستان اسمبلی سے ان کی رکنیت ختم کر دی گئی۔ نواب صاحب تشریف لائے تھے لیکن یہاں ان کو سیاسی موسم راس نہ آیا تو خاموشی سے اپنے وطن لوٹ گئے۔

جناح صاحب ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت سے دستبردار نہ ہونا چاہتے تھے۔ کراچی میں لیگ کونسل کے اجلاس ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے لیگی رہنماؤں کو انھوں نے اپنے حالات کے مطابق اپنی تنظیم الگ کر لینے کی اجازت دے دی تھی، لیکن انھیں مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر صدارت لکھنؤ کانفرنس مورخہ ۲۹، ۳۰ر دسمبر ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ کے نمائندوں کی حیثیت سے شریک ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اور ہندوستان میں لیگ کے رہنماؤں نے اس پر عمل کیا تھا، خواہ وہ اس فیصلے سے متفق نہ ہوں۔ انھوں نے کانفرنس کے منتظمین سے مبصر کی حیثیت سے شرکت کی اجازت چاہی اور اجازت مل گئی۔ کانفرنس کے مذاکرات اور فیصلوں میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ جناح صاحب لیگ کے ہندوستانی حصے کو الگ اور آزاد کر کے بھی شاید اسے اپنی ہدایات پر چلانا چاہتے تھے، لیکن اب

ملک کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد اس کا کوئی موقع نہیں رہا تھا۔ (ا۔س۔ش)

لیگیوں کی رجعت قہقری:

۳۰؍جون ۱۹۴۷ء: قیام پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی لیگیوں نے بھی خطرات کو محسوس کرتے ہوئے رجعت قہقری میں کوتاہی نہیں کی۔ چناں چہ ۳۰؍جون کو مسلم لیگ کے صدر مدراس اسمبلی کی لیگ پارٹی کے لیڈر محمد اسماعیل صاحب نے پریس کو بیان دیتے ہوئے فرمایا:

> ''مدراس کے مسلمان اول ہندوستانی اور اس کے بعد مسلمان ہیں۔ ہر سچا مسلمان سچا ہندوستانی اور سچا مدراسی بھی ہے۔ میرے اس نظریے کی تائید قرآن اور حدیث سے ہوتی ہے۔
>
> سوال یہ ہے کہ اگر اقلیت والے صوبوں کی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا تو کیا پاکستان ہماری امداد کے لیے ہندوستان کے خلاف کوئی فوجی کارروائی کرے گا؟ نہیں! ایسا بالکل ممکن نہیں اور اسی خیال سے میں اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ اگر واقعی سچے مسلمان ہیں تو سب سے پہلے سچے ہندوستانی بنیں۔ میرا یہ خیال کسی غلطی پر مبنی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے آپ کو قومیت و وطنیت کی طرف منسوب کرتے ہوئے خود کو ہاشمی العربی فرمایا ہے۔ اگر ہم اس کے خلاف کوئی طریقہ اختیار کریں گے اور اپنے آپ کو پہلے مسلمان اور بعد میں ہندوستانی قرار دیں گے تو ہم اپنے ہی دیش میں غیر ملکی بن کر رہ جائیں گے۔''
>
> (قومی آواز: ۳؍جولائی ۱۹۴۷ء)

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے اجلاس میں چودھری خلیق الزماں صاحب (لیڈر مسلم لیگ پارٹی) نے فرمایا:

> ''ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ قومی جھنڈے کا احترام کرے۔ اگرچہ یہ کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے، لیکن یہ قوم کی آرزوؤں اور عزت کا نشان ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ

ہر مسلمان اور ہر عیسائی اس جھنڈے کو بلند کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔"

(قومی آواز: ۲۸ر جولائی ۱۹۴۷ء)

ڈپٹی لیڈر مسلم لیگ پارٹی (سر سعد اللہ صاحب) نے فرمایا:

"میں جھنڈے کو سلام کرتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ جھنڈا نشان ہے ہماری تمناؤں کا، ہماری جدوجہد کی کامیابی اور ہماری قربانیوں کا۔"

(قومی آواز: ۲۸ر جولائی ۱۹۴۷ء)

جناح صاحب اور ہندوستان میں مسلمانوں کی رہنمائی:

۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء: لیگی رہنماؤں نے ایک ایک کرکے فیصلہ کرلیا کہ وہ نئے قایم ہونے والے ملک پاکستان جائیں گے۔ سوال یہ تھا کہ پھر ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کون کرے گا۔ مسٹر جناح نے چودھری خلیق الزماں سے کہا کہ وہ ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے، لیکن یہی بات انھوں نے مسٹر آئی. آئی. چندری گر سے بھی کہی۔ چودھری صاحب کا خیال تھا کہ نواب محمد اسماعیل خاں کو یہ ذمے داری سونپی جائے۔ پھر چودھری صاحب مسٹر چندریگر کے حق میں دست بردار بھی ہوگئے، لیکن ۱۳ر جولائی کو کانسٹی ٹیونٹ لیگی ارکان کا جو جلسہ ہوا اس میں منتخب چودھری صاحب ہوگئے۔ جوڑتوڑ اور رازِ درونِ پردے کی کہانی تو معلوم نہیں ہوسکی۔ چودھری صاحب کے قلم سے دوسری تفصیلات یہ ہیں:

"صوبۂ یوپی سے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی آٹھ نشستوں میں سے ۷ مسلم لیگ کو ملیں اور ایک رفیع احمد قدوائی کو۔ (۱) نواب اسماعیل خاں (۲) مولانا حسرت موہانی (۳) مسٹر عزیز احمد خاں (۴) نواب قزلباش (۵) مسٹر رضوان اللہ (۶) بیگم اعجاز رسول (۷) خلیق الزماں۔ دوسرے صوبوں کے مسلم اقلیتی نمایندوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔ مدراس ۴، بمبئی ۲، بہار ۵، مشرقی پنجاب ۴، مغربی بنگال ۴۔

۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو ہم نے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں لیڈر کے انتخاب کے لیے نواب اسماعیل خاں کی صدارت میں جلسہ کیا، مگر چوں کہ اس میں بہت سے ممبران شریک نہیں

تھے، لہٰذا ۱۲ر جولائی کے لیے جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔ جب ۱۲ر جولائی کو جلسہ ہوا تو وہ بھی بہ وجوہات ۱۳ر جولائی کے لیے ملتوی ہو گیا۔

۱۲ر جولائی کی شام کو میں چندریگر کے یہاں بیٹھا تھا کہ کچھ اور مسلم ممبران کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی آ گئے اور تجمل حسین بہار کے ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں خود مسلم پارٹی کی لیڈری منظور کر لوں۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں نواب اسماعیل خاں کی تائید کرتا ہوں اور آپ بھی انھیں کی تائید کریں۔ جب صبح ۱۳ر جولائی کو وسٹرن کورٹ میں جلسہ ہوا تو مجھ سے کہا گیا کہ چندریگر صاحب بھی ایک امیدوار ہیں اور آپس میں مصالحت کی گفتگو ہو رہی ہے، لہٰذا جلسہ ۳ بجے شام تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ میں نے اس کو بہ خوشی منظور کر لیا۔ (یہ ملحوظ خاطر رہے کہ چندریگر صاحب کا اس وقت تک پاکستان منتقل ہونا طے نہیں ہوا تھا)۔ چندریگر صاحب نے مجھے بتایا کہ جناح صاحب نے ان سے کہا ہے کہ میں خود مسلم لیگ پارٹی کی قیادت قبول کر لوں، جس سے ان کو بڑی خوشی ہوگی۔ میں نے کہا کہ بھئی میں خود نواب اسماعیل خاں کی تائید کر رہا ہوں اور اس آخر وقت میں ردوبدل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نواب صاحب سے میرے تعلقات خراب ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ جناح صاحب سے میں ٹیلی فون ملاؤں اور آپ خود ان سے بات چیت کر لیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ ٹیلی فون نہ ملائیں، میں ان کو ناخوش نہ کروں گا۔ لنچ کے بعد دوبارہ جلسہ ہوا اور میں مسلم انڈیا کا لیڈر منتخب ہو گیا۔" (شاہراہِ پاکستان: ص ۵۷-۱۰۵۶)

مسٹر جناح کی ہندوستانی مسلمانوں کو نصیحت:

۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء: ۱۱ر اکتوبر کو پاکستانی فوج سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر محمد علی جناح نے ہندوستانی مسلمانوں کو نصیحت کی:

"ہندوستان میں اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے میری یہی نصیحت ہے کہ وہ جس ریاست میں ہوں اس کے ساتھ بغیر کسی جھجک اور تکلف کے اپنی وفاداری کا اظہار کریں۔"

(ہندوستان اپنے حصار میں: ایم۔ جے۔ اکبر۔ ناشر خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ، ص ۱۲-۲۱۱)

پاکستان بھارت تعلقات اور مسٹر جناح کا بیان:

۲۵/اکتوبر ۱۹۴۷ء: گورنر جنرل پاکستان نے رایٹر کے نمایندے کو جو انٹرویو ۲۵/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دیا تھا، اس میں انھوں نے کہا تھا:

''پروفیسر ڈاکٹر گیڈگل نے اپنے ۹/اکتوبر کے بیان میں یہ بجی بات کہی ہے کہ نئی انڈین یونین کی موزوں اور مناسب تعبیر صرف یہ ہے کہ یہ ایک ہندو ریاست ہے یا ہندو قومی ریاستوں کا وفاق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انڈین یونین کو ہندو ریاست کہنا اس بنا پر درست ہے کہ یہی اس کے مزاج کا سب سے نمایاں اور بالاتر پہلو ہے۔

۱۱/مارچ ۱۹۴۸ء کو قایدِ اعظم محمد علی جناح سے سویٹزرلینڈ کے ایک اخبار نویس نے انٹرویو لیا، اس نے قایدِ اعظم سے متعدد سوالات پوچھے، ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا کوئی ایسی امید ہے کہ پاکستان اور بھارت اپنے بنیادی اختلافات اور جھگڑے پُرامن ذرایع سے طے کرلیں؟

قایدِ اعظم نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ شرط یہ ہے کہ بھارتی حکومت غرور اور برتری چھوڑ دے اور پاکستان سے مساوی سطح پر معاملہ طے کرے، نیز حقایق کا پورا اعتراف کرے۔

نامہ نگار نے قایدِ اعظم سے ایک اور سوال کیا کہ آیا بھارت اور پاکستان دونوں بین الاقوامی امور میں کسی یکساں پالیسی پر عمل کر سکتے ہیں اور اپنی بری اور بحری سرحدوں کے دفاع کے لیے دوش بہ دوش کھڑے ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں بانیٔ پاکستان نے کہا:

> ''ذاتی طور پر اس باب میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے اپنے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان بین الاقوامی امور و مفادات میں باہمی تعاون کے ذریعے بڑا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان اور ہندوستان دونوں کے لیے یہ امر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ بیرونی حملے کی صورت میں یہ اپنی بری اور بحری سرحدوں کے تحفظ کے لیے دوستانہ طریق پر تعاون کریں، مگر سارا دار و مدار اس امر پر ہے کہ بھارت اور پاکستان خود اپنے اختلافات

پہلے طے کرلیں۔ گھر کا اندرونی نظم ونسق بہتر ہوگا جب ہی ہم بین الاقوامی امور میں عظیم کردار ادا کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔''

(روز نامہ کوہستان-لاہور: ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۸ء بہ حوالہ ''گفتار قائداعظم'' مرتبہ احمد سعید)

مسٹر جناح نے کابینہ پلان پہلے منظور کرلیا تھا، پنڈت نہرو کے ایک بیان کو بہانہ بنا کر اس کی منظوری واپس لے لی تھی۔ حال آں کہ انھوں نے یہ منظوری لیگ کے حلقوں کی بے چینی، اخبارات کی تنقید اور بمبئ وغیرہ کے مسلمان سرمایہ داروں کی پریشانی اور احتجاج سے مجبور ہوکر واپس لی تھی۔ وہ کنفیڈریشن کے نظریے اور اس کی اہمیت کے مخالف نہ تھے۔ چناں چہ اس انٹرویو میں انھوں نے

۱۔ بین الاقوامی امور (خارجہ پالیسی) اور

۲۔ دفاع

دو امور میں ہندوستان سے تعاون اور یک ساں پالیسی واختیار کے امکان کو تسلیم کرلیا ہے۔ اب اگر دونوں حکومتیں ایک تیسرے درجے کے مسئلے ''رسل ورسایل'' میں ایک پالیسی پر عمل پیرا ہوجائیں اور اس طرح کا تعاون کرلیں کہ دونوں ملکوں کی خودمختاری پر آنچ نہ آئے تو کیا یہ ٹھیک کابینہ مشن پلان نہ ہوجائے گا؟ لیکن اگر کابینہ مشن پلان کی بنیاد پر تصفیہ کیا جاتا تو زیادہ باعزت اور باوقار معاہدہ ہوتا۔

(۲)

مسلم لیگ-تاریخ وسیاست

انگریزوں سے ساز باز-شبہات:

۱۹۲۷ء: اقبال احمد خان نے وولپرٹ کی کتاب ''جناح آف پاکستان'' سے مستفاد ایک مضمون لکھا ہے جو ''بدلتی دنیا'' لاہور کے ''تحریک آزادی نمبر'' میں چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے:

> ''جناح نے کانگریس کی جانب سے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی بہ ظاہر تو حمایت کی لیکن اسے دل سے قبول نہیں کیا بلکہ اس معاملے پر اس نے وائسرائے سے مستقل رابطہ رکھا اور اس کو بتایا کہ وہ بائیکاٹ کی صرف اس لیے حمایت کر رہا ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو کانگریس کے انتہا پسند لیڈروں کو ابھرنے کا موقع ملے گا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ جناح نے اس قسم کی دوہری پالیسی اختیار کی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ گو ایک طرف تو وہ ہندوستان کی آزادی کا سچے دل سے خواہاں تھا لیکن اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ خود آزاد ہندوستان کا سربراہ لیڈر بن کر ابھرے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کی حکمت عملی ہمیشہ یہ رہی تھی کہ وہ کانگریسوں کے مقابلے میں انڈین گورنمنٹ کے سامنے اپنے آپ کو زیادہ تعاون پر آمادہ اور قابل اعتماد لیڈر کی حیثیت سے پیش کرے۔ اسی وجہ سے اس کی کوشش یہ بھی رہی تھی کہ حکومت کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے ہندوستانی مشتعل ہوں اور انتہا پسندوں کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ اس لیے جب سائمن کمیشن کے متعلق غور کیا جارہا تھا تو جناح نے وائسرائے پر زور دیا تاکہ کمیشن میں ہندوستانی کمشنروں کو بھی شامل کیا جائے، لیکن اس نے جناح کے مشورے سے زیادہ ہیلی کے

مشورے کو اہمیت دی، جس کا نتیجہ وہی نکلا جس کا جناح کو ڈر تھا۔''

وزیر ہند کی سایمن کو ہدایت:

۱۹۲۸ء میں جب سایمن کمیشن ہندوستان کا دورہ کر رہا تھا اس وقت کے وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ (جیسا کہ ان کے بیٹے نے اپنی کتاب ''ایف ای'' میں اقتباس دیا ہے) وائسرائے کو یہ لکھا تھا:

''میں سایمن کو تمام مرحلوں پر ان تمام لوگوں سے ملنے کا مشورہ دوں گا جو کمیشن کا بائیکاٹ نہیں کر رہے ہیں، خصوصاً مسلمان اور اچھوت۔ میں نمایندہ مسلمانوں کے ساتھ سایمن کی گفتگوؤں کی پوری مشتہری ہی چاہوں گا۔ ساری پالیسی اب واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ اکثریت والے ہندوؤں کو خوفزدہ کرنا ہے۔ اس تشویش کے ساتھ کمیشن مسلمانوں کے قبضے میں جا رہا ہے اور ایسی رپورٹ دے جو ہندوؤں کے لیے قطعی تباہ کن ہو۔ محض اس لیے کہ اسے پوری مسلم سپورٹ مل جائے اور جناح بٹ پٹا تارہ جائے۔''

(محمد علی جناح از مرزا راشد علی بیگ: ص ۱۱، خدا بخش لائبریری جرنل ۱۰۲)

مسلم لیگ کا قیام اور اس کا عروج:

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے ایک مسلم اکثریت والے حصے اور ایک ہندو اکثریت والے حصے بنانے کے لیے صوبۂ بنگال کی تقسیم کی۔ جب لوگوں کو یہ علم ہوا کہ اس قسم کا کوئی فیصلہ زیر غور ہے تو دونوں فرقوں نے زبردست احتجاج کیا۔ لارڈ کرزن نے انعام واکرام کی پیش کش کر کے مسلمانوں کو ملا لیا۔ ۱۸ر فروری ۱۹۰۴ء میں ڈھاکہ میں ایک تقریر کرتے ہوئے لارڈ کرزن نے مسلمانوں کو بتایا:

''وہ ڈھاکہ میں مسلم قوت کا ایک مرکز بنانے میں ان کی مدد کریں گے جو مشرقی بنگال کے مسلمان میں وہ اتحاد و یک جہتی پیدا کر دے گا جو انھوں نے مسلمان وائسرائے اور مسلمان بادشاہوں کے عہد میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔''

مسلم لیگ کو اپنی جاگیردارانہ اور مذہبی فطرت کے اظہار میں بھی تردّد نہ ہوا، ۱۹۰۷ء کے ان کے آئین نے رکنیت چار سو بارسوخ اور اہل حیثیت افراد تک محدود رکھی۔ اس کا پہلا مطالبہ اُن ضمانتوں کا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے لیے الگ حلقہ انتخاب کی مانگ کی۔ مسلم لیگ کے قیام کے محض تین سال بعد ۱۹۰۹ء کے انڈین کونسل ایکٹ (جو مارلے، منٹو ریفارمس کے نام سے مشہور ہے) نے علاحدہ حلقہ ہائے انتخاب اور قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کی الگ اہمیت اور حیثیت کو دستوری طور پر تسلیم کرلیا، مگر مسلم لیگ کو کچھ عرصے بعد ہی ایک زبردست دھکا اس وقت لگا جب ۱۹۱۱ء میں دہلی میں منعقد ہونے والے ''دہلی دربار'' میں کنگ جارج پنجم نے بنگال کی تقسیم کے ناسور کو ختم کرکے اور صوبے کو پھر سے متحد کرکے ہندوستان کو ایک عطیہ دے دیا۔

ایک افسردہ وغم گین نواب سلیم اللہ نے ۱۹۱۲ء میں عملی سیاست سے دست کشی اختیار کرلی۔ مسلم لیگ نے اب تک ہندوؤں کے تسلط سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے خیال سے برطانوی حکومت کی حمایت کی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں اس نے سیلف گورنمنٹ کے کانگریس کے مطالبے کو مان لیا۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کی طرف سے محمد علی جناح اور سر وزیر حسن اور کانگریس کی طرف سے موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرد نے دونوں پارٹیوں کے مابین مشہور و معروف لکھنؤ پیکٹ کی تدوین کی۔ اس معاہدے کے امکانی عواقب کو مسلم لیگ کے لیڈر راجہ محمود آباد نے خوش آمدید کہتے ہوئے بہت اچھے طریقے پر بیان کیا تھا:

''ہم ہندوستانی پہلے ہیں اور مسلمان بعد میں۔''

مسلم لیگ کے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ جو پارٹی مسلمانوں کے نام پر بنی تھی اسے خود مسلمانوں کی حمایت نہیں مل رہی تھی۔ مسلمانوں میں زیادہ دل چسپی کانگریس سے نظر آتی تھی۔ اس مقام پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جماعتیں کانگریس اور مسلم لیگ حقیقی معنوں میں باقاعدہ جماعتیں تھیں ہی نہیں، یہ دراصل تحریکیں تھیں۔ ایک ملک کی آزادی کے لیے اور دوسری مسلمانوں کے تحفظ کے لیے۔ محمد علی جناح جیسے پرانے لیڈر صدی کی دوسری دہائی میں بہ یک وقت دونوں تنظیموں میں اہم عہدوں پر فائز رہے اور بغیر کسی قسم کی دشواری محسوس کیے ہوئے۔ یہ تو جب گاندھی

جی نے کانگریس کے لیے ایک مستحکم نظریاتی اساس کی تشکیل شروع کی اس وقت سے ہندو اور مسلمان فرقہ پرست کانگریس سے دور ہونا شروع ہوئے۔ یہ صورتِ حال خود گاندھی جی اور ان کے ساتھ ان کے نئے دست و باز و جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوش، مولانا ابوالکلام آزاد اور اچاریہ کرپلانی جن کی گاندھی جی تربیت کر رہے تھے، سب ہی کے لیے بڑی اطمینان بخش تھی۔

تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے مسلم لیگ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر جاں بلب تھی۔ تین افراد جو اسے اب بھی بچا سکتے تھے مر چکے تھے۔ تحریک خلافت کے پر جوش قاید مولانا محمد علی ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں ذیابیطس کے مرض میں انتقال کر گئے۔ ان کی تدفین یروشلم میں ہوئی۔ اسی سال ۳۱ر مئی کو راجہ صاحب محمود آباد پر دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ بھی اس دنیا سے سدھار گئے۔ ان دونوں کے بعد ۶ر جنوری ۱۹۳۲ء کو پنجاب کے لیڈر سر محمد شفیع بھی رحلت کر گئے۔ بد دل اور مایوس جناح صاحب نے سیاست سے کنارہ کشی کا فیصلہ کیا اور ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے بعد لندن ہی میں رک گئے کہ وہاں اپنی وکالت کی پریکٹس کی تجدید کریں۔

مسلم لیگ کے ایک اہم لیڈر چودھری خلیق الزماں اپنی کتاب (پاتھ وے ٹو پاکستان۔ لانگ مینس ۱۹۶۱ء) میں اپنی پارٹی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''مسلم لیگ پر...... خطاب یافتہ شرفا، نوابوں، زمین داروں اور جی حضوریوں کا تسلط تھا...... ۱۹۰۶ء میں اس کے قیام کے بعد ہی سے مسلم لیگ کی سرگرمیاں تقریباً ہمیشہ ہی اندرون خانہ سرگرمیوں تک محدود رہیں۔ اس کے سالانہ اجلاس بھی سجے سجائے پنڈالوں میں یا کبھی بڑے ہال میں ہوا کرتے تھے جن میں خصوصی اجازت ناموں کے ذریعے معدودے چند عزت مآب حضرات کو شرکت کا موقع ملتا تھا۔ بڑے بڑے عوامی جلسوں سے مسلم لیگ واقف ہی نہیں تھی۔ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں اس کے قیام کے بعد سے ۱۹۱۰ء تک اس تنظیم کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں رہا۔ رکنیت کی فیس اور سالانہ چندوں سے آنے والی رقم عوام میں کام کے لیے تو کم تھی ہی، وہ سلیقے کا ایک دفتر چلانے کے لیے بھی کافی نہیں تھی۔ راجہ صاحب محمود آباد کی تین ہزار رُپے سالانہ کی امداد پر اس نے اپنی زندگی گزارنا شروع کی،

یہی رقم اس کی اصل مقررہ آمدنی تھی۔

مسلم لیگ کو بچانے کے لیے ۱۹۳۴ء میں بہ ہر حال جناح صاحب کو واپس آنے پر مجبور کرلیا گیا۔ اسی سال فروری کے مہینے میں، سلیم پور کے راجہ نے دہلی کے سیسل ہوٹل میں جناح صاحب کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا اور اس میں انھیں ملک کے مسلم قایدین سے ازسرنو متعارف کرایا گیا۔

۲؍جولائی ۱۹۳۵ء کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو شاہی رضامندی حاصل ہوگئی اور ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے لیے راہ ہم وار ہوگئی۔ ان ہی انتخابات کے ذریعے ہندوستانی ریاستوں میں پہلی بار حکومت، ہندوستانی پارٹیوں کو سونپی جانے والی تھی۔ یہی موقع تھا کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے لیے یہ ثابت کرنے کا کہ انھیں ان عوام کی کتنی حمایت حاصل ہے جن کی نمایندگی کا وہ دعویٰ کرتی ہیں۔ جناح صاحب نے پورا زور لگایا، گھر گھر جاکر مسلم لیگ کا ساتھ دینے کی بات کرنے والے ملاؤں کی پشت پناہی کی مدد سے ''ہندو جبر واستبداد'' کو اپنی مہم کا محور بنایا۔ انھوں نے کہا کہ ۲۳ کروڑ ہندو ۷ کروڑ مسلمانوں کو ختم کردیں گے اور ان ہندوؤں کو مسلمانوں کی اس بربادی کے لیے کانگریس کی شکل میں ایک مؤثر ہتھیار مل گیا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ

''ایسی قوتیں ہیں جو تم کو چھیڑیں گی، تم کو ڈرائیں اور دھمکائیں گی۔''

اپنے ۱۹۳۸ء کے خطبے میں انھوں نے کہا: کانگریس مسلمانوں سے غیر مشروط طور پر ہندوراج کی ماتحتی قبول کرانا چاہتی ہے...... کانگریس ہائی کمانڈ عزم کرچکی ہے، مصمم عزم، تمام دوسری کمیونٹیز اور دوسری ثقافتوں کو نیست و نابود کرنے کا اور ہندوراج کے قیام کا...... (گاندھی) کا مطمحِ نظر ہے ہندو مذہب کا احیا اور اس ملک میں ہندوراج کا قیام۔

ہندوستانی قوم پرستی کی تعریف مسلمانوں کی غلامی سے کی گئی اور اسی لیے سب سے بڑے دشمن مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسے وہ مسلمان قرار پائے جو بدستور کانگریس میں شامل رہے۔

مگر جناح صاحب اور مسلم لیگ دونوں کو یہ پتا چل گیا کہ مسلم عوام اس نقطۂ نظر سے

بالکل اتفاق نہیں کرتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ فیصلہ کن حد تک مسترد ہوئی (یہ بہت دل چسپ بات ہے کہ مسلم لیگ نے صرف وہی ایک الیکشن جیتا جو ۱۹۴۶ء میں تقسیم ہند سے ذرا پہلے ہوا تھا۔ مسلم لیگ خود اپنے تخلیق کردہ پاکستان میں کوئی الیکشن نہیں جیت سکی) چودھری خلیق الزماں جو مسلم لیگ کے گڑھ یوپی کی مسلم لیگ کے لیڈر تھے، اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ

> ''یہ مسلمانوں کی حمایت کے بغیر مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔''

وہ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

> ''ہم نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں انتخابی مہم کے لیے چندہ جمع کرنے کی خاطر بلائے گئے ایک جلسے کو خطاب کرنے کے لیے مسٹر جناح کو مدعو کیا۔ یہ جلسہ جوگنگا پر شاد میموریل ہال (لکھنؤ) میں منعقد ہوا تھا جہاں مسلم لیگ سے عوام (مسلمانوں) کی بے تعلقی کا یہ حال نظر آیا کہ شاید سو آدمی سے زاید اس جلسے میں نہ تھے۔ کل ۲۱ ہزار رُپے چندے کا اعلان ہوا جس میں سے ...... تین ہزار وصول نہیں ہوئے۔''

یہ افسوس ناک صورت حال اس وقت مسلم لیگ سے مسلمانوں کی دل چسپی کی آئینہ دار ہے۔ کمیونل اوارڈ آف ۱۹۳۲ء کے تحت مسلمانوں کے صوبے میں ۴۸۵ نشستیں دی گئیں تھیں۔ وہ جماعت جسے مسلمانوں کا تحفظ کرنے کا دعویٰ تھا ان میں سے صرف دس نشستیں ہی جیت سکی۔ اور یہی پارٹی تھی جسے انگریز ''ہندوستانی مسلمانوں کی آواز'' کہتے رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود مذہبی لوگ بھی پورے طور پر لیگ کے ساتھ نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۸ء میں جمعیت علماے ہند کے مولانا مدنی مسلمانوں کو بتا رہے تھے کہ

> ''آج قوموں کا تعین ان کے وطن کے توسط سے ہوتا ہے، نسل یا مذہب سے قوم نہیں بنتی۔''

پچھلے سال مولانا آزاد جمعیت علما کو غیر مشروط طور پر مسلم لیگ کو چھوڑنے اور کانگریس میں شامل ہونے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ۷ ارمئی کو الہ آباد میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں جمعیت علما نے اس سلسلے میں ایک تجویز بھی منظور کی تھی (بنیاد

پرست مذہبی گروہ نے علاحدگی اختیار کی اور ''جماعت اسلامی'' کے نام سے ایک الگ تنظیم اگست ۱۹۴۱ء میں لاہور میں بنالی)۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات۔نتائج اور تجزیہ:

۱۹۳۷ء میں جناح صاحب کے پیش کیے ہوئے اس فرقہ پرستانہ نقطۂ نظر کی حمایت سے اکثر اہم مسلمان لیڈروں نے انکار کردیا۔ان میں یہ خیال پرورش پانے لگا تھا کہ اب جب کہ مسلمانوں کو وہ ''ضمانتیں'' مل گئی ہیں، مسلم لیگ کا جواز ہی ختم ہوجاتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات مذہبی کی بجائے سیاسی منشوروں پر بڑی کامیابی کے ساتھ لڑنے۔

پنجاب میں سکندر حیات خان اور سر فضل حسین جیسے لیڈروں نے کسان لیڈر سر چھوٹو رام کے ساتھ مل کر یونینسٹ پارٹی بنائی اور انتخابات میں زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔ انتہائی کوششوں کے باوجود مسلم لیگ پنجاب کی ۸۶ مسلم نشستوں میں سے صرف دو نشستیں جیت سکی (ان دو نشستوں میں بھی ایک پر راجہ غضنفر علی خان کامیاب ہوئے تھے جو انتخابات کے فوراً بعد یونینسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے تھے)۔

بنگال میں فضل حق کی کرشک پرجا میتی جو غریب کسانوں کے حقوق اور زرعی اصلاحات کے لیے لڑ رہی تھی، فاتح ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ فضل حق نے مسلم لیگ کے لیڈر خواجہ ناظم الدین کو خود ان کے حلقۂ انتخاب میں شکست دے کر یہ دکھادیا کہ درحقیقت مسلم ووٹ کس طرف ہیں۔

سندھ میں کل ۶۰ نشستیں تھیں، ان میں سے ۳۵ مسلم سیٹیں تھیں۔ان میں سے مسلم لیگ کو ایک بھی سیٹ نہیں ملی۔سندھ یونائیٹڈ پارٹی نے ۱۸ نشستیں حاصل کیں، مسلم پارٹی نے تین، سندھ مسلم آزاد پارٹی نے دو، اور آزاد امیدواروں نے بارہ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔سر ہدایت اللہ نے ایوان میں سب ہی کے تعاون سے حکومت بنائی۔

شمالی مغربی سرحدی صوبے میں مسلم لیگ کے انتخاب کے نتائج اتنے ہی شرم ناک تھے۔غرض مسلم لیگ کے لیے ان علاقوں میں جو بعد کو پاکستان بننے والے تھے، مسلم عوام کی

حمایت کا یہ حال تھا۔

بہ ظاہر یہ بات کچھ عجیب سی ضرور لگے گی مگر حقیقت یہی ہے کہ مسلم لیگ مسلم اکثریت والے علاقوں میں بھی جہاں اس کا خیال تھا کہ وہ بادشاہ ہوگی بہت حمایت کبھی بھی حاصل نہ کر سکی۔

کشمیر میں اس کے شاہی ریاست ہونے کی وجہ سے انتخاب نہیں ہوئے تھے مگر وہاں بھی مسلم عوام نے مسٹر جناح کی ان تھک کوششوں کے باوجود مسلم لیگ کے مقابلے میں شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کو ترجیح دی۔

خود صوبہ متحدہ (یوپی) میں بھی جہاں کٹر مسلم لیگیوں کا اچھا خاصا اجتماع تھا، مسلم لیگ ۶۶ مسلم نشستوں میں سے صرف ۲۹ نشستیں جیت پائی۔

اس صورت حال کے باوجود یہ افسانہ حقیقت کے روپ میں مشہور ہوگیا کہ مسلم عوام پاکستان چاہتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی حمایت یقیناً حاصل کی مگر یہ صرف اس وقت ممکن ہوا ''جب ملک ایک عظیم طوفان کے پیدا کیے ہوئے بھنور میں پھنس کر ناچ رہا تھا۔'' انسانی معاملات میں ایسے طوفان شاذ و نادر ہی آتے ہیں مگر اس کی قوت ہر ایک کو اندھا ضرور کر سکتی ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات عوامی رجحان کے سچے مظہر نہیں تھے۔ ووٹ کے اختیار کو جو ۱۹۳۲ء کے انتخابات میں بہت محدود اور چنیدہ تھا، وسعت دے دی گئی تھی اور کسانوں کو پہلی دفعہ ووٹ دینے کا موقع ملا۔ اسی الیکشن میں کانگریس نے اپنے قومی پلیٹ فارم سے انتخابات میں اتحاد، جمہوریت، سیکولرزم اور نہرو کی صدارت کے زمانے میں شوشلزم کے نعروں کے ساتھ شرکت کی اور یہ دکھا دیا کہ اس کی حمایت کی بنیادیں کتنی گہری ہیں۔ کانگریس کی جیت اچھی جیت تھی۔ مسلم نشستوں کے حلقے میں بھی کانگریس نے مسلم لیگ کے مقابلے میں بہتر کارکردگی دکھائی تھی اور ان ۵۸ سیٹوں میں جس پر اس نے اپنے امیدوار کھڑے کیے تھے، ۲۶ سیٹوں پر کامیابی حاصل کی (ہندو فرقہ پرست پارٹی ''ہندو مہاسبھا'' نے بھی، جو مسلم لیگ کے ردّ عمل کے طور پر وجود میں آئی تھی، اتفاق سے ان انتخابات میں بری شکست کا منہ دیکھا)۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات اس لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل تھے، اس میں ملک کے سارے مسلمانوں کی نمایندگی کے مسلم لیگ کے وعدے کو کسوٹی پر پرکھنے کا پہلا موقع سامنے آیا تھا اور اس کے نتائج کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ گاندھی یا جناح، کس کی فلاسفی نے عوامی ذہن کو متاثر کیا تھا؟

گاندھی نے ایک سیدھا سادا نعرہ دیا تھا اور اسے انھوں نے اپنی انوکھی خوب صورت انگریزی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا دلی ملاپ کہا تھا اور اس کے اظہار کے لیے ''ہندو مسلمان کی جے'' کا نعرہ تجویز کیا تھا۔ عدم تشدد اس نظریے کا بنیادی عنصر تھا۔ ۱۹۲۰ء کے کلکتہ سیشن کے بعد جب سے گاندھی جی نے کانگریس کا چارج لیا تھا، ان عوام کو ان کا یہی پیغام تھا جن سے خود ان کو محبت تھی اور وہ خود انھیں چاہتے تھے۔ گاندھی جی نے کانگریس کو کسانوں کے مسایل سے وابستہ کرایا اور ان کے مفادات کے حصول اور تحفظ کے لیے جدوجہد کی۔ بہار کی نیل تحریک ہو یا گجرات میں باردولی کی جدوجہد۔ گاندھی جی کو اعلا طبقے کے ہندو اور مسلمان حکومت کے روایتی ٹھیک داروں سے نفرت تھی۔ ان کا تعلق چند افراد سے نہیں لاکھوں لوگوں سے تھا۔ ان میں اس بات کی جرأت و ہمت تھی کہ وہ کانگریس کو ان لوگوں سے دور رکھیں جو اسے مسلم لیگ جیسی یا ہندو جماعت میں تبدیل کر دینا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر مونجے اور سری سادر کر جیسے ہندو جو تلوار کی طاقت کے نظریے پر ایمان رکھتے ہیں وہ مسلمانوں کو ہندو اقتدار و تسلط کے ماتحت رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ میں اس حلقے کی نمایندگی نہیں کرتا، میں کانگریس کی نمایندگی کرتا۔

انھوں نے ۱۹۴۲ء کے کانگریس سیشن کی اپنی تقریر میں وضاحت کی:

''اور بالکل اسی طرح جس طرح وہ کانگریس کو ایک ہندو پارٹی بنانے کی اجازت نہیں دیں گے، ویسے ہی مسلم لیگ کے اس حق کو بھی وہ نہیں مانتے کہ وہ سارے مسلمانوں کو لیگ کی جائیداد سمجھے۔''

یہی وہ چیز تھی جو جناح صاحب چاہتے تھے کہ کانگریس مان لے اور یہی وہ بات تھی جسے کانگریس بھی اپنے نظریات کو قربان کیے بغیر نہیں کر سکتی تھی۔ یہی کش مکش اور تنازعہ تھا جو ۱۹۳۷ء میں ایک اور مسئلے کی جڑ بنا اور جسے پاکستان کے قیام کا ایک فیصلہ کن عنصر کہا جا سکتا

ہے۔ یہ عنصر تھا ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد صوبہ متحدہ میں کانگریس اور لیگ کا متحدہ محاذ بنانے کی ناکام کوشش کا عنصر۔ (ہندوستان اپنے حصار میں: ص ۲۲-۲۰)

۱۹۳۷ء- انتخابات کے بعد:

انتخابات کی شکست نے مسلم لیگ کی حکومت کی خواہش کو مدھم نہیں کیا۔ اس خیال کو زندہ رکھنا تھا کہ یہ صرف لیگ ہی ہے جو مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اگر کانگریس کے مسلمان وزرا اپنی وزارت کے زمانے میں یہ دکھا سکتے کہ وہ کانگریسی حکومت کا ایک حصہ ہونے کے باوجود اپنی کمیونٹی کے لیے مفید ہو سکتے ہیں تو بچی کھچی مسلم لیگ بھی ختم ہو جاتی۔ جناح صاحب صوبہ متحدہ (یوپی) جیسی اہم ریاست میں حکومت میں شامل ہونے کے لیے بے چین تھے اور اسی لیے انھوں نے اس حقیقت کے باوجود کہ صوبے میں کانگریس اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے، کانگریس سے مسلم لیگ کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ تشکیل دینے کے لیے کہا۔ توقع کے مطابق جناح صاحب نے صرف یہ مطالبہ کیا کہ کانگریس کو اپنی طرف سے کسی مسلمان وزیر کا تقرر نہیں کرنا چاہیے اور اسے اپنا رویہ ایک ہندو پارٹی کی طرح رکھنا چاہیے۔ مسلم لیگ نے ۲۲۸/ اراکین کے ایوان میں ۲۹ نشستیں جیتی تھیں، مگر اس نے کابینہ میں دو وزیروں کی شمولیت پر اصرار کیا۔ چودھری خلیق الزماں جو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر بنائے گئے اور نواب اسمٰعیل خاں۔

لیگ نے یہ تجویز رکھی کہ اگر اس کے مطالبات مان لیے گئے تو یہ بات ہندو مسلم تنازعے کو ختم کرنے کی اور انگریزوں کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنانے کی بنیاد بن سکتی ہے۔ مگر یہ بات کہ کانگریس مسلم لیگ کی شرائط کو منظور کرے گی ناممکن سی نظر آتی تھی۔ کیوں کہ ایسا کر کے کانگریس نوآبادیاتی حکومت کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد میں بلا امتیاز نسل و مذہب ہر ہندوستانی کی نمائندگی کرنے کے اپنے دعوے کے جواز اور اس کی صداقت کو یک سر ختم کر دیتی۔ کانگریس حقیقت میں ایک ہندو پارٹی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجوزہ اتحاد کے خلاف لڑائی میں سب سے زیادہ جوش و خروش اور سرگرمی کے ساتھ کانگریس سوشلسٹ اور مسلمان کانگریسی شریک ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتا ان تمام مقاصد اور

اصولوں سے غداری کے مترادف ہوگا جن کے لیے وہ اب تک جدو جہد کرتے رہے ہیں۔
خلیق الزماں نے لکھا ہے کہ وہ ۱۲ر مئی ۱۹۳۷ء کو مجوزہ اتحاد کے سلسلے میں نہرو سے تبادلۂ خیال کرنے گئے۔ اس دن نہرو آنند بھون الہ آباد میں صاحبِ فراش تھے۔ میرے نظریات کے بالکل برعکس نہرو کا خیال تھا کہ ہندو مسلمان کا سوال ہندو مسلم دانشوروں، زمین داروں اور سرمایہ داروں تک محدود ہے جو اسے ایک مسئلہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ عوام کے ذہنوں میں ہے ہی نہیں۔ اسمبلی کی چہار دیواری میں مسلمانوں کی ایک الگ تنظیم کے خیال کا ہی انھوں نے مذاق اڑایا۔

مسلم لیگ سے گفت وشنید کرنے کے ذمے دار مولانا آزاد تھے اور اس کام میں انھیں مدد دینے کے لیے تھے رفیع احمد قدوائی اور گوبند بلبھ پنت۔ مولانا نے کابینہ میں نواب اسماعیل خاں کی شمولیت پر اعتراض کیا، کیوں کہ نواب ان جاگیردارانہ مفاد کی نمایندگی کرتے تھے جو کانگریس کی اقتصادی فلاسفی کے برعکس تھے، مگر مسلم لیگ کا اصرار ختم نہیں ہوا۔ ۱۵ر جولائی کو مولانا نے کانگریس کی کم سے کم شرایط کی پیش کش کی۔ انھوں نے خلیق الزماں کو ٹایپ کیے ہوئے دو صفحات دیے۔ اتحاد کے لیے خلیق الزماں کو دستخط کر کے ان کاغذوں کو واپس کرنا تھا۔ مذکورہ تحریر میں لکھا تھا:

> ’’مسلم لیگ کا گروپ صوبۂ متحدہ میں الگ حیثیت سے کام کرنے کو ترک کر دے گا۔ صوبۂ متحدہ کی اسمبلی میں مسلم لیگ کے موجودہ اراکین کانگریس کا حصہ بن جائیں گے اور کانگریس پارٹی کے دوسرے ممبروں کی طرح تمام مراعات اور ہر ذمے داری میں ان کا حصہ ہوگا۔‘‘

لیگ نے احتجاج کیا اور کہا کہ یہ بڑی کڑی شرطیں ہیں۔ مولانا نے معاہدے میں ترمیم کی مگر مسلم لیگ بہ ہر حال مسلمانوں سے متعلق مسایل پر ووٹ دینے کے وقت کانگریس سے الگ اپنے ووٹ دینے کے حق کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ حقیقتاً کانگریس کو اسی بات کا ڈر تھا۔ بہ ہر حال اس نے بھی مسلم لیگ کی اس ضد کو نہیں مانا۔

۲۷ر جولائی ۱۹۳۷ء کو جب اسمبلی کا سیشن شروع ہوا تو مسلم لیگ کے اراکین اسمبلی میں حزبِ مخالف کی بینچوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ تو نہیں مگر ان کے پاس ہی نواب زادہ

لیاقت علی خاں بیٹھے ہوئے تھے جنھیں بعد کو پاکستان میں جناح کا جانشین بننا تھا۔ لیاقت علی خاں نے ۱۹۳۷ء کے اواخر تک مسلم لیگ میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ سلیم پور کے راجا نے بھی مسلم لیگ چھوڑ دی تھی۔ وہ بھی ایوان میں ایک آزاد ممبر کی حیثیت سے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا راجا صاحب ان لوگوں میں تھے جو جناح صاحب کو لندن سے واپس لائے تھے۔ (ہندوستان اپنے حصار میں: ص ۲۷-۲۳)

۶/ مارچ ۱۹۳۴ء: علامہ اقبال کا ایک خط مولانا راغب احسن کے نام جس میں انھوں نے پاکستان اسکیم سے اپنے نام کی نسبت سے انکار کیا ہے اور تاکید کی ہے کہ اس کا اخبار میں اعلان کر دیا جائے۔ یہ خط ''اقبال - جہان دیگر'' میں خود علامہ کی قلمی تحریر میں شائع ہو چکا ہے، خط یہ ہے:

۶/ مارچ

عزیز من راغب!

میرا خیال ہے یہ بات زیادہ مناسب ہوگی کہ میں فاضل رحمت اللہ سے سلسلۂ جنبانی کروں اور یہی کروں گا، لیکن آپ شفیع داؤدی صاحب سے فرمائیں کہ وہ اپنا خط تحریر فرما کر مجھے ارسال کر دیں اور خط پر ہم دونوں کے دستخط ہوں گے۔

مجھے توقع ہے کہ آپ مجھے جمہوریت اور آئین کے بارے میں اپنے خیالات سے جلد از جلد آگاہ کریں گے۔

میں اس خط کے ساتھ اپنی کتاب کے بارے میں ایڈورڈ تھامسن کا تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ ایڈورڈ تھامسن انگلستان کی مشہور ادبی شخصیت ہیں۔ یہ تبصرہ مختلف وجوہات کی بنا پر دل چسپ ہے اور شاید تبصرہ آپ کے جریدے میں اشاعت کے لیے مناسب ہی رہے۔ دوسری کاپی ''اسٹار آف انڈیا'' (کلکتہ) کو روانہ کر دیجیے۔

براہ کرم نوٹ فرمالیں کہ اس تبصرے کا مصنف اس مغالطے کا شکار ہے کہ جیسے میری تجویز ''پاکستان کی اسکیم'' سے تعلق رکھتی ہے۔

جہاں تک میری تجویز کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے۔ جب کہ پاکستان اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب کے

مسلم صوبوں کا ایک ایسا وفاق تشکیل دیا جائے جو انڈین فیڈریشن سے علاحدہ ہو اور انگلستان سے براہِ راست وابستہ ہو۔

آپ اپنے تعارفی کلمات میں اس نکتے کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ''اسٹار آف انڈیا'' کے مدیر کی توجہ بھی اس نکتے کی جانب منعطف کرادیں۔

• خدا کرے کہ آپ بہ خیر و عافیت ہوں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

نوٹ: پاکستان کی اسکیم سے مراد چودھری رحمت علی کی اسکیم ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی تجویز کی جس خصوصیت کے بارے میں یہ لکھا ہے:

''وہ یہ ہے کہ انڈین وفاق کے اندر ایک مسلم صوبہ تخلیق کیا جائے۔''

اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ چودھری رحمت علی کی تجویز سے قطعاً متفق نہ تھے اور مسلم لیگ کی مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد علامہ مرحوم کے خط کے چھ برس کے بعد پاس ہوئی، اس وقت علامہ اقبال کی وفات کو دو برس گزر چکے تھے۔ اور جس اصول پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا، وہ ''قرارداد لاہور'' کا بھی منشا نہ تھا۔ اور جس صورت اور فلسفے پر پاکستان قایم ہوا اس کا تعلق علامہ مرحوم کی فکر و تجویز صدیوں دوری گا، پھر انھیں مفکر پاکستان کیوں کو کہا جا سکتا ہے؟ حضرت علامہ مقام پاکستان کی فکر سے سیکڑوں گنا پہلے ہی بلند ہے۔ مفکر پاکستان کے خطاب سے ان کی عزت میں کیا اضافہ ہو سکتا ہے۔

آرمی بل کے متعلق لیگی رہنماؤں کے اعلانات

(۱)

اگر ہندوستانی فوج کو ہندوستانیوں کی خواہشات کے خلاف استعمال کیا گیا تو میں حکومت کا مقابلہ کروں گا

قاید ملت مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کا نعرۂ حق:

"آرمی بل کے متعلق تقریر کرتے ہوئے قاید اعظم ملت اسلامیۂ ہندیہ مسٹر محمد علی جناح نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ اگر حکومت برطانیہ نے ہندوستانی فوج کو ہندوستانیوں کی خواہشات کے خلاف اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا تو میں اور میری جماعت ایسا کرنے والی استعماری مشنری کو ناکارہ کر دیں گے۔ میں میدان میں نکل کر حکومت کا مقابلہ کروں گا اور حکومت کو مجبور کروں گا کہ وہ ملک کی فوج کو اپنے مفاد کے لیے استعمال نہ کرے۔"

(روزنامہ احسان۔ لاہور، ۳۱ راگست ۱۹۳۸ء)

(۲)

اگر ہندوستانی فوج کو ممالک اسلامیہ کے خلاف استعمال کیا گیا تو میں سول نافرمانی کروں گا۔ شیر اسلام مولانا شوکت علی کا اعلان:

مولانا شوکت علی نے آرمی بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"اگر حکومت برطانیہ نے ہندوستانی افواج کو اسلامی ممالک کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی تو میں دو سال کے لیے جیل کی مصیبتوں کو لبیک کہتے ہوئے حکومت برطانیہ کے خلاف زبردست محاذ قایم کروں گا۔" (روزنامہ احسان۔ لاہور، ۳۱ راگست ۱۹۳۸ء)

(۳)

میں نے ہی فوج بھرتی کا بل پاس کرایا ہے!

لائل پور میں سر سکندر حیات خان کا اعتراف:

آرمی بل کا ذکر کرتے ہوئے سر سکندر حیات نے کہا کہ

"یہ قانون میں نے پاس کروایا ہے۔ اس وقت فوج میں ۸۰ فیصدی بھرتی پنجابیوں کی ہوئی ہے، اس سے پنجاب کا وقار اور عزت بہت بلند ہوا ہے۔ جو لوگ اس بھرتی کو روکتے ہیں وہ صوبے سے غداری کے مرتکب ہوتے ہیں اور صوبے کے وقار کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ قانون پاس کیا جارہا ہے۔ گورنمنٹ نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے کہ فوج میں ہندوستانی آفیسروں کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے فوجی کام سیکھنے کے لیے دیہاتیوں کے لڑکوں کے لیے ۳۲ ہزار رُپے کے وظایف منظور کیے ہیں۔"

(روزنامہ دیر بھارت۔ لاہور، ۵ر ستمبر ۱۹۳۸ء)

قیام پاکستان سے اخلاص۔ ۱۹۳۹ء:

اوایل ۱۹۳۹ء میں ایک موقع پر قیام پاکستان کے بارے میں میری ان کی (چودھری سرظفر اللہ کی) گفتگو ہورہی تھی۔ وہ کہنے لگے:

"جناح بے وقوف ہیں۔ اگر پاکستان بن گیا تو نسبتاً مسلمانوں کا ہندوؤں سے زیادہ نقصان ہوگا۔"

آٹھ سال کے بعد جب میں ان سے کراچی میں ملا تو ان کی گفتگو یاد دلائی اور پوچھا کہ اب آپ کی کیا راے ہے؟ بولے کہ

"آج بھی اسی راے پر قایم ہوں۔ (۱۰)"

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ سرکاری سطح پر میرے اور ان کے تعلقات خوش گوار تھے لیکن دعوتوں اور پارٹیوں میں ان سے میری ملاقات ہمیشہ دوستانہ ماحول میں ہوتی تھی۔ یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ وہ پختہ عقیدے کے مسلمان تھے لیکن قادیانی ہونے کی وجہ سے وہ پاکستان میں ہردل عزیز نہ تھے۔ سردار عبدالرب نشتر نے ایک موقع پر مجھ سے کہا تھا کہ قادیانیوں کا شمار مسلمانوں میں نہیں ہے۔ چوں کہ میں اسلامی عقاید سے اچھی طرح واقف نہ تھا اس لیے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ باہمی اختلافی عقیدہ کیا ہے، لیکن یہ محسوس کرتا تھا کہ مسلمان ان کو بہ نظر پسندیدگی نہیں دیکھتے تھے۔ ان کی تقریر سننے میں اکثر جایا کرتا تھا۔ ان کی قابلیت اور پیغمبر اسلام کے ساتھ ان کی عقیدت مندی کا مجھے اعتراف ہے۔ مجھے یاد ہے کہ

جب وہ ایک بار بنارس میرے گھر پر ہم لوگوں سے ملنے آئے تو میرے والد سے ان کی جو گفتگو ہوئی وہ میں نے سنی۔ انھوں نے پر جوش انداز میں قادیانی عقاید سمجھائے اور بتایا کہ جس طرح ہنود کرشن جی کو اوتار مانتے ہیں اسی طرح قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا بھی اوتار ہے اور قادیانیوں اور غیر قادیانیوں میں یہی اختلافی عقیدہ ہے۔ ان کی روشن خیالی کا میں معترف ہوں۔

وایسرائے کی کونسل کے قادیانی ممبر ہونے کی حیثیت سے یہ منتخب کمیٹیوں کی صدارت کیا کرتے تھے۔ اسی نوعیت کی ایک میٹنگ میں کانگریسی ممبروں نے بے شمار ترمیمات پیش کی تھیں۔ جلسے کے اختتام پر انھوں نے مجھ سے کہا کہ

"آپ کانگریسی ممبران بہت تیار ہو کر آتے ہیں۔"

انھوں نے کہا کہ

"مسلم لیگی ممبران بھی تو یہاں اسی غرض سے ہیں مگر وہ اتنی تیاری کر کے نہیں آتے ہیں۔"

میں یہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جو مسلمان حضرات بڑے بڑے عہدوں پر فایز تھے، مثلاً عبدالرحیم، سر سلطان احمد، سر مرزا اسماعیل، نواب چھتاری ان سب کو تحریکِ پاکستان کے مفید ہونے میں شک تھا، لیکن ان کی رائے کے باوجود پاکستان بن گیا۔ عام مسلمان اس کے نتائج سمجھے بغیر، اس کے حامی تھے......

سر ظفر اللہ کو اپنے قادیان کے مکان کی بڑی فکر تھی۔ انھوں نے بتایا کہ

"وہ نہایت خوب صورت مکان ہے اور مجھے خود بھی تعمیری صنعت سے بڑی دل چسپی ہے۔"

چناں چہ میں نے فوراً گورنر مشرقی پنجاب سری ایم ترویدی اور چیف منسٹر ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو لکھا کہ متعلقہ معلومات حاصل کر کے مجھے اطلاع دیں۔ دونوں کے جواب آئے کہ مکان بدستور اچھی حالت میں ہے اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ سر ظفر اللہ خود آکر دیکھ سکتے ہیں یا کسی اور کو بھیج کر اطمینان کر لیں۔ میں نے خود جا کر سر ظفر اللہ کو یہ اطلاع دی، لیکن مجھے اچنبھا سا ہوا جب انھوں نے کہا کہ

"ہاں! میں سب جانتا ہوں۔ آپ مجھے اسی طرح کا جواب دے رہیں جیسا میں اسمبلی میں آپ کے سوالات کے جواب دیا کرتا تھا۔"

مجھے اس افسوس ناک اعتراف پر بڑی حیرت ہوئی۔

نوٹ: سر ظفر اللہ خان سے گفتگو میں فریق ثانی سری پرکاش پاکستان میں ہندوستان کے پہلے قونصل جنرل ہیں اور گفتگو ان کی کتاب: "پاکستان کے قیام اور ابتدائی حالات" سے ماخوذ ہے۔

حاشیہ ❶ میرے ایک دوست نے پاکستان کے ایک اردو اخبار کا وہ تراشا مجھے بھیجا جس میں لکھا تھا کہ جب سر محمد ظفر اللہ کی توجہ میرے آرٹیکل (مطبوعہ ہندوستان ٹائمز) کی طرف منعطف کی گئی تو انھوں نے کہا کہ "سری پرکاش نے سفید جھوٹ بولا ہے۔ مسٹر جناح میری بڑی قدر کرتے ہیں، میں ایسے گستاخانہ الفاظ ان کی شان میں استعمال ہی نہیں کر سکتا ہوں۔"

یہ بھی کہا کہ "میری اور سری پرکاش کی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔"

مگر مجھے اپنے حافظے پر اس بات چیت کا پورا اعتماد ہے۔ یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دوران مباحثہ مسٹر جناح اور سر ظفر اللہ کے تعلقات کبھی خوش گوار نہیں رہے۔

لیگ کا ریزولیوشن برائے پاکستان-۱۹۴۰ء:

......آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء میں حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی تھی، جسے پاکستان کی بنیادی قرارداد کہا جا سکتا ہے:

"مسلم لیگ کی یہ پختہ رائے ہے کہ کوئی دستور حکومت بغیر اس کے کہ وہ ذیل کے اصولوں پر مبنی ہو نہ قابل عمل ہو سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول۔

یہ کہ جغرافیائی حیثیت سے متصل وحدتوں کی ایسے علاقوں میں حد بندی کری جائے جو اس طرح بنائے جائیں اور ان میں ضرورت کی مطابق ایسی سرحدی تبدیلیاں کی جائیں کہ وہ رقبے جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے مثلاً ہندوستان کے شمالی مغربی اور مشرقی منطقے ایک مستقل ریاست بن جائیں اور اس ریاست کے اجزائے ترکیبی اندرونی طرز پر خود مختار اور مطلق العنان ہوں۔

یہ کہ ان علاقوں اور منطقوں کے اجزائے ترکیبی میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی،

اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لیے آئین میں معتدل اور مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات درج کیے جائیں اور نیز ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد کم ہے مسلمانوں کے لیے اور نیز دوسرے اقلیتوں کے لیے ایسے معتدل مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور پر دستور میں شامل کر دیے جائیں جن سے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت ہو جائے۔

یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ اختیار دیتا ہے کہ دستور کی ایک اسکیم مرتب کرے جو ان بنیادی اصولوں پر مبنی ہو اور وہ اس قسم کی ہو کہ اس میں یہ گنجایش ہو کہ ان علاقوں کو اس قسم کے اختیارات مل جائیں جسے دفاع، امور خارجہ، رسل و رسایل، کروڑ گیری اور نیز ایسے ہی دوسرے امور جو ضروری ہوں۔ (اجمل۔ بمبئی، ۳۰ مئی ۱۹۴۴ء)

قرارداد پاکستان-ایک سربستہ راز:

قرارداد لاہور جو قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں پاس ہوئی تھی لیکن اس کے بارے میں آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اسے کس نے لکھا تھا۔ سبجیکٹ کمیٹی میں کہاں سے آئی؟ کونسل میں کس نے پیش کی؟ اس کے پاس ہونے پر کیا گزری؟ اس کی تائید کرنے والے بھی نہیں جانتے۔ گذشتہ ساٹھ برس کے عرصے میں مسلم لیگ کا کوئی رہنما اس کی تالیف کے قابل فخر کارنامے کی ذمے داری لینے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ پھر اس کے پیش کیے جانے اور پاس ہونے سے ان دن پہلے ''ٹائمز آف انڈیا'' تک یہ قرارداد کیسے پہنچ گئی؟ لیگ کونسل کے اجلاس میں کسی کو اظہار خیال کا موقع دیے بغیر جس تیزی کے ساتھ اسے پاس کر دیا گیا۔

(شاہراہ پاکستان: ص ۷۹۲)

وہ بھی ایک راز ہی ہے۔ مسٹر جناح نے بھی ایسی راز داری کی کہ اپنے سیکریٹری کو بھی اس کی ہوا نہ لگنے دی! چودھری ظفر اللہ خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اسی زمانے میں اس قسم کی کوئی تجویز وایسرائے کی خدمت پیش کی تھی اور اس سلسلے میں ان کا نام راز میں رکھنے کی استدعا کی تھی۔ خیال یہ ہے کہ وزیر اعظم پنجاب سر سکندر حیات خان کے

ذریعے وہی تجویز مسلم لیگ کے سامنے آگئی تھی۔ وزیراعظم پنجاب سے پوچھا بھی گیا تھا کہ اس قرارداد کا خالق کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا اپنے قاید سے پوچھو! مسلم لیگ کے تمام چھوٹے بڑے رہنما دنیا سے سدھارے، یہ راز آج تک سربستہ راز ہے۔ مرزا راشد علی بیگ اس زمانے میں مسٹر جناح کے سیکریٹری تھے، وہ لکھتے ہیں:

''مارچ کے وانسط میں جناح صاحب لاہور جارہے تھے۔ جانے سے ایک دن پہلے میری ملاقات ہوئی اور کسی ایک لفظ --- یا کسی قرینے سے انھوں نے ذرا سا اشارہ بھی نہیں دیا کہ مارچ کے اس لیگ سیشن میں لاہور میں پاکستان ریزولیوشن پیش کیا جانے والا ہے۔ مگر چند ہی دن بعد بہت رات گئے فرینک موریس نے مجھے فون کیا: ''تم نے مجھے پاکستان ریزولیوشن کے بارے میں کچھ کیوں نہیں بتایا؟'' اس نے پوچھا۔ ''زیرولیوشن؟'' میں نے حیران ہو کے پوچھا۔ اس نے پورا پڑھ کے سنا دیا۔ میں دنگ رہ گیا، لیکن اپنا راستہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا، میں لیگ میں اس لیے آیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے اتحاد کے لیے کام کرسکوں، لیکن اگر لیگ کے ذریعے اتحاد ممکن نہ رہا تو میری اس کے اندر کوئی جگہ نہ تھی۔ فرینک جسے میرے نصب العین اور ہدف اچھی طرح معلوم تھے، پوچھنے لگا: ''اب کیا ارادہ ہے؟'' ''ظاہر ہے، استعفیٰ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟'' میں نے فوراً جواب دیا، لیکن فرینک میں چھپا ہوا صحافی فوراً بولا:

''تمہارا استعفیٰ دینا تو ٹھیک ہے ہی، لیکن اس کے لیے ایک بیان جاری کرد جس میں اپنے مستعفی ہونے کے وجوہ بتاؤ، ہم اسے اس طرح مشتہر کرنا چاہتے ہیں۔''

صبح میں ذرا جلدی اٹھ گیا اور لکھنے کے لیے بیٹھ گیا۔ جب اپنے لکھے سے پوری طرح مطمئن ہو چکا تو اسے فرینک کے پاس لے گیا، اس نے کئی بار پڑھا اور پھر مجھ سے کہا اس میں تمہارے نظریات اور خیالات پوری طرح آگئے ہیں۔ اگلے دن یہ بیان ''ٹایمز آف انڈیا'' میں آگیا اور اس کے دوسرے دن باقی تمام اخباروں میں بھی۔ اچھی خاصی مشتہری ہوئی اس بیان کی۔ کئی ایک اخباروں نے اداریے بھی لکھے۔ اردو اخبارات نے بھی کوئی تنقید نہیں کی کہ یہ غریب بھی پاکستان ریزولیوشن پر محض بھونچکے رہ گئے تھے اور سمجھ میں نہ آتا

تھا کہ کیا رویہ اختیار کریں۔ میرا یہ بیان اچھا خاصا طویل تھا لیکن اس کے زیادہ ضروری حصے تو نقل کر ہی دوں:

مسلم سیاست کا سارا نصب العین فرقہ وارانہ امن کا حصول ہونا چاہیے۔ اس منزل کی طرف تھوڑا سا اقدام بھی بھلی سیاست ہے۔ تقسیم کے معنی یہ ہیں کہ یہ پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا کہ فرقہ وارانہ اتحاد ناممکن چیز ہے اور اسی لیے یہ بدترین سیاست کی صورت ہے..... مسلم لیگ کی ضرورت میں دو وجوہ سے سمجھتا تھا کہ ایک تو وہ یک جائی کا باعث ہوگی اور دوسرے اس یک جائی سے فرقہ وارانہ امن مل سکے گا اور مستقلاً مل سکے گا ان دونوں وجوہ پر اب بھی میرا ایمان ہے اور اگر اس وقت میں مسلمان عوام سے ناتا توڑ رہا ہوں تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ایک وجہ دوسری وجہ کی مخالفت کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ میں ملت کی یک جائی میں جو مستقل جدائی یا علاحدگی کے مقصد کی خاطر ہو، عقیدہ نہیں رکھتا..... مسئلے کی نوعیت اب ہم مسلمانوں کے سامنے بالکل واضح ہے۔ ہم ہندو مسلم اتحاد میں عقیدہ رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہم اسے ناممکن سمجھتے ہیں تو ہماری جگہ لیگ میں ہے اور اگر ہم اسے ممکن سمجھتے ہیں تو لیگ سے باہر!........

محض شاطرانہ خیال:

کیا میں نے استعفیٰ دینے میں کچھ جلد بازی کی؟ یہ سوال میں نے اپنے آپ سے کئی بار پوچھا ہے۔ ایک انگریز ''پنڈرال مون'' نے جو پنجاب کے مسلمان لیڈروں سے کافی قریب اور ان کا معتمد تھا اپنی کتاب ''ڈوائڈ اینڈ کویٹ'' میں لکھا ہے:

> ''نجی طور سے جناح نے لاہور میں ایک دو لوگوں سے کہا کہ یہ ریزولیشن محض ایک شاطرانہ چال ہے اور یہ امر کہ وہ چھ برس بعد تقسیم سے کچھ کم پر بھی راضی نظر آتا تھا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں وہ حقیقتاً اس مسئلے پر آخری فیصلہ کن موڑ پر نہیں پہنچے تھے۔ اس لیے ایک حد تک یہ ایک شاطرانہ چال بھی ہو سکتی تھی، جس کا مقصد کانگریس سے ایسی رعایتیں حاصل کرنا ہو جو پارٹنر شپ کو گوارا بنا دیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ریزولیشن کے نتائج پر مجوزہ آزاد ریاستوں کی

ہیئت ترکیبی پر اور ان کے باہمی روابط کے بارے میں اس مرحلے پر پوری طرح غور وخوض قطعی نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں بعض امور بعد میں صاف ہوئے، لیکن جناح صاحب پاکستان کے واقعی خدوخال کی وضاحت دینے کے سلسلے میں بہت زیادہ مشتاق نہیں رہتے تھے، حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء تک بھی اس بارے میں کچھ شکوک رہے کہ بالآخر جناح صاحب اپنے تصورات کو عملی جامے میں کس انداز پر دیکھنا پسند کریں گے۔"

مون کا اس نتیجے پر پہنچنا کہ قوی امکان ہے کہ ریزولیشن محض سودا بازی کے نقطۂ نظر سے منظور کیا گیا ہو، اس میں ان بیانات سے خاصی مطابقت ہے جو لاہور سے واپسی پر لیگی دوستوں نے میرے سامنے رکھے۔ تم بھی عجیب عقل مند آدمی ہو جو ریزولیشن پر سنجیدگی سے غور کرنے بیٹھ گئے۔ ان لوگوں نے مجھ سے کہا، تمھیں یہ نہیں معلوم کہ ہندو تو بنیے ہیں اور بنیا صرف یہی زبان سمجھ سکتا ہے؟ اور خود جناح صاحب؟ ان کے مقصد کی غیر لچک داری اور ارادے کی پختگی وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے، لیکن ۱۹۴۶ء کی جولائی کے پہلے ہفتے تک کی صورت حال یہ تھی کہ وہ ایک گیر متحدہ مرکز (یونین سینٹر) قبول کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ تھے۔ آخری فیصلہ تو جولائی ۱۹۴۶ء ہی کے دوسرے ہفتے میں انھوں نے کیا کہ پاکستان سے کم اب کچھ بھی نہیں اور اس کے اسباب تھے جن پر پھر گفتگو ہوگی۔

(محمد علی جناح از مرزا ارشد علی بیگ، خدا بخش لائبریری جرنل ۱۰۲: ص ۴۶-۳۴۵)

مسلم لیگ کے مالی امداد کے ذرائع:

۲۸ راگست ۱۹۴۲ء: امریکا میں متعین برطانیہ کے سفیر ہالی فیکس نے جو ہندوستان میں لارڈ اروِن کے نام سے وائسرائے رہ چکے تھے، ۲۸ راگست ۱۹۴۲ء کو واشنگٹن سے ایک انتہائی خفیہ پیغام اپنے وزیر خارجہ انتھونی ایڈن کو ارسال کیا۔ جس میں اسے مطلع کیا گیا تھا کہ نئی دہلی سے امریکا کے قونصل جنرل جارج آر میریل (Gearg R. Merrell) نے وزارت خارجہ کو حال ہی میں بتایا ہے کہ

"مسلم لیگ اپنے لیے "مالی امداد" زیادہ تر ہندو اور مسلمان والیان ریاست،

مسلمان بڑے جاگیرداروں اور بہ طور خاص کلکتہ کے انگریز تاجروں سے وصول کرتی ہے۔"

اس رپورٹ میں وضاحت سے کہا گیا ہے کہ وہ ہندوستانی والیان ریاست اور برطانوی تاجر مسلم لیگ کی مدد ان ہی مقاصد کے لیے کرتے ہیں جس کے لیے حکومت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ یعنی ہندوستان کے نمایندوں کو حصول اقتدار سے باز رکھنا، ہندوستان کے مسئلے کے واضح حل سے اجتناب کرنا اور موجودہ بحران کو طول دینا۔ ایک ثانوی وجہ جس کی بنا پر مسلمان جاگیردار مسلم لیگ سے تعاون کرنے میں دل چسپی رکھتے ہیں یہ ہے کہ وہ کانگریس کے اس پروگرام سے خایف ہیں کہ تمام قدرتی وسایل کو قومی ملکیت لے لیا جائے گا۔ (ابوالکلام آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست: ص ۴۲٦)

پاکستان کی عدم وضاحت اور اس کی مصلحت:

جناح کی حکمت عملی میں ایک اور عنصر بھی تھا، وہ پاکستان کی وضاحت نہیں کرتے تھے، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اس سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ لیگ میں بھی انتشار پیدا ہوگا۔ منزل مقصود کو غیر واضح دیکھ کر جناح مسلمانوں کے مختلف گروہوں کی خواہشات کے مطابق مطمئن کرتے رہے۔ مریم کے الفاظ میں:

"مسلمان تاجروں کو نظر آتا تھا کہ انھیں ایسی منڈی مل جائے گی جہاں ہندو تاجروں سے مقابلہ نہیں کرنا پڑے گا۔ زمین داروں کو امید تھی کہ زمین دار سسٹم مستحکم ہوگا۔ دانش وروں کا خیال تھا کہ انگریز کے چلے جانے سے ایک نئی ثقافت جنم لے گی جس پر ہندوؤں اور انگریزوں کے اثرات نہ ہوں گے اور یہ ثقافت ترقی کرے گی۔ قدامت پسندوں کے نزدیک پاکستان ایک مذہبی ریاست تھی۔ سرکاری افسران اور نوکر شاہی سمجھتی تھی کہ نئی ریاست میں شارٹ کٹ کے ذریعے سنیارٹی کے مواقع میسر آئیں گے۔ اس طرح پاکستان کے مطالبے میں ابہام کے باعث جناح کے لیے راہ ہم وار ہوتی گئی اور دوسروں کو قایل کرنا آسان ہوگیا۔

جناح قوم کے مختلف النوع ردِ عمل کا اندازہ نہ کر سکتے تھے۔ ان کا وجدان کہتا تھا
کہ پاکستان کی وضاحت نہ کرنا اور اس کے تصور کو مبہم رکھنے میں ہی بہتری
ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جناح جان بوجھ کر پاکستان کی سرحدات
تک کی معین صورت بتانے سے گریز کرتے تھے۔'' (مسلم افکار: ص ۲۴۰)

مسلم لیگ اور اس کا پاکستان:

کون صحیح تھا؟ کیا نہرو کا یہ کہنا صحیح تھا کہ مسلم لیگ محض طبقۂ اشراف کی تخلیق اور عوام کی ضرورتوں سے یک سر بے تعلق جماعت ہے؟ ثبوت صرف عمل میں اور تخلیق شدہ پاکستان کی اساسی نوعیت میں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ یہ بات اب بالکل صاف طور پر سامنے آ چکی تھی کہ مذہبی حلقے اور زمین داروں کے اتحاد نے کس طرح پاکستان کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ ایک طرف اگر زمین داروں اور سرمایہ داروں نے مذہبی حلقے کو اس کی اجازت دی کہ وہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنائیں تو دوسری طرف مذہبی حلقے نے زمین داروں کو یقینی حقوق ملکیت اور سرمایہ داروں کو اقتصادیات پر بے روک ٹوک قابو کی ضمانت دی۔ حکومتِ الٰہیہ اور زمین داری اور سرمایہ داری، پاکستان اور بنگلادیش کے دو اہم ستون ہیں۔ سریرِ حکومت پر کوئی بھی آئے، حاکم وردی میں ہو یا شہری لباس میں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مذکورہ دونوں باتوں میں کوئی دخل اندازی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان دونوں حقوق کے بارے میں کسی نے معمولی سوال بھی کرنے کی کوشش کی تو اقتدار سے ہٹا دیا جائے گا۔ جناح صاحب کا یہ خیال کہ پاکستان انھوں نے تخلیق کیا ایک خوش خیالی تھی، جس کی ہر شخص نے ہم نوائی اور ہمت افزائی کی۔ وجہ یہ تھی کہ جناح صاحب جیسے غیر معمولی عزم، صلاحیت اور سلیقہ رکھنے والے ایک لیڈر کی ان کو ضرورت تھی اور یہ صحیح بھی ہے ان خوبیوں کے بغیر جو جناح صاحب میں تھیں، پاکستان وجود میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان کے گاندھی کے خواب کو جس شخص نے بالآخر چکنا چور کر دیا وہ بھی ایک گجراتی تھا، جس کے والدین کا گاؤں گاندھی جی کے آبائی گھر سے تقریباً تیس میل دور جنوب میں تھا۔ محمد علی جناح ۱۸۷۶ء میں کرسمس کے دن پیدا ہوئے اور اپنا

بچپن انھوں نے کراچی میں گزارا، جہاں ان کے والد نے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔

سولہ برس کی عمر میں جناح صاحب کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیج دیا گیا تا کہ وہ اپنے باپ کی فرم کی وراثت کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ لائق ہو جائیں۔ ....لندن میں کاروبار سے متعلق تعلیم نے انھیں بور کر دیا۔ ایک موقع پر تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی تھیٹر میں شامل ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ایک تھیٹر گروپ کے ساتھ تین مہینے کا ایک معاہدہ کیا بھی، لیکن پھر طے یہ کیا کہ انھیں قانون کی ڈگری لینے پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے، چناں چہ انھوں نے ''لنکنس ان'' میں داخلہ لے لیا۔ یہ فیصلہ ایک بڑی سمجھ داری کا فیصلہ تھا۔ کیوں کہ اپنی نسل کے بہترین وکیلوں میں ایک وکیل ہونا جناح صاحب کا مقدر تھا۔...... جناح صاحب بہ ہر حال لندن میں اس وقت تک ٹھہرے رہے جب تک کہ انھوں نے اپنی وکالت کی تعلیم مکمل نہیں کر لی۔ جب تک وہ واپس آئے اس وقت تک ان کی والدہ اور ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ جناح نے اپنے بیمار باپ کے ساتھ رہنے کی بجائے بمبئی آنے اور یہاں اپنی وکالت شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے ساتھ ان کی بہن فاطمہ بھی آئیں جن کو اپنے بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔........

جناح صاحب بنیادی طور پر ''پکے بیچلر'' تھے۔ ان میں وہ تمام عادتیں تھیں جو انگلستان سے آئے ہوئے ہندوستانی طبقۂ اشراف کے ایک فرد کی خصوصیات ہو سکتی ہیں۔ اسلامی حکومت پاکستان کے تمام دفاتر میں ان کی تصویریں بڑے نمایاں طور پر لگی ہوئی ہیں، مگر جنرل محمد ضیاء الحق کو اس بات پر بڑا اطمینان ہوگا کہ ''پاکستان کے ''باپ'' جناح صاحب آج بہ قیدِ حیات نہیں ہیں، نہیں تو انھیں بھی ان کی ''شخصی عادتوں'' کی وجہ سے سرِ عام کوڑے لگائے گئے ہوتے۔'' مسٹر جناح صرف یہی نہیں کہ Carvan A کی سگریٹیں لگاتار پیتے تھے بلکہ ''انھیں وہسکی بھی اچھی لگتی تھی'' اور................''ان کی زندگی اعلا طبقے کے ایک آزاد خیال فرد کی زندگی تھی۔ اپنی نجی اور پبلک زندگی کے بیشتر حصے میں وہ یقیناً آزاد خیال تھے۔''.........

پاکستان جانے والوں میں ان کے ساتھ تنہا ان کی بہن فاطمہ تھیں (کئی برس بعد، ایوب خان کے کرائے ہوئے انتخابات میں وہ متحدہ حزب اختلاف کی طرف سے امیدوار

کی حیثیت سے الیکشن میں کھڑی ہوئی تھیں) جناح صاحب کی اکلوتی بیٹی دینا نے پاکستان جانے سے انکار کردیا تھا۔ جناح صاحب جنھوں نے رتی سے شادی کی اب بالکل بدل چکے تھے اور اسلامی فوجوں کے کمانڈر ہو گئے تھے۔ دینا ایک پارسی سے شادی کرنا چاہتی تھی، یہ خبر جب جناح صاحب کو ملی تو وہ بہت خفا ہوئے۔ انھوں نے اپنی بیٹی سے کہا کہ لاکھوں مسلمان لڑکے ہیں وہ ان میں سے کسی کا بھی انتخاب کرسکتی ہے۔ اس پر دینا نے جواب دیا تھا کہ پہلے بھی لاکھوں مسلمان لڑکیاں موجود تھیں اس کے باوجود جناح صاحب نے ایک پارسی لڑکی سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ جناح صاحب کے پاس اس بات کا صرف ایک جواب تھا کہ وہ اپنے بیٹی کو عاق کردیں۔ انھوں نے اُس کے بعد پھر کبھی دینا کو دینا کہہ کر نہیں پکارا۔ اگر کبھی نام لینے کی ضرورت پیش آئی تو مسز واڈیا کہا۔ وہ بہرحال اپنے باپ کی خاصی وفادار تھی۔ ۱۴ اور ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو اس نے اپنی بالکونی پر پاکستان اور ہندوستان دونوں کے جھنڈے لگائے تھے۔

لیکن یہ روشن اور آزاد خیال جناح ہی تھے جن کی طرف اول اول سارے ملک کی نگاہیں اٹھیں۔ وی پی مینن نے اپنی کتاب ٹرانسفر آف پاور اِن انڈیا (اورینٹ لانگ مینس ۱۹۵۷ء) میں انھیں ''اپنی نسل کا حقیقی ہیرو'' کہا ہے۔ جناح صاحب سیاست کے میدان میں بہت پہلے ہی آ گئے تھے۔ امپیریل لیجس لیٹو کونسل میں وہ بمبئی کے نمائندے کی حیثیت سے ۱۹۰۹ء میں داخل ہوئے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں اس وقت تک اسمبلی کے رکن رہے جب تک کہ انھوں نے رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ نہیں دے دیا۔ ۱۹۲۰ء میں وہ مسلم لیگ کے صدر بھی تھے اور کانگریس کے اہم لیڈر بھی۔ وہ گاندھی جی سے اولاً دور اس وقت سے ہونے لگے جب انھیں حقیقتاً یہ محسوس ہوا کہ گاندھی جی سیاست میں مذہبیت کو متعارف کرا رہے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے مسلم لیگ کے سیشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ:

> ''مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں، ہندوؤں سے لڑنے کے خیال نے نہیں بلکہ اپنے مادرِ وطن کے لیے انھیں متحد کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے خیال سے۔''

مدھولیمائے نے اپنے ایک اچھے مضمون ''جناح دی لبرل'' (سنڈے اکتوبر ۱۹۸۳ء) میں لکھا تھا:

''اگر قوم پرستی سے فرقہ پرستی مراد نہ ہو تو جناح ایک کٹر قوم پرست تھے۔''

۱۹۱۹ء میں پارلیمانی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت کے موقع پر ان سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی امتیازات کا یک سر خاتمہ چاہتے ہیں تو ان کا جواب تھا:

''جی ہاں! ایسی ساعت آنے سے زیادہ خوش کن بات میرے لیے اور نہیں ہو سکتی۔''

تیسری دہائی کے وسط تک وہ انتہائی فخر کے ساتھ یہ اعلان کرتے رہے کہ وہ:

''ایک ہندوستانی پہلے ہیں اور ایک مسلمان بعد میں۔''

جناح صاحب کو ان مولویوں اور ملاؤں سے کوئی محبت نہیں تھی جو سیاست میں دخل اندازی کرتے تھے۔

پاکستان اسکیم کے تعارف کی دعوت:

یہی جناح صاحب تھے جنھیں پاکستان کے خیال کا اصل معمار بنا دیا گیا۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا خیال اس وقت تشکیل ہوا تھا جب جناح صاحب خود ترکِ وطن کیے ہوئے لندن میں تھے۔ ۱۹۳۳ء میں کیمبرج یونی ورسٹی کے ایک طالب علم رحمت علی نے لندن کے والڈورف ہوٹل میں ایک عشایے کا اہتمام کیا۔ کھانوں کی فہرست انتہائی غیر اسلامی تھی۔ فہرست میں ''گھونگھے بھی تھے'' اور ''اچھے قسم کی واین بھی۔'' مگر کھانے کے موقع پر جو خیال پیش کیا گیا وہ تھا مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کے قیام کا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان زمانے میں پاکستان کو ''طالبِ علم کی تجویز'' کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔

قرارداد پاکستان:

۱۹۴۰ء تک جناح صاحب بالکل تیار ہو چکے تھے۔ انھوں نے ایک اخباری نمائندے

کو بتایا بھی تھا کہ لیگ کا لاہور سیشن ایک تاریخی سیشن ہوگا۔ پاکستان کا نام نہیں لیا گیا تھا، مگر یہ بات طے ہو گئی تھی کہ

''وہ علاقے جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں، جیسے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں، ایک ساتھ سمجھے جانے چاہئیں اور ان علاقوں پر مشتمل ایک ''آزاد ریاست'' بنائی جانی چاہیے، جس میں شامل اکائیاں خود مختار اور آزاد ہوں گی۔''

۱۹۴۷ء آتے آتے جناح صاحب کا فیصلہ کامیاب ہوا۔ ایک طرف گاندھی جی نے ہندوستان کے یوم آزادی کی خوشی منانے سے انکار کیا کہ یہ وہ ہندوستان نہیں جو وہ چاہتے تھے، دوسری طرف جناح صاحب نے تالیوں کی گونج میں ایک نئے ملک کی پیدائش کا اعلان کیا۔

نظریۂ پاکستان:

یہ تو پاکستان کے حصول کے بعد ہی جناح صاحب کو پتا چلا کہ انھیں یہ نہیں معلوم کہ وہ اس ملک کا کیا کریں۔ دفعتہً وہ ایک بار پھر آزاد اور روشن خیال ہو گئے۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء کی ایک پریس کانفرنس میں ایک صحافی نے جب ان سے پوچھا کہ کیا پاکستان ایک مذہبی ریاست ہوگا؟ جناح صاحب نے جواب دیا:

''تم ایک ایسا سوال پوچھ رہے ہو جو فضول اور حماقت آمیز ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ایک مذہبی ریاست کا مطلب کیا ہوتا ہے۔''

۱۱ر اگست کو جس دن انھیں پاکستان آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا اور نئے ملک کا پرچم اپنایا گیا تھا انھوں نے ایوان سے کہا تھا:

''ہم اس ریاست کا آغاز بغیر کسی امتیاز و تفریق کے کر رہے ہیں۔ یہ بات ہمیں اپنے سامنے اپنے مقصد کی طرح رکھنا چاہیے اور آپ کچھ دنوں بعد دیکھیں گے کہ ہندو، ہندو نہیں رہ جائیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی لحاظ سے نہیں کیوں کہ یہ تو ہر فرد کے ذاتی اور نجی عقیدے کی بات

ہے، بلکہ سیاسی لحاظ سے ایک ملک کے شہری ہونے کے لحاظ سے!''

جناح صاحب کے دست راست اور جانشین لیاقت علی خاں کے یہاں بھی قایداعظم ہی کے جذبات کی بازگشت تھی۔ جب انھوں نے ۱۱راگست کو کراچی میں آئین ساز اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے اس پرچم کی وضاحت کی تھی جسے وہ اس وقت لہرانے جارہے تھے، انھوں نے کہا کہ

> ''یہ پرچم کسی ایک مخصوص جماعت یا فرقے کا پرچم نہیں ہے۔ یہ پرچم ان تمام لوگوں کے لیے ہے جو اس کے وفادار ہوں گے۔ آزادی، حریت اور مساوات کا پرچم ہوگا۔ پاکستان کی ریاست کا جو تصور میرے ذہن میں ہے اس میں کسی مخصوص فرقے یا فرد کے لیے خصوصی مراعات نہیں ہیں، خصوصی حقوق نہیں ہیں۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر پاکستان کیوں؟

تضادات:

پاکستان کی تخلیق کرنے والوں اور عوام میں جو تضادات تھے وہ خود جناح صاحب کی زندگی ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ جناح صاحب خود اردو نہیں جانتے تھے، گجراتی ان کی مادری زبان تھی اور انگریزی ان کی بقا کا ذریعہ۔ سارے کا سارا بنگالی پاکستان اردو نہیں جانتا تھا، مگر یونائیٹڈ پراونس لابی کے دباؤ کی وجہ سے اردو پاکستان کی قومی زبان قرار پائی۔ ۲۴ر مارچ ۱۹۴۸ء کو جب ڈھاکا یونی ورسٹی کے طالب علموں کو جناح صاحب خطاب کرنے گئے تو انھوں نے ان کو آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے، ملک کی صرف ایک ہی زبان ہوسکتی ہے......اور وہ صرف اردو ہی ہوسکتی ہے۔''

ہربرٹ فیلڈمین (دی انڈ اینڈ دی بگننگ: پاکستان ۱۹۶۹-۷۱ء آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس) نے کچھ زیادہ صفائی سے یہ بات کہی ہے:

> ''یہ بات مشکوک ہے کہ خود محمد علی جناح ان سیاسی الجھنوں سے واقف تھے جو

اس پاکستان میں فطری طور پر مضمر تھیں، جو بالآخر انھوں نے منظور کیا تھا۔"

انجام:

پاکستان کا خیال چوتھی دہائی میں پیدا ہوا، پانچویں دہائی میں جدوجہد شروع ہوئی، چھٹی دہائی میں اس کی شکل مسخ ہوئی، ساتویں دہائی میں اس کا گلا گھٹا اور آٹھویں دہائی میں وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

انجام سے بے خبر رہنا:

برصغیر کے حالات ایک بار پھر غیر یقینی ہو رہے ہیں۔ اگر جناح صاحب صحیح تھے تو ۱۹۴۷ء "ایک کرم خوردہ" (تقسیم کے بعد پاکستان کو بیان کرتے وقت جناح صاحب نے یہی الفاظ استعمال کیے تھے۔) برصغیر کی طرف بڑھنے کے عمل کا محض آغاز تھا۔ اپنی اپنی حکومت کے پینتیس سال بعد اب وقت آ گیا ہے کہ حقایق کا جایزہ لیا جائے اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کی جائے کہ زبردست دشواریوں اور مسایل کے باوجود کون زیادہ کامیاب رہا۔ جمہوری وفاقی ریاست جسے مہاتما گاندھی چاہتے تھے یا وہ مذہبی ریاست جو جناح صاحب اپنے بعد چھوڑ گئے۔ تقسیم ایک حقیقت تھی یا برصغیر کے ارتقا کے سفر میں ایک بے کیف وقفہ۔ آخری وایسراے لارڈ لوئیس فرانس البرٹ وکٹر نکولس ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب دیا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی تقسیم پر اتفاق راے حاصل کرنے کے فوراً بعد نجی طور پر لکھا تھا:

> "اس مجنونانہ فیصلے کی ذمے داری دنیا کی نگاہوں میں پورے طور پر ہندوستانیوں پر ڈالی جانی چاہیے۔ ایک دن وہ اس فیصلے پر جو وہ عن قریب لینے والے ہیں خود کفِ افسوس ملیں گے۔" (ہندوستان اپنے حصار میں: ص ۲۹-۲۴)

مسٹر جناح اور نیشنلسٹ مسلمان:

مسٹر جناح کانگریس کو ایک خالص ہندو جماعت سمجھنے لگے تھے۔ چناں چہ وہ "ہندو

کانگریس'' کے نام سے اس کا حوالہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ان مسلمانوں سے بھی نفرت کرنے لگے تھے جو علم و فضل و دانش مندی کے نقطۂ نظر سے نہایت ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور کانگریس میں شریک تھے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ان کو ایک خط لکھا کہ میں آپ سے مل کر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

مسٹر جناح نے ان سے ملاقات کرنے کو بہ نظر حقارت دیکھا اور لکھا:

''تم کو کانگریس نے ایک دکھاوے کا کھلونا بنا رکھا ہے۔ پہلے کانگریس چھوڑ دو پھر مجھ سے ملنے کا ارادہ کرو۔''

بعض وہ حضرات بھی جو مسٹر جناح کے حامیوں میں تھے ان کی ترش زبانی کے شاکی تھے، حال آں کہ خوش خلق ہونا ایک مخصوص اسلامی شان و روایت ہے۔ مسٹر آصف علی ہے جو اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ممبر تھے، مسٹر جناح کو اتنی نفرت تھی کہ جب انھوں نے اپنی قیام گاہ پر جملہ ممبران کو پارٹی دی تھی تو بالا ارادہ آصف علی کو نہیں مدعو کیا۔ ہر صاحب نظر پر یہ واضح تھا کہ مسٹر جناح کو انگریزوں کی نہ صرف حمایت مل رہی تھی بلکہ وہ ان کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔ مسٹر جناح ہندوؤں کے خلاف کتنی ہی زہر افشانی کریں ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ دراں حال آں کہ اس سے بہت کم کہنے والے بڑے بڑے ہندو لیڈر جیلوں میں بھرے جا رہے تھے۔ انگریزوں کو کانگریس سے نفرت تھی کیوں کہ وہ ملک کی آزادی کی خواہاں تھی، اس لیے وہ مسلم لیگ کے حامی تھے اور اس عام اصول پر کہ ''دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔'' مسٹر جناح کو اپنا حلیف بنا لیا تھا۔ (پاکستان- قیام اور ابتدائی حالات)

۷ر مارچ ۱۹۴۴ء کو اجمل بمبئی نے اپنے اڈیٹوریل میں لکھا کہ مسٹر جناح کا بیان رجعت پسندانہ ہی نہیں بلکہ اس نے مسلم لیگ کی پوزیشن کو حد درجہ مضحکہ خیز بنا دیا ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف جیسے شخص کو جناح کے طرز عمل پر اتنی سخت تنقید کرنی پڑی ہے۔

(حسرت موہانی- ایک سیاسی ڈائری)

بھیس بدل کے!

زمزم لاہور نے اپنی اشاعت ۱۵ر مئی ۱۹۴۵ء میں مندرجہ بالا عنوان سے ذیل کا فکر انگیز شذرہ لکھا ہے:

''مہابلشور سے جہاں آج کل گاندھی جی اپنی صحت کی بحالی کے لیے ٹھیرے ہوئے ہیں یہ حیرت ناک ''افواہ بعض اخبارات میں شایع ہوئی ہے کہ ''قایداعظم'' جناح صاحب بہت خاموشی سے چھپتے چھپاتے بھیس بدل کے اور مصنوعی داڑھی لگا کے وہاں پہنچے ہیں اور بڑی راز داری کے ساتھ تخلیے میں گاندھی جی سے ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ جو لوگ جناح صاحب کی افتادِ طبیعت سے واقف ہیں وہ اس خبر پر ایک طویل قہقہہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خصوصاً اس میں مصنوعی داڑھی لگانے کا جو ٹکڑا ہے وہ تو واقعی بہترین افسانوی دماغ کی کاریگری کا نتیجہ ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اس قسم کی افواہ پیدا کیسے ہوئی اور وہ کون سی چیز ہے جس نے اس خبر کو اتنی اہمیت دی کہ کچھ ذمے دار لوگوں نے باقاعدہ ٹولی بنا کر جناح کی تلاش مہابلشور میں شروع کر دی اور پھر وہاں سے چل کر یہ چیز اخباروں تک آ گئی؟ اس سوال پر مسلم لیگ کے ذمے دار افراد ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔

لیکن جناح صاحب کے بارے میں اس سے زیادہ دل چسپ چیز گجراتی کے ایک اخبار کا وہ انکشاف ہے جو اس نے ان کی اور وزیرِ ہند کی خط و کتابت کے سلسلے میں کیا ہے۔ اخبار مذکور لکھتا ہے کہ جناح صاحب نے گاندھی جی سے پچھلے دنوں جو ملاقات کی تھی اُس سے چند دن قبل وزیرِ ہند کو ایک خفیہ خط میں لکھا تھا کہ گاندھی جی سے ملنے کو میرا جی نہیں چاہتا، مگر کیا کروں مجبوراً مل رہا ہوں، کیوں کہ اگر نہ ملوں گا تو کانگریسی اخبارات میرے خلاف شور مچا کر زمین آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔ اس کے بعد وزیرِ موصوف کو قایدِاعظم نے یہ یقین دلایا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان جنگ میں پوری طرح آپ کے ساتھ ہیں۔ وزیرِ ہند نے اس خط کے جواب میں جناح صاحب کے صرف اس قول پر شکریے کا اظہار کیا تھا کہ مسلمان جنگ میں برطانیہ کے ساتھ ہیں۔

جناح صاحب کا اول الذکر ''بھیس'' تو قابلِ یقین معلوم نہیں ہوتا، لیکن یہ ثانی الذکر ''بھیس'' کچھ بعید از قیاس نہیں۔ اس لیے ہمیں تو اس پر کوئی حیرت نہیں، البتہ مسلم لیگ کے ''ترقی پسند'' ممبران سے ہم یہ سوال کریں گے کہ

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر گو؟

روشن خیال برطانیہ کا نقطۂ نظر مسٹر جناح کے بارے میں!

ایک دل چسپ خط گذشتہ ہفتے ہوائی ڈاک کے ذریعے سے انگلستان سے آیا ہے۔ جس میں ایک انگریز نے اپنے ایک ہندوستانی دوست کو جو اس کے ساتھ عرصے تک بنگال میں انڈین سول سروس میں رہا ہے اور اپنی قبل از وقت پنشن سے پہلے تک ذمے دار عہدے پر سرفراز رہا ہے اور اب انگلستان میں سوشل اور تعلیمی مشاغل میں منہمک ہے، وہ لکھتا ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ ویول کی تجویز کا گر جانا حقیقتاً ایک سانحہ ہے۔ تمہاری طرح میرا بھی بخشتہ خیال ہے کہ ہندو مسلم اختلافات کی اکثر و بیشتر تلخیاں برطانوی پالیسی کی مرہونِ منّت ہیں۔ اگر ہندوستان کے برطانوی نظم و نسق نے ان دونوں جماعتوں کو متحد کرنے کی جدوجہد کی ہوتی تو وہ آج سے پچاس سال پہلے نہایت آسانی سے اسے کر سکتے تھے، اب البتہ یہ بہت ہی مشکل ہو گیا ہے، لیکن اس کے بجائے انھوں نے ان اختلافات کو ہوا دی اور انھیں بڑھنے دیا۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جناح ہندوستان کا Evil Genius (ذہین شیطان) ہے۔ اس کے مطالبات احمقانہ ہیں اور زیادہ تر اس غلط فہمی پر مبنی ہیں کہ مفاہمت کے التوا میں وہائٹ ہال اس کی خاموش پشت پناہی کر رہا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ویول اپنے اس فریب خوردہ کو بلا کر کہیں گے کہ ''بہت اچھا! اگر تم ناموں کی فہرست دینے سے انکار کرتے ہو تو میں اپنی کارروائی کو آگے بڑھاتا ہوں اور بغیر تمہارے اس فہرست کو لے کر جو دوسری پارٹیوں نے پیش کی ہے اپنی کونسل بناتا ہوں۔'' میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ (ویول) اپنی رائے میں آزاد ہوتے تو ایسا ہی کرتے، مگر مسٹر چرچل نے مطالبات کی منظوری پر جو طریق کار تجویز کیا تھا وہ یہ تھا کہ اگر ایسی مشکل پیش آئے جیسی کہ حقیقتاً پیش آئی تو فوراً قدیم سسٹم کی طرف لوٹ جائے۔ یہ بری طرح مشہور ہے کہ چرچل رعایت دینے کے بہت سخت خلاف ہے اور پرانے سسٹم کو برقرار رکھنے کے لیے جو بھی موقع حاصل ہوتا ہے، اس سے اس کو خوشی ہوتی ہے۔ ہم حقیقتاً متعجب تھے کہ اس نے ''ویول کی تجاویز'' پر کیسے دستخط کر دیے؟ غالباً اس نے اس لیے دستخط کر دیے کہ اسے یقین کامل تھا کہ جناح ہٹ دھرم ثابت ہوگا اور کانفرنس کو ناکام کر دینے کے لیے یہ ہٹ دھرمی ایک بہانہ ہو جائے گی۔ جیسا کہ تمھیں علم ہے چرچل

فطرتِ انسانی کے کم زور پہلوؤں کا اندازہ لگانے میں بہت ماہر ہے اور غالباً وہ (چرچل) پوری طرح سے واقف تھا کہ اگر میں پیشتر سے کوئی اشارہ نہ کروں گا تو جناح کا کیا طرزِ عمل رہے گا۔ اب صرف ایک امید رہ گئی ہے کہ لیبر گورنمنٹ واپس آ جائے۔

جہاں تک شہنشاہیت کا تعلق ہے لیبر پالیسی کے بارے میں کچھ اچھا خیال نہیں رکھتا، لیکن کم از کم شاید وہ بات چیت کا دروازہ کھولے اور ویول کو آزادی سے کام کرنے کا موقع دے۔ آج ''رینالڈ نیوز'' میں ایک زبردست مقالۂ افتتاحیہ چھپا ہے، جس میں سارا الزام جناح پر رکھا گیا ہے اور کھلے بندوں یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ بغیر مسٹر جناح کے اشتراک کے کونسل بنائی جائے۔ یہ اخبار لیبر پارٹی کے زیادہ روشن خیال لوگوں کا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ یہ ہے وہ مقالۂ افتتاحیہ جو ''رینالڈ نیوز'' نے لکھا ہے اور جس میں شملہ کانفرنس کی ناکامی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جس کا اشارہ میں نے اپنے خط میں کیا ہے۔

اب وقت ہے کہ ہندوستان کے بارے میں صاف گوئی سے کام لیا جائے۔ مسلم لیگ کے صدر جناح نے باوجود اس صاف حقیقت کے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بہت بڑا حصہ کانگریس میں شریک ہے، اس مطالبے پر اڑ کر کہ مسلم لیگ ہی کو ہندوستانی مسلمانوں کا واحد نمایندہ تسلیم کیا جائے، ایک بار پھر دستوری جمود کے حل کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ یہ صرف پہلا موقع نہیں ہے کہ جناح نے غیر مصالحانہ روش اختیار کی ہو۔ ہم کب تک اسے ہر پُر امید اقدام کو ٹھکرانے کا موقع دیتے رہیں گے؟ برطانیہ کا فرض یہ ہے کہ وہ مصالحت کی پوری کوشش کرے، لیکن اگر مصالحت کی جدوجہد ایک پارٹی کے طرزِ عمل سے کھلے بندوں توڑی جا رہی ہو تو پھر برطانیہ کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ مسلم لیگ سے کہہ دے کہ مجھے تمہارے طرزِ عمل پر افسوس ہے اور ہم اسے ہندوستان کی سیلف گورنمنٹ کے حل میں مسلسل روڑے اٹکانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہم اس سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس حل کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں جس کو ہم صحیح سمجھتے ہیں اور جسے ہندوستانی سیاسی تحریک کی سب سے بڑی جماعت نے قبول کر لیا ہے۔ مسلم لیگ کے لیے جگہ خالی ہے، جب وہ خواہش کرے گی اسے اس کی جگہ دے دی جائے گی۔ سابقہ تجربات کی بنا پر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک برطانیہ اس خاردار درخت کو ہاتھ نہیں لگائے گا اس وقت تک ہمیں

سیلف گورنمنٹ کی جانب کسی حقیقی ترقی کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔

(ماڈرن ریویو۔ ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء: ص ۱۳۵)

بحث و مذاکرہ۔ مولانا حسین احمد:

''موجودہ سیاسی ہنگامے سے پہلے اگر کوئی مسلمان شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور مسٹر جناح میں مقابلے کی جرأت کرتا تو اس کے خبطی ہونے میں کس کو شبہ نہ ہوتا۔ اگر وہ مقابلے میں مسٹر جناح کو ترجیح دیتا تو اس کے الحاد پر تمام مسلمان چلا اٹھتے، اگر وہ ایک اور قدم آگے بڑھا کر مسٹر جناح کو امامِ برحق قرار دیتا اور شیخ الہند کی اسلام دشمنی کا صور پھونکتا تو تصور کرو مسلمان کی مذہبی غیرت اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی؟ شور برپا ہو جاتا کہ اسلام کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو رہا ہے اور علم و جہل، نور اور تاریکی کا امتیاز مٹایا جا رہا ہے۔ مگر آج؟ اتفاقات ہیں زمانے کے! امت اسلامیہ کو یہ وقت بھی دیکھنا تھا کہ اسیر مالٹا مسٹر جناح کی جگہ ہیں اور مسٹر جناح اسیر مالٹا کی جگہ۔ قاید اعظم پہلے کی طرح اب بھی مسٹر ہیں، شکل و صورت، تہذیب و معاشرت میں نہ پہلے اسلام کے پیرو تھے نہ اب ہیں۔ اسلامی ارکان و فرایض سے نہ پہلے تعلق تھا نہ اب کوئی تعلق ہے۔ نہ کبھی پہلے انگریز کے کوڑے کھائے نہ آیندہ کھانے کا ارادہ ہے۔ وہ ہر اعتبار سے الآن کما کان ہیں!

حضرت مدنی کا بھی یہی حال ہے وہ پہلے بھی مسجد نبوی کے شیخ الحدیث تھے اور اب بھی وراثت نبوی کی مسند پر سرفراز ہیں۔ شکل و صورت، خصلت و سیرت پہلے بھی اسلامی تھی اور اب بھی اسی کی آئینہ دار ہے۔ وہ پہلے بھی انگریز کی نظروں میں کانٹا تھے، اب بھی اس کی آنکھوں میں خار ہیں۔ مگر ذوق و مزاج کو بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی، حسین احمد کو گالیاں اور ملاحیاں اور جناح کو تحسین و آفرین۔ جانشین پیغمبر شیخ الہنود اور مالا بار ہل کا عافیت کوش شیخ الاسلام اور امیر المومنین!

سنا کرتے تھے کہ ہندی مسلمان کی مذہبیت بڑی پختہ ہے اور علما کی عقیدت اس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے، مگر اس انقلاب نے اس خوش فہمی کی بھی پردہ دری کر کے رکھ دی اور یہ ثابت ہو گیا کہ ایک مسٹر بھی جب چاہے نبوت کی بساط اُلٹ سکتا ہے، ایک رند میں بھی یہ طاقت ہے کہ تقویٰ کے حلقوم پر چھری چلا کر روحانی نظام کو درہم برہم کر ڈالے!

پنجاب کا مسلم پریس حسین احمد کے نظریات پر تنقید نہیں کرتا، باولے کتے کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ نثر ونظم کی جولانیاں اس شخص کے خلاف وقف ہیں، جس کے سامنے احترام واطاعت کے لیے تمام سروں کو جھک جانا چاہیے۔ یہاں شیخ الہند اور شیخ الاسلام کا مقابلہ نہیں ہے، یہاں بیت الحرم اور مالا بار ہل کا مقابلہ ہے۔ افسوس موجودہ سیاست کی بحرانیت پر کہ اسلام کا امیر المومنین گالیاں کھا رہا ہے اور خاموش ہے اور فرنگی تہذیب کا زائیدہ خراج تحسین وصول کر رہا ہے اور ''مولویت'' کے خاتمے پر مسرور ہے۔ خوب گالیاں دو، خوب کمینے پن کا ثبوت دو، خوب اسلام کو رسوا کرو مگر یہ گمان مت کرو کہ اس کی پاداش سے بچ جاؤ گے اور حق وعدالت کی بارگاہ سے تمہارے خلاف کوئی فیصلہ صادر نہ ہوگا۔'' (زمزم-لاہور: ۲؍ستمبر ۱۹۴۵ء)

مسٹر جناح سے خطاب:

۱۹؍ستمبر ۱۹۴۵ء: دسمبر ۱۹۴۵ء میں مرکزی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے، لیگ نے ان انتخابات کو کفر واسلام کا مسئلہ بنا دیا تھا اور نیشنلسٹ مسلمانوں اور جمعیت علمائے ہند اور اس کے صدر حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کے خلاف الزامات واتہامات کا ایک سیلاب تھا کہ امڈ آیا تھا اور بے ہودہ گوئی اور دشنام کا ایک طوفان برپا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں جمعیت علمائے ہند کو مقاصد کی عام تبلیغ واشاعت کے وسائل بھی حاصل نہ تھے۔ ہوتے تو اسی کے خواص تو درکنار عام کارکن تک وہ زبان اور لہجہ واسلوب بیان استعمال نہ کر سکتے تھے، لیکن حضرت شیخ الاسلام نے عقیدت کیشوں نے لیگی لٹریچر کے مقابلے میں نظم ونثر دونوں میں نہایت مہذب ادب پیش کیا، جو اسلامی تہذیب واخلاق کا آئینہ دار بھی تھا اور اپنے اندر زبان وبیان واسلوب کی خوبیاں بھی رکھتا تھا۔ تعداد کے لحاظ سے بھی اس قسم کا کثیر لٹریچر فراہم ہو گیا۔ مشتے نمونہ از خروارے! حضرت شیخ الاسلام اور مولانا ابوالکلام آزاد کی شان میں چند نفیس ڈائری میں درج کی ہیں۔ ان میں سے ایک نظم از سرفراز احمد فراز قریشی کی یہاں درج کی جاتی ہے:

ناز ہے قانون دانی پر تجھے، لیکن بتا! باتیں قرآں کی سناتا ہے حسین احمد کہ تو؟

قوم کی خاطر مسلسل سختیاں سہتا ہے کون — جیل کے در کھٹکھٹاتا ہے حسین احمد کہ تو؟
مصطفیٰ کی پیروی میں اپنی ناداں قوم سے — روز پتھر کون کھاتا ہے حسین احمد کہ تو؟
حاکمانِ وقت کے ظلم و ستم کر کے بیاں — کون تکلیفیں اٹھاتا ہے حسین احمد کہ تو؟
ہند میں انسانیت پر، قوم پر، اسلام پر — نقدِ جاں و دل لٹاتا ہے حسین احمد کہ تو؟

قاید اعظم بنارہ تو ہی لیکن سچ بتا
کام آڑے وقت آتا ہے حسین احمد کہ تو؟

(زمزم-لاہور: ۱۹ر ستمبر ۱۹۴۵ء: ص ۱)

علم الدین غازی کا مقدمہ-مسٹر جناح کا اسلامی کارنامہ:

۲ر اکتوبر ۱۹۴۵ء: لدھیانہ ۲ر اکتوبر، پولیس ڈویژن نمبر ۳ کے چوک میں گزشتہ رات مجلس احرار لدھیانہ کے زیرِ اہتمام ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن نے فرمایا کہ جو لوگ مولانا آزاد کو گالی دیتے ہیں وہ کبھی آرام نہ پائیں گے۔ اس کے بعد کہا کہ آج لوگ میاں افتخار الدین کے لیگ میں آنے سے خوش ہیں۔ ہم بھی خوش ہیں کہ میاں صاحب ٹھیک جگہ پہنچ گئے، جو لوگ خدا کو نہیں مانتے اُن کے لیے مسلم لیگ ہی میں جگہ ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا کہ مسلم لیگ نے بھی مہاشہ راج پال کے قاتل علم الدین کو غازی کہا تھا۔ پھر مسلم لیگ والوں نے مقدمے کی پیروی کے لیے مسٹر جناح کو بلایا اور مسٹر جناح نے مسلمانوں کی اس خدمت کے صلے میں اپنی فیس دس ہزار رُپے لی اور پھر بھی مقدمہ ہار گئے۔ (مدینہ-بجنور: ۹ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

مسلم یونی ورسٹی میں ہلڑ ازم کی تعلیم:

۵ر اکتوبر ۱۹۴۵ء: علی گڑھ، ۵ر اکتوبر۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں نے اپنی تقریر میں یونی ورسٹی کے طلبہ کو تعلیم چھوڑ دینے اور انتخابی جنگ میں حصہ لینے کا حکم دیا تھا۔ اس حکم کے زیرِ اثر طلبہ کی ایک تعداد نے تعلیم سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ طالب علموں کو کام کرنے کی ٹریننگ دی جا رہی ہے، جہاں بہت سے سنجیدہ طالب علم پڑھنے لکھنے میں مصروف ہیں وہاں طلبہ کی ایک تعداد ہلڑ بازی کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

یہ بات یقینی ذرائع سے معلوم ہوئی ہے کہ یونی ورسٹی کے ڈیڑھ سو طلبہ کو خاص طور پر بجنور کے لیے تیار کیا جارہا ہے تاکہ وہ فساد انگیزی کر کے جلسوں کو درہم برہم کریں۔ ایک دل چسپ خبر یہ موصول ہوئی ہے کہ یونی ورسٹی کے ایک صاحب زادے بجنور میں بھوک ہڑتال کریں گے تاکہ حافظ محمد ابراہیم کو مسلم لیگ میں آنے پر مجبور کیا جائے۔

مسلم لیگ کا پہلا انتخابی وفد ناکام ہو کر واپس لوٹ گیا۔ ضلع بجنور نے اس وفد کے جلسوں سے غیر حاضر رہ کر یہ ثابت کر دیا کہ اس ضلعے کے دونوں حلقوں میں مسلم لیگ کا کوئی اثر نہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی پر دوسرا قاتلانہ حملہ:

۱۱/اکتوبر ۱۹۴۵ء: (ڈاک کے ذریعے) بھاگل پور میں عام جلسہ ہونے والا تھا، جس کے لیے مولانا حسین احمد مدنی صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایک موقعے پر مسلم لیگی عوام کے فساد پسند عنصر نے جن میں مسلم ہائی اسکول کے طلبہ بھی شامل ہیں، ان کی شان میں گستاخی کی۔ جب مولانا جلسہ گاہ میں جانے کے لیے موٹر میں بیٹھے تو غنڈوں نے جمع ہو کر ان پر پتھر اور اینٹیں برسائیں اور پیچھے مولانا حسین احمد صاحب پر چھرے سے حملہ کیا، لیکن اتفاق سے وار خالی گیا اور چھرا موٹر کے پچھلے حصے کے پردے پر پڑا، جس پر پردہ چاک ہو گیا اور مولانا بال بال بچ گئے۔ (زمزم-لاہور: ۱۱/اکتوبر ۱۹۴۵ء)

آخر یہ کیا ہے؟

اگر ہم مسلم لیگی حضرات کو اسلام کا واسطہ دے کر تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ ملحدین، مارکسین کے جھانسے میں آکر علمائے دین کی توہین نہ کریں اور اپنی شوریدہ سری سے باز آجائیں تو کہا جاتا ہے کہ ''زمزم'' مسلم لیگ کا مخالف ہے اور وہ سب کو ایک لکڑی سے ہانکتا ہے، لیکن لیگی حضرات خود ہی اپنی شرارتوں کی توجیہہ فرمائیں اور یہ بتائیں کہ اختلاف رائے کی بنا پر علمائے حق کو سب و شتم کرنا اور شریعت کے باغیوں کو چن چن کر اپنا لیڈر بنانا، حق خود ارادیت اور پاکستان کی کون سی قسم ہے؟ جس کی ایجاد کا فخر انہیں حاصل ہوا ہے؟ کیا اس اطلاع کو

پڑھ کر علماے حق کے پیرو مسٹر جناح کو معاف کر سکتے ہیں کہ سید پور اسٹیشن پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو لیگی اشرار نے اپنی غنڈہ گردی کا نشانہ بنایا اور ان کی بے عزتی کی؟ ہمیں امید نہیں کہ لیگ کے رہنما اپنے کارکنوں کو ان حرکتوں پر نفرت و ملامت کریں گے، البتہ ہم لیگ ہائی کمان کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ان کے عیش کوش ہجڑوں سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ البتہ اگر کسی مجاہد نے انتقام کی ٹھان لی اور اس کا کوئی نتیجہ نکلا تو لیگی حضرات کے آنسو دس سال تک نہ تھم سکیں گے۔ ہجڑوں کا دم خم معلوم ہے، مگر ہم لیگی حضرات کو نصیحت کریں گے کہ وہ پیروانِ حق کے دست و بازوؤں کو آزمانے کی کوشش نہ کریں گے اور اس خام خیالی سے باز آجائیں کہ ان حرکتوں سے بھی وہ مردِ مجاہد بن سکتے ہیں۔

(ادارتی نوٹ، سہ روزہ ''زمزم'': ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی تقریر:

بجنور ۲۹ر اکتوبر: حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے یہاں جامع مسجد میں تقریر فرمائی۔ حضرت مولانا نے شروع میں فرمایا:

''انسانی زندگی کا سکون دو قسم کی بیماریوں سے تباہ ہو جاتا ہے، جسمانی بیماریوں سے اور روحانی بیماریوں سے۔ جسمانی بیماریوں کا علاج ڈاکٹر اور حکیم کرتے ہیں اور روحانی بیماریوں کے لیے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر خاص روحانی قوت لے کر آتے ہیں۔ ڈاکٹر اور حکیم دوا اور پرہیز تجویز کرتے ہیں، مگر بہت سے انسان دوا اور پرہیز سے انکار کر دیتے ہیں۔ اسی طرح پیغمبر روحانی علاج تجویز کرتے ہیں، مگر انسانوں کی اکثریت اس کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس وقت کو یاد کیجیے جب آقاے مدینہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں حق کی طرف بلایا مگر تم نے اور تمہاری اکثریت نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سننے سے انکار کر دیا۔ حملے کیے گئے، پتھر برسائے اور ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔

ہندوستان کے علماے حق کی ہستی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ آقائے مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم علم و حکم کے پیغام رساں ہیں۔ ہم آج اس سبق کو دہرا رہے ہیں جو ہمیں اپنے اکابر علماے حق اور حضرت شیخ الہندؒ کی طرف سے ملا ہے۔ خواہ کچھ ہو ہم پوری قوت سے اسے تمہارے کانوں تک پہنچاتے رہیں گے۔''

مسٹر جناح کی تاریخی غلطیاں:

حضرت شیخ نے فرمایا:

''میرا کام یہ نہیں ہے کہ میں مسٹر جناح کے ذاتی کیریکٹر اور شخصیت پر حملہ کروں، میں صرف ان کی سیاسی اور مذہبی غلطیوں کی تاریخ پیش کروں گا۔ مسٹر جناح نے ۱۹۳۶ء میں ہمیں بلایا، ہم سے شریفوں کی طرح معاہدہ کیا۔ ان کے تین وعدے تھے:

(۱) وہ آزادی خواہ طاقتوں کی حمایت کریں گے۔

(۲) خودغرض سرکار پرستوں اور سرکاری عنصر کو مسلم لیگ سے نکال دیں گے۔

(۳) مذہبی معاملات میں ہر فیصلہ علمائے ہند کی رائے کے مطابق کریں گے۔

اور اگر وہ اس معاہدے کو پورا کرنے سے معذور رہے تو مسلم لیگ کو چھوڑ کر آزادی خواہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔''

مسٹر جناح کی معاہدہ شکنی:

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ انھوں نے معاہدے کو توڑ دیا اور یہ کہہ دیا کہ وہ معاہدے سیاسی تھے۔ آج مسٹر جناح آزادی کی جدو جہد کو پامال کر رہے ہیں، ان کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے بڑے بڑے خطاب یافتہ سرکار پرست موجود ہیں، انھوں نے اسمبلی میں اسلامی شریعت کے احکام کو مٹایا اور ان بلوں کو برباد کر ڈالا جو علما کے مشورے سے پیش کیے گئے تھے انھوں نے اور ان کی پارٹی نے شریعت بل، خلع بل، قضا بل ایسے اہم شرعی مسئلوں میں کسی ایک عالم سے بھی فتویٰ نہیں لیا اور اپنے انتخابی اعلان ۱۹۳۰ء کو بھی جھٹلا دیا۔ جب ہمیں یہ تحقیق ہوگیا کہ ہم سے ہر بات میں وعدہ خلافی کی گئی ہے تو ہم اسلام کے تحفظ، شرعی احکام کی بجا آوری اور آزادی کی جدو جہد کے لیے مسلم لیگ سے باہر آگئے۔ حال آں کہ یہی وہ مسلم لیگ تھی، جس کے متعلق ۱۹۳۷ء کے بعد ہمارے نام ایک خط میں یہ لکھا گیا تھا کہ تو نے تیس برس کی مردہ مسلم لیگ کو زندہ کر دیا۔''

شریعت کی پامالی:

حضرت مولانا نے سول میرج ایکٹ کے سلسلے میں گورنمنٹ اور انڈیا گزٹ کے

تاریخی حوالے دے کر مسٹر جناح کی ایک تقریر نقل فرمائی، جس میں مسٹر جناح نے کہا تھا:

"اگر روشن خیال اور نئے تعلیم یافتہ مہذب ہندو مسلمان لڑکے اور لڑکیاں شادی کرنا چاہیں تو انھیں سول میرج کا حق ہونا چاہیے۔"

جب مسلمان ممبر قانون نے ان کو توجہ دلائی، ایسی شادیاں قرآن کے خلاف ہیں تو مسٹر جناح نے کہا:

"یہ کوئی دلیل نہیں، قرآن کے خلاف قانون پاس ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

مسٹر جناح نے یہاں تک کہا کہ

"مسلمانوں کی اکثریت بھی میرے خلاف ہے، مگر اکثریت کا کسی بات پر اتفاق کر لینا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ بات حق ہے۔"

حضرت مولانا نے جب تاریخ وار سرکاری رپورٹوں سے حوالے دیے تو عام مسلمان اپنی انگلیاں چبانے لگے۔

سیاسی غلطی:

حضرت نے فرمایا:

"مسلم لیگ اور مسٹر جناح کی تاریخ مذہبی اور سیاسی غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ انھوں ۱۹۱۶ء میں مسلم اقلیت کے صوبوں کو مسلم اکثریت کے صوبوں پر قربان کیا اور اب اقلیت کے صوبوں کے تین کروڑ مسلمانوں کو اکثریت کے اصولوں کے لیے موت کے گھاٹ پر پہنچایا جا رہا ہے۔ یہی مسلم لیگی تھے، جنھوں نے گول میز کانفرنس میں اقلیتوں سے معاملہ کر کے بنگال کو یورپین پارٹی کے ہاتھ میں دے دیا اور پنجاب کے مسلمان اکثریت کو مجبور کر دیا کہ وہ غیر مسلم اقلیت سے مل کر حکومت کا کاروبار کرے۔ اگر آج اسلامی ہند کے بڑے صوبوں میں خالص مسلم اکثریت مفقود ہے اور مسلمان اقتدار سے محروم ہیں تو یہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی سیاسی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ وہ جماعت جو بار بار غلطیاں کر چکی ہے آج پھر ایک بڑی غلطی پر اصرار کر رہی ہے۔ وہ لوگ جو پاکستان کے نعرے سے غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں اور اسلام اور اسلامی حکومت کے دعوے کرتے ہیں انھیں مسٹر جناح کا یہ اعلان

اپنے سامنے رکھنا چاہیے کہ

”مسلم لیگ سیاسی جماعت ہے اور پاکستان میں موجودہ طرز کی جمہوری حکومت ہوگی۔“

جس میں ہندو قریب قریب برابر کی آبادی رکھیں گے۔ اس اسلامی حکومت میں کم و بیش مسلمانوں کے برابر ہندوؤں کا اقتدار ہوگا اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے وہی اتحاد و تعاون اور اشتراک عمل کرنا پڑے گا جس سے پاکستان کے حامی دامن بچار ہے ہیں۔“

حضرت مولانا نے فرمایا:

”اس مرتبہ جمعیت علماے ہند کا مسلم پارلیمنٹری بورڈ اپنی ذمے داری پر ایسے لوگوں کو اسمبلیوں اور کونسلوں میں بھیجے گا جو آزاد ہندوستان کے لیے جدو جہد کریں گے، جس میں مسلمانوں کے صوبے مکمل آزاد ریاستوں کی صورت میں اپنی قسمت کے مالک ہوں گے اور سیاسی اشتراک عمل کی بنیاد پر ترقی کریں گے۔ مرکز معمولی اختیارات کا مالک ہوگا۔ اس پر بھی صوبوں کو حق علاحدگی حاصل ہوگا۔ یہ لوگ کوئی ایسا قانون پاس نہیں کر سکیں گے جو اسلام اور اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔

یہ ہے اصلی صورت حال، اگر آپ نے اس کے بعد بھی مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دیا تو آپ ایسے غلط کار لوگوں کو ووٹ دیں گے جو اپنی ذات کے علاوہ کسی کے نمایندہ نہیں! ہم نے پیغام پہنچادیا۔ اب عمل کرنا اور دنیا و آخرت کی جواب دہی کا خیال رکھنا آپ کا فرض ہے۔“ (زمزم- لاہور: ۷ر نومبر ۱۹۴۵ء)

سنجیدہ سوال:

مندرجۂ بالا عنوان سے زمزم- لاہور نے ایک شذرہ لکھا ہے، جس میں مسٹر محمد علی جناح سے ایک سوال کیا گیا ہے، ادارہ لکھتا ہے:

”قاید اعظم مسٹر جناح نے سندھ مسلم لیگ کے صدر مسٹر (جی ایم) سید کے رویے پر اظہار ناراضگی کرتے ہوئے کہا:

”مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے فیصلے کے خلاف کسی قسم کی بغاوت ڈسپلن کے تمام

بنیادی اصولوں کے منافی اور مسلم لیگ کے آئین کی مخالفت کے مرادف
ہوگی۔"

بات بالکل صحیح ہے کہ مسٹر سید کو لیگ کا ممبر رہتے ہوئے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے احکام کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ مسٹر سید لیگ کے دایرے سے باہر ہو کر تو حق رکھتے ہیں کہ سرے سے لیگ ہی کی مخالفت کر ڈالیں لیکن لیگ کے اندر رہتے ہوئے انھیں لیگ سے بغاوت کر کے دین قیم کے بنیادی اصولوں سے انحراف کریں اور اسلام کے ڈسپلن کو توڑیں؟ مسلم لیگ کے ڈسپلن کو توڑنا خدا کو پسند نہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ لیگ کا کوئی ممبر بغاوت نہ کرتے خدا چاہتا ہے کہ آپ جو اسلام کے ممبر ہیں اسلام سے بغاوت نہ کریں۔ اگر آپ اسلام کو قبول کرتے ہوئے اور اسلام کے دایرے میں رہتے ہوئے اسلام کے مرکزی احکام (نماز، روزہ، حج وغیرہ) کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں تو مسٹر سید سے یہ کہنا دیانت داری کی کون سی قسم ہے کہ "مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے فیصلے کے خلاف کسی قسم کی بغاوت ڈسپلن کے تمام بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔" لیگ سے شیفتگی کا یہ عالم کہ کسی لیگی کو بغاوت کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے اور اسلام سے محبت کی یہ حالت کہ اپنی پوری زندگی اسلام کی بغاوت میں گزر رہی ہے! (شذرہ، زمزم-لاہور، ۳؍نومبر ۱۹۴۵ء)

انڈین نیشنل آرمی پر مقدمہ چلایا جائے!

۱۳؍نومبر ۱۹۴۵ء: سرفیروز خان نون نے ڈیفنس منسٹر کی حیثیت سے وایسرائے کو یہ مشورہ دیا کہ انڈین نیشنل آرمی پر مقدمہ چلایا جائے ورنہ پنجاب اور دیگر صوبہ جات میں بغاوت ہو جائے گی۔

(سیٹھ سدرش لیڈر پنجاب اسمبلی پارٹی، روزنامہ وطن: ۱۳؍نومبر ۱۹۴۵ء، ص ۱، کالم ۵)

یہ انکشاف وایسرائے کی اگزیکیٹو کونسل کے ممبر کے بتانے پر ہوا، جس کے لیے سیٹھ صاحب اور وہ ممبر دونوں ہندوستان کے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ اس الزام کو شایع ہوئے ایک ہفتے کے قریب ہوتا ہے لیکن سرفیروز خان کی جانب سے اس کی کوئی تردید شایع نہیں ہوئی، اس لیے ان لوگوں پر جو انڈین نیشنل آرمی سے ہمدردی رکھتے ہیں اور جو انڈین آرمی

کے سپاہیوں اور آفیسروں کے متعلقین ہیں سر نون کی اس اسلامی خدمت کا علم ہونے کے بعد ان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے مسلم لیگ کے محب اسلام مجاہد آزادی کو ضرور ووٹ دے کر اسمبلی میں بھیجیں تاکہ پھر یہ ممبر بن کر ایسی ہی قابل رشک خدمات انجام دیں۔ ارشادات عالیہ کا انتظار ہے کہ وہ اس اسلامی خدمت پر کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو پنجابی اپنے اس نایٹ کو اس طرح یاد رکھیں گے جس طرح سر مائیکل اڈویر کو یاد رکھتے ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ سر نون کا ریکارڈ شاندار رہتا ہے یا سر مائیکل کا۔

(حریت-دہلی: ۱۵ر نومبر ۱۹۴۵ء)

جناح صاحب کے لیے صلۂ خدمات:

۱۹ر نومبر ۱۹۴۵ء: ۱۹ر نومبر (۱۹۴۵ء) کو اخبار ''انصاری'' اور ۲۰ر نومبر کو ''تیج'' دہلی نے یہ خبر دی کہ مسٹر جناح کو نظام حیدر آباد کی معرفت برٹش کی طرف سے چھ لاکھ رُپے سالانہ ملتا ہے۔ اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب انکم ٹیکس کے افسران نے جناح کے حساب میں ۲۰ لاکھ رُپے کا اضافہ غیر معلوم طور پر موجود پایا۔

(مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈایری: ص ۳۷۴)

جمعیت علماے اسلام بہ مقابلہ جمعیت علماے ہند:

۲۳ر نومبر ۱۹۴۵ء: جمعیت علماے ہند کے مقابلے میں جمعیت علماے اسلام قایم کرائی گئی تو اس کا اعتماد پیدا کرنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کیے گئے اور کیا کیا افترا پردازیاں عمل میں لائی گئیں، اس کا کچھ اندازہ مولانا محمد کفیل اور مولانا عبدالرؤف (دانا پوری) کی اس مکاتبت سے ہوتا ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:

محترم المقام حضرت مولانا دام اللہ فضلکم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ مزاج شریف

باعث تصدیعہ یہ امر ہے کہ مجھے کل ایک صاحب نے جمعیت علماے اسلام کلکتہ کی طرف سے مطبوعہ دو ورقہ دکھایا جو کہ آں جناب کے اور مولانا محمد قریش صاحب ناظم جمعیت علماے اسلام کلکتہ کے دستخطوں سے شایع کیا گیا ہے۔ اس قرطاس میں عبارت ذیل مرقوم ہے:

''افسوس ہے کہ دہلی کی نام نہاد جمعیت علما کچھ عرصے سے اُمت سے منقطع ہوگئی ہے اور نہ صرف جمہور امت بلکہ علمائے حق کے اصول مسلمہ کے خلاف حقیقی اسلامی نصب العین سے منحرف ہوکر ہندو کانگریس کی قومیت متحدہ واشتراکیت کی جاہلیت جدیدہ کی حمایت کررہی ہے۔

جمعیت علما کانگریس علانیہ روسی دہریت وزندقہ اور کانگریسی الحاد وضلالت کی تبلیغ و تائید کررہی ہے۔ ایک کافر مشرک ہندو کو اپنا سیاسی لیڈر مان چکی ہے۔ جمعیت کا صدر کانگریسی مہاتما کی قیادت میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا رکن بن چکا ہے اور یہ جمعیت دین و ملّت کو قربان کرکے ہنود کی سیاست کی پیروی کررہی ہے۔''

سطور مذکورۃ الصدر کو پڑھنے کے بعد ہر شخص یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند جس کے صدر مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ہیں، وہ معاذ اللہ! مرتد ہوچکے ہیں۔ اس کے صدر اور تمام اراکین مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا محمد طیب صاحب وغیرہ وغیرہ دین اسلام سے خارج ہیں۔ آں جناب میرے نزدیک محترم ہستی اور ذی علم شخصیت ہیں، مجھے یقین نہیں آتا کہ آں جناب نے یہ فتویٰ دیا ہو؟ کیا میرا یہ خیال صحیح ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر بلا خوف لومتہ لائم اپنی برأت کا اعلان فرمادیں اور اگر فی الواقع یہ آپ کا فتویٰ ہے تو کیا یہ تمام بزرگانِ دین اور جملہ اراکین اور لاکھوں مسلمان جو جمعیت علمائے ہند کی پالیسی سے اتفاق رکھتے ہیں ملحد اور زندیق ہیں؟ آپ کی نظر میں امت مسلمہ کے اندر اپنا کوئی مقام نہیں رکھتے؟

خادم العلماء
محمد کفیل عفی عنہ

جواب

مولانا مدظلہ!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

جناب کو معلوم ہے کہ چار پانچ مہینے پر (کے بعد) مکان سے آیا ہوں، نئی جمعیت کے کاموں کا ابھی مجھے بالکل علم نہیں۔ جناب مولانا حسین احمد صاحب، مفتی کفایت اللہ

صاحب جناب مولوی محمد طیب صاحب وغیرہ کی شان میں ہرگز میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا۔ ان حضرات کی رائے سے مجھے کچھ اختلاف ہے، مگر میں ان حضرات کو علم اور تقویٰ کے اعتبار سے بہت ہی بلند سمجھتا ہوں۔ میری کیا مجال ہے کہ نعوذ باللہ ان حضرات کے خلاف کفر کا فتویٰ دے سکوں، جس مضمون کا آپ نے تذکرہ کیا ہے اس کو دیکھ لوں تو کچھ عرض کر سکوں گا۔

عبدالرؤف عفی عنہ

(زمزم-لاہور: ۲۳ نومبر ۱۹۴۵ء، ص ۵)

حسین احمد

زحمتنرہ صادقی نظام آبادی اعظمی

فدائے قوم و ملت ہے اسیرِ مالٹا تو ہے
ہمارا رہنما تو ہے ہمارا پیشوا تو ہے
نہاں گنجینۂ علم و عمل ہے تیرے سینے میں
دیا ہے درس قال اللہ مدت تک مدینے میں
حسین احمد ترا ایثار عالم آشکارا ہے
ستم گاروں کا دشمن، بے کسوں کا تو سہارا ہے
ہے چرچا تیرے استقلال کا ہفت آسمانوں میں
برائے قوم تکلیفیں اٹھائیں قید خانوں میں
مقدس تیری ہستی، سب سے اعلیٰ تیری شخصیت
تعال اللہ ترا صبر و تحمل، ہمت و جرأت
فدائے قوم شیدائے وطن، ملت کا دیوانہ
تجھے [illegible] دنیا شمع آزادی کا پروانہ
مبارک ہو تجھے اے قوم! ایسا رہبرِ کامل
دکھائے گا یہی راہیں بتائے گا یہی منزل

(زمزم-لاہور: ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء)

حضرت حکیم الامت تھانویؒ پر بہتان:

اس الیکشن کے دور پرفتن میں طرح طرح کے بہتان حضرات علمائے کرام پر باندھے جارہے ہیں۔ من جملہ ان کے ایک بہتان حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ پر لگایا جارہا ہے۔ وہ بہتان یہ ہے:

''کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور حضور پاک کے ساتھ محمد علی جناح کو بھی دیکھا۔''

لیگی حضرات اس بہتان کو اپنی تقریروں میں بڑے فخر سے بیان کرتے پھرتے ہیں۔ اور اخبار ''انقلاب'' میں بھی یہ بہتان شایع کیا گیا۔ چاہیے تو یہ تھا اس بہتان کی تردید تھانہ بھون سے شایع ہوتی، مگر ان تمام پر ایک سکوت کا عالم طاری ہے۔ اگر کانگریس کے خلاف کوئی مضمون شایع کرنا ہو، تو درجنوں کے درجن فتاوے شایع کیے جاتے ہیں۔

(۱) اس فقیر نے اس خواب (بہتان) کے متعلق حضرت مولانا خیر محمد صاحب (مہتمم مدرسۂ عربی خیر المدارس جالندھر شہر) اور صوفی کامل حضرت مولانا عبدالجبار صاحب ابوہی (مبلغ دارالعلوم دیوبند) سے دریافت کیا۔ یہ دونوں حضرات حکم الامت تھانویؒ کے بڑے خلفا میں سے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب نے فرمایا کہ میں نے اس خواب کے متعلق حضرت تھانویؒ سے ان کی حیات مبارک ہی میں سوال کیا تھا، حضرت مرحوم سنتے ہی لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھنے لگے۔ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری نے بھی تردید کی۔

(۲) دوسرا بہتان لیگی اخبار یہ کرتے ہیں کہ مولوی ظفر احمد صاحب تھانوی کے ساتھ ''خلیفہ حضرت حکیم الامت'' لکھتے ہیں۔ حال آں کہ حضرت تھانویؒ نے اپنی حیات ہی میں، ان سے ان کی بعض حرکات کی بنا پر خلافت چھین لی تھی۔ تتمہ اشرف السوانح میں خلفا کے نام شایع کیے گئے ہیں اور ان کے اوپر ایک نوٹ بھی تحریر کیا گیا ہے۔ ''ان شایع کردہ خلفا کے علاوہ جو کوئی بھی خلافت دعویٰ کرے غلط ہے۔

آپ حضرات تتمہ اشرف السوانح کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ حال ہی میں مولانا خیر محمد صاحب جالندھری نے ایک بنگال کے آدمی کے نام خط تحریر کیا ہے، جس میں تحریر فرماتے ہیں کہ مولوی ظفر احمد صاحب سے حضرت حکیم الامت نے خلافت چھین لی تھی۔ جو لوگ

علمائے کرام پر بہتان باندھتے ہیں خداوند کریم ان کو ہدایت فرمائے۔

(از طفیل احمد جالندھری، زمزم۔لاہور: ۳۰ر نومبر ۱۹۴۵ء)

علمائے تھانہ بھون کی تردید:

انتخابات کے دنوں میں جہاں اور بہت کچھ ہوا وہاں غلط افواہوں نے بھی جنم لیا مولانا ظفر احمد تھانوی نے یہ بات ہر جگہ بیان کی کہ

''حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے خواب میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور ان کے ساتھ قاید اعظم محمد علی جناح بھی کھڑے تھے۔''

اس خواب کے چرچے لیگی حضرات ہر جگہ جلسوں میں کرنے لگے، یہاں تک کہ لیگی اخبارات نے بھی اسے شایع کر دیا۔ اس پر جالندھر کے ایک شخص محمد طفیل نامی نے حضرت تھانوی مدظلہ تعالیٰ کو تھانہ بھون خط لکھا کہ آیا اس خواب کی کوئی حقیقت ہے؟ اس خط کا جواب تو نہ آیا، البتہ مولانا عبدالجبار ابوہری اور مولانا خیر محمد مہتمم مدرسۂ خیر المدارس جالندھر (یہ دونوں حضرات حضرت تھانوی مدظلہ العالی کے بڑے خلفا سے ہیں) نے کہا کہ

''ہم نے حضرت تھانوی مدظلہ العالی سے جب اس خواب کی حقیقت دریافت کی تو حضرت سنتے ہی لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھنے لگے۔''

حضرت ابوہری نے اس بات کی تردید کی کہ مولانا ظفر احمد تھانوی حضرت حکیم الامت کے خلیفہ ہیں۔ حضرتؒ نے ان کی کسی حرکت پر ان سے یہ منصب چھین لیا تھا۔

(سہ روزہ ''زمزم''۔لاہور: ۳۰ر نومبر ۱۹۴۵ء، بہ حوالہ کاروان احرار: ج ٦)

بنگال کا قحط اور مسلم لیگی وزرا

مسلم لیگ کے عہد وزارت میں

بنگال کے الم ناک قحط کے متعلق چند معلومات

پوسٹر مسٹر عزیز الرحمٰن سابق مسلم لیگی:

شہید سہروردی کے پاس بینک میں ۳۱/ مارچ ۱۹۴۳ء میں دس ہزار رُپے تھے اور ۱۹۴۵ء میں ۳۱/ مارچ کو ۴ کروڑ رُپے ہو گئے۔

خواجہ شہاب الدین کے پاس ۳۱/ مارچ ۱۹۴۳ء میں پانچ ہزار رُپیہ تھا مگر ۳۱/ مارچ ۱۹۴۵ء میں ۳ کروڑ ہو گیا۔

خواجہ شہاب الدین (وزیر تجارت)، شہید سہروردی (وزیر سپلائی)، سر ناظم الدین (وزیر اعظم)، حمید الحق چودھری (کنٹریکٹر) راندا پرشاد (بینکنگ ایجنٹ) نے ایام وزارت میں نراین گنج میں ڈیویڈ کمپنی کو خریدا۔ (اخبار نیشنلسٹ، کلکتہ۔ ۲/ دسمبر ۱۹۴۵ء)

سپلائی آفس ایڈیشنل ڈائریکٹر ٹیکسٹائل:

تمام صوبۂ بنگال میں کپڑوں کی تقسیم کے لیے بیس آدمیوں کو سہروردی نے ایجنٹ بنایا، جن میں دو مسلمان، دو بنگالی ہندو، سولہ مارواڑی تھے اور ضلع وار تقسیم کے لیے چار آدمیوں کو ایجنٹ بنایا، جن میں ایک مسلمان، دو مارواڑی، ایک بنگالی تھا۔

مسٹر جی ایم سید کا بیان:

کراچی۔ ۲۷/ دسمبر ۱۹۴۵ء: مسٹر جی ایم سید نے حسب ذیل بیان جاری کیا ہے:

آخر نہ ٹلنے والی گھڑی آ ہی گئی۔ مسلم لیگ کی رجعت پسندانہ قیادت کے متعلق میرا

انتہائی خوف مادی مشکل میں نمودار ہوگیا۔ سندھ اسمبلی کے لیے مسلم لیگ سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ نے امیدواروں کی جو فہرست تیار کی ہے اس میں سے سندھ مسلم لیگ کے ترقی پسند عناصر کو کلیتًا خارج کر دیا گیا ہے۔ سب سے آخری حربہ جو استعمال میں لایا گیا یہ تھا کہ جو ٹکٹ میرے چار احباب کو دیے گئے تھے وہ واپس لے لیے گئے۔ ٹکٹوں کی یہ واپسی کھلے طور پر اس عہد کے خلاف ورزی ہے جو نوابزادہ لیاقت علی خاں صدر سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ اور قاضی عیسیٰ ممبر مجلس عمل آل انڈیا مسلم لیگ نے مجھ سے کیا تھا کہ ان چاروں ممبروں میں سے کسی کے خلاف ان پر عاید کردہ الزامات کی بنا پر کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ ٹکٹ کی واپسی کا یہ معاملہ میری غیوبت (غیر حاضری) میں عمل میں آیا، جب کہ میں مذکور الصدر دونوں حضرات کے اس وعدے پر یقین کر کے کہ میری حسب منشا فیصلہ ہوگا ۱۹؍دسمبر کو کراچی سے باہر چلا گیا تھا۔ باوجود اس علم اور یقین کے کہ سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ نے جو نامزدگیاں کی تھیں وہ ان لوگوں کی خواہشات کی آئینہ دار تھیں، جنھوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے مسلم لیگ کی اجارہ داری پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میں مذکورہ بالا سمجھوتے کی بنیاد پر جو مجھ سے اور مذکور الصدر دونوں حضرات کے ساتھ ہوا تھا ان کے دوش بہ دوش چلنے پر راضی تھا۔ میں یہ امید کرتا تھا کہ میرا یہ طرز عمل لیگ کے شیرازے میں اتحاد کا باعث ہوگا لیکن وقت ہاتھ سے نکل جانے پر مجھے یہ معلوم ہوا کہ مجھے دھوکا دیا گیا تھا اور منسوخ کردہ ٹکٹ ایک افراد کو دیے جا چکے تھے، جن میں سے بعض تو لیگ کے ممبر بھی نہ تھے اور بعض نے لیگ ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے درخواست تک نہیں دی تھی۔

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا:

میرے مسلمان بھائیوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے اختلافات کی کہانی کیا تھی؟ یہ سب کو معلوم ہے کہ میں لیگ میں شامل ہونے سے پہلے کانگریسی تھا۔ کانگریس سے میری علاحدگی کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس صوبہ سندھ کے وقتی اور مقامی معاملات میں اپنی آل انڈیا پالیسی پر عمل کرتی تھی اور اس پالیسی کو صوبہ سندھ کی بہبودی پر مقدم سمجھتی تھی اور اسی اصول کی بنا پر لوکل آزادی میں دخل انداز ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اور میرے ساتھیوں

نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ اس امید پر کہ خود غرض لوگوں کی دست برد سے سندھ کے عوام کو بچانے کا اس طریقے پر شاید بہتر موقع ہاتھ آئے۔ نیز آزاد ہندوستان میں آزاد پاکستان کا جذبہ پیدا کرنے میں شاید بہتر کامیابی ہو۔

ہم نے لیگ کے لیے خون پسینہ ایک کر دیا۔ ہم نے لیگ کے بہترین اغراض کے لیے تمام وہ بہترین چیزیں قربان کر دیں جو ہمارے قبضہ و تصرف میں تھیں اور یہ سب ہم نے نہایت خوشی سے، رضامندی سے اور بغیر تیوریوں پر بل ڈالے ہوئے کیا۔ اگر ہمیں یقین ہو جاتا تھا کہ فلاں کام سے عوام کو فایدہ پہنچے گا تو ہم جدو جہد میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے، لیکن یہ سب خواب تھا، جس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہ تھی۔ ہمیں بہت دیر میں یہ احساس ہوا کہ ہم لوگوں کو عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر نہیں استعمال کیا جا رہا تھا بلکہ ہمیں جوتوں کے نیچے روندا جا رہا تھا، تاکہ ہم مسلمان امرا اور برطانوی شہنشاہیت کے مستند پٹھوؤں کی گرفت کو ڈھیلا نہ ہونے دیں۔ صرف اسی برطانوی شہنشاہیت کے نفع کے لیے ہمیں ہندوؤں کے ذاتی مفاد سے نجات دلائی گئی۔ یہ مثل ہم پر صادق آتی ہے کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا! بہ ہر حال عوام کے مفاد کو نظر انداز کیا گیا، جیسے کہ ان سے کسی کو تعلق ہی نہیں ہے۔

حقیقی اختلافات:

اب آیے حقیقی اختلافات کی جانب! عمل کی راہ اختیار کرنے میں سندھ کی پبلک کے مفاد کو ہمیں لیگ ہائی کمانڈ کی غیر مصرح اور متلون آل انڈیا پالیسی کے مقتضیات کے ماتحت رکھنا پڑتا ہے، جو کہ آج کل ان مسلمان لیڈروں کی خواہشات کے مطابق رہتی ہے جو مسلم اقلیت کے صوبوں کے باشندے ہیں۔ یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ وہ ہمیں ہندوؤں کے پنجے سے نجات دلا رہے ہیں ہمارے یہ احباب ہمیں حقیقتاً صاف طور سے اپنے پنجوں کی گرفت میں لے رہے ہیں اور مرکز میں اپنی لیڈری کی اجارہ داری کو بحال رکھنے کے لیے صرف یہی نہیں کہ وہ رجعت پسند عناصر کو صوبے میں تقویت پہنچاتے ہوں بلکہ وہ لوگ اس جماعت کا جز و بنے ہوئے ہیں جو مسلسل کچلے ہوئے عوام کو لوٹ رہی ہے اور اسی کی نگاہ میں عوام کی صرف اسی قدر حقیقت ہے کہ وہ عوام کو اپنا شکار سمجھتی ہے۔

مسلم لیگ کو پاک وصاف کرنے کی اور اسے ان عناصر سے چھٹکارا دلانے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے جو رشوت ستانی وغیرہ جیسے جرایم سے ملوث ہو کر صوبہ سندھ کو بدنام کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس رجعت پسند عناصر کو آگے بڑھانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا جاتا اور عوام کی خدمت کرنے کے بارے میں ہماری تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ ہمارے آدمیوں کی توجہات کو ان خامیوں کی جانب سے پھیرنے کے لیے انھوں نے زیادہ آسان طریقہ ایجاد کیا کہ ہندو فرقے کی مخالفت کے گیت گاؤ۔ کام کی اس نوعیت نے ہمیں مسلم عوام کی خدمت کے سلسلے میں بیکار محض بنا دیا ہے۔ نیز برطانیہ کے پنجے سے آزادی حاصل کرنے کے سلسلے میں ہمیں بے دست و پا کر دیا ہے، کیوں کہ کوئی نواب اور جاگیردار برطانیہ کی مخالفت کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا۔ دوسری طرف کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی چلی جارہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صرف ہندوستان ہی کے مفاد کو نقصان نہیں پہنچ رہا ہے بلکہ پاکستان کے مفاد کو بھی شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ نیز مشرق کی ان قوموں کو بھی شدید نقصان پہنچ رہا ہے جو آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔

غیر ترقی یافتہ طبقوں کی حفاظت کا نام لیتے ہوئے مسلم لیگ کے ذمے دار ارکان اس امر کے خواہش مند ہیں کہ صوبہ جاتی قانون ساز میں یقیناً ایسے رجعت پسند عناصر آنے چاہییں جو جہالت، لاعلمی اور خود غرضی میں طاق ہوں اور کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں ایسے ہی لوگ جائیں جو مسلسل عوام کو لوٹتے رہے ہوں۔ کیوں کہ ایسے لوگ سوائے ذاتی مفاد کے دستوری طور سے پبلک زندگی کے مسایل اور پالی ٹکس سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

جناح کی قلعی کھل گئی:

مسلم حق خود ارادیت کے نام سے ہمیں تمام ان چیزوں کو ہضم کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے جو خود غرضیوں کی تکمیل کے لیے مسلسل ذرایع مہیا کرتی ہیں۔ اگر ہم میں سے کوئی اپنی نحیف و کم زور آواز اُٹھانے کی جرأت کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا ہمیں ان سنہرے شرفا کے مفاد کی خاطر پاکستان کے حصول کے لیے مدعو کیا جاتا ہے جس میں پیشہ ور ٹوڈیوں کی فوج ہے اور جس کے عناصر ترکیبی خان بہادر، نواب بہادر، سر اور سردار ہیں تو ہمیں یہ حکم

دے کر خاموش کر دیا جاتا ہے کہ "سوئے ہوئے فتنوں کو بیدار نہ کرو اور جب تک ہم منزل مقصود تک نہ پہنچ جائیں غیر مناسب اقتصادی مسایل کو نہ چھیڑو، اگر کوئی شخص بنیادی مسایل اور بنیادی مطالبات کو اُٹھاتا ہے کہ اس مرحلے پر بھی یہ تعریف و تشریح ضروری ہے کہ پاکستان کے ماتحت نفع اُٹھانے والے کون ہوں گے تو اسے نہایت تند لہجے میں یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا ہے کہ "یہ اسلام کا دشمن ہے۔"

لیگ میں جو امرا کا طبقہ ہے وہ بہت ہوشیار ہے۔ اگر ان کی ذاتی خواہشات کا اقتضا ہوگا تو وہ صدر مسلم لیگ صوبۂ سندھ کو بھی نہیں بخشیں گے۔ اگر اس نے بے احتیاطی سے کھلے طور پر اس طبقے کے مفاد کا خیال کیا ہوگا جس کے پاس زمینیں نہیں ہیں، کوئی فاسٹ نظام کا طریقہ ان کے لیے شرم ناک نہیں ہے، اگر وہ اس کے ذریعے اپنے مخالف کو شکست دے سکیں! ایسے ہی لوگوں کی نسبت ہم سے کہا جاتا ہے کہ ان پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرو اور انھیں پر اعتماد کرو۔

موجودہ صورت حالات میں مجھے چار و ناچار حسب ذیل فیصلہ کرنا پڑا:

(۱) اس ٹکٹ کو واپس کر دوں جو مجھے دیا گیا ہے، تا کہ مخالفین کو موقع مل جائے کہ وہ جو مناسب سمجھیں کارروائی کریں۔ انھوں نے اپنے کچھ گماشتوں کو اس بات پر تیار کر لیا ہے کہ وہ میرے خلاف کام کریں۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ راہ میں کسی طرح روڑا اٹکاؤں۔

(۲) آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور مجلس عمل کی ممبری سے استعفا دے دوں نیز یہ کہ جب تک موجودہ رجعت پسند لیڈری کا قبضہ مرکز پر ہے سندھ کی صوبائی مسلم لیگ بہ حیثیت ایک آزاد جماعت کے کام کرے گی اور اسے حق ہوگا کہ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ جو ٹکٹ دے اسے منظور کرے یا واپس دے دے، اس کی بجائے کسی دوسرے کو ٹکٹ دے۔ یا سندھ مسلم لیگ کونسل کی پاس کردہ تجویز کے ماتحت سندھ پراونشل مسلم لیگ کی جانب سے نمایندے کھڑے کرے۔ (ایسوسی ایٹڈ پریس)

(روزنامہ "امرت بازار پترکا": ۲۸ر دسمبر ۱۹۴۵ء)

نظریاتی مملکت؟

آدمی کوئی کام کرتا ہے تو اس کے ذہن میں اس کام کی ضرورت اور اہمیت کا ایک تصور

ضرور ہوتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تحریک پاکستان کے رہنماؤں کے ذہن اس قسم کے تصور سے خالی ہوں۔ بس ان کے ذہن میں قیام پاکستان کی جو ضرورت اور اہمیت تھی وہی نظریہ پاکستان تھا اور یہی بنیاد پاکستان کے نظریاتی مملکت ہونے کی ہے، لیکن یہ بات کہ پاکستان دنیا کی واحد اسلامی نظریاتی مملکت ہے یا روس اور اسرائیل غیر اسلامی نظریاتی مملکتیں ہیں، درست نہیں۔ دنیا کی ہر مملکت نظریاتی مملکت ہوتی ہے، خواہ اس کے سامنے قرار داد مقاصد جیسی کوئی دستاویز اور دستور میں کسی نظریے پر مبنی کوئی دفعہ موجود نہ ہو۔ پاکستان اگر نظریاتی مملکت ہے تو کیا اسے قرار داد مقاصد نے نظریاتی مملکت بنایا ہے؟ جس کی کوئی قانونی اور دستور سازی میں مؤثر حیثیت ہی نہیں۔ ایک ایسی مقدس دستاویز جو پارلیمنٹ کو کسی قانون سازی پر مجبور نہ کر سکتی ہو، جس کی بنیاد پر پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے کسی قانون کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ پارلیمنٹ کا ایک بل اس کی اس مقدس حیثیت کو پامال اور اس کے وجود کو ختم کر سکتا ہے۔ پھر اگر کسی دستاویز کی بنیاد پر کوئی ملک ایک نظریاتی مملکت بن جاتی ہے اور اس کی کوئی مقدس حیثیت ہو جاتی ہے تو اس کے شرف کے لیے یہ بات بس کرتی ہے۔ اسے روس یا اسرائیل کی مملکتوں سے مماثل قرار دینا اور ان سے ہم ردیف کرنا تو اس کے تقدس کے خلاف ہے۔

۱۵ر فروری ۱۹۴۶ء:

مولانا عبدالرحیم صاحب حوالدار کٹھور ضلع سورت کے نام حضرت شیخ الاسلامؒ نے ایک خط میں یہ تحریر فرمایا ہے۔ لیگیوں کی جانب سے حضرت کے خلاف جو افسوس ناک اور توہین آمیز واقعات پیش آ رہے تھے اسی پس منظر میں مولانا عبدالرحیم صاحب نے خط لکھا تھا، حضرت نے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا اس کے بعد حضرت کے مقامِ فنافی اللہ کے بارے کیا کہا جا سکتا ہے؟

۱۳ر ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ: اگر میں حق پر ہوں اور مخلصانہ مذہبی اور اسلامی خدمات کر رہا ہوں تو غیروں اور اپنوں سے جو کچھ بھی اذیتیں پیش آئیں یا آ رہی ہیں ان کے لیے اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے احوال اور اعمال مشعل راہ ہیں۔ جو جو مصایب انبیاے کرام اور اولیاے عظام اور مقدس علما کو پیش آئے ہیں، ان کے سامنے ہمارے مصایب تو وہ بھی

نسبت نہیں رکھتے جو ذرّے کو پہاڑ سے ہے۔ پھر اس پر کبیدگی اور قلق کیوں ہے: "اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل" سے تو بشارت حاصل ہوتی ہے، جس سے قبولیت عنداللہ کا پتا چلتا ہے۔

اور اگر خدانخواستہ میں غلط راستے پر ہوں اور معاذ اللہ ضلال اور گم راہی میں پھنسا ہوا ہوں تو اس کا مستحق ہی ہوں۔

اللهم انی اعوذبك من ان اَضلَ او اُضلَ و اَزِل و اُزلَّ و اَجهَل و یُجهد علَی. آمین

(الجمعیۃ-دہلی (شیخ الاسلام نمبر ۱۹۵۸ء): ص ۱۶۷)

غذائی مسئلے پر مسٹر جناح کا بیان:

نئی دہلی۔ ۱۹/ مارچ ۱۹۴۶ء: آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح نے آج ایک صحافتی ملاقات میں کہا کہ غذائی مسئلے پر غور کرتے وقت جماعتی سیاست کے سوال کو نہیں اُٹھانا چاہیے............ جہاں تک غذائی صورت حال کا تعلق اس کے سلسلے میں سیاسی مسئلوں کو نہ اُٹھانا چاہیے اور نہ اس میں جماعتی سیاست کو کوئی دخل ہونا چاہیے......... میں نے شروع ہی سے اس مسئلے کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے اور وایسرائے اور حکومت ہند کو اپنا پورا پورا اشتراک عمل پیش کیا ہے۔ ہم اپنے ہم وطنوں کی جانیں بچانے کے لیے جو بھی امداد دے سکتے ہیں، دیں گے۔ (قومی آواز: ۲۱/ مارچ ۱۹۴۶ء و امرت بازار پترکا: ۲۱/ مارچ ۱۹۴۶ء)

وڈہیڈ کمیشن رپورٹ ص ۸۳:

اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ رقم جو ۱۹۴۳ء میں چاول کی خرید و فروخت میں غیر معمولی منافع کے ذریعے حاصل کی گئی ایک ارب پچاس کروڑ رُپے ہیں، اسی طرح قحط میں مرنے والے ہر انسان کے مقابلے میں اندازاً ایک ہزار رُپے زاید منافع کمایا گیا۔

مولانا آزاد کا زلزلہ افگن بیان:

۲/ اپریل ۱۹۴۶ء: مولانا آزاد نے کلکتہ سے ۲/ اپریل کو ایک بیان دیا تھا، اس میں علی

الاعلان یہ الزام لگایا تھا کہ ہندوستان کی چاروں سرحدوں کے اندر پورے ہندوستان کے سرکاری افسر لیگ کی دوستی اور جانب داری کا دم بھر رہے تھے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایک غیر ملکی حکومت کے حکام محض اسلام اور مسلمانوں کے فایدے کے لیے لیگ کی حمایت پر مجبور ہوئے، حتیٰ کہ سرحد کے گورنر نے ایک نواب کو کانگریس کے مقابلے کے لیے لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہونے کے لیے زور دیا۔ گورنر نے تردید کی مگر مولانا آزاد نے دوبارہ اس کو چیلنج دیا ہے اور اپنا بیان واپس لینے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد ۴/اپریل ۱۹۴۶ء کو مولانا ابوالکلام نے ایک دوسرے بیان میں کہا کہ بنگال کے انتخابات لیگ کی حرکتوں اور سرکاری حکام کی چشم پوشی اور عملی کارروائیوں کی وجہ سے محض ایک مذاق ہو کر رہ گئے ہیں۔

اپنے دعوے کی تائید میں مولانا آزاد نے نمونے کے طور پر چند واقعات پیش کیے ہیں، جن میں امیدواروں کے اغوا سے لے کر ووٹروں کے خلاف تشدد تک کے واقعات شامل ہیں۔

مولانا نے کہا کہ لیگ نے اَن پڑھ پیروں اور ملاؤں کی سرپرستی حاصل کر کے لیگ کے خلاف ووٹ دینے والوں کو عذاب الٰہی کی دھمکیاں دیں۔

سرکاری حکام کی لیگ نوازی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا:

''ان کا طرزِ عمل ایسا تھا کہ الیکشن کے نتایج پر بھی شبہ ہوتا ہے اور اسی بنا پر یہ الزامات لگائے جا رہے ہیں کہ بہت سے مقامات پر ووٹ کے بکسوں میں دست اندازی کی گئی ہے۔

بنگال کے انتخابات کو دراصل عام معنوں میں انتخاب کہنا دشوار ہے۔ موجودہ زمانے کے انتخابات میں سیاسی جماعتیں اپنے رائے دہندگی کے حلقوں کے سامنے وہ متبادل پروگرام پیش کرتی ہیں جسے وہ مجالس قانون ساز میں چلانا چاہتی ہیں، لیکن بنگال کے انتخابات کی حیثیت اس سے زیادہ اس جہاد کی تھی جس میں بدترین قسم کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کیا گیا۔ بنگال میں ایسے بہت سے ناخواندہ اور نیم خواندہ پائے جاتے ہیں جو خاندانی وراثت کے بل پر پیر اور مذہبی پیشوا بن بیٹھے ہیں۔ ان میں اکثر عربی کی ایک سطر بھی نہیں پڑھ سکتے اور اسلام کے مذہبی ادب سے بالکل نابلد ہیں۔ اس کے باوجود صوبے کے مختلف

حصوں بالخصوص مشرقی علاقوں میں ان کے بہت سے ماننے والے ہیں، جن کی جہالت اور سادہ لوحی سے فایدہ اُٹھا کر یہ لوگ اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھتے ہیں۔

لیگ نے مذہبی جنون کو اتنے بڑے پیمانے پر بیدار کرنے کے لیے جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، ان لوگوں کی امداد حاصل کر لی اور انتخابات میں کوئی سیاسی مسئلہ اُٹھانے یا اس پر بحث کرنے کے بجائے اس کو ایک مذہبی جنگ بنا دیا گیا۔

فتوؤں کے ذریعے اعلان کر دیا گیا کہ لیگ کو ووٹ دینا اسلام کو ووٹ دینا ہے اور لیگ کے خلاف ووٹ دینا دائمی عذاب کو دعوت دینا ہے۔ غیر لیگی امیدواروں کو کافر اور مرتد قرار دے دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو ہندوستان میں اسلام ختم ہو جائے گا اور مولویوں کے زبانی وعظ فتووں کے حدود سے بھی آگے نکل گئے۔''

حکام کی سازش:

انتہائی زہریلی قسم کی مذہبی لعنت ملامت کے ساتھ ساتھ جسمانی تشدد بھی اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ انتخابات کے دوران میں امن و نظم قایم رکھنے میں حکومت کی ناکامی اتنی نمایاں تھی کہ اس پر ایک سازش کا شبہ ہوتا ہے۔ میں انتخابات کے سلسلے میں لیگ کی حمایت میں سرکاری حکام کی بین صوبہ جاتی سازش کا پہلے بھی تذکرہ کر چکا ہوں۔ بنگال میں سازش بالکل کھلی ہوئی تھی۔ بہت سے واقعات میں حکام نے کھلم کھلا لیگ کی حمایت کی۔

مجھے ذمے دار پبلک کارکنوں نے جن کی صداقت پر شبہ کرنے کی مجھے کوئی وجہ نہیں ہے، بتایا ہے کہ مسلم حکام کی اکثریت نے ایسی روش اختیار کر رکھی تھی کہ یہ تمیز کرنا دشوار تھا کہ یہ لوگ سرکاری ملازم ہیں یا لیگ کے کارندے۔ چھوٹے درجے کے افسروں نے جب یہ دیکھا کہ اعلا حکام ان کی سرگرمیوں پر کوئی توجہ نہیں دیتے تو ان کی ہمت و جرأت اور بڑھ گئی۔

مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر اس معاملے کی تحقیقات کرنے کے لیے ایک غیر جانب دار عدالت مقرر کی جائے تو بڑے چھوٹے بہت سے افسروں کی انتہائی جانب داری، پاس داری، دخل اندازی اور فرایض سے کوتاہی کے بہت سے واقعات سامنے آ جائیں گے۔

ان کا طرزِ عمل ایسا تھا کہ الیکشن کے نتایج پر بھی شبہ ہوتا ہے اور اسی بنا پر یہ الزامات لگائے جارہے ہیں کہ بہت سے مقامات پر ووٹ کے بکسوں میں دست اندازی کی گئی ہے۔

عذابِ الٰہی کی دہائی اور کھلم کھلا سرکاری پاس داری کے علاوہ لیگ نے انتخابات میں اپنی کامیابی کے لیے زیادہ تر دھمکی اور تشدد پر انحصار کیا۔ امیدواروں کو نقل وحمل کی آزادی سے جو انتخابی مہم میں ضروری ہے، محروم کردیا گیا۔ پولنگ بوتھ تشدد اور غنڈا گردی کے مرکز بن گئے۔ ووٹ کو راز میں نہیں دیا گیا۔ دوسرے فریقوں کے پولنگ ایجنٹوں کو کام نہیں کرنے دیا۔

دوسری جماعتوں کا ضبط:

غیر لیگی امیدواروں اور ان کے حامیوں کے گھروں کو آگ لگادی گئی۔ حملہ اور مار پیٹ کے لاتعداد واقعات پیش آئے۔ غیر لیگی امیدواروں کا جان و مال غیر محفوظ ہوگیا اور یہ سب اس وجہ سے نہیں ہوا کہ لیگ کو عوام کی کسی بڑی اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ دوسری جماعتوں نے اپنے ماننے والوں کو پرامن فضا قایم رکھنے کی سخت ہدایتیں کردی تھیں، لیکن دوسری جماعتوں کے ضبط کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ لیگ کے حمایتیوں کی غنڈا گردی اور تشدد میں مزید اضافہ ہوگیا۔

بنگال میں متعدد حلقے ایسے ہیں جہاں دوسری جماعتوں کو کافی تائید حاصل ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ان مقامات پر مسلم پارلیمنٹری بورڈ یا کرشک پرجا پارٹی کے امیدوار چاہتے تو وہ غنڈا گردی کا جواب دے سکتے تھے، لیکن انھوں نے عدمِ تشدد کی فضا قایم رکھی۔

جہاں جہاں غیر لیگی اُمیدواروں کے حامیوں نے بھی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور غنڈا گردی کا مقابلہ کیا جیسا کہ باریسال میں اور کھلنا، فرید پور، میمن سنگھ اور مرشد آباد کے بعض حصوں میں ہوا، وہاں غیر لیگی امیدوار زبردست اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ (مدینہ۔ بجنور، ۱۳؍اپریل ۱۹۴٦ء)

۱۹؍جون ۱۹۴٦ء: ۱۹؍جون کو مسٹر جناح نے ایک خفیہ خط وایسرائے کو لکھا کہ لیگ ہرگز برداشت نہیں کرے گی کہ عارضی حکومت میں کوئی غیر لیگی مسلمان شامل کیا جائے۔ یہ

ہمارا بنیادی اصول ہے، ہم اسے پس پشت نہیں ڈال سکتے۔

(مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈائری: ص ۲۸۰)

عارضی حکومت کی ذمے داریاں:

۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو نئی مرکزی حکومت کے چودہ ارکان میں سے سات نے حلف وفاداری اٹھایا۔ پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، بابو راجندر پرشاد، مسٹر آصف علی، سید علی ظہیر، مسٹر جگ جیون رام اور مسٹر سرت چندر بوس۔ اس کے ساتھ ہی وائسرائے کی صدارت میں نئی حکومت کا پہلا اجلاس ہوا۔

جب وائسرائے ہاؤس میں یہ کارروائی ہو رہی تھی باہر مسلم لیگ سے متعلق لوگوں نے مخالف نعرے لگائے، سیاہ جھنڈیاں لہرائیں، ان کے مخالف کانگریسیوں نے بھی ترنگے جھنڈے لہرائے اور حکومت کے حق میں نعرے لگائے، تاہم کوئی تصادم نہیں ہوا۔

یوم سیاہ:

اس روز ہندوستان کے اکثر شہروں میں مسلمانوں نے اپنے مکانوں اور دکانوں پر سیاہ جھنڈے لہرائے۔ نیز مسلم اخبارات نے ۲ر ستمبر کا دن یوم سیاہ کے نام سے منایا۔ اس روز کوئٹہ، بمبئی اور الہ آباد میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، جس میں دونوں اطراف کے لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔

فرقہ جعفریہ کی طرف سے شکریہ:

سید علی ظہیر کو نئی عارضی حکومت میں شامل کرنے پر شیعہ پولی ٹیکل کانفرنس کے سیکریٹری جنرل نے پنڈت جواہر لال نہرو کو مبارک باد کا تار دیا اور پرخلوص شکریہ ادا کیا۔

(روزنامہ ''انقلاب'' لاہور: ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء)

مجلس احرار کا سالانہ انتخاب:

۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو لاہور میں آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شیخ حسام الدین کی جگہ آئندہ سال کے لیے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو آل انڈیا مجلس احرار کا صدر منتخب کیا گیا۔ (کاروان احرار: ج ۷، ص ۳۶۴-۳۶۳)

مسٹر محمد علی جناح اور چرچل کے تعلقات

مسٹر جناح کا اقرار چرچل سے خط و کتابت:

مسٹر جناح نے مندرجہ ذیل بیان دیا ہے:

''میری توجہ اُس پریس نوٹ کی طرف مبذول کرائی گئی ہے جو کہ مسٹر مائیکل فوٹ ممبر پارلیمنٹ نے ''ڈیلی ہیرالڈ'' میں شایع کیا ہے۔ (سرکاری ترجمان لیبر حکومت) کہ ایک زمانے سے میرے اور چرچل کے درمیان خط و کتابت ہو رہی ہے یہ غلط اور شرارت آمیز ہے۔

میں نے مسٹر ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ کو ۶/ جولائی ۱۹۴۶ء کو لکھا کہ کس طرح وزارتی وفد اور ویسرائے نے مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس کے ساتھ میرے بیانات مورخہ ۲۷ و ۲۸/ جون بھی شامل کر دیے تھے مع چند دیگر کاغذات ضروریہ کے۔ یہ وزارتی وفد کی روانگی کے وقت لکھا گیا تھا، کیوں کہ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہ تمام معاملات پارلیمنٹ کے سامنے رکھے جائیں گے۔ اسی قسم کا ایک خط مسٹر چرچل کو بھی میں نے لکھا جس میں چند ضروری کاغذات و تفاصیل شامل تھیں۔ اس کے بارے میں ایٹلی کو مطلع کر دیا تھا۔ مجھے دونوں سے جوابات موصول ہوئے، پھر دونوں کو تفصیلی حالات سے مطلع کیا جو نازک صورت اختیار کرنے والے ہیں۔ (ہندوستان اسٹینڈرڈ - کلکتہ: ۲/ ستمبر ۱۹۴۶ء، ص ۴، کالم ۵)

چرچل جناح سازش:

مشہور امریکی مصنف مسٹر لوئی فشر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

(لندن بہ ذریعہ تار) ونسٹن چرچل ہندوستان کی آزادی کے سخت دشمن رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے خیالات کو کبھی نہیں چھپایا۔ خود ان کی پارٹی کے بہت سے ممبر آزادیٔ ہند کے متعلق اختلاف رکھتے ہیں، لیکن چرچل کی شاہیت پسند پالیسی اپنی جگہ پر قایم ہے۔

مسٹر محمد علی جناح نے حال کے برسوں میں ہندوستان کی آزادی کے بارے میں کسی قسم کے خلوص کا ثبوت نہیں دیا ہے اور نہ ہی مسلم لیگ نے جس کے وہ صدر ہیں۔ زمین داروں کا طبقہ جس کی لیگ کی کونسل اور کمیٹیوں میں بھاری اکثریت ہے۔ نئے ہندوستان کی تعمیر کے خلاف ہے، کیوں کہ ان کا نقصان اور غریب کسانوں کا فایدہ ہے۔ اس لیے اس سے زیادہ قدرتی بات کیا ہوسکتی ہے کہ چرچل اور جناح میں گذشتہ مہینوں میں ہندوستان کی قسمت کے بارے میں نامہ و پیام ہوا کیا ہے۔ اُن دونوں نے نہایت ہی راز دارانہ طور پر آپس میں خط و کتابت اور راز و نیاز کی باتیں کی ہیں۔

یہ واقعہ چرچل کے ایک ایسے ہی نہایت خفیہ خط پانے کے بعد ظہور میں آیا کہ مسلم لیگ نے برطانوی وزارتی وفد کی تجاویز کی منظوری پر دوبارہ غور کیا اور دستور ساز اسمبلی کے مقاطعے کا فیصلہ کر دیا جو آزاد ہندوستان کا دستور بنانے والی ہے۔

برطانوی مشن نے انتھک کوشش کی کہ سیاسی طاقت برطانیہ کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کو منتقل کرنے کا راستہ صاف کر دے، مگر چرچل اور جناح دونوں ان تمام کوششوں کو ناکام بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔

غیر ذمے داری:

مسٹر جناح کے نئے طرز سیاست کا ایک پھل کلکتہ میں لوٹ، موتیں اور قتل و غارت گری کی صورت میں ظاہر ہوا ہے جو شخص اپنے پیروؤں کو قابو میں نہیں رکھ سکتا ہے وہ ضرور انھیں بے لگام کر دے گا۔ مسٹر گاندھی اس چیز کو محسوس کرتے ہیں اور انھوں نے مجھ سے کہا بھی کہ اگر ہندوستان کی آزادی کی موجودہ کوششیں ناکام بھی ہو جائیں تو بھی وہ سول نافرمانی نہیں شروع کریں گے، کیوں کہ انھیں اندیشہ ہے کہیں وہی قتل و غارت گری شروع ہو جائے جو "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں ہوئی تھی۔ مسٹر جناح مہاتما گاندھی سے سبق حاصل کریں۔ طویل المیعاد تجاویز کو رَدّ کرنے میں مسٹر جناح نے انتہائی غیر ذمے داری سے کام لیا ہے، لیکن چرچل کی غیر ذمے داری اور بڑھی ہوئی ہے، کیوں کہ وہ بہت اونچے عہدے پر رہ چکے ہیں اور غالباً مغربی اصول امن و قانون سے واقف ہوں گے۔

شاید جناح کو معلوم نہ ہو کہ چرچل کا اثر برطانیہ میں اور ٹوری پارٹی میں بھی بڑی حد تک زایل ہو چکا ہے لیکن چرچل شاید یقین کرتا ہے کہ جناح کے روڑے مزدور حکومت سے ہندوستان کو آزاد کرنے میں ضرور باز رکھیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے؟

میرے خود ذاتی تاثرات جو لندن میں حاصل ہوئے ہیں یہ ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کی عارضی قومی حکومت دینے اور آئین ساز اسمبلی کو چلانے کے ارادے میں بالکل مضبوط ہے۔ بلاشبہ مسلم لیگ کے مقاطعے دستور ساز اسمبلی سے مشکلات اور رکاوٹیں سب کے لیے پیش آسکتی ہیں، لیکن یہ مشکلات ایسی ناقابل فتح اور یہ رکاوٹیں ایسی ہمت شکن نہیں ہیں جو کہ آزادیٔ ہند کی پوری اسکیم کے لیے قابلِ تسلیم ہوسکیں۔

مہذب طریقہ:

میں نہیں خیال کرتا ہوں کہ جناح برطانوی حکومت کے فیصلے پر جب کہ وہ ہندوستانیوں کی اکثریت نے منظور کرلیا ہے، خط تنسیخ کھینچ سکتے ہیں! جناح ایسا کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں اور قتل و خون ریزی کا سبب بن سکتے ہیں، لیکن اس سے ان کو کچھ فایدہ نہ پہنچے گا۔

ہندوستان کی آزادی اب رد کی نہیں جاسکتی۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ایک علاحدہ مسلم سلطنت چاہتے ہیں تو اس کو وہ بغیر کسی بغاوت و تشدد کے بھی حاصل کرسکتے ہیں، مگر یہ دکھانے کے بعد کہ متحدہ ہندوستان تمام باشندگانِ ہند کے فایدے کے لیے کام نہیں کرسکتا ہے۔

مجھے ہندوستان میں معلوم ہوا کہ ہر ذی فہم آدمی ہندوستان یونین سے مسلم علاقے کی علاحدگی کو تسلیم کرتا ہے۔ ان لوگوں کی صرف یہی خواہش ہے کہ کم از کم پانچ چھ سال کے لیے بہ طور آزمایش کے متحدہ ہندوستان کے حق میں فیصلہ کیا جائے۔ اس کے بعد تقسیم ہند اور معاشرتی سیاسی اور اقتصادی نقصان اٹھانے کا فیصلہ کیا جائے۔ متحدہ ہندوستان میں پوری پوری تہذیبی خود اختیاری اور وسیع ترین اقتصادی اور سیاسی خود مختاری رہنی چاہیے اور دستور ہند میں تجربے کے بعد ترمیم کی گنجایش رہنی چاہیے۔ یہی مہذب طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ

موت ہے، تباہی ہے، بربادی ہے، فاقہ اور موت ہے اور لامتناہی نفرت ہے، جو کم از کم ایک صدی تک قایم رہ سکتا ہے۔ کون سا راستہ جناح اختیار کرے گا اور کون سا طریقہ چرچل پسند کرے گا؟

درحقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جناح اور اس کی مسلم لیگ زمین داروں کی ایک انجمن چرچل کی شاہیت پسند ٹوری پارٹی کی طرف جھکی ہوئی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے سمجھدار اور روشن خیال مسلمان جناح کی رہنمائی میں چل رہے ہیں۔

بنیادی لعنت:

کانگریس کی بہت سی نمایاں شخصیتیں ماضی میں لیگ کو کم زور کرنے کی مخالف رہی ہیں۔ میرے خیال میں یہ انتہائی (بیجا) فیاضی کی بات ہے۔ مسلم لیگ ہندوستان میں ایک بدقسمت عامل ہے اور مسلمانوں کو اُن لوگوں کے خلاف بغاوت کر دینا چاہیے جو اس کی پالیسیوں کو بناتے ہیں۔ میں ہندوستان میں بے شمار مسلمانوں سے ملا جو مسٹر جناح کو ذاتی طور پر ناپسند کرتے ہیں اور ان کے سیاسی اعمال کی مذمت کرتے ہیں، لیکن وہ لوگ کم ذمے داری سے بولے کیوں کہ کانگریس نے ماضی میں غلطیاں کی ہیں جو مسلمانوں کے غلبے کا سبب ہوئیں۔ اور موجودہ جداگانہ انتخاب جس کے ماتحت ایک ہندو ایک مسلمان کو اور ایک مسلمان ایک ہندو کو ووٹ نہیں دے سکتا ہے، ایک مسلمان جو سیاسی ترقی نہیں چاہتا ایک ایسی مسلم جماعت کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے جو اسے ووٹ دے۔ بجائے کانگریس پارٹی کے، جس نے بہت سے مسلمانوں کی سیاسی سیڑھی پر چڑھنے کی ہمت افزائی نہیں کی ہے۔ مستقبل قریب ان تمام حالات کو بدلنے والا ہے۔ نئی مخلوط ہندوستانی حکومت میں مسلمان اہم پارٹ ادا کر سکتے ہیں اور کریں گے۔ پہلی مرتبہ کانگریسی مسلمانوں کی ایک بڑی اسمبلی بجائے جداگانہ انتخاب کے مخلوط انتخاب کے حق میں فیصلہ کرے گی۔ اس سے (مخلوط انتخاب سے) ہندوستانی سیاسی زندگی سے بنیادی لعنت دور ہو جائے گی اور ہندو مسلم اتحاد کا ضامن ہوگا، جب کہ مسلمان کو ہندو اور ہندو مسلمان کو ووٹ دے سکے گا۔ ہندوستانی معاملات میں تفریق موقوف ہو جائے گی اور معاملات بجائے مذہبی ہونے کے معاشرتی اور

اقتصادی ہو جائیں گے، یہ بہت ہی مناسب ہے، اس سے مسلمانوں کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ کانگریس کے ساتھ مل کر کام کریں جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ ہندو اور مسلمانوں میں تعلقات خراب رہے ہیں اور گزشتہ چند سالوں سے ان سے اور بھی زیادہ خراب ہو گئے ہیں، لیکن یہ تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں اگر ہندوستان نے نئی سیاسی ترقی کی طرف قدم آگے بڑھایا، مثلاً جیسا کہ وزارتی وفد نے پیش کیا ہے۔ کیا یہی وہ چیز ہے جس سے جناح گریز کرتے ہیں اور کیا چرچل جناح کے انھیں ناپاک خیالات کا علم بردار ہے؟

(ڈیلی ہندوستان اسٹینڈرڈ۔ کلکتہ: ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء، سوم وار: ص ۴، کالم ۴ و ۵)

لاہور

۱۱ر ستمبر ۱۹۴۶ء

میرے عزیز سردار!

میں اس خط کے ساتھ اس سرکلر (گشتی مراسلے) کی ایک نقل منسلک کر رہا ہوں جو مبینہ طور پر بڑی تعداد میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہندوؤں میں سے کچھ (لوگ) اس (سرکلر) کو ہندوؤں میں تقسیم کر رہے ہیں تاکہ وہ جوابی اقدام کے لیے اپنے آپ کو منظم کر سکیں۔ راشٹریہ سیوک سنگھ (تنظیم) خاص طور پر انتشار پیدا کر رہی ہے اور دوسروں کو معاندانہ رویہ اختیار کرنے پر اُکسا رہی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر اس سرکلر پر آپ کی کابینہ میں بحث کی جاتی اور (سرکلر) کی مذمت کی جاتی (اور) فریقین سے خاموش اور پرسکون رہنے اور اس (سرکلر) سے گم راہ نہ ہونے کے لیے کہا جاتا تو اس سے (سرکلر) کا منفی اثر زایل ہو جاتا اور (اس سے) لوگوں پر مثبت اثرات مرتب ہوتے! میں اس (سرکلر) کی ایک نقل سری دیش بندھو گپتا کو بھی بھیج رہا ہوں تاکہ وہ شارٹ نوٹس پر (ایوان) میں سوال اٹھا سکیں۔

(روزنامہ) ڈان (بھی) قابلِ اعتراض (مواد) مضامین شایع کر رہا ہے۔ (اب) یا تو آپ ہیں یا دہلی کے چیف کمشنر صاحب ہیں، جو اس پر (کچھ) اقدامات کر سکتے ہیں، براہِ مہربانی اس سوال پر غور کیا جائے اور اس پر بحث کی جائے یا (زیرِ بحث) لایا جائے۔

یہ جان کر آپ کو (یقیناً) افسوس ہوگا کہ رہتک میں چھرا گھونپنے کے چھ واقعات ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے شمال مغرب کے بعض اضلاع میں اس کا ردِ عمل ہو، حکومت احتیاطی

تدابیر اختیار کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور (ہر قسم کے) تشدد کو دبانے کے لیے تیار ہے۔

نیک ترین تمناؤں کے ساتھ! آپ کا مخلص

گوپی چند بھارگوا

سوامی شردھانند کا پیرو ڈایریکٹر، اردو روزنامہ (تاج) دہلی کا سرکردہ کانگریسی رہنما رکن اے آئی سی سی اور لوک سبھا۔ من جانب ایک سابق مسلم لیگی

منسلک دستاویزات

زبانی سرکلر جس کی منظوری جناب جناح اور مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے دی تھی (اس زبانی سرکلر میں کہا گیا تھا کہ)

(۱) ہندوستان کے تمام مسلمان پاکستان کے (قیام) کے لیے (اپنی) جان دے دیں گے۔

(۲) پاکستان کے قیام کے ساتھ تمام ہندوستان کو بھی فتح ہو جانا چاہیے۔

(۳) ہندوستان کے تمام عوام کو (مسلمان) ہو جانا چاہیے، اسلام قبول کر لینا چاہیے۔

(۴) مسلمانوں کو ساری دنیا میں اینگلو امریکی استحصال کے استیصال کے لیے ہاتھ بڑھانا چاہیے!

(۵) ایک مسلمان کو پانچ ہندوؤں کے (مساوی) حقوق لینے چاہیے، اس لیے کہ ایک مسلمان پانچ ہندوؤں کے برابر ہے۔

(۶) جب تک کہ ہندوستان پاکستان کی (دو علاحدہ علاحدہ سلطنت) مملکت قایم (نہ) ہو جاتی مندرجہ ذیل اقدامات (جاری رہیں گے) کیے جاتے رہیں گے:

۱۔ (وہ) تمام کارخانے اور دکانیں (جو) ہندوؤں کی ملکیت میں ہیں انھیں جلا دیا جائے (جلا دینا چاہیے)۔ (انھیں) تباہ کر دیا جائے (تباہ کر دینا چاہیے)۔ انھیں لوٹ لیا جائے (لوٹ لینا چاہیے) اور لوٹ (کا) مال مسلم لیگ کے دفاتر میں دے دیا جائے (دے دینا چاہیے)۔

۲۔ تمام مسلم لیگیوں کو (قانون کی) اور اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار لے کر چلنا چاہیے (ہتھیار ساتھ رکھنے چاہییں)۔

۳۔ تمام مندروں کو (تباہ کر دینا) یا جلا دینا چاہیے۔
۴۔ ہندوؤں کو بہ تدریج قتل کر دینا چاہیے (تاکہ) ان کی آبادی کم ہو جائے۔
۵۔ وہ تمام قوم پرست مسلمان جو مسلم لیگ میں شمولیت اختیار نہیں کرتے، انھیں مسلم لیگ کی خفیہ پولیس کے ہاتھوں قتل ہو جانا چاہیے (انھیں مسلم لیگ کی خفیہ پولیس کے ذریعہ قتل کر دیا جائے)۔
۶۔ ہندوستان کے دیہات اور اضلاع میں مسلم لیگی جاسوس تعینات کیے جائیں (مقرر کیے جائیں)۔
۷۔ کسی نہ کسی طریقے سے (چال سے) ہر ماہ کانگریس کا (کم از کم) ایک رکن قتل ہو جانا چاہیے۔
۸۔ کانگرس کے (دفتری کاغذات) مسلم لیگ کی خفیہ پولیس کے ہاتھوں (تباہ) یا جلا دینا چاہیے (اور یہ کام فرد واحد کے ذریعے انجام پائے تو زیادہ بہتر ہے)۔
۹۔ کراچی، بمبئی، کلکتہ، مدراس وغیرہ کو......... دسمبر ۱۹۴۶ء تک مسلم لیگی رضا کاروں کے ہاتھوں مفلوج ہو جانا چاہیے یا کر دیا جائے۔
۱۰۔ مسلمانوں کو (بری، بحری، گورنمنٹ ملازمتوں یا نجی اداروں) میں ہندوؤں کے ماتحت ہرگز کام کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔
۱۱۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ پورے ہندوستان (کو) اور کانگریسی حکومت کو سبوتاژ کر دیں تاکہ مسلمان ہندوستان پر حملہ آور ہو سکیں (حملہ کر سکیں)۔
۱۲۔ ہندوستان پر حملے کے لیے مسلم لیگیوں کو ناظم کمیٹی کے ہاتھوں مالی وسایل فراہم کیے جاتے ہیں۔ (فراہم کرنے والوں میں کچھ اینگلو انڈین، پارسی اور کچھ عیسائی بھی شامل ہیں)۔
ہندوستان ہر مسلم لیگی حملے کے لیے اور مسلم ریاست کے قیام کے لیے پنجاب، سندھ اور بنگال میں جنگی ہتھیار تیار کیے جائیں گے۔
۱۳۔ تمام اسلحہ اور ہتھیار بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس، بنگلور، لاہور، کراچی مسلم لیگی شاخوں میں تقسیم کیے جائیں گے۔

۱۴۔ مسلمانوں کے ہر طبقے کو اپنے ساتھ ہمیشہ کوئی نہ کوئی (چھوٹا بڑا) خواہ وہ جیبی چاقو ہی ہو، ساتھ رکھیں، تاکہ ہندوؤں کو (نہ صرف) تباہ کیا جاسکے (بلکہ) انھیں ہندوستان سے نکال باہر کیا جاسکے۔

۱۵۔ ساری ٹرانسپورٹ کو ہندوؤں کے خلاف جنگ کے لیے منظم اور استعمال کیا جانا چاہیے۔

۱۶۔ ۱۹/اکتوبر ۱۹۴۶ء سے ہندوؤں کی عورتوں اور لڑکیوں (کے ساتھ) زنا کیا جانا چاہیے اور ان کو اغوا کر لینا چاہیے، ان کو مسلمان کر لینا چاہیے (اور ان کو تبدیلی مذہب کر دینا چاہیے) ان سے اسلام قبول کروالینا چاہیے۔

۱۷۔ ہندو ثقافت تباہ کر دینی چاہیے۔

۱۸۔ تمام مسلم لیگیوں کو ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ ظالم بن کر رہنا چاہیے اور ان کا سماجی، معاشی اور دوسرے کئی طریقوں سے مقاطعہ کرنا چاہیے۔

۱۹۔ کسی بھی مسلمان کو کسی ہندو سے کچھ بھی نہیں خریدنا چاہیے۔ ہندوؤں کی تیار کی ہوئی تمام فلموں کا مقاطعہ ہونا چاہیے۔

۲۰۔ ۱۵/ستمبر ۱۹۴۶ء تمام مسلم لیگیوں کو ان ہدایت پر عمل کرنا چاہیے (اور انھیں عملی جامہ پہنانا چاہیے)۔

ہندوستان میں خانہ جنگی کے لیے چرچل پارٹی کی طرف سے مالی امداد:

ناگ پور ۱۹/نومبر: سی پی کے فارورڈ بلاک لیڈر مسٹر آر ایس روئیکار نے یورپ کے طویل دورے کے بعد اپنے تاثرات مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیے ہیں:

> ''سویزر لینڈ، آئرلینڈ اور برطانیہ کے دورے کے دوران مجھے سرکردہ لیڈروں، قانون دانوں، جرنلسٹوں اور تاجروں سے ملنے کا موقع ملا۔ جہاں تک سیاسی صورت حالات کا تعلق ہے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک طرف امریکا اور برطانیہ کے درمیان اور دوسری طرف امریکا و برطانیہ اور روس کے درمیان کشیدگی بد سے بدتر ہورہی ہے۔''

تیسری جنگ کے آثار:

چناں چہ یورپ کی سیاسی فضا پر تیسری جنگ کے بادل ایک خوف ناک بھوت کی طرح چھائے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی بین الاقوامی صورت حالات ہندوستان کے لیے انتہائی ساز گار ہے۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی صدق دلی کے ساتھ ہندوستان کا تصفیہ کرنا چاہتی ہے۔ مستقبل قریب میں کنزرویٹو پارٹی کے برسر اقتدار آنے کا کوئی امکان نہیں۔ اگر چہ وہ کوشش کرے تب بھی اسے لیبر پارٹی کے مقابلے میں برطانوی پبلک کی حمایت حاصل نہیں ہوسکتی۔ ایک سرکردہ ٹریڈ یونین لیڈر نے مجھے بتایا کہ لیبر پارٹی یقیناً ابھی مزید کچھ سال برسر اقتدار رہے گی، اس لیے ہندوستان کو اس نادر موقعے سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھانا چاہیے اور یہ کہ لیبر پارٹی ہندوستان کو مکمل آزادی کی منزل تک پہنچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کے لیے تیار ہے۔

فرقہ وارانہ صورت حالات:

میں نے ہندوستان کی فرقہ وارانہ صورت حالات کے متعلق وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس اور برطانوی پارلیمنٹ کے دیگر ممبروں سے بھی بات چیت کی۔ اس بات چیت کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لیبر پارٹی ہندوستان کی کسی ایسی فرقہ پرست جماعت کی حمایت نہیں کرے گی جو خانہ جنگی کرانے پر تلی ہوئی ہے۔ میں اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ اگر عارضی گورنمنٹ نے فسادات کے دبانے کے لیے انتہائی سخت قدم اٹھایا تو لیبر گورنمنٹ کوئی مداخلت نہ کرے گی۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی درست ہے کہ برطانوی گورنمنٹ فسادات دبانے کے لیے خود ہرگز پہل نہ کرے گی۔ کنزرویٹو اخبارات کی طرف سے فرقہ وارانہ فسادات کی آڑ لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ہندوستانی حکومت کرنے کے قابل نہیں، لیکن عام انگریزوں پر اس قسم کے لغو پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیبر پارٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس ہی ہندوستان کی حقیقی نمایندہ جماعت ہے۔ پارلیمنٹ کے ایک سرکردہ ممبر نے مجھے بتایا کہ اگر کانگریس جرأت کر کے ہندوستان سے برطانوی فوجوں کے فوری اخراج کا مطالبہ کرے اور پنڈت جواہر لال نہرو عارضی گورنمنٹ

کے وایس پریذیڈنٹ کی طرف سے اس مطالبے کو پیش کریں تو لیبر پارٹی فوری انتقال اختیارات کی راہ میں ہرگز رکاوٹ نہ بنے گی۔

متحدہ محاذ:

مسٹر رویکار مزید لکھتے ہیں: عالم گیر اور برطانوی سیاسیات کے اس پس منظر کی روشنی میں ہمارا فرض ہے کہ ہم مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے متحدہ محاذ قایم کریں۔ اس ضمن میں ہمیں رجعت پسندوں کی طرف سے خانہ جنگی کی دھمکیوں سے ہرگز مرعوب نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں جرأت کے دامن کو ہاتھ میں لیتے ہوئے تشدد، لوٹ مار، آتش زدنی اور قتل و غارت گری کی دھمکیوں سے مرعوب نہ ہونا چاہیے۔

کنزرویٹوں کی سازش:

اب صرف میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ جب میں لندن میں تھا تو میں نے یہ افواہیں سنیں کہ برطانیہ کے کچھ کنزرویٹو ہندوستان کے فسادات میں غیر معمولی دل چسپی لے رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ وہ ہندوستان میں فسادات کرانے کے لیے رجعت پسند عناصر کو مالی امداد بھی دے رہے ہیں۔ ان دنوں وہاں یہ افواہ بھی گشت لگا رہی تھی کہ کنزرویٹو پارٹی کا ایک ایلچی فسادات کرانے کے لیے ہندوستان روانہ ہو چکا ہے۔

(خاص) (روزنامہ پرتاب۔ لاہور: ۲۱ر نومبر ۱۹۴۶ء، ص ۱۰ نمبر ۱۲۱، اسپیشل ایڈیشن)

مطالبۂ پاکستان کا حشر:

مجلس احرار اسلام نے شروع ہی سے مطالبۂ پاکستان کا ساتھ نہیں دیا، بلکہ اس کی دیانت داری سے یہ رائے رہی ہے کہ جو لوگ تقسیم ہندوستان کا غوغا بلند کر رہے ہیں۔ ان میں بیشتر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کی عمر خوان استعمار کی خوشہ چینی میں گزری ہیں اور پاکستان کا نعرہ انھی کاسہ لیسان ازلی کے اعتراض کا حفاظتی آلہ ہے۔

ہمیں اپنی اس رائے کے لیے بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ مسلمانوں نے اپنی

قیادت عظمیٰ کی پیروی میں یہی نہیں کہ ہم سے اختلاف کیا بلکہ اختلاف کو تصادم کی رنگت دے کر ہمارے خلوص کو بندوں کی خریدی ہوئی متاع سمجھا اور ہمیں مقاصد ملی کا دشمن گردانا۔

اس بارے میں ہمیں مسلمان عوام سے کوئی شکایت نہیں اور نہ ان کے طرز عمل سے کوئی گلہ ہے۔ مسلمانوں نے جو کچھ کیا جذبات کی رو میں کیا۔ عوام جذبات کی مخلوق ہوتے ہیں اور ان کے لیے بس یہی کافی ہوتا ہے کہ ان کے جذبات کو کس طرح جنبش دی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں کو ہندوؤں کے سماجی برتاؤ اور اقتصادی سلوک سے بہت سی شکایتیں ہیں اور یہ شکایتیں اتنی طویل و تلخ ہو چکی ہیں کہ انھوں نے بڑھ پھیل کر شکوے سے نفرت، نفرت سے غصے اور غصے سے مستقل سیاسی لڑائی کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس ساری کہانی نے سمٹ کا اپنا نام ''پاکستان'' رکھ لیا ہے۔

احرار کا ذہن ان عوارض سے غافل نہیں لیکن ان کا نظریہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ جب تک غیر ملکی رخت سفر باندھ کر رخصت نہیں ہو جاتا ہے اس وقت تک اندرونی شکوؤں کو ہوا دینا خود ایک بڑے مقصد یعنی ملک کی آزادی کے راستے میں روک پیدا کرنا ہیں۔

اس بحث کی بہت سی شاخیں مختلف جرائد میں زیر بحث آ چکی ہیں اور آئندہ بھی اس پر نقد و نظر کے دروازے کھلے ہیں، لیکن امروزہ صحبت میں ہمارے سامنے صرف ایک سوال ہے اور وہ برطانوی کابینہ کا تجاویز میں ''ادعائے پاکستان'' کے خد و خال کا معاملہ ہے۔

مسلمانوں کی قوتِ محاسبہ جو اپنے آزمودہ خادموں کو صرف اس جرم میں رگید چکی ہے کہ مطالبۂ پاکستان میں مسلم لیگ سے متفق نہیں تھے۔

ہمارا اس سے بلا واسطہ سوال ہے کہ پچھلے دو تین مہینوں میں جو حالات پیدا ہوئے اور ان کے سیاسی مؤقف سے ان کی پسندیدہ لیڈر شپ نے جو غداری کی اس پر بھی کچھ سوچا گیا؟ یا زبان و قلم کے انگارے اور دست و بازو کے آرے صرف صحیح الخیال مسلمانوں کے لیے ہی جمع کیے گئے تھے؟ پاکستان کے آغاز و انتہا کی سرگزشت تو ایک مستقل مضمون ہے اور ان شاء اللہ ہم اس پر مستقل مقالات لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو کہ ان کے ساتھ سیاسی قلابازوں نے جو سلوک کیا ہے اس کا منشا و مفہوم کیا تھا اور ان کے سیاسی مؤقف کی بازی کس طرح ہاری گئی ہے۔

مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ

(۱) ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو قومیں بستی ہیں، جن کے نظریاتِ زندگی ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد بھی ہیں۔
چوں کہ ان دونوں میں قومی وحدت کا پیدا ہونا محال ہے، لہٰذا..... ہندوستان کی تقسیم ہی ان کے سیاسی مسایل کا بہترین حل ہے۔

(۲) مسلمان کسی صورت میں بھی ایک مرکز قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہے ان کے باہمی اشتراک سے وہ ایک جداگانہ اور ہر لحاظ سے خودمختار ریاست قایم کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) ایک کانسٹیٹیوٹ اسمبلی کا سوال لایعنی ہے، مسلمان ہرگز ہرگز اس کو تسلیم نہیں کریں گے۔

یہی تین بڑے دعاوی تھے جن پر مسلم لیگ کی عمارت کھڑی کی گئی اور مسلمانوں میں پروپیگنڈا کیا گیا کہ ان کو نقصان پہنچا تو ہندوستان میں اسلام کی عمارت ڈھے جانے کا خدشہ ہے۔

مسلمانوں کو اسلام سے جو شیفتگی ہے وہ ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ پاکستان کے نشے میں اس قدر بہک گئے کہ انھوں نے اسلام اور پاکستان دونوں کو ایک شے سمجھا اور اس جنون میں ان گراں قدر ہستیوں پر بھی ہاتھ اٹھانے سے دریغ نہ کیا جو نظریۂ پاکستان کی مؤید نہ تھیں، لیکن جن کی زندگیاں ہندوستان میں بہمہ وجوہ اسلامی اوصاف کی شارح ہیں۔

آج جو کچھ ملا، لیگ نے جس طرح مانگا اور چنگیز و ہلاکو بننے والوں نے لارڈ ویول کے آستانے پر جس طرح جبینِ نیاز خم کی اس ناز و نیاز کی داستان نہایت دل چسپ اور ردّ و قبول کا افسانہ غایت درجے افسوس ناک ہے۔

مشن نے اپنی تجاویز میں:

(۱) پاکستان کے مطالبے کو مسترد کر دیا، جس کا اعتراف خود مسٹر جناح نے اپنے شملہ کے بیان میں کیا ہے۔

(۲) ایک مرکز قایم رکھا اور اس کے اختیار میں فوج، امورِ خارجہ اور وسایلِ حمل و نقل دیے گئے جو ہر خودمختار ریاست کی جان ہوا کرتے ہیں۔

(۳) گروپنگ سسٹم میں اختلافی تاویلوں سے قطع نظر یہ امر شک وشبہ سے بالا ہے کہ ہر ایک صوبہ اپنے گروپ سے الگ ہوسکتا ہے، لیکن مرکزی یونین سے کسی حصے کو بھی علاحدگی کا اختیار نہیں دیا گیا۔

(۴) مرکزی یونین میں مساوی نمایندگی کی کوئی صورت بھی نہیں رکھی گئی، نہ ہندو مسلم برابر نمایندگی اور نہ تین گروپ کا مساویانہ تناسب!

مرکزی دستور ساز اسمبلی میں کل ممبر دو سو چھیانوے ہوں گے، جن میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ اسی تک پہنچ سکتی ہے۔ مسلم لیگ کی رہنما جماعت نے ان حقایق کو سمجھ کر اپنے ابتدائی بیانوں میں مطالبۂ پاکستان کے استرداد کا اقرار کیا اور اظہارِ غیظ بھی فرمایا، لیکن عارضی حکومت میں شمولیت کی ہوس نے اس کے تدبر و فراست پر کچھ ایسا قابو پالیا کہ دعاوی و مقاصد کا سارا انبار طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا اور وایسرائے کی انتظامیہ کونسل میں شرکت کا شوق ہی اصل مقصد قرار پایا۔

اقبال پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، ایک ایک مصرعے میں حقایق و معارف کی دنیا سمو جاتا ہے۔ شاید اس صورتِ حال کے لیے ہی اس نے کہا تھا ؎

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

مسٹر جناح نے مطالبۂ پاکستان کی شہادت کے باوجود عارضی حکومت میں دعوتِ شرکت قبول کرلی۔ لارڈ ویول نے بارہ ارکان لینے کا ارادہ ظاہر کیا اور پانچ پانچ کے تناسب سے کانگریس، لیگ مساوات رکھی لیکن کانگریس راضی نہ ہوئی۔ پھر تیرہ ممبر بنادینے کی صلاح ٹھہری۔ کانگریس نے اس کو بھی نہ مانا۔ چودہ ارکان کا اعلان کردیا گیا۔ لیگ نے بارہ سے چودہ تک کی ہر پوزیشن کو قبول کیا۔

ان چودہ ارکان میں سے چھ کانگریسی اور پانچ لیگی تھے۔ کانگریس نے اپنے کوٹے میں سے ایک نشست قوم پرور مسلمان کو دینا چاہی لیکن مسٹر جناح کسی حالت میں بھی اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ گو انھیں اس پر ضد کرنے کا اصولاً کوئی حق نہ تھا، مگر انھوں نے اس کو مطمحِ نظر بنالیا اور کچھ اس طرح کی فضا پیدا کردی جیسے انتظامیہ کونسل میں قوم پرور مسلمان کی عدم شرکت ہی پاکستان کا نعم البدل ہے۔

اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس طرح مسلمانوں کا تناسب گھٹتا نہیں بڑھتا ہے، لیکن مسٹر جناح کی ضد نے کام نہ بننے دیا۔

انھیں بعض وعدوں کے سہارے یقین تھا کہ عارضی گورنمنٹ کانگریس کی شرکت کے بغیر بھی بنے گی، لیکن جب کانگریس نے شریک نہ ہونے کا فیصلہ کرلیا اور وایسرائے نے اپنی تجویز واپس لے لی تو مسٹر جناح نے لارڈ ویول پر بدعہدی کا الزام لگایا۔ وایسرائے نے فوراً تردید کردی اور مسٹر جناح اپنی سی کہہ کر رہ گئے۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں اور اس قماش کے دوسرے لیگی بزرگ اس ناکامی پر نہایت سیخ پا ہو رہے ہیں اور برطانوی مشن کی تجاویز کے استرداد کا شور اٹھا رہے ہیں۔ انھوں نے بلا جھجک کہا ہے کہ عارضی حکومت کے بارے میں حکومت نے جس وعدہ خلافی سے کام لیا ہے اس کے پیش نظر ہم پاکستان کے مطالبے کو از سر نو دہرانے پر مجبور ہوں گے۔

اس سیاسی بے تدبیری کی مثال کہیں اور ملنا محال ہے۔ عارضی اقتدار کی چند کرسیاں مل جائیں تو پاکستان کو غایب کر دینا بھی جایز تھا۔ ان پر ہاتھ نہیں پہنچا تو غریب کا دامن پھر دراز کیا جارہا ہے ؂

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

مسلم لیگ کے قاید کو چک نے حال ہی میں یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں کو اپنے رہنماؤں پر تنقید نہیں کرنا چاہیے، اب تقلید کا دور ہے۔ ہمیں اس کا مطلب اچھی طرح معلوم ہے اور فی الحال ہم اس کو زیر بحث نہیں لانا چاہتے لیکن بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا جو اجلاس ہو رہا ہے اور زعمائے لیگ اپنی خوردگی کو جن خوش فریبیوں کے آسرے زندہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے متعلق ہمیں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ؂

زندگی میں کوئی دل چسپی تو ہونی چاہیے
ہو سکے تو ایک دھوکا اور ہم کو دیجیے

۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو نئی مرکزی کابینہ نے حلف وفاداری اٹھایا۔ مسلم لیگ نے اسے یوم سیاہ کے طور پر منایا اور مظاہرے کیے۔ اسی شام باغ بیرون دہلی گیٹ لاہور میں ایک عظیم الشان اجتماع عام سے خطاب کرتے ہوئے مجلس احرار کے نو منتخب صدر امیرِ شریعت سید عطاء

اللہ شاہ بخاری نے کابینہ مشن پلان اور عبوری حکومت میں نمایندگی پر مسلم لیگی نقطۂ نظر کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا:

"مسلم لیگ نے وزارتی مشن تجویز کو قبول کر کے ایک مرکز اور ایک قوم کے اصول کو تسلیم کر لیا اور پاکستان کے مطالبے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا، لیکن ڈیڑھ ماہ کی قلیل مدت گزرنے کے بعد اسی مسلم لیگ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ اب سارا جھگڑا اور معاملہ نشستوں کا رہ گیا ہے کہ مسلمانوں کو پانچ ملیں اور چھ نہ ملیں۔ میں مسٹر جناح سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کون سا بدبخت ہوگا جو کانگریس کی طرف سے حکومت میں شامل ہو کر مفاد کو نظر انداز کر گیا۔ احرار نے کانگریس کے سامنے ۴۵، ۴۵ اور ۱۰ کا فارمولا رکھا تھا لیکن اب مسلم لیگ نے اسے مسترد کر کے پینتیس فیصد قبول کر لیا ہے۔ اس طرح مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ پینتالیس فیصد نیابت کے فارمولے پر بات چیت کا راستہ روک دیا۔" (ابوالکلام آزاد اور........: ص ۸۹-۶۸۵)

ایک تاریخی اور حقایق سے لبریز مکتوب:

اوایل ۱۹۴۷: حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کا یہ علمی تاریخی مکتوب گرامی جس میں وقت کے سیاسی مسایل کے حوالے سے نہایت اہم تحقیقی بحث اور بہت فکر انگیز مطالب ہیں، چاہ میراں والا، ڈاک خانہ گورمالی ضلع مظفر گڑھ (پنجاب) کے حافظ محمد صدیق کے نام ہے۔ اس مکتوب پر تاریخ و سنہ تحریر درج نہیں، لیکن اس میں جو مسایل زیر بحث آئے ہیں وہ عام طور پر ۱۹۴۶ء کے نصف ثانی میں جب کہ مسلم لیگ نے وزارتی منصوبے کی منظوری واپس لے لی تھی اور صوبائی اور مرکزی انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا، زور شور کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ جن کا سلسلہ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کے اعلان تقسیم ملک تک دراز ہوتا چلا گیا تھا۔ یہ مکتوب اسی زمانے کا ہے۔ حضرت نے یہ مکتوب علم و فکر کی جس بلندی سے اور فراست و تدبر کے جس مقام سے لکھا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کی تاریخ تحریر کیا ہے، لیکن مکتوب الیہ کے نام حضرت کا دوسرا مکتوب چوں کہ ۱۴ر اپریل ۱۹۴۷ء کا ہے۔ اس لیے یقین

ہے کہ اس سے قبل کی کسی تاریخ کا یہ مکتوب بھی ہوگا۔ تاریخ پاکستان کے پس منظر میں اس مکتوب کا مطالعہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس پر حواشی مولانا نجم الدین اصلاحی مرحوم کے قلم سے یادگار ہیں۔ حضرت کا مکمل مکتوب یہ ہے:

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف، والا نامہ باعث عزت افزائی ہوا، مجھ کو گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے اس قدر فرصت نہیں ہے کہ آپ کے سوالات کا تفصیلی جواب عرض کرسکوں، اگرچہ آپ کے سوالات تفصیل طلب ہیں لیکن تنگی وقت کی بنا پر مختصر اجوابات پر اکتفا کرتا ہوں۔

اسلام نے کسی صورت میں بھی غلامی پر قناعت نہیں کی۔ بہت سی نصوص سے دلالتاً اور صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا تقاضا حکومت اور سربلندی ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا۔ (1)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الاسلام يعلو ولا يعلى. (2)

شامی میں ہے:

والملوك الذين يطيعونهم عن ضرورة مسلمون ولو كانت الاطاعة عن غير ضرورة منهم فساق واما طاعة الكفرة فذالك مخادعته. (3) (شامی: ج۳، ص ۳۶٦)

اگر کسی اسلامی ملک پر کفار کا ہجوم ہو تو مسلمان پر ان کا دفع کرنا اور ان سے جہاد کرنا فرض عین ہوجاتا ہے، اگر اس ملک کے مسلمان تساہل سے کام لیں تو بہ تدریج تمام مسلمانان عالم پر یہ ہی فرض عاید ہوجاتا ہے۔ (درمختار و حاشیہ ردالمختار: ج ۳، ص ۳۰٦، عالم گیری: ج ۲)

اس لیے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس ملک کو کفار کے تسلط سے نجات دلانے کے لیے احکام کفار کی نافرمانی سے لے کر جہاد بالسلاح تک جو ذریعہ

مقاومت بھی ان کے امکان میں ہو، اس کو کام میں لائیں۔ مسلمانانِ ہند کی اجتماعی قوت اور ان کے موجودہ سیاسی احوال کے پیش نظر چوں کہ ہندوستان کے علما اور تمام اہل الرائے حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ حکومت مسلّطہ کے متشددانہ ذرائع سے جنگ کرنا مسلمانوں کی وسعت اور طاقت سے باہر ہے، اس لیے پُرامن ذرائع ہی اختیار کرنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے، لیکن اگر تنہا مسلمان اس قسم کی جدوجہد کریں تو ناکامی بدیہی ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کے سیاسی و اقتصادی نقصانات بدیہی ہیں، اس لیے حکومت کے خلاف پُرامن جدوجہد کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اس میں شریک ہوں، مختلف قوموں کے اس اشتراک کی وجہ سے آزادی کے بعد ملک میں جو نیا نظام قایم ہوگا، اس کی تعمیر میں مسلم و غیر مسلم دونوں شریک ہوں گے۔ یہ مشترکہ نظام اگرچہ مکمل طور پر اسلامی معیار کے مطابق نہ ہوگا، تاہم اس میں مسلمانوں کا ایک اہم اور موثر عنصر ہوگا۔ اب یہ خود مسلمانوں کی حکمت تبلیغ پر منحصر ہے کہ وہ آنے والے نظام کو کس حد تک اسلامی معیار پر ڈھال سکتے ہیں۔ ان ہی وجوہ سے آزادی کے بعد قایم ہونے والے مشترکہ نظام کو موجود نظام کے مقابلے میں اھون البلیتین قرار دیا جاتا ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے بہ طور اصول اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس ضروری تمہید کے بعد ہندوستان کے آیندہ نظام حکومت سے متعلقہ سوالات کا جواب بہ ترتیب حسب ذیل ہے:

(۱) ہندوستان کا آیندہ نظام جمہوری ہوگا، جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ انتخاب کے ذریعے معینہ عرصے کے لیے ایک صدر جمہوریہ کا انتخاب ہوتا رہے گا۔ صدر جمہوریہ کبھی مسلمان ہوگا کبھی غیر مسلم ہوگا، لیکن اس کو شاہانہ اختیارات حاصل ہوں گے۔

(۲) مرکزی حکومت میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب اگرچہ کم ہوگا لیکن بنیادی آئین میں مسلمانوں کے لیے ایسے تحفظات رکھے جائیں گے کہ مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی و اقتصادی حقوق پوری طرح محفوظ رہیں گے اور مضامین جو مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں گے بہت ہی محدود ہوں گے۔ مثلاً دفاع، معاملات، خارجہ، رسل و رسایل اور بعض محدود مالی اختیارات۔ اس کے علاوہ تمام معاشرتی اور تمدنی مسایل، صوبوں کے تحت اختیارات ہوں گے، اس لیے اس سلسلے میں قوانین شرعی کے اجرا کے نفاذ کا مسئلہ

صوبائی حکومتوں سے متعلق ہے۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی ایسے تحفظات دیے جائیں گے کہ مسلمانوں کے اپنے قوانین اور اپنے قانون شخصی (پرسنل لا) پر عمل کرنے کی آسانیاں حاصل ہوں۔

(۳) نظام تعلیم صوبوں کے تحت اختیار ہوگا اس لیے مسلم اکثریت ❼ کے صوبوں پر تو آپ کا سوال عاید ہی نہیں ہوتا۔ اقلیت کے صوبوں میں بھی چوں کہ مسلمان صوبوں کے نظام حکومت میں مختلف تناسب کے ساتھ شریک ہوں گے، اس لیے ان کو حق ہوگا کہ حکومت سے اپنی مذہبی تعلیم کے تحفظ کا مطالبہ کریں، خواہ اس کے لیے مزید ٹیکس عاید کرنا پڑے یا بہ طور خود اپنی تعلیم کا انتظام کریں، جس کی آزادی ان کو حاصل ہوگی۔ اگر نظام تعلیم اور تعلیمی نصاب مسلمانوں کے قومی و ملی مزاج کے مخالف نہ ہو، محض اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے کلاسوں میں مسلم اور غیر مسلم طلبہ کے ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ جب کہ تعلیمی اداروں کے باہر مختلف ادارہ ہاے حکومت و تجارت و صنعت میں مسلم و غیر مسلم کی شرکت موجود ہے اور شہری و دیہاتی زندگی میں ان کے اشتراک سے گریز ناممکن ہے۔ مسلمانوں میں خالص اسلامی تہذیب کی اشاعت اور غیر اسلامی اثرات کی مدافعت، نجی اصلاحی اداروں کے ذریعے عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

(۴) ہندوستان کی آزادی کا سوال ایک ملکی اور قومی سوال نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی ملی آزادی کا سوال ہے۔ انگریزی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد اعلائے کلمۃ الحق کے وسایل اختیار کرنے کے لیے نہ صرف ہندوستان کے مسلمان موجودہ حالت سے بہتر حالت میں ہوں گے بلکہ اسلامی ممالک کی غلامی کی زنجیریں بھی کٹ جائیں گی ❽۔ اسلام کے اجتماعی فرایض ادا کرنے کے لیے وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے زیادہ آزاد ہوں گے اور ہندوستان کے مسلمان رضا کارانہ حیثیت سے مؤثر امداد کریں گے۔ ہندوستان کے مرکزی حکومت میں مسلمانوں کی مؤثر نمایندگی پورے ملک میں ان کی کثیر تعداد مختلف صوبوں میں ان کی خود مختار حکومتیں اور ان صوبوں کی جغرافیائی حیثیت مسلمانوں کی قومی و ملی خصوصیات اور ہمسایہ اسلامی ممالک سے ان کا مذہبی و سیاسی اتحاد و تعلقات اس بات کی ضمانت ہیں کہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی اسلامی مصالح سے متصادم نہ ہوگی۔

(۵) بلاشبہ اسلامی قوانین ہی دنیا کے لیے حقیقی امن و سلامتی کے ضامن ہیں۔ ہندوستان کی مشترکہ حکومت میں ان قوانین کی حاکیت مطلقہ قایم نہ ہوگی اور نہ حدود شرعیہ جاری ہوں گی، لیکن یہ خود مسلمانوں کا علمی و عملی فریضہ ہے کہ وہ دوسری قوموں سے اسلامی قوانین کی یہ حیثیت تسلیم کرالیں، اھون البلیتین آخری منزل مقصود نہیں ہو سکتی، مسلمانوں کے لیے سعی و عمل کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کی آزادی سے یہ راہیں بند نہیں ہو جائیں گی۔

(٦) آپ کا یہ سوال تمام مغالطوں اور غلط فہمیوں کا سر چشمہ ہے۔ ہندوستان کا نظامِ حکومت خواہ ایک ہی یونین مرکزی کی بنیاد پر قایم کیا جائے، یا دو جداگانہ ریاستوں کے اصول پر بہر صورت مشترکہ نظام ہوگا، جس میں مسلم و غیر مسلم مختلف تناسب مگر یک ساں حقوق و اختیارات کے ساتھ یک ساں شریک ہوں گے۔ محض عددی نسبت کے اختلاف سے اس کی مشترکہ حیثیت میں کوئی فرق پیدا نہ ہوگا ❻ اس لیے مشترکہ نظام کو اسلامی نظام حکومت یا حکومت الٰہیہ نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں تک صوبوں کے داخلی مسایل کا تعلق ہے مرکز کی وحدت اور تعدد سے اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ایک مرکز کے ماتحت بھی صوبے اسی طرح خود مختار ہوں گے جس طرح دو مرکزوں کے ماتحت ان کو آزادی حاصل ہوگی۔ اس لیے اگر مسلمان چاہیں تو ایک یونین میں شریک رہتے ہوئے اس معاشرتی، تمدنی اور اقتصادی مسایل میں اس حد تک اسلامی فکر کو بروئے کار لا سکتے ہیں، جس حد تک غیر قوموں کا اشتراک اس کو برداشت کر سکتا ہے۔ پاکستان کے مشرقی و مغربی منطقوں میں بہ ترتیب ۳۹ اور ۴۰ کی نسبت سے ایک منظم غیر مسلم اقلیت موجودہ کی وجہ سے خالص اسلامیت کو بروئے کار لانے میں جو مشکلات سدِ راہ ہوں گی وہ باخبر لوگوں سے مخفی نہیں ہیں۔ البتہ دفاع، امورِ خارجہ، مواصلات، کرنسی اور بعض محاصل مالیہ کے بارے میں مرکز کی وحدت اور تعدد سے ایک فرق ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ وحدت مرکز کی صورت میں یہ مضامین ایک ایسی یونین کے ماتحت ہوں گے جس میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ سے زیادہ ۴۵ فیصدی ہوگا ❼ جو بجائے خود ایک اہم اور مؤثر تناسب ہے، لیکن اس صورت میں ملک کی طاقت منقسم ہو کر کم زور نہ ہوگی اور خارجی دراندازی کا امکان کم سے کم ہوگا، ہندوستان کی اس

مرکزی قوت سے غیر مسلم اقوام کی طرح ہندوستانی مسلمان اور ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک بھی مستفید ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر یہ موضوعات دو مرکز کے ماتحت تقسیم کر دیے جائیں اور مسلم اکثریت کے صوبوں کا دفاع، خارجہ پالیسی، رسل و رسایل وغیرہ ایک علاحدہ مرکز کے ماتحت دیے جائیں تو بہ حیثیت مجموعی ملکی وقومی نقصانات کے علاوہ اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں ہی کو پہنچے گا۔ ان کی وحدت فنا ہو جائے گی، اقلیت کے صوبوں میں ان کی سیاسی و اقتصادی حیثیت فنا ہو جائے گی اور اکثریت کے صوبوں کی مرکزی حکومت ناقابل حل داخلی و خارجی مصایب میں مبتلا ہو جائے گی۔ بہ حیثیت مجموعی مسلم اکثریت کے صوبوں کی ہمہ گیر اقتصادی پس ماندگی، پانچ میں سے تین صوبوں ⑧ کا خود مکتفی نہ ہونا ۳۹، ۴۰ فیصدی غیر مسلموں کی منظم اور مؤثر اقلیت کی مقاومت وغیرہ پاکستان مرکز کے وہ داخلی مسایل ہوں گے جن سے حکومت عہدہ برآ نہ ہو سکے گی اور اپنی حالت کو سنبھالنے کے لیے کسی دوسری طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہوگی، جس کی وجہ سے اقتصادی زندگی کا توازن بیرونی حکومتوں اور غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا۔ مزید براں یہ حکومت اپنے وسایل کی قلت اور مصارف کی زیادتی کی وجہ سے ملک کی دفاعی ذمے داریوں کو بھی صحیح طور پر پورا نہ کر سکے گی ⑨۔ اس لیے اس ملک کے دفاع کو دولت مشترکۂ برطانیہ کے دفاع سے وابستہ کرنا ہوگا یا اپنے سیاسی مستقبل کی باگ اس کے ہاتھوں میں دینی پڑے گی اور اس طرح یہ نام نہاد سیاسی استقلال روس یا برطانیہ ⑩ کی سیاسی و اقتصادی غلامی میں تبدیل ہو جائے گا اپنی کم زوری اور تباہ حالی کی وجہ سے نہ اس کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل ہو سکے گی اور نہ یہ حکومت اسلامی ممالک کی کوئی مؤثر امداد کر سکے گی، بلکہ روس اور برطانیہ کی سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماج گاہ بن کر رہ جائے گی۔ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعصبات سے برطانیہ کو پورا پورا فایدہ اٹھانے کا موقع میسر آئے گا اور اس طرح ہندوستان سے برطانیہ کے تسلط کے خاتمے کے باوجود از سر نو پاکستان و ہندوستان میں اس کا اقتدار قایم ہو جائے گا۔ پاکستان کے ان یقینی نقصانات کے مقابلے میں وہ متوقع خطرات بالکل بے حقیقت ہیں جو ہندوستان کی ایک یونین کی صورت میں غیر مسلم اقلیت کی وجہ سے پیش آ سکتے ہیں۔ اس لیے پاکستان مسلمانوں کے لیے اهون

البلیتین نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت اہون البلیتین ہے [۱۱]۔

(۷) ہندوستان دارالحرب ہے، وہ اس وقت تک دارالحرب باقی رہے گا جب تک اس میں کفر کو غلبہ حاصل رہے گا۔ دارالحرب کی جس قدر تعریفات کی گئی ہیں اور جو شروط بیان کی گئی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ اسرارہم نے اپنے فتاویٰ میں اس موضوع پر بحثیں فرمائی ہیں، ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ مزید تفصیلات کے لیے جامع الرموز جلد۳ کتاب الجہاد، شامی جلد۳ صفحہ ۳۳۶، ۳۴۵ اور فتاویٰ عالم گیریہ جلد۲ باب استیلاء الکفاء وغیرہ ملاحظہ فرمایے۔

(۸) دارالحرب میں غدر اور خیانت کے سوا ہر طریقے سے اہل حرب کے اموال حاصل کرنا مسلمانوں کے لیے مباح ہے۔ اس لیے مسلمانوں اور حربی کے درمیانی معاملہ سود پر سود کا اطلاق ہی نہیں ہوتا، طرفین کا اصول ہے:

لان الرباء لایجری بین المسلم والحربی فی دارالحرب [۱۲]۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک حربی کے ساتھ بھی سودی معاملات جایز نہیں ہیں۔ جو لوگ از راہِ تقویٰ دارالحرب میں سود لینے سے اجتناب کرتے ہیں وہ امام ابو یوسفؒ کے اسی مسلک پر عمل پیرا ہیں، لیکن یہ تمام تفصیلات اسی صورت میں ہیں جب کہ سود لینے والا مسلمان ہو اور سود دینے والا حربی ہو۔ مسلمان کا مسلمان سے سود لینا یا غیر مسلم کو سود دینا متفقہ طور پر ناجایز ہے۔

(ب) سرکاری بنکوں میں اور ان بنکوں میں جن کے مالک غیر مسلم ہوں رُپیہ جمع کرنا جایز نہیں، کیوں کہ اس رُپے سے وہ کاروبار کر کے مالی استفادہ حاصل کرتے ہیں اور اسی کے منافع سے اسلام اور مسلمانوں کی تخریب پر صرف کیا جاتا ہے، لیکن جمع کرنے کے بعد اس کا سود نہ لینا اور اس کو بنکوں میں چھوڑ دینا بھی جایز نہیں ہے۔ اس رُپے کو جو بنکوں کے سود کے ذریعے حاصل ہوتا ہے مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں صرف کر دینا چاہیے۔

عالم گیری میں ہے:

وما اوجف المسلمون عليه من اموال اهل الحرب بغير قتال يصرف فی مصالح المسلمین⑬. الخ

(ج ۲ کتاب السیر: ص ۲۱۸)

تفصیلات کے لیے ردالمختار جلد ۳ صفحہ ۳۴۵ از شرح السیر الکبیر جلد ۳ صفحہ ۱۴، ۱۷۸، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۲۹ عالم گیری جلد ۲ صفحہ ۲۱۰ وغیرہ ملاحظہ فرمایے۔

(ج) ہندوستان کی زمین نہ عشری ہے نہ خراجی۔

(۹) استعانت بالمشرکین اوران کے ساتھ اشتراکِ عمل کے بارے میں مولانا محمد شفیع صاحب⑭ ومولانا ظفر احمد صاحب تھانوی⑮ وغیرہما کی جانب سے جو فتاویٰ دیے گئے ہیں، ان کے جوابات بھی اخبارات اور مستقل رسایل کی صورت میں شایع ہو چکے ہیں۔ جمعیت علمائے ہند کے دفتر سے یہ جوابی فتاویٰ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مجملاً یہ ہے کہ جن لوگوں نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے، انھوں نے حالات کا صرف ایک رخ نمایاں کیا ہے۔ بلاشبہ اگر مسلمانوں میں بہ ذات خود قوت مقاومت موجود ہو اور استعانت بالکفار میں فتنے کا خوف نہ ہو تو استعانت صرف اس شرط کے ساتھ جایز ہے کہ اسلام کا حکم ظاہر اور غالب رہے، جیسا کہ قایلین عدم جواز نے تصریحات پیش کی ہیں، لیکن اگر مسلمانوں میں بہ ذات خود مقاومت موجود نہ ہو اوران کے لیے کوئی دوسری جائے پناہ بھی نہیں ہے تو اختیار اھون البلیتین کے اصول کے ماتحت بعض کفار کا مقابلہ بعض کفار کی استعانت سے جایز ہے، جیسا کہ حضرت ام سلمہؓ کی حدیث سے واضح ہوتا ہے، (شرح السیر الکبیر: ج ۳، ص ۱۸۷) خصوصاً جب کہ مسلمانوں کے مفاد اور مصالح بھی پیش نظر ہوں تو ایسی استعانت بالکفار کے جواز میں شبہ نہیں ہے۔ چناں چہ شرح سیر الکبیر میں اس قسم کی جزئیات بہ کثرت بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ولو قال اهل الحرب للاسراء فيهم قاتلوا معنا عدوّنا من المشركين. الخ کے ماتحت شارح سرخسی نے فرمایا: فلا رخصة فی ذالك الاعلٰی اعزاز الدين والدفع عن نفسه⑯.

(ج ۳، ص: ۲۴۱، ۲۴۲)

(۲) ولو قال لاسراء قاتلوا معنا عدونا من اهل الحرب

اخرین علی ان نخلی سبیلکم اذا انقضت حربنا. الخ فلا باس بان یقاتلوا معهم⑰.

شارح نے اس صورتِ مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے، اس اعتراض کو بھی دفع کیا ہے، جو عام طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ (ج ۳، ص: ۲۴۱، ۲۴۲)

(۳) قال قیل کیف یسعهم هذا وفیه قوة علی المسلمین لانهم اذا ظفر وابعدوهم فامنوا جانبهم اقبلوا علی قتال المسلمین وربما یاخذون منهم الکراع والمسلاح فیقودون بها علی المسلمین، قلنا ذالك موهوم وما یحصل لهم من النجاة عن اسر المشرکین بهذا القتال معلوم فیترجح هذا الجانب⑱. (ص: ۲۴۲، ۲۴۳)

وان کانوا فی خروبلد یخافون علی انفسهم الهلاك فلا باس بان یقاتلوا معهم المشرکین اذا قالوا نخرجکم من ذالك لان فی هذا القتال غرضاً صحیحا وهو دفع البلاء والضرر الذی نزل بهم⑲. (ص: ۲۴۳)

(٤) ولو ان اهل الحرب ارسلوا الاسراء خاصة ان یقاتلوا اهل الحرب اخرین وجعلو الامیر من الاسراء وجعلواله ان یحکم بحکم اهل الاسلام وسلموا لهم الغنائم یخرجونها انی دار الاسلام فلا باس بالقتال علی هذا اذا خافوهم اولم یخافوا لانهم یقاتلون وحکم الاسلام هو الظاهر علیهم ویکون الجهاد ذالك جهادا منهم⑳. (ص: ۲۴۷)

جوازِ استعانت کی ان صورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے مشرکین کے ساتھ ان شرائط پر اشتراکِ عمل کرنا کہ اس مشترکہ جدوجہد میں فتح حاصل کرنے کے بعد؛

(۱) ملک کے نظامِ حکومت میں ان کا ایک مؤثر حصہ ہوگا۔

(۲) مسلمانوں کا قانونِ شخصی (پرسنل لا) محفوظ ہوگا اور ان کو اس پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔

(۳) مسلمانوں کے مذہبی ادارے، اوقاف، مساجد، مقابر وغیرہ محفوظ رہیں گے۔ اُن کا کلچر اور تہذیب وتمدن محفوظ رہے گا۔

(۴) گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں مسلم اکثریت کی حکومتیں قایم ہوں گی جو تمام داخلی معاملات، قانون سازی، نظامِ تعلیم، اقتصادی نظام کے قیام، معاشرتی اور تمدنی مسایل میں پوری طرح بااختیار ہوں گی، کیا مسلمانوں کے مفاد اور مصالح کے لحاظ سے مفید نہیں ہے؟ یہ مصلحتیں ومفادات ان اغراض سے بہت زیادہ اہم ہیں جن کی بنا پر استعانت بالمشرکین کی اجازت دی گئی ہے۔ اس لیے ہندوستان کی آزادی غیر مسلم جماعتوں اور قوموں سے اشتراکِ عمل کرنا نہ صرف جایز بلکہ ضروری ہے۔

واللہ اعلم والیہ یعول الحق وہوی یہدی السبیل

ننگِ اسلاف

حسین احمد غفرلہٗ

حواشی ونوٹ:

نوٹ: یہ مکتوب سیاسی تاریخ کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ حضرات علما نے جدوجہد آزادی میں جو حصہ لیا وہ ایک سوچے سمجھے نصب العین کے مطابق تھا، تقسیم ہند اور دو قومی نظریے کے جو جھگڑے پیدا کیے گئے اگر مسلمان ان کا شکار نہ ہوتے اور علمائے کرام کی دانش مندانہ سیاست کو تسلیم کر لیتے تو ہندوستان کے صرف ایک ٹکڑے میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں ان کی حیثیت اتنی بلند ہوتی کہ زمامِ اقتدار انھیں کے زیرِ تصرف ہوتی۔ حضرت مدظلہ العالی نے جو کچھ اس مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا ہے وہ جمعیت علمائے ہند کے فارمولے کا مفہوم ہے، جس کی تقریباً تمام دفعات کو کانگریس تسلیم کر چکی تھی۔

❶ وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول سیدھی راہ پر اور سچے دین پر تاکہ اوپر رکھے اس کو ہر دین سے، اور کافی ہے اللہ حق ثابت کرنے والا۔

❷ سربلندی تو اسلام ہی کو ہے، کوئی اس پر حاکم نہیں۔

❸ اور وہ بادشاہ جنھوں نے غیر مسلم حکومت کی ضرورتاً اطاعت کر لی ہے، مسلمان ہیں اور اگر ان کی اطاعت بلاضرورت کے ہو تو فاسق ہیں، لیکن کفار کی اطاعت سو یہ وقتی تدبیر ہے۔

④ جتنا حصہ اس وقت پاکستان کہلاتا ہے وہ تب بھی قدرتی طور پر مسلم اقتدار کے ماتحت ہوتا۔ مزید برآں مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال بھی اسی اقتدار کے ماتحت ہوگا۔ کیوں کہ یہ تمام علاقے جو مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیس اور پٹیالہ یونین پر مشتمل ہے صوبہ پنجاب کا حصہ تھا، جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور اس بنا پر پشاور، کراچی سے سہارن پور تک مسلم اقتدار کے ماتحت آتا۔ کشمیر کا سوال بھی خود بہ خود حل تھا۔ اسی طرح بنگال کا صوبہ آسنسول تک جس میں کلکتہ اور مغربی بنگال کے تمام اضلاع شامل تھے۔ آسام میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں تھی لیکن مسلمان وہاں چونتیس فیصدی تھے، باقی میں ہندو اور پہاڑی علاقے کی اقوام شامل تھیں۔ ہندو بھی چونتیس فیصدی تھے۔ اور توازن مسلمانوں کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ اس بنا پر ۱۹۳۷ء میں سر سعد اللہ وہاں کے وزیر اعظم بنائے گئے تھے۔ یہی حال دہلی کا تھا۔ اس طرح نصف ہندوستان مسلمانوں کے زیر اقتدار آتا اور اس صورت میں مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی نسبت بہت مضبوط ہوتی۔

⑤ ہندوستان کی تقسیم نے اس مقصد کو بہت دھکا لگا۔ یہ مقصد قریب قریب فوت ہوگیا۔ کیوں کہ اول تو ہندوستان کی طاقت گھٹ کر نصف رہ گئی، پھر وہ بھی رات دن خود اپنے مسایل میں الجھی ہوئی۔ چناں چہ کشمیر یا نہروں کے پانی جیسے مسایل نے ہندو پاکستان دونوں کو ایک دوسرے کے برخلاف ایسی پیچیدگی میں مبتلا کر دیا ہے کہ کسی دوسرے بین الاقوامی مسئلے پر اثر انداز ہونے کے بجائے یہ دونوں ملک دنیا کی بڑی طاقتوں کے رحم و کرم کے محتاج بن گئے ہیں۔

⑥ علاوہ ازیں پاکستان ایسی نکیل ہے کہ دنیا کی کوئی بھی بڑی طاقت اگر اس کو تھامے رہے تو ہندوستان کا اونٹ بدک کر کبھی بھی کسی دوسری طرف نہیں جا سکتا۔

یہ تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے جب پاکستان کا تصور جنم لے رہا تھا اور تبادلۂ آبادی کی بھیانک تصویر کسی کے خواب میں بھی نہیں آئی تھی۔ اب جب کہ پاکستان بن چکا اور غیر مسلموں کا تناسب بھی وہاں قایم نہیں رہا تو کیا کوئی اس خالص مسلم اسٹیٹ کے متعلق دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہاں اسلامی نظام حکومت یا حکومت الٰہیہ ہے۔

آج اس کے پرانے عقیدت مند بھی اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ پاکستان کا موجودہ نظام حکومت نہ صرف اسلام کے دامن پر تقدس پر بدنما داغ ہے بلکہ موجودہ ملت اسلامیہ کے لیے بھی ننگ و عار ہے۔

⑦ جمعیت علمائے ہند اور قوم پرور مسلمانوں نے جو فارمولا کانگریس کے سامنے پیش کیا تھا اور اگست

۱۹۴۲ء کے اجلاس میں کانگریس نے اس کو تقریباً منظور بھی کر لیا تھا، اس کی اہم دفعات یہی تھیں: (۱) صوبے آزاد ہوں گے۔ (۲) چند موضوعات کے علاوہ باقی جملہ مصرحہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہوں گے۔ (۳) مرکز میں نمائندگی اس طرح ہوگی، ہندو ۴۵ فیصدی، مسلمان ۴۵ فیصدی اور دیگر اقلیتیں ۱۰ فیصدی۔

❽ صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان۔

❾ جب کہ پاکستان بنے ہوئے دس سال ہو چکے ہیں، اس پیشین گوئی کی صداقت کا مشاہدہ فرمایئے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی: اتقوا فراسة المؤمن فانه یری بنور اللہ او کما قال صلی اللہ علیه وسلم کی تصدیق کیجیے۔ ترجمہ: مومن کی فراست اور دوسرا اندیشی سے پرہیز کرو وہ اللہ کے نور سے مستقبل کو دیکھتا ہے۔

❿ ۱۹۴۰ء کی جنگ عظیم نے برطانیہ کی جگہ امریکا کو سیاست کا امام بنا دیا۔

⓫ دنیا میں شاید ہی کوئی پیشین گوئی اس سے زیادہ سچی ثابت ہوئی ہو۔ کیا اسی پر کہا جاتا ہے کہ علما سیاست نہیں جانتے؟

⓬ کیوں کہ دار الحرب میں مسلم اور کافر کے درمیان سود کا حکم نہیں جاری ہوتا ہے۔

⓭ کفار کے جن املاک پر مسلمان بغیر جنگ کے قابض ہو جائیں، ان کی آمدنی مسلمانوں کے مفاد عامہ پر صرف کی جائے گی۔

⓮ عشری زمین ہونے کی ابتدا پانچ صورتیں ہیں؛ (۱) اول یہ کہ کسی شہر اور گاؤں کے حربی کفار مسلمان ہو گئے تو وہ شہر اور گاؤں عشری ہوگا، یعنی ان کی اپنی تمام زمینوں کی پیداوار میں عشر (جو زکوٰۃ ہے) ادا کرنا ہوگا۔ (۲) دوم یہ کہ ملک عجم کے بلاد کو مسلمانوں نے بہ زور شمشیر فتح کر لیا اور وہاں کی زمین مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دی گئی تو وہ بھی عشری ہوگی۔ (۳) سوم یہ کہ عرب کے بت پرستوں پر مسلمانوں نے بہ زور شمشیر فتح پائی تو وہاں کی سب زمین عشری ہوگی، اگرچہ وہ زمین مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہ کی جائے۔ کیوں کہ جزیرۂ عرب میں کفار کے قیام کی کوئی صورت نہیں ہے جو ان پر خراج لگایا جائے۔ (۴) اسلامی مقبوضہ کی پرانی زمین جس پر کسی کا قبضہ نہ ہو اس کو کسی مسلمان کا آباد کرنا اور عشری زمین سے قریب ہونا یا عشری پانی یا خرابی اور عشری دونوں پانی سے سیراب ہوتی ہو تب بھی عشری ہے۔ (۵) کسی مسلمان نے اپنے گھر کی زمین کو باغ یا کھیت بنا لیا تو اس پر بہرحال عشر واجب ہے بہ شرطے کہ سیرابی صرف خراجی پانی

سے ہوتی ہو۔

زمین کے خراجی ہونے کی دو صورتیں ہیں:

(الف) جب کفار کے ملک و بلاد کو مسلمانوں نے بہ زور شمشیر فتح کر لیا، لیکن زمین مسلمانوں میں تقسیم نہیں ہوئی بلکہ زمین ان ہی کافروں کی ملک میں چھوڑ دی گئی تو اس زمین پر مسلمان حاکم خراج مقرر کرے گا۔

(ب) کسی شہر، گاؤں یا ملک کے کافروں نے بغیر لڑائی و جہاد مسلمانوں کی اطاعت کر لی ہو اور صلح کر لی ہو تو اس صورت میں بھی ان مقامات کی زمین کافروں ہی کی ملک ہوگی اور اس پر خراج لگایا جائے گا۔ کتاب العشر والزکوٰۃ

⑮ مولانا عبدالحق نافع مدظلہ نے نافع المہدی نامی رسالے میں فاضلانہ جوابات دیتے ہوئے تدلیس سے کام لینے والے مولویوں کا بھانڈا پھوڑا ہے اور حضرت امام العصر نے تو مجتہدانہ انداز اپنے اس والانامہ میں اختیار فرمایا کر اصولی نکتوں پر اکتفا فرمایا ہے، جو اپنی جگہ سب سے بڑی حجت ساطعہ ہے، سچ ہے ''لکل فن رجال۔''

⑯ اگر کفار اپنے مسلمان قیدیوں سے کہیں کہ ہمارے ساتھ ہمارے مشترک دشمنوں سے جنگ کرو، تو بہ قول شارح سرخسی اجازت نہ ہوگی۔ البتہ دین اسلام کی ترقی اور اپنے اوپر سے مصیبت دور کرنے اور جان بچانے کے لیے جنگ کرنا جایز ہوگا۔

⑰ اگر کفار مسلمان قیدیوں سے کہیں کہ ہمارے دشمنوں سے ہمارے ساتھ جنگ کرو اور ہم اختتام جنگ پر تم کو رہا کر دیں گے تو اس شرط پر ان کی امداد میں مسلمان جنگ کر سکتے ہیں۔

⑱ اگر اس پر یہ اعتراض ہو کہ مذکورہ بالا شکل میں بھی مسلمانوں کی قوت کم زور ہو جائے گی، کیوں کہ کفار اپنے حریف پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد اپنے دشمنوں سے اطمینان حاصل کر کے مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار ہوں گے اور مسلمانوں کا ساز و سامان ان سے چھین لیں گے اور اس طرح مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی طاقت مضبوط ہو جائے گی تو ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ اندیشہ وہمی ہے اور مسلمانوں کا کفار کی قید سے نجات پانا قطعی ہے، لہٰذا جنگ کرنے کی تجویز کو ترجیح حاصل ہے۔

⑲ اگر مسلمان ایسے ملک میں ہوں جہاں ان کو اپنی ہلاکت کا خطرہ ہے تو اس صورت میں یہ مسلمان ان کافروں کے ساتھ مل کر ان کے مشترک دشمنوں سے جنگ کر سکتے ہیں، بہ شرطے کہ کفار ان کے اس خطرے کو دور کرنے کا وعدہ کریں، کیوں کہ اس جنگ کا جایز مقصد ہے یعنی اپنے اوپر سے خطرہ اور ہلاکت

کا دور کرنا۔

⑮ اگر کفار مسلمان قیدیوں کو کافروں سے جنگ کرنے کے لیے بھیجیں اور مسلمان ہی کو مسلم فوج کا سردار بنائیں اور اس مسلمان افسر کو یہ اختیار ہو کہ وہ احکام اسلامی کے مطابق فیصلہ کرے اور جو مال غنیمت حاصل کریں وہ ان مسلمانوں کے ہی حوالے ہو کہ وہ دارالاسلام میں لے جاسکیں تو اس صورت میں جنگ کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے، خواہ مسلمانوں کو ان سے خطرہ ہو یا نہ ہو، کیوں کہ موجودہ صورت میں ان کی جنگ اسلامی قانون کے ماتحت ہوگی اور یہ جہاد خود ان کی طرف سے ہوگا۔ غلبۂ اسلام کے لیے ہوگی اور ان کی جہاد شرعی جہاد ہوگا۔

تقسیم ملک میں عجلت! چہ معنی دارد؟

نوٹ: ''حصول پاکستان کے لیے اگر جناح صاحب جلدی کے خواہاں تھے تو یہ بات واضح ہے کہ وہ اس میں اقتدار سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے اور اس خواہش کے لیے انھیں ہرگز الزام نہیں دیا جاسکتا۔ سوچنے کی اصل بات یہ ہے کہ انگریزوں کو کیا جلدی تھی؟ وہ تو اقتدار چھوڑ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ سے تو سونے کی چڑیا نکل رہی تھی۔ انھیں تو اپنے اقتدار کی مدت کو طول دینا چاہیے تھا۔''

۲۰ رفروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم کلیمنٹ اٹیلی نے بالآخر برطانیہ کے اقتدار کے خاتمے کا اعلان کیا۔ آخری سامراجی لارڈ ویول کو ہٹایا اور بتایا کہ جون ۱۹۴۸ء تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس سلسلے کی اختتامی تقریبات کی سربراہی کریں گے۔ آخری تاریخ کے آنے میں ابھی ایک سال سے زاید کی مدت باقی تھی۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر لارڈ ماؤنٹ بیٹن مدت میں مختصری مزید توسیع کے لیے نہایت آسانی سے درخواست کر سکتے تھے، مگر انھوں نے التوا یا تاخیر کی بجائے بے حد جلدی کی۔ ان کی اس جلد بازی کی کوئی منطقی وضاحت آج تک نہیں ہو پائی ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا عذر یہ رہا ہے کہ اگر انھوں نے انتقال حکومت میں ذرا بھی تاخیر کی ہوتی تو اس کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہوتی جو دینی پڑی، مگر یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ بہر حال یہ سمجھ میں آنا مشکل ہی نظر آتا ہے کہ اس صورت میں اور ابتری ہی ہوتی، کیوں کہ نہ صرف ملک ہی تقسیم ہوا تھا بلکہ چند ہفتوں کے اندر ہزاروں انسانی

جانیں اس تقسیم کی نذر ہو گئی تھیں۔ اور اسی کی وجہ سے جنگوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو ابھی بھی ختم نہیں ہو پایا ہے۔ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ انگریزوں نے انتقال حکومت میں اتنی جلدی اس لیے دکھائی کہ وہ ایک ایسی بات جانتے تھے جو ان کے اور خود جناح صاحب کے علاوہ کوئی تیسرا نہیں جانتا تھا۔ اور یہ بات یا یہ راز تھا پاکستان کے خالق جناح صاحب کا دق کا مرض، اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا اور اگر وہ پاکستان کے قیام کے منصوبے کے اعلان سے پہلے مر جاتے تو شاید ایک الگ ملک کے مطالبے کی تحریک دم توڑ دیتی۔ اس اندازِ فکر کا جواز موجود تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان ووٹروں نے مسلم لیگ کی حمایت کبھی نہیں کی اور پاکستان کی تحریک نے صرف چوتھی دہائی کے وسط میں اس وقت تقویت حاصل کی جب جناح صاحب خوف وہراس کی فضا بنانے میں پورے طور پر کامیاب ہو گئے۔

پاکستان مسلم عوام نے نہیں بنایا، اس کا جنم تو مرہون منّت ہے ان مٹھی بھر لیڈروں کا جن کے لیے محض عقاید میں علاحدگی باعث تسکین نہیں تھی۔ وہ تو الگ الگ حلقہ انتخاب، الگ الگ زبانیں، الگ الگ لباس، الگ الگ شناختیں، حتیٰ کہ الگ الگ گھر چاہتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں اپنے قیام کے بعد صرف ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو کچھ ووٹ ضرور ملے تھے۔ مگر لیگ خود اپنے قایم کیے ہوئے ملک میں بھی زندہ نہیں رہ پائی۔ پاکستان سے ہمدردی رکھنے والے مفسرین نے بھی مسلم لیگ کے لیے عام حمایت کی کمی کو محسوس کیا۔ مثال کے طور پر خالص انگریز اخبار دی اسٹیٹس مین (جس کی ملکیت بھی انگریزوں کی تھی) کے انگریز ایڈیٹر ایان اسٹفین (Ian Stephens) جنھیں سارے واقعات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور نئے ملک سے ان کو ہمدردی بھی بہت تھی، اپنی کتاب ''پاکستان اولڈ کنٹری-نیونیشن'' (Penguin Books, p. 90) میں کہتے ہیں:

''لندن میں کچھ دنوں وکالت کرنے کے بعد مسٹر جناح ۱۹۳۴ء میں ہندوستان آئے اور یہاں انھوں نے کچھ ہی عرصے میں اپنے آپ کو مسلم لیگ کے لیڈر کے منصب سے سرفراز پایا۔ کانگریس کی بجائے انڈین لبرل پارٹی کی طرح مسلم لیگ نے بھی ابھی تک عوامی رابطے کی کوشش شاذ و نادر ہی کی تھی اور اس کی حیثیت طبقۂ امرا کے ان افراد کے لیے جو ایک خاص قسم کی سیاسی دل چسپی رکھتے تھے، تبادلہ خیال کی ایک جماعت سے زیادہ کچھ نہیں ہو

سکتی تھی۔ فلسفی شاعر سر محمد اقبال نے جناح صاحب کے نام اپنے ایک خط میں جو انھوں نے ۲۸ رمئی ۱۹۳۷ء کو لکھا تھا، اس خط میں شاعر نے سیاست دان سے کہا تھا:

''لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آیا وہ ہندوستانی مسلمانوں کے امرا کی نمائندہ جماعت بنی رہے گی یا وہ ان مسلم عوام کی نمائندگی کرے گی جنھوں نے ابھی تک بہ وجوہ اس میں کوئی دل چسپی نہیں لی ہے۔ اپنے طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کے حالات کو بہتر کرنے کا وعدہ نہیں کرتی ہے وہ ہمارے عوام کی توجہ بھی اپنے طرف مبذول نہیں کرا سکتی۔''

ہمارا ذہن پھر اسی بنیادی سوال کی طرف لوٹتا ہے، آخر کس کا مفاد تھا جس کی خاطر پاکستان کا قیام عمل میں آیا؟ یہ مفاد بہرحال مسلم عوام کا مفاد نہیں تھا۔ اسے صرف انگریزوں کی دین کہنا چاہیے کہ جناح صاحب مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا دعویٰ کر سکے۔ یورپ میں جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو کانگریس نے اس سلسلے کی برطانوی کوششوں میں مدد دینے سے انکار کیا۔ اور (۱۹۳۷ء میں منتخب ہونے والی) اپنی صوبائی حکومتوں سے مستعفی ہو جانے کے لیے کہہ دیا۔ جناح صاحب کے لیے جو انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے یہ موقع فیضان الٰہی تھا۔ اور اسی وجہ سے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیانی دس برسوں میں مسلم لیگ نے انگریز دوستی کا زبردست اور سرگرم رول ادا کیا۔ ان دس برسوں میں انگریزوں کے خلاف اس نے نہ تو کوئی تحریک خود چلائی اور نہ ہی کسی ایسی تحریک میں شرکت کی۔ اپنے سارے جوش و خروش اور غم و غصے کو کانگریس کے لیے محفوظ رکھا جو نو آبادکاروں کی مخالفت بدستور جاری رکھے ہوئے تھی۔ دوسری طرف جناح صاحب ہر ہر موقع پر انگریز کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ چناں چہ جب کانگریس وزارتوں نے استعفے دے دیے تو جناح صاحب نے اعلان کیا کہ ۲۲ رنومبر ۱۹۳۹ء کو ''یومِ نجات'' منایا جائے گا۔ جنگ کے زمانے میں بنگال جیسے اہم صوبے میں لیگ کو حکومت کا وہ مزا ل گیا جس سے وہ ۱۹۳۷ء میں محروم رہی تھی۔ جناح صاجب کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ ریاستی مشینری کو اپنے پروپیگنڈے کے لیے ہتھیار کی طرح استعمال کریں۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ نے ''ہندو کانگریس سے اسلام کو خطرہ'' کے نعرے کو اپنی مہم کا موضوع بنایا تھا، جسے بہرحال

مسلمانوں نے مسترد کر دیا تھا۔ اب انگریزوں نے فیصلہ کیا اور انتہائی اہم اور تشویش ناک فیصلہ یعنی انتخابات میں شکست کھائے ہوئے ان ہی جناح صاحب کو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمایندہ آواز بننے کا حق دینے کا فیصلہ۔ ۱۹۴۶ء کے اوایل میں جب جنگ سے تھکے ہوئے اور نڈھال انگلستان نے ہندوستان کے مسئلے کا حل ڈھونڈنا شروع کیا تو جناح صاحب کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اگر برصغیر تقسیم نہ کیا گیا تو وہ ہندوستان میں سول وار کی دھمکی تو دے ہی سکیں گے۔ ۱۶/اگست ۱۹۴۶ء کو یوم راست اقدام کے ذریعے بنگال میں شہید سہروردی کی مسلم لیگی حکومت نے یہ بات ظاہر کر دی کہ برسر اقتدار لیگ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ کلکتہ خوف ناک فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ لیگ کے مسلح کارکنوں نے بڑی پیمانے پر ہندوؤں پر حملے شروع کر دیے۔ اس کے جواب میں ہندوؤں نے بھی ویسی ہی شقاوت اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔ یہ سول وار کی دھمکی کے سچ ہونے کا ایک انتباہ تھا۔ قتل و آتش زنی کا دور دورہ ہوا۔ دلوں میں خوف و ہراس بیٹھ گیا اور یہی غیر فطری ماحول تھا جس میں مسلم لیگ نے اپنے ووٹوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کا اہتمام کر لیا۔ فروری ۱۹۴۷ء کو آزادی کا اعلان ہو گیا۔ مارچ میں ماؤنٹ بیٹن آئے، اپریل کے آغاز میں ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے چھ ملاقاتیں کیں۔ ۱۰/اپریل کو برطانیہ نے تقسیم کو منظور کر لیا۔ یکم مئی کو کانگریس نے ہتھیار ڈال دیے اور اس کی ہائی کمان نے نہرو کو ایک منقسم ہندوستان کی آزادی کو مان لینے کا اختیار دے دیا۔ گاندھی جی نے بڑی بے چارگی کے ساتھ جو کچھ ان کے چاروں طرف ہو رہا تھا اس میں معنویت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ انھوں نے کانگریس سے ایک متحدہ ہندوستان میں جناح صاحب کو برسر اقتدار آنے دینے کی اپیل تک کی، مگر قتل و غارت گری اور بربریت کے اس بے نظیر دور دورے میں انسانیت اور سمجھ داری کی بات کون سنتا!

۳/جون کو ایک گول میز کانفرنس میں تقسیم کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت ہوئی۔ کانفرنس میں نہرو، سردار پٹیل اور اچاریہ کرپلانی نے کانگریس کی نمایندگی کی۔ مسلم لیگ کی طرف سے جناح صاحب، لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر شریک ہوئے۔ برطانیہ کے ترجمان ماؤنٹ بیٹن، لارڈ اسمے اور سر ایرک میویل تھے۔ ۴/جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے

ہندوستان کے وائسرائے کی محض دوسری پریس کانفرنس کو خطاب کیا اور اعلان کیا کہ ۱۵ار اگست کو حکومت منتقل ہو جائے گی۔ صرف دو ماہ باقی تھے۔ سرحدوں کے تعین کا سب سے دشوار کام ابھی تک شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ وکیل سر سیسل ریڈکلف (Sir Cycil Redcliffe) کو لندن سے بلایا گیا کہ وہ ایک ایسے برصغیر کے دل پر نشتر چلائیں جسے انھوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ مُلّا ایک ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جناح صاحب اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ چوں کہ انھوں نے ۱۹۳۳ء کے ایکِ ناممکن خواب کو ممکن بنا کر دکھا دیا تھا، وہ اسے ایک نظریہ دینے میں کامیاب ہوں گے۔ مگر پاکستان ان لبرل اصولوں کی خاطر وجود میں نہیں آیا تھا، جن کو جناح صاحب خود اس وقت تک مانتے رہے تھے، جب تک کہ ان پر ایک ضد نہیں مسلط ہوئی تھی۔ تاریخ نے آج یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کون تھا جس نے حقیقتاً پاکستان کے خیال کی تشکیل کی اور مذہب کے نام پر بنے ہوئے اس ملک میں کون حکومت کرنے والا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پانچ سال کے اندر اندر لیاقت علی خاں کے قتل سے جناح صاحب کا سیکولرزم ختم ہوا۔ اگلی دہائی میں ایوب خان نے جناح کی جمہوریت کو دفن کیا اور ۲۵ برس کے اندر پاکستان تباہ ہو چکا تھا۔ تو پھر ۱۴ر اگست کو جناح صاحب نے کیا بات ثابت کی سوائے اس کے کہ انھوں نے یہ بھی نہیں جانا کہ اپنی زندگی کے آخری دس برسوں میں انھوں نے کیا کیا؟

(ہندوستان اپنے حصار میں: ص ۳۳-۳۰)

انگلستان کا سفیر اور پاکستان کی وکالت:

ایک دوسرے سفیر نے جو کچھ کہا وہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں تا کہ قارئین اس رائے سے بھی واقف ہو جائیں۔ یہ انگلستان کا نمائندہ تھا۔ باتیں کرتے کرتے تقسیم ملک کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے اظہار افسوس کیا کہ انگریزوں نے تین سو برس میں جو کچھ کیا تھا ملک کا بٹوارا کر کے اس پر پانی پھیر دیا۔ انھوں نے اس ملک کی وہی ہیئت کر دی تھی جو ہمارے قومی احساس میں مضمر تھی۔ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک انھوں نے اس برصغیر کو ایک متحدہ شکل دے دی۔ قانون اور امن و امان کا دور دورہ ہو گیا اور عوام کی بے اطمینانی سکون و اطمینان سے بدل دی، لیکن خود انگریزوں نے یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے ملک کے

دو ٹکڑے کر کے اپنے ہاتھوں اپنے کارناموں کو ملیامیٹ کر دیا۔

میں نے کہا کہ جہاں تاریخ انگریزوں کے کارناموں کو سراہے گی، وہاں اس تقسیم ملک کو کبھی معاف نہ کرے گی۔ یہ سب سن کر اس نے جواب دیا:

''برطانوی باشندے اس کو کبھی نہیں برداشت کر سکتے کہ بے بس مسلمانوں کی اقلیت کو بے رحم ہندوؤں کی اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ جائیں۔ اس لیے جب ہم نے اس ملک کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تو یہ بالکل مناسب کام تھا کہ ملک کے دو ٹکڑے کر کے مسلمانوں کے لیے ایک گھر بناتے جائیں۔''

میں نے کہا کہ

''تقسیم کے وقت متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی ایک چوتھائی سے زیادہ تھی۔ تقسیم ہو جانے پر بھارت یعنی تقسیم شدہ ہندوستان میں ان کی تعداد دسواں حصہ ہو گئی۔ اگر یہ فرقہ جو آبادی کا پچیس تیس فیصد تھا اکثریت سے ڈرتا اور پریشان تھا تو دسواں حصہ بن جانے پر تو وہ اور خوف زدہ ہو جائے گا۔ یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ مسلمانوں کا ایک ایک فرد اپنی ہر چیز چھوڑ کر دوسرے خطے میں چلا جائے۔ بٹوارا کرنے والوں کا اور خاص کر انگریزوں کا یہ فرض تھا کہ وہ سمجھ لیتے کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کی آبادی کا تناسب ہندوؤں سے بہت زیادہ کم ہو جائے گا۔ تقسیم کرنے والے کی منطق ہی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس حالت میں مسلمانوں کے لیے خطرہ بڑھ جائے گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان مسلمانوں کے لیے انگریزوں نے کیا بندوبست کیا۔''

اس کا جواب یہ ملا کہ

''میں سیاسی آدمی نہیں بلکہ ایک ڈپلومیٹ ہوں۔ اس لیے اس مسئلے پر کوئی رائے دینے سے قاصر ہوں۔''

سری پرکاش نے جو سوال ایک برٹش ڈپلومیٹ سے کیا اور وہ لاجواب ہوا، اس سوال کا جواب کسی لیگی رہنما اور پاکستانی رہنما کے پاس بھی نہ تھا۔ تحریک پاکستان کے سب سے

بڑے رہنما نے تو ہندوستان کی مسلم اقلیت کو پاکستان کی مسلم اکثریت پر قربان کر دینے اور انھیں رایٹ آف کر دیے جانے کا اعلان فرما دیا تھا۔

آج بھی کسی لیگی کے پاس اس کا جواب نہیں کہ اگر ایک اقلیت کو دوسری اکثریت کے مفاد پر قربان کر دیا جا سکتا ہے اور سیاست و تدبر اسی کا نام ہے تو اب پاکستان کے تیرہ کروڑ کو ہندوستان کے بیس کروڑ مسلمانوں کے مفاد پر قربان کر دینا چاہیے!

اس سے آگے سری پرکاش اس برٹش ڈپلومیٹ کے تذکرے کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اپنے مزید شکوک کا اظہار کیا میں نے کہا: ''اگر ہندوستان سے رخصت ہوتے ہوئے آپ کو اس کی بڑی فکر تھی کہ یہاں کے ہر فرقے کا تحفظ کر دیا جائے، تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے والیان ریاست کے لیے کیا انتظام کیا؟ برٹش انڈیا میں ہر ہندو اور مسلمان آزادی کا طلب گار تھا، لیکن کسی والی ریاست نے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے کبھی بھی برطانیہ سے علاحدگی نہیں چاہی۔ حتیٰ کہ ملکی مفاد کو ٹھکراتے ہوئے انھوں نے ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیا۔ فرماں روائے انگلستان کے ساتھ ان کی خاص وابستگی تھی۔ آپ لوگ ان کو بے دست و پا بنا کر چل دیے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حیدر آباد اور کشمیر میں کیا ہوا۔ انھوں نے کتنے معاہدے کر کے خود کو آپ سے کتنا وابستہ کر رکھا تھا۔ آپ نے ان کے لیے کوئی بندوبست کیوں نہیں کیا؟

اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور بات ختم ہو گئی۔ میں نے اس سے اس قسم کے سوالات کرنے کی معافی چاہی۔

''میں اس کو بالکل ماننے کے لیے تیار نہیں ہوا کہ بٹوارا اٹل تھا۔ کم از کم میں تو یہی دیکھ رہا ہوں کہ بٹوارے سے ہندو، مسلمان اور دوسرے فرقے جو اس ملک میں بسے ہوئے ہیں، سب ہی کو نقصان پہنچا۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ بلند نظری اور دل کش نصب العین برباد ہو گیا۔ ہم کوشاں تھے کہ اپنے ملک میں سماج کو ایسا بنائیں گے کہ مختلف مذاہب میں باہمی رواداری کی فضا پیدا ہو جائے۔ یہ آرزو ایک خواب و خیال بن کر رہ گئی۔ میرا ذاتی خیال تو بالکل یہی ہے۔ میری سمجھ میں یہ بالکل نہیں آتا کہ یہ مصایب کا پہاڑ جو ہم پر ٹوٹ پڑا ہے

کیسے ہٹایا جاسکتا ہے؟ یہ اگرچہ مسٹر جناح نے مجھ سے کہا تھا کہ پاکستان بنتے ہی تمام شکایتوں کا خاتمہ ہوجائے اور ہماری تمام مشکلات و معاملات کا حل نکل آئے گا، لیکن میری نظروں کے سامنے تو یہ ہے کہ نہ صرف پرانے جھگڑے جوں کے توں ہیں بلکہ ایسی نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کا کوئی حل نہیں۔ باہمی تلخیاں اور منافرت روزافزوں ہے اور کسی کو بھی نہ تو سیاسی سطح پر کوئی فایدہ پہنچا ہے نہ اخلاقی بنیاد پر!''

اس حقیقت پسندانہ بیان کی روشنی میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تاریخ نے تحریک پاکستان کے رہنما کے تدبر کے خلاف کتنا سنگین فیصلہ کیا ہے!

سری پرکاش صاحب مزید لکھتے ہیں:

''ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے لیڈروں نے بٹوارہ مانا ہی کیوں؟ ہر ایک جانتا ہے کہ مہاتما گاندھی اس تقسیم کے مخالف تھے۔ خود مجھ سے انھوں نے کہا کہ ''میری زندگی بھر کی محنت ایک گندے نالے میں پھینک دی گئی۔''

وہ فرقہ وارانہ اتحاد کے حامی تھے اور اس کے لیے انھوں نے اپنی جان کی بازی بھی لگادی تھی، لیکن اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ اختلاف کی بنیاد پر دو بلکہ تین حصوں میں ملک کا بٹوارا ہوگیا۔..........''

''یہ واضح ہو کہ اس وقت انگریز کانگریسی اور مسلم لیگی لیڈروں سے گفت وشنید کر رہے تھے۔ انھوں نے ملک کے دو حصے کر کے ایک کانگریس کو اور دوسرا مسلم لیگ کو دے دیا اور خود چلتے بنے۔ دراصل انگریزوں نے ہمارے مطالبۂ سوراج کا انتقام لیا۔ ہمارے رہنماؤں نے اس فیصلے کو تسلیم کرلیا۔ یقیناً وہ لوگ جو میرے ہم خیال ہوں گے ان کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ ان لیڈروں نے ایسا کیوں کیا؟'' (پاکستان- قیام اور ابتدائی حالات: ص ۲۶-۱۲۴)

ڈاکومنٹ نمبر ۸۲: ریئر ایڈمرل وسکاؤٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کی مسٹر جناح سے ملاقات کا ریکارڈ ماؤنٹ بیٹن پیپرز، وایسرائے کا انٹرویو نمبر ۱۶۲:

۱۲ر جولائی ۱۹۴۷ء بہ وقت چھ تا سات بج کر پچاس منٹ شام میں نے ان سے

عبوری حکومت کی تشکیل نو کے مسئلے پر گفتگو کی اور کمیونک کے مسودے کی نقل ان کو دی۔ وہ اس پر بہ طور خاص مشکور نہیں ہوئے اور اپنے انداز میں کہا: ''میں اس پر اپنے رفقا سے مشورہ کروں گا۔'' میں نے ان کی توجہ اس نکتے کی جانب مبذول کرائی، جو میں نے پہلے ان کو بتایا تھا کہ عبوری حکومت کے تمام شعبہ جات کانگریس کے سپرد کردیے جائیں اور مسلم لیگ ظلی کابینہ (Shadow Cabinet) تشکیل دے لے۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے اس پہلو پر اپنی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے مشورہ کیا ہے اور انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس اسکیم سے بالکل تعاون نہیں کریں گے بلکہ اسے قبول بھی نہیں کریں گے۔ میں نے انھیں بتایا کہ آپ کس قدر خوش نصیب تھے کہ میں ایک متبادل تلاش کرنے میں کامیاب ہوا۔

میں نے ان کو حیدرآباد کے وفد سے ملاقات کا احوال بتایا۔ (ڈاکومنٹ نمبر ۶۱) اور انھیں وہ خطوط بتائے جن پر میں کام کررہا تھا۔ انھوں نے مجھے مطلع کیا کہ اگر کانگریس نے حیدرآباد پر کوئی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تو تمام ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ایک ہوکر ہندوستان کی قدیم ترین سلطنت کے دفاع کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

میں نے ان کو بتایا کہ نظام کو کسی مسلح مداخلت کا خطرہ نہیں ہونا چاہیے تا آں کہ وہ کانگریس کے ساتھ چال بازی نہیں کرتا! کیوں کہ وہ (کانگریس) نظام کے ساتھ کسی چال بازی کا ارادہ نہیں رکھتی جس کے نتیجے میں سلطنت میں گڑبڑ ہو اور دس کروڑ مسلمان اٹھ کھڑے ہوں۔

میں نے ان سے ریاستوں کے بارے میں پالیسی پر گفتگو کی جو دونوں ڈومینیز اختیار کریں گی اور خان آف قلات کے ساتھ ۱۹؍جولائی کو میٹنگ کے لیے ان کی رائے جاننا چاہی اور مسئلے کا حل بتایا کہ وہ اس بنیاد پر پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر اصرار کریں گے کہ تین شعبہ جات ڈیفنس، امورِ خارجہ اور مواصلات پاکستان کے پاس رہیں۔

انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ اس پر غور کریں گے اور میں خان آف قلات سے آپ کی ملاقات کے بعد ملنا پسند کروں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ریاستوں کے مسئلے پر پاکستان کا نقطۂ نظر جاننا چاہتا ہوں۔

تب مسٹر جناح نے مجھے بتایا کہ وہ نشتر کو بلوچستان کا گورنر بنانے کے بارے میں غور

کررہے ہیں۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اس قسم کا کوئی قدم اس وقت تک نہ اٹھائیں جب تک اس معاملے پر سر کونراڈ فیلڈ سے گفتگو نہ کرلیں۔ ان سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کریں کہ آیا صوبہ سرحد کا پٹھان نشتر بلوچستان کے قبایل کے لیے قابل قبول بھی ہوگا؟ اوراس کے متبادل کے لیے بھی گفتگو کریں کہ کون سے برطانوی پولی ٹیکل آفیسرز زیادہ مفید ثابت ہوسکتے ہیں؟

میں نے ان کو سیکرٹری آف اسٹیٹ کے ٹیلی گرام کی نقل دی، جس میں صوبہ سرحد کے لیے جارج کننگھم کو گورنر مقرر کرنے کی چند شرایط کے ساتھ منظوری دی گئی تھی۔ (ڈاکومنٹ نمبر ۱۳، پیرا نمبر ۵ اوراس کے نوٹس نمبر ۶ اور ۷) میں نے ان سے کہا کہ وہ مجھے جلد از جلد شرایط کی قبولیت سے آگاہ کردیں۔

میں نے انھیں مطلع کیا کہ دفتر خارجہ نے اب لارڈ کیلرن سے گفتگو کرنے کا مجھے اختیار دے دیا ہے اور میں نے آج ان کو اس سلسلے میں سنگاپور ٹیلی گرام ارسال کردیا ہے۔ (لارڈ کیلرن نے آخر کار مشرقی بنگال کا گورنر بننے سے انکار کردیا تھا۔ دیکھیں جلد گیارہ ڈاکومنٹ نمبر ۸۷۴، نوٹ نمبر ۳) کہ وہ دہلی آئیں اور میرے ساتھ قیام کریں اور مشرقی بنگال اور سلہٹ کا گورنر بننے کے معاملے پر مسٹر جناح سے گفتگو کریں۔

تب میں نے مسٹر جناح کو وایس ایڈمرل مایلز کا اصل خط ۱۱ر جولائی کو دیا جو رایل پاکستان نیوی کے مستقبل کے فلیگ آفیسر کے بارے میں تھا۔ میں نے مسٹر جناح سے کہا کہ وہ مسٹر مایلز کو بلوالیں اور ان سے اس سلسلے میں گفتگو کریں۔ بعد میں دو متعلقہ افسران کو بلائیں اور گفتگو کریں۔ میں نے ان سے دریافت کیا آیا انھوں نے پاکستان کے جھنڈے کے بارے میں سوچ بچار کرلی ہے؟ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ بہت زیادہ معذرت خواہ ہیں کہ انھیں اس معاملے پر ایک بھی شخص کی حمایت نہ ہوسکی کہ مسلم لیگ کے جھنڈے کے اوپر یونین جیک لہرایا جائے۔ انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ مسلمانوں کے مذہبی احساسات سے متصادم ہوگا کہ عیسائیوں کی صلیب والے جھنڈے کے ساتھ مسلمانوں کے ہلال والا جھنڈا لہرائے۔ میں نے ان کو بتایا کہ جہاں تک بحریہ کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ وہ برطانوی دولت مشترکہ کا سفید نشان والا جھنڈا اسٹاف کے نشان کے طور پر لہرائیں، لیکن وہ

پاکستان کا علم بھی بلند کر سکتے ہیں۔ (خواہ اس پر یونین جیک کا نشان ہو یا نہیں) میں نے ان کو بتایا کہ یہ دولت مشترکہ کی بحریہ کی روایت ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس سے اتفاق کریں گے تاکہ میں ایڈمرل مایلز کو ضروری ہدایات دے سکوں۔ انھوں نے جواب دیا یقیناً! تب انھوں نے میرے ساتھ جی سی ایم جی کے مسئلے پر گفتگو کی اور کہا کہ مجھے اس اعزاز کی مقبولیت پر اپنی پارٹی کے اندر سے مخالفت پر حیرانی ہوئی ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ مسلم لیگ نے حال ہی میں ایک قرارداد منظور کی ہے۔ (ڈاکومنٹ نمبر ۸۶ جلد ہشتم ریزولیوشن نمبر ۲) جس میں تمام برطانوی اعزازات مسترد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان کے پیروکاروں کا خیال تھا کہ اب اگر وہ کوئی برطانوی اعزاز قبول کرتے ہیں تو اس سے ان کی پوزیشن پر حرف آئے گا۔

وہ مجھے یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ اس پر وہ کتنے زیادہ ذاتی طور پر معذرت خواہ ہیں اور انھیں کس قدر امید تھی کہ وہ مستقبل قریب میں اپنے پیروکاروں کو اپنا نقطۂ نظر تبدیل کرنے پر آمادہ کرلیں گے۔ تب نہ صرف وہ خود بلکہ دوسرے پاکستانی بھی جنھوں نے امتیازی خدمات سرانجام دی ہیں، برطانوی اعزازت اور تحفے قبول کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اس مسئلے پر دوبارہ بعد میں ان سے گفتگو کروں گا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ اگرچہ یہ بہ ظاہر برطانیہ کی مزاحمت ہے یعنی گورنر جنرل بی سی ایم بی اور جھنڈا، لیکن وہ دیکھیں گے کہ پاکستان دولت مشترکہ کا وفادار اور مستقل ممبر رہنے کا عزم رکھتا ہے، جس کے تعلقات دیگر برطانوی ڈومینیز کے ساتھ سال بہ سال دوستانہ ہوتے جائیں گے، تا آں کہ تمام تلخ احساسات ختم ہو جائیں گے اور وہ خود برطانوی خاندان کے حقیقی ممبر کے طور پر احترام کرنے لگیں گے۔

میں نے ان سے کہا: آیا وہ گورنر جنرل کے لیے عام طور پر جانا پہچانا جھنڈا لہرانے پر آمادہ ہیں، یعنی گہرا بلیو جھنڈا جس پر "پاکستان" کا لفظ پیلے اور پیلے رنگ سے ہی کراؤن بنا ہوگا، یہ ان کے سرکاری بنگلے (گورنمنٹ ہاؤس)، کار اور اگر وہ بحری بیڑے پر جائیں گے تو ان سب پر لہرائے گا۔ انھوں نیم جواب دیا کہ وہ اسے اعزاز سمجھیں گے۔ میں نے انھیں یہ جھنڈا دینے کا وعدہ کیا۔

(نوٹ: پاکستان کے گورنر کون سا جھنڈا لہرائیں گے اس مسئلے پر گفتگو نہیں ہوئی، لیکن

یہ مسئلہ جلد غور کا متقاضی ہے)۔

میں نے ان سے اس مختصر نوٹ پر گفتگو کی جو پی ایس وی نے گورنر پنجاب سے ملاقات کے بعد تیار کیا تھا اور مسٹر جناح پر زور دیا کہ وہ حد بندی کی دشواریوں پر سکھوں کے ساتھ عدالت سے باہر قابو پانے کی کوشش کریں، لیکن ان کو کامیابی کی زیادہ امید نہ تھی، لیکن انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے اصلی وعدے کے مطابق گیانی کرتار سنگھ سے ملاقات کے لیے اب بھی تیار ہیں۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ میں مؤخر الذکر سے رابطہ قایم کرتا ہوں اور ان کی مسٹر جناح سے ملاقات کا انتظام کرتا ہوں۔

آخر میں میں نے صوبہ سرحد کی صورت حال پر گفتگو کی، مسٹر جناح اس پر خوش تھے کہ آخری انتخاب میں صرف ٦٢ فیصد ووٹروں نے اپنے رائے کا اظہار کیا تھا اور ڈاکٹر خان صاحب نے اخباری نمایندوں سے کہا تھا کہ ۳۱ فیصد سے زاید کا مطلب مسلم لیگ کی فتح ہوگا۔ انھیں یقین تھا کہ اب کی مرتبہ ۷۵ فیصد ووٹر رائے دیں گے۔ میں نے ان سے استفسار کیا کہ جب ۲۱/ جولائی کو ریفرینڈم کا نتیجہ نکلے گا تو مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے؟ مسٹر جناح نے جواب دیا کہ میں نے ابھی اس پہلو پر غور نہیں کیا، لیکن میں صوبائی وزارت کی برخاستگی اور دفعہ ۹۳ کے نفاذ کا مشورہ دوں گا۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں دفعہ ۹۳ کے نفاذ کا شدید مخالف ہوں۔ برطانیہ اقتدار کے آخری چار ہفتوں میں اسے بالکل غلط تصور کرے گا۔ مسٹر جناح نے مجھ سے پوچھا کیا میں مسلم لیگ کی وزارت قایم کرنے کے لیے تیار ہوں؟ جب میں نے اس کا جواب ''ہاں'' میں دیا تو انھوں نے کہا:

> ''لیکن اگر قانون ساز اسمبلی میں ہماری اکثریت نہ ہوئی تو ہم کس طرح برسر اقتدار رہ سکتے ہیں؟''

میں نے ان سے کہا کہ قانون ساز اسمبلی کا اجلاس نہیں بلایا جائے گا اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کے انعقاد کی کوئی امید ہے اور ۱۵/ اگست کے بعد معاملہ پاکستان آئین ساز اسمبلی کے سپرد کیا جاسکتا ہے اور تب یہ اسمبلی ڈومینین کے لیے قانون سازی کرے گی۔

آخر میں میں نے ان سے کہا کہ اگر ڈاکٹر خان صاحب مستعفی نہیں ہوتے تو میں ان کی وزارت کو برخاست کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں، یا مسلم لیگ کی وزارت قایم نہیں

کروں گا تا آں کہ میری کابینہ یا پاکستان کی ایگزیکٹو کونسل اس کا مشورہ نہ دے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ مسٹر جناح کے لیے کسی طرح بہتر نہ ہوگا کہ میں ۱۹ر جولائی کو مسلم لیگ کی وزارت قایم کروں۔ ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت ۱۵ر اگست تک قایم رہے۔

میں نے بادشاہ کے دستخط کے بارے میں گفتگو کی۔ میں نے ان سے کہا کہ ''پارٹیشن کونسل'' میں میں نے تجویز پیش کی تھی اور جس پر کانگریس کے لیڈروں نے میرے ساتھ اتفاق کیا تھا، اس پر آپ کے رویے میں بے مہری تھی۔ یعنی بادشاہ ''جب شہنشاہ ہند'' کا لقب ترک کر دے گا تو ''جارج آر آئی'' کے لفظوں سے دستخط کرتا رہے گا۔ مسٹر جناح نے جواب دیا کہ وہ آخری آدمی ہوں گے جو یہ خواہش کریں گے کہ بادشاہ کس طرح اپنے نام کے دستخط کریں، اگر بادشاہ اپنے نام کے دستخط ''جارج آر آئی'' کے لفظ میں کرنا پسند کرتے ہیں تو پاکستان بھر سے کسی کو اس پر اعتراض نہ ہوگا۔ ہم میں باہمی اتفاق ہوا کہ میں ''پارٹیشن کونسل'' کی میٹنگ کی کارروائی جو اس مسئلے سے متعلق ہے، دیکھ لوں اور ہمارے درمیان جو کچھ طے پایا ہے اس سے کانگریس کے لیڈروں کو بھی مطلع کر دوں اور ان سے کہوں کہ وہ اس سلسلے میں مزید کوئی اقدام نہ کریں اور اسے ملک معظم کی صواب دید اور خوشی پر چھوڑ دیا جائے اور وہ جس طرح پسند کریں دستخط کر سکتے ہیں۔

ڈاکومنٹ نمبر ۱۱۲: ریئر ایڈمرل وسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما اور مسٹر جناح و مسٹر لیاقت علی خاں کے درمیان انٹرویو کا ریکارڈ، ماؤنٹ بیٹن پیپرز، وایسرائے کا انٹرویو نمبر ۱۶۵، ۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء

خفیہ پارٹیشن کونسل کی میٹنگ کے اختتام پر میں نے ان دونوں کو آدھ گھنٹے کے لیے روک لیا۔ پہلے میں نے ان دونوں کو اس آرڈر کی نقل دکھائی جس کا تعلق کابینہ کی تشکیل نو سے تھا جو کہ ۱۹ر جولائی کو تشکیل کی جا رہی تھی۔

مسٹر جناح نے حسب عادت پس و پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس پر غور کرنے کی مہلت دی جائے۔ میں نے ان کو بتایا کہ آپ کی توجیہہ بالکل غیر ضروری ہے، کیوں کہ یہ کونسل ان آرڈر کی ہدایت کے مطابق نہیں بلکہ اب میں نے اپنے اختیار سے تیار کیا ہے، جو

مجھے بل کی دفعہ ۹ کے تحت حاصل ہے۔ میں نے آرڈر جاری کرنے سے قبل خوش اخلاقی کے جذبے کے تحت آیندہ صبح کابینہ کی تشکیل مناسب خیال کیا۔

میں نے ان کو بتایا کہ اس کے تحت استعفوں کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے برعکس مجھے پاکستان کی آرڈر ان کونسل کے دو اہم مقاصد کے لیے ضرورت ہے۔

(الف) یہ کونسل مجھے بتا سکے کہ حکومت پاکستان کو مستقبل میں ایکٹ ۱۹۳۵ء میں کون سی ترامیم کی ضرورت ہے۔

(ب) اور مجھے یہ بھی بتائے کہ اگر صوبہ سرحد میں ریفرینڈم میں شکست کے بعد حکومت مستعفی ہونے سے انکار کردے تو کیا اقدام کرنا چاہیے۔

آخر میں میں نے انھیں بتایا کہ کراچی روانگی سے قبل پاکستان اگر اپنے محکمہ جات، ان کے افسران اور وزرا کا تقرر کر لیتا ہے تو اس سے اسے بڑا فایدہ ہوگا۔

(جوں ہی وہ جانے لگے میں نے مسٹر لیاقت علی خان کو لمحہ بھر کے لیے روک لیا اور واضح کیا کہ میں پاکستان کے لیے آرڈرز ان کونسل مسٹر جناح کے کہنے پر نہیں بنا سکتا۔ کیوں کہ وہ پاکستان کے آئینی گورنر جنرل بن رہے ہیں اور وہ اس مسئلے پر مجھے مزید ہدایت نہیں دے سکتے۔ میں اس نکتے پر مسٹر جناح کے سامنے گفتگو کرنا نہیں چاہتا تھا، لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ مسٹر لیاقت علی خاں کسی غلط فہمی میں رہیں۔ میں آیندہ اس مسئلے پر مسٹر جناح سے کسی قسم کی ہدایت نہیں لوں گا جو کہ پاکستان کی وساطت سے مجھ تک پہنچنی چاہیے۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے اس نکتے کو نوٹ کیا، اس پر غور کرنے کا وعدہ کیا اور شکریہ ادا کیا)۔

(۲) میں نے ایک مرتبہ پھر جھنڈوں کے بارے میں گفتگو کی، اور افسوس ظاہر کیا کہ پاکستان ڈومینین کے جھنڈے کے اوپر یونین جیک لہرانے پر رضامند نہیں ہے۔ اس پر مسٹر جناح کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ دولت مشترکہ سے تعلقات کا انقطاع میری آخری خواہش ہوگی۔ درحقیقت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں تعلقات کو بہتر طور پر استوار کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان کو بتایا کہ جھنڈا اہم اور ظاہری نشان ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ ڈومینین کے جھنڈے کے ساتھ یونین جیک کا جھنڈا لہرانے کی روایت اختیار کریں، اسی مستول یا دوسرے پر جھنڈا خاص مواقع پر لہرانا ہوگا۔ شاہی خاندان کے جنم دنوں پر، دوسری

ڈومینیز کے ڈے، پر (ہر سال ۱۴ اگست کو پاکستان ڈے پر) اور دوسرے مواقع پر۔
انھوں نے جواب دیا: یقیناً اگر آپ مجھے ان ایام کی فہرست فراہم کر دیں جن پر یونین جیک لہرانا ہوگا میں دیکھوں گا کہ اس پر عمل ہو سکے۔

(۳) میں نے ان پر زور دیا کہ وہ پاکستان کی فوج کا کمانڈر ان چیف بنانے کا فیصلہ کریں اور میری رائے میں جنرل میسروی سے بہتر شخص ملنا ممکن نہیں ہے۔ وہ راول پنڈی میں کمان سنبھالے ہوئے ہیں اور ان کا ہیڈ کوارٹر بھی وہی ہے۔ اس طرح پاکستان کو ہندوستان کی نسبت فایدہ رہے گا۔ ہندوستان اپنے نئے کمانڈر ان چیف کے لیے نیا ہیڈ کوارٹر بنائے گا۔ میں نے ان کو بتایا جنرل میسروی ہماری شادی کی سلور جوبلی میں شریک ہونے کے لیے یہاں آرہے ہیں اور آیندہ دو تین روز میں ان سے ملاقات ہوگی۔ مسٹر جناح نے کہا کہ وہ اس مسئلے پر جنرل میسروی سے گفتگو کریں گے اور اس کے بعد فوراً اپنے فیصلہ سے مطلع کریں گے۔

(۴) میں نے دونوں سے کہا: آیا وہ سمجھتے ہیں کہ لارڈ اسمے کو یہاں رکھنے سے فایدہ ہو گا؟ (ان کی تنخواہ حکومت برطانیہ ادا کرے گی) میں نے یہ تجویز اس لیے پیش کی ہے تاکہ مسٹر جناح اور مسٹر لیاقت علی خاں سے رابطہ قایم رہ سکے۔ یہ سن کر انھوں نے گرم جوش اور خوشی ظاہر کی اور کہا پالیسی مسایل پر دونوں حکومتوں کے درمیان ابتدائی ایام میں رابطے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ اس سے اختلافات کے مواقع کم ہو جائیں گے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں اس کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ لارڈ اسمے اس کے لیے رضامند ہوں گے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے جو رائے ظاہر کی ہے، لارڈ اسمے کی آمادگی حاصل کرنے کے لیے، بڑا وزن رکھتی ہے۔

(۵) مسٹر لیاقت علی خاں اس پر بہت زیادہ فکر مند تھے کہ آیا میں نے ابھی تک سر پیٹرک اسپینز سے ثالثی ٹریبونل کے بارے میں جواب حاصل کیا ہے یا نہیں؟ کیوں کہ انھوں نے اپنے امیدوار چن لیے تھے اور وہ اس پر ان سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ دراصل وہ اپنے امیدواروں کو دہلی بلانا چاہتے تھے، تاکہ وہ چیف جسٹس سے مل سکیں۔ میں نے انھیں اس سے برعکس مشورہ دیا۔ کیوں کہ ہو سکتا تھا کہ چیف جسٹس یہ محسوس کریں کہ ان پر دباؤ ڈالا

جارہا ہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ سر پیٹرک اسپینز کی آمد آیندہ دو ایک روز میں متوقع ہے۔

(۶) مسٹر لیاقت علی خاں نے استفسار کیا کہ ۱۵ر اگست کے بعد پارٹیشن کونسل کا جانشین ادارہ کون سا ہوگا؟ میں نے ان کو بتایا کہ میں نے ابھی اس مسئلے پر غور نہیں کیا، لیکن اب میں اس پر سوچ بچار کروں گا اور آپ کو بتادوں گا۔

(۷) انھوں نے مجھ سے کہا: آیا میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے کانگریس کو اس پر آمادہ کرسکتا ہوں کہ پاکستان ہائی کمشنر اور اس کے اسٹاف کو لال قلعہ میں رہایش اختیار کرنے دی جائے۔ میں نے کہا کہ میں اس مسئلے پر غور کروں گا۔

ڈاکومنٹ نمبر ۱۴۵: ریئر ایڈمرل وسکاوٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کا مراسلہ ارل آف لسٹول کے نام،

نئی دہلی، ۱۶ر جولائی ۱۹۴۷ء، گیارہ بج کر پندرہ منٹ رات

موصول ۱۷ر مئی ۳ بج کر پینتیس منٹ صبح

خفیہ

۱۵ر اگست کی تقریبات کے انتظامات کے پیش نظر مندرجہ نکات پر آپ کی رہنمائی کے لیے شکر گزار ہوں گا!

کیا میں ۱۴، ۱۵ر اگست کی درمیانی رات کے نصف گزرنے کے ایک منٹ بعد گورنر جنرل کے موجودہ عہدے سے علاحدگی اختیار کرلوں؟ اس صورت میں میرے لیے ضروری ہوگا کہ میں ۱۵ر اگست کو صبح آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانے سے قبل حلف وفاداری اٹھاؤں۔ یہی حلف وفاداری مسٹر جناح کو بھی اٹھانا ہوگا اور میں اس کی ایک نقل ممکنہ حد تک جلد ان کو پہنچا دوں گا، تاکہ وہ بھی کراچی میں تقریبات کے انتظامات کرسکیں۔

ڈاکومنٹ نمبر ۱۷۲: ریئر ایڈمرل وسکاونٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کے نام پنڈت نہرو کا مراسلہ نئی دہلی ۱۹ر جولائی ۱۹۴۷ء

مائی ڈیر ماؤنٹ بیٹن!

کابینہ جس کی تشکیل نو کی جانی ہے، کے بارے میں میں نے اپنے رفقائے کار سے

مشورہ کیا ہے اور ہماری رائے یہ ہے کہ فی الوقت صرف عبوری انتظام کیا جائے۔ ہم بلاشبہ کابینہ کے ارکان میں اضافہ کریں گے، لیکن ہم اس معاملے میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتے۔ ہم مزید وزرا کے نام مستقبل قریب میں پیش کر دیں گے۔ اس اثنا میں تمام انتظامات عبوری ہیں اور ان میں تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے۔ فی الحال کابینہ کے مندرجۂ ذیل وزرا کام جاری رکھیں گے:

سردار ولبھ بھائی پٹیل،	مولانا ابوالکلام آزاد	ڈاکٹر راجندر پرشاد
ڈاکٹر جان متھائی	شری راج گوپال اچاری	سردار بلدیو سنگھ
مسٹر جگ جیون رام	مسٹر سی ایچ بھابھا	جواہر لال نہرو

یہ وزرا اپنے موجودہ محکموں پر فائز رہیں گے اور وہ مسلم لیگ کے خالی کردہ پانچ محکموں کا چارج بھی سنبھالیں گے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

خزانہ	:	مسٹر سی۔ راج گوپال اچاری
مواصلات	:	ڈاکٹر جان متھائی
صحت	:	مسٹر جگ جیون رام
کامرس	:	مسٹر بھابھا
قانون	:	جواہر لال نہرو

مسٹر جگ جیون زخموں سے صحت یاب ہو کر نا معلوم کب واپس آئیں، میں ان کی آمد یا دیگر انتظام تک ان کا محکمہ اپنے پاس عارضی طور پر رکھوں گا۔

میں اس امر کو دہراتا ہوں کہ یہ انتظامات عارضی ہیں اور مستقبل میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

آپ کا مخلص

جواہر لال نہرو

ڈاکومنٹ نمبر ۱۷۳: سر بی۔ ایبل کا مراسلہ مسٹر لیاقت علی خاں کے نام

۱۹ر جولائی ۱۹۴۷ء

مائی ڈیر مسٹر لیاقت علی خاں

آج صبح آپ نے پاکستان کی عبوری حکومت میں محکمہ جات کی تقسیم کے بارے میں

وزرا کے نام وائسرائے کو دیے۔ انھوں نے مجھے کہا ہے کہ میں آپ کی توثیق کے لیے خط لکھوں کہ منسلک فہرست درست ہے۔ براہِ کرم آپ اس کا جواب ٹیلی فون سے دے دیں۔

آپ کا مخلص

جی بی ایبل

آنریبل مسٹر لیاقت علی خاں: خزانہ، امور خارجہ، دولت مشترکہ تعلقات اور دفاع

آنریبل مسٹر آئی آئی چندری گر: تجارت، صنعت اور سپلائیز، ورکس، مائنز اور پاور

آنریبل عبدالرب نشتر: انفارمیشن، ریلویز، ٹرانسپورٹ، مواصلات اور ریاستی امور

آنریبل راجہ غضنفر علی خاں: صحت، خوراک، زراعت اور داخلہ

آنریبل جوگندر ناتھ منڈل: تعلیم، آرٹ اور لیبر

ڈاکومنٹ نمبر ۲۲۲: لارڈ اسمے اور مسٹر جناح کے درمیان ملاقات کا ریکارڈ، ماؤنٹ بیٹن پیپرز۔ انٹرویو نمبر ۱۶۸، ۲۴ر جولائی ۱۹۴۷ء سوا پانچ بجے بعد سہ پہر

میں نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح کیا کہ میں آپ سے انتہائی سنجیدہ اور پیچیدہ مسئلے پر بے تکلف باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں مبالغہ آرائی نہیں کر رہا کہ حالیہ واقعات کے سلسلے کے نتیجے میں وائسرائے مسٹر جناح سے دوستانہ تعاون کے امکانات کے بارے میں تقریباً مایوسی کا شکار ہو چکے ہیں۔ وائسرائے نے ہمیشہ مسٹر جناح سے تعاون کی کوشش کی مگر مسٹر جناح نے ہمیشہ مخالفت کی اور بار بار اسے دہرایا۔

اول: آخری وقت میں مسٹر جناح نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ خود پاکستان کا گورنر جنرل بننا چاہتے ہیں۔ اس سے وائسرائے کی پوزیشن بہت زیادہ مجروح ہوئی اور انگلینڈ کے تمام سیاسی حلقوں میں مسٹر جناح کے وقار کو بہت زیادہ ٹھیس پہنچی۔

دوسرے: وائسرائے نے مسٹر جناح سے بہ طور خاص کہا تھا کہ وہ کانگریس کی طرف برطانوی اور پاکستان کی طرف اپنے ملک کے باشندوں میں گورنر جنرل بنانے کے مسئلے کو پریس میں اچھال کر تمسخر اڑانے سے گریز کریں۔ مسٹر جناح نے اس کا وعدہ کر لیا تھا، لیکن یہ پورا نہیں ہوا۔ ''ڈان'' نے اس مسئلے کو خوب اچھالا۔ جب کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایسا نہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

تیسرے: جھنڈے کا مسئلہ تھا۔ مسٹر جناح نے عبوری انتظام کے طور پر پاکستان کے جھنڈے کے ایک کونے میں یونین جیک کا نشان بنانے پر رضا مندی ظاہر کر دی تھی، لیکن بعد میں کہا کہ وہ اسے قبول نہیں کر سکتے۔

آخر میں مسٹر جناح نے کہا کہ وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ پر ڈومینین گورنر جنرل کا عام جھنڈا نہیں لہرا سکتے۔ اور وہ پاکستان نیوی کو سفید نشان والا جھنڈا لہرانے کی اجازت بھی نہیں دیں گے۔ ان دونوں سے انکار بہت زیادہ بے مہری ہے۔ وائسرائے پر اس کا بہت زیادہ اثر ہوا اور انھوں نے وزیر اعظم برطانیہ کو بھیجنے کے لیے ایک ٹیلی گرام کا مسودہ تیار کروایا، جس میں کہا گیا تھا کہ مسٹر جناح سے تعاون کی امید وابستہ کرنا سراب خیال ہے۔ اس لیے اس بارے میں رہنمائی کی جائے۔ بہر حال لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے فی الوقت یہ ٹیلی گرام ارسال نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

مسٹر جناح نے تمام باتیں تحمل سے سنیں اور میرے ہر ایک الزام کا جواب دینا شروع کیا۔

پہلے اعتراض کے بارے میں انھوں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ وہ شروع سے ہی مشترکہ گورنر جنرل مقرر کرنے کے مخالف تھے۔ انھیں ہمیشہ سے یہ یقین تھا اور اب بھی ہے کہ یہ قابل عمل نہیں ہوگا۔ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا گلہ مسٹر جناح کے فیصلے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ہماری شکایت ہے کہ اس فیصلہ کا اعلان عین وقت پر کیا گیا۔ میں نے ان کو یاد دلایا کہ سر ایرک میویل اور میں نے جون کے ابتدائی ایام میں مسٹر لیاقت علی خاں سے کہا تھا کہ مسٹر جناح کو ترغیب دیں کہ وہ پاکستان کا گورنر جنرل جلد از جلد نامزد کر دیں۔ اگر وہ اس وقت بلا تکلف حتمی طور پر بتا دیتے کہ انھوں نے اپنے آپ کو گورنر جنرل نامزد کر لیا ہے تو بے شمار غلط فہمیوں اور گڑبڑ سے بچ جاتے۔ مسٹر جناح مصر رہے کہ انھوں نے وائسرائے کو کبھی بھی معمولی سا اشارہ نہیں دیا، جس سے وہ مشترکہ گورنر جنرل کے تقرر کا نتیجہ اخذ کرتے۔ اس لیے اس دلیل پر زور دینا بے مقصد ہے۔

تب مسٹر جناح نے مسلم لیگ پریس کی جانب رخ پھیرا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنے وعدے پر قایم رہے اور مسلم پریس نے کوئی تمسخر نہیں اڑایا، تا آں کہ کانگریس پریس نے

اس بنا پر مسٹر جناح پر حملے شروع نہ کیے کہ پہلے تو انھوں نے مشترکہ گورنر جنرل کے تقرر پر اتفاق کیا تھا اور بعد میں اپنے وعدہ سے مکر گئے۔

یہ ناقابل برداشت اور غلط الزام تھا، جس کا جواب دیا جانا چاہیے تھا۔ میں نے کہا کہ میں لندن گیا ہوا تھا اور میں نے اخبارات میں شائع ہونے والے آرٹیکلز نہیں دیکھے، اس لیے میں اس مسئلے پر گفتگو نہیں کر سکتا۔

پھر ہم نے پاکستانی جھنڈے کے پہلے ڈیزاین کے بارے میں گفتگو کی۔ جھنڈے کے ایک کونے میں یونین جیک رکھا گیا تھا۔ مسٹر جناح نے اعتراف کیا کہ جب پہلی مرتبہ انھیں یہ جھنڈا دکھایا گیا تو انھیں اس پر کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن انھوں نے مزید کہا کہ جب انھوں نے اس پر اپنے رفقائے کار سے گفتگو کی تو انھوں نے یک دم کہا کہ ایک ہی جھنڈے پر صلیب اور ہلال کا نشان ناممکن ہے۔ اس سے دیرینہ تمام نفرتیں اور مخاصمتیں پیدا ہو جائیں گی، میں نے بتایا کہ وایسرائے کو اس مشکل کا احساس تھا، لیکن وہ مسٹر جناح کے اس اعتراض کو سمجھ نہ سکے، جو سرکاری رہائش گاہ پر ڈومینین کا جھنڈا لہرانے پر تھا۔ اس نکتے پر مسٹر جناح کو پورا یقین نہ تھا۔ انھوں نے غیر متعلقہ باتوں میں الجھانا شروع کیا کہ ۱۵ اگست کے بعد بادشاہ کا ''جارج آر آئی'' دستخط کرنا غلط ہوگا۔ عزت ماب اس تاریخ کے بعد ہندوستان کے شہنشاہ نہیں رہیں گے اور اگر وہ اس سلسلے کو جاری رکھتے ہیں تو اس کی مخالفت ہوگی۔ ان کی اگلی دلیل تھی کہ وہ اپنی ذاتی رہائش گاہ پر اپنی خواہش کے مطابق کوئی بھی جھنڈا لہرا سکنے کے لیے آزاد ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ رہائش گاہ ایک طرح سے ان کی ذاتی نہیں ہے۔ یہ بادشاہ کے نمایندے کی رہائش گاہ ہے اور درست یہی ہے کہ یہاں پر بادشاہ کا نشان لہراتا نظر آئے۔

تب مسٹر جناح نے آیرلینڈ کی آئینی پوزیشن کے بارے میں طویل گفتگو کی اور کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کا آئین بھی آیرلینڈ جیسا ہوگا یعنی دوسری ڈومینینز سے مختلف ہوگا۔ وہ برطانوی پارلیمنٹ سے بالا ہی علاحدگی اختیار کر سکیں گے۔ اس لیے وہ آیرلینڈ کے آئین کو بہ طور ماڈل پسند کرتے تھے۔

میں نے ان کو بتایا کہ کینیڈا اور آسٹریلیا کی علاحدگی برطانوی پارلیمنٹ کی قانون

سازی کے نتیجے میں ہوئی تھی، لیکن میں کسی طرح بھی آئینی طریقوں سے تبدیلیوں سے متعلق نہیں ہوں، بلکہ میرا تعلق آئین کے اطلاق سے ہے۔ کیا مسٹر جناح واقعی یہ چاہتے تھے کہ پاکستان اور برطانیہ کے تعلقات کی نوعیت وہی ہو جو آیرلینڈ اور برطانیہ کی صورت اختیار کر چکی ہے؟ ہم آیرلینڈ کے ساتھ افسران یا ساز و سامان کی شکل میں تعاون نہیں کر رہے ہیں اور نہ ہی ان کے باشندوں کو اپنے اسٹاف کالجوں میں داخل کرتے ہیں۔ درحقیقت اسے ڈومینین کی کوئی بھی سہولت میسر نہیں ہے۔ دوسری طرف مسٹر جناح برطانوی افسروں اور ملازموں کی بڑی تعداد پاکستان کی ملازمت میں رکھنے کے لیے فکر مند ہیں اور مصر ہیں کہ پاکستان ہمیشہ دولت مشترکہ میں بہ طور ممبر شامل رہے گا۔

اس کے بعد مسٹر جناح نے ایک اور پہلو پر گفتگو شروع کر دی کہ انھوں نے اپنے پیروکاروں کی طرف سے مکمل طور پر گفتگو کرنے کا اختیار رکھنے کی شہرت محض اس وجہ سے حاصل کی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کے خیالات کا پوری طرح مطالعہ کرتے ہیں اور دنیا پر اسے پوری ذمے داری کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔ وہ میری اس بات سے یقیناً خوش ہوئے تھے، جب میں نے ان کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب کچھ مسٹر چرچل کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ وہ ذاتی طور پر ڈومینین کا جھنڈا لہرانے پر بالکل معترض نہیں ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پیروکار شاید اسے محسوس کریں اور اس کے بعد پارلیمنٹ میں اس پر احتجاج ہو اور اسے تبدیل کرنا پڑے۔

میں نے ان کو جواب دیا کہ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اگر مسٹر جناح ڈومینین کے جھنڈے کی بجائے اپنا جھنڈا لہراتے ہیں تو برطانیہ میں رائے عامہ مسٹر جناح کو دوستی اور خوش اخلاقی کے روایتی انداز سے بے بہرہ خیال کرے گی۔ جب کہ اگر وہ ڈومینین کا جھنڈا لہرانے سے ابتدا کرتے ہیں اور بعد میں پارلیمنٹ کے دباؤ کی وجہ سے اسے تبدیل کر لیتے ہیں تو برطانیہ میں رائے عامہ اسے زیادہ برائی سے تعبیر نہیں کرے گی۔

مسٹر جناح نے کہا کہ وہ اس موضوع پر اپنے رفقائے کار سے مزید گفتگو کریں گے اور مجھے اس کے نتائج سے آگاہ کریں گے۔

آخر میں میں نے ان سے سفید نشان کے بارے میں بات چیت کی۔ مجھے یہ جان کر

حیرانی ہوئی جب مسٹر جناح نے بتایا کہ ان کے خیال کے مطابق اس مسئلے میں بعض غلط فہمیاں ہوگئی ہیں۔ وہ اس پر مصر تھے کہ پاکستان کی بحریہ سفید نشان ہی لہرائے گی، جو کہ ڈومینین کی تمام بحریہ کے درمیان رفاقت کی علامت ہے۔ میں نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا اور یہ معاملہ یہیں ختم کر دیا۔

ہماری گفتگو انتہائی خوش گوار ماحول میں ہوئی۔

جب مسٹر جناح واپس جانے لگے تو انھوں نے اپنے ہاتھ میرے کندھوں پر رکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا:

''میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ وایسرائے کو میری طرف سے یقین دلائیں میں ان کا دوست ہوں اور یہ رشتہ اب بھی اور ہمیشہ قایم رہے گا۔ میری درخواست ہے کہ وہ میرے بارے میں رائے قایم کرتے ہوئے میرے کردار کو پیش نظر رکھیں، میرے الفاظ کو نہیں۔'' اسمے

۲۵/۱۲/۱۹۴۷ء

ڈاکومنٹ نمبر ۲۲۲: میں لارڈ اسمے کی زبان سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جناح صاحب سے پیدا ہونے والی جن شکایات کا ذکر آیا ہے یہ وہ شکایات تھیں جن کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے شدت سے محسوس کیا تھا اور ضروری سمجھا کہ یہ شکایات جناح صاحب کے علم میں لے آیا جائے اور اگرچہ ان کا تدارک ممکن نہیں تو آیندہ اور شکایاتِ نو پیدا نہ ہوں، لیکن ماؤنٹ بیٹن کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور لارڈ اسمے کی کوشش رایگاں گئی۔ آیندہ بھی شکایات پیدا ہوئیں اور ان کا نقصان اُٹھانا پڑا، اور نئی شکایات نے گذشتہ احساسات کو بھی زندہ کر دیا۔ شاید اس میں جناح صاحب کی نیت کو دخل نہ ہو، لیکن جو چیز ظہور میں آچکی ہو اس کی تاثیر کو پھیلنے سے کیوں کر رد کیا جا سکتا ہے!

پاکستان کے لیے ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء انتقالِ اقتدار کی تاریخ مقرر کی گئی تھی، لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن انتقالِ اقتدار کی رسم ادا کرنے اور جناح صاحب سے حلف لینے کراچی پہنچے تو وہ غیر منقسم ہندوستان کے وایسرائے اور کامن ویلتھ اور حکومت برطانیہ کے نمایندے کی حیثیت سے اقتدار دینے اور آزادی بخشنے والے تھے۔ بلاشبہ یہ برطانوی اقتدار کا آخری دن

تھا، لیکن دست برداری کا عمل ابھی ظہور میں نہ آیا اور ان کی عزت تابی میں کوئی فرق نہ پڑ گیا تھا۔ پاکستان ابھی وجود میں نہ آیا تھا۔ نہ کوئی مملکت کا سربراہ تھا نہ کوئی نظام حکومت کا صدر! جو تھا برطانوی شہنشاہیت کا سب جیکٹ اور رعیت کا فرد تھا۔ قایم ہونے والے نئے نظام کا کوئی نمایندہ ماؤنٹ بیٹن کے استقبال کے لیے ایر پورٹ پر موجود نہ تھا۔ نہ پاکستان کے ہونے والے گورنر جنرل نہ قایم ہونے والی حکومت کے وزیراعظم! نہ ایک صبح وشام کے بعد آزاد ہونے والی قوم کا پرجوش اور شکرگذار مجمع۔ برطانوی سندھ کا گورنر (غلام حسین ہدایت اللہ) جسے خود وایسراے نے مقرر کیا تھا، ایر پورٹ پر موجود تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے صورت حال کو اپنی توہین سے کچھ کم سمجھا ہوگا۔ حلف برداری کی تقریب اور انتقالِ اقتدار کی رسم کی ادائیگی کا آغاز ہوا تو جناح صاحب پہلے ہی اس کرسی پر بیٹھ گئے جس پر انھیں حلف اُٹھانے کے بعد بیٹھنا تھا۔ ان غلطیوں کو خواہ کتنی ہی کم حیثیت دی جائے لیکن ان کی تاثیر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ خان عبدالولی خان نے اس واقعے کی روداد کو مرتب کردیا ہے۔ مطالعہ فرمایے:

''لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی بیوی کے ہم راہ کراچی آیا، تاکہ تاج برطانیہ کے نمایندے کی حیثیت سے پاکستان کے نئے گورنر جنرل محمد علی جناح کو اپنے عہدے کا حلف دلا کر آئینی طور پر انگریز کی سلطنت کے خاتمے کا اعلان کرے۔ اس سلسلے میں تعجب کی بات پہلے تو یہ تھی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو خوش آمدید کہنے نہ جناح صاحب خود گئے اور نہ ہی لیاقت علی خاں گئے، جو پاکستان کے وزیراعظم مقرر ہوئے تھے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے اُسے خوش آمدید کہنے سندھ کا گورنر غلام حسین ہدایت اللہ گیا۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں کی عجیب ذہنیت تھی، چھوٹی چھوٹی باتوں کے ناپ تول سے یہ لوگ نہیں چوکتے تھے۔ اپنی عزت اسی میں سمجھتے ہیں کہ کسی اور کی بے عزتی کردیں۔ اس کے بعد ایک اور اہم مسئلہ پیش آیا۔

جناح صاحب نے کہا کہ میں چوں کہ پاکستان کا گورنر جنرل ہوں اور اسی آئین ساز اسمبلی کا صدر ہوں، تو میں سب سے اونچی کرسی کا حق دار ہوں اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن مجھ سے چھوٹی کرسی پر بیٹھے گا، لیکن اس مسئلے میں انگریز سب کا استاد تھا۔ انھوں نے کہا کہ جناب! تم تو تب جاکر گورنر جنرل بنو گے جب ہندوستان کا وایسراے لارڈ ماؤنٹ بیٹن تمھیں عہدے

کا حلف دلائے گا۔ تمہارا مقام اور اختیار تو اُسی عہدے کے حلف سے وابستہ ہے۔ اور جب تک ماؤنٹ بیٹن یہ حلف نہ دلا دے، اور یہ اختیارات تمھیں منتقل نہ کر دے تو تمہاری حیثیت کیا ہے، ایک عام آدمی ہو۔ یہ بات بھی اُن پر واضح کر دی کہ اگر تم گورنر جنرل بن بھی جاؤ تو تمہارا عہدہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کم تر ہے، کیوں کہ وہ وایسرائے ہے اور یہ درجہ تمہارے درجے سے اونچا ہے۔ تب جا کر کہیں یہ مسئلہ حل ہوا۔

مرتبے کی اونچ نیچ کا یہ مسئلہ جب ختم ہوا تو دوسرا مسئلہ پیدا ہوا، یہ افواہ گرم تھی کہ پنجاب کے سکھ بے انتہا غصے میں ہیں اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب جناح صاحب اسمبلی کے اجلاس میں جائیں گے تو ان پر بم پھینکا جائے گا، تو جوں ہی ماؤنٹ بیٹن جہاز سے اُترا تو اُس سے سوال کیا گیا کہ ان اطلاعات کی روشنی میں کیا فیصلہ ہوا ہے کہ سرکاری جلوس نکلے گا کہ نہیں؟ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ یہ تم لوگوں کا اپنا فیصلہ ہے، انتظام تمہارا ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ جناح صاحب نے یہ فیصلہ آپ پر چھوڑا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کہتا ہے کہ اگر کسی نے یہ فیصلہ کیا بھی ہو کہ جناح صاحب کو بم سے اُڑائیں تو جب میں اُس کے ساتھ سواری میں بیٹھ جاؤں گا تو غالب امکان یہ ہے کہ یہ حملہ نہ ہوگا، کیوں کہ ایسا کرنے سے تو پاکستان کے گورنر جنرل کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا گورنر جنرل بھی قتل ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ مجھے تو جلوس نکالنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اُس کے بعد جلوس کا انتظام ہوا۔ جب دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کے بعد جناح صاحب اور ماؤنٹ بیٹن واپس گورنر جنرل ہاؤس پہنچے تو جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن کی طرف منہ کر کے کہا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ میں تمھیں زندہ واپس لے آیا۔''

ماؤنٹ بیٹن نے فوراً جواب دیا: ''خدا کا شکر یہ ہے کہ میں تمھیں زندہ واپس لے آیا۔'' (حقایق حقایق ہیں بہ حوالہ ''بریک ڈاؤن'': ص ۱۳۴)

ڈاکومنٹ نمبر ۲۲۴: ریئر ایڈمرل وسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما کا مراسلہ ارل آف لسٹول کے نام انتہائی اہم

۲۴ر جولائی ۱۹۴۷ء ۴ بجے بعد سہ پہر

موصول ۲۴ر جولائی ۳ بج کر تیس منٹ بعد سہ پہر

اجلاس میں مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت کی: وایسرائے (صدر) ہندوستان کی

آینده حکومت کے نمائندے سردار ولبھ بھائی پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد، پاکستان کی آینده حکومت کے نمائندے مسٹر جناح اور مسٹر لیاقت علی خاں اور سکھوں کی طرف سے سردار بلد یو سنگھ۔

پارٹیشن کونسل کا اعلان! اب جب کہ ۱۵/اگست سے دو آزاد ڈومینیز قایم کرنے کا حتمی فیصلہ ہو چکا ہے، پارٹیشن کونسل کے ممبران جو کہ مستقبل کی دونوں حکومتوں کے مجاز ہیں اعلان کرتے ہیں کہ وہ فضا کو پرامن بنانے کا عہد کرتے ہیں تا کہ تقسیم کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے اور فوری نوعیت کے اہم انتظامی اور اقتصادی امور کی تشکیل نو کی جا سکے۔

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے یقین دہانی کرائی ہے کہ انتقال اقتدار کے بعد اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ اور مساویانہ سلوک روا رکھا جائے گا۔ مستقبل کی دونوں حکومتوں نے اس کی توثیق کی ہے۔ ان کا عزم ہے کہ تمام شہریوں کے بلا امتیاز مذہب، ذات یا جنس جایز حقوق و مفادات کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ تمام شہریوں کو یک ساں بنیادی حقوق حاصل ہوں گے اور دونوں ممالک کی حکومتیں ضامن ہوں گی کہ ہر شہری کو اپنے ملکی حدود کے اندر اظہار رائے، انجمن سازی، اپنی پسند کے مطابق عبادت آزادی کے ساتھ کر سکے۔ مزید برآں ہر ایک زبان اور کلچر کی حفاظت کرے گی۔

دونوں حکومتوں نے مزید یقین دلایا کہ جن لوگوں کے سیاسی نظریات ۱۵/اگست سے پہلے مختلف تھے، ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

دونوں ممالک کی حکومتوں نے اپنے اپنے ملک کے شہریوں کو یقین دلایا ہے کہ تشدد کو کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ دونوں ممالک کی حکومتیں اس بارے میں عزم مصمم رکھتی ہیں۔

پنجاب میں تبدیلی کے دوران امن و امان قایم رکھنے کے لیے دونوں ممالک کی حکومتیں یکم اگست سے اسپیشل ملٹری کمانڈ قایم کرنے پر رضامند ہو گئی ہیں۔ یہ کمانڈ سیال کوٹ، گوجراں والہ، شیخو پورہ، لایل پور، منٹگمری، لاہور، امرتسر، گورداس پور، ہوشیار پور، جالندھر، فیروز پور اور لدھیانہ کے اضلاع کی نگرانی کرے گی۔ ان کی رضا سے میجر جنرل ٹی ڈبلیو ریس کو ملٹری کمانڈر اور بریگیڈیر ڈگمبر سنگھ برار (انڈیا) اور کرنل ایوب خان

(پاکستان) کو ان کا مشیر مقرر کیا گیا ہے۔ ۱۵راگست کے بعد میجر جنرل ریس دونوں نئی مملکتوں کے ان علاقوں میں نقل و حرکت کو کنٹرول کریں گے۔ سپریم کمانڈر اور جوائنٹ ڈیفنس کونسل کی وساطت سے دونوں حکومتوں کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

دونوں حکومتیں اگر ضروری خیال کریں تو بنگال میں بھی اسی قسم کا انتظام کر سکتی ہیں۔

دونوں حکومتوں نے از خود وعدہ کیا ہے کہ حد بندی کمیشن کا ایوارڈ کچھ بھی ہو قبول کریں گے۔ حد بندی کمیشن کے اجلاس جاری ہیں، اگر اپنا کام تسلی بخش طور پر انجام دیتا ہے تو ضروری ہے کہ تقاریر یا تحریر، بائیکاٹ کے خوف و ہراس یا ڈایریکٹ ایکشن کی دھمکی یا ان کے کام میں مداخلت کی دھمکی دے کر ان کے کام کو متاثر نہ کیا جائے۔ دونوں ممالک کی حکومتوں نے اس سلسلے میں مناسب اقدام کی ضمانت فراہم کی ہے اور جوں ہی ایوارڈ سنایا جائے گا دونوں حکومتیں غیر جانب داری سے فوراً ایوارڈ نافذ کریں گے۔

(انتقال اقتدار کے ڈاکومنٹس: ص ۱۶-۸۱۵)

کیا اس میں خلاف اصول کوئی بات ہے؟

۱۱راگست ۱۹۴۷ء: جوں جوں ۱۴راگست کا دن قریب آتا گیا حکومت ملنے اور اقتدار پر قبضہ جمانے کی خوشی میں مسلمانوں کے حقوق کے علم بردار اور اسلام کے ٹھیکے دار اپنے اپنے لاؤلشکر اور طوطوں، بلیوں اور کتوں سمیت دارالحکومت (کراچی) آتے گئے اور ہندوستان میں ساڑھے چار کروڑ رہ جانے والے مسلمانوں کے مفاد کو اقتدار اور حکومت ملنے کی خوشی میں بھلا کر انھیں ان کی قسمت کے حوالے کر دیا گیا اور پچھلے چند برسوں میں فرقہ وارانہ نفرت کی جو آگ بھڑکائی گئی تھی نہ تو اس کے نتایج کی کوئی پروا کی گئی اور نہ اس کے سدباب کا کوئی انتظام کیا گیا۔

۱۱راگست کو انھوں نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ (اور سرکاری کاغذات میں، (اب ش)) ان کے لیے قایداعظم کا لقب استعمال کرنے کی قرارداد پاس کی گئی۔ گورنر جنرل کے منصب کے لیے انھوں نے اپنے تئیں پہلے ہی نامزد کر لیا تھا۔

۱۴راگست کو برطانوی شہنشاہیت اور اس کے نمایندے کی وفاداری کے ساتھ وہ

پاکستان کے باضابطہ گورنر جنرل بن گئے۔

اب وہ پاکستان کے گورنر جنرل تھے، پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پریذیڈنٹ تھے، (پاکستانی فوج کے سپریم کماندار تھے۔ (اب ش)) اور ٹھیک اسی وقت وہ مسلمانوں کی واحد نمایندہ سیاسی جماعت ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کے مستقل صدر بھی تھے۔ اب انگریزوں کی ملازمت (گورنر جنرل شپ) اور پاکستان ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اور پاکستان کی دستور سازی کے میدان میں مہم جوئی کے مناصب شتیٰ میں کوئی فرق نہ رہا تھا سب ایک شخصیت میں جمع ہو گئے تھے ❶۔ (نئے سندھ کے لیے جدوجہد اور جی ایم سید: ص ۶۷،۳۶۶)

جی ایم سید مرحوم نے پاکستان کی تاریخ کی جس پہلی بے ضابطگی کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کے آغاز کا تعلق قایداعظم کی ذات گرامی سے ہے۔ اس وقت اسمبلی میں پاکستان کے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بہ نفس نفیس تشریف فرما تھے، لیکن انھوں نے اس بے ضابطگی پر نہ ٹوکا نہ احتجاج کیا۔ کسی اور سے جس کی ہوس اقتدار اور اغراض نے اسے یہاں تک پہنچایا تھا کیا توقع ہو سکتی تھی جو اس بے ضابطگی پر ٹوکتا؟ اللہ تعالیٰ نے حق کے اعتراف و اظہارِ توفیق کو ان سے پہلے ہی سلب کر لیا تھا۔

۱۱ راگست ۱۹۴۷ء: آج پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ مسٹر جوگندر ناتھ منڈل کرسی صدارت پر بیٹھے تھے۔ اسمبلی کے صدر کا انتخاب شروع ہوا۔ مسٹر منڈل نے اعلان کیا کہ سات حضرات کی طرف سے کاغذات نامزدگی داخل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں صدارت کے لیے قایداعظم کا نام تجویز کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے امیدوار کے کاغذات نامزدگی وصول نہیں ہوئے۔ اس لیے قایداعظم محمد علی جناح پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے منتخب صدر قرار دیے جاتے ہیں۔ قایداعظم اپنی جگہ سے اٹھے اور صدارتی کرسی پر تشریف لے گئے۔ مسٹر لیاقت علی خاں ان کی ایک جانب اور سردار عبدالرب نشتر دوسری جانب ان کے ساتھ ساتھ انھیں وہاں پہنچا کر واپس آگئے۔ قایداعظم کی خالی کردہ کرسی پر مسٹر منڈل آکر بیٹھ گئے۔ اسمبلی کے اراکین نے قایداعظم کو مبارک باد دی۔

(قایداعظم کے شب و روز از خورشید احمد خان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء: ص ۱۵۷)

حاشیہ ❶: ہندوستان پاکستان الگ الگ دونوں ملکوں میں وقت کے تقاضوں کے مطابق مسلم لیگ کی تقسیم کا فیصلہ ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال (کراچی) میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں کیا گیا تھا۔ (اب ث)

مجلس دستور ساز پاکستان سے خطاب:

"آپ آزاد ہیں۔ اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جانے کے لیے۔ آپ پاکستان کی مملکت میں بالکل آزاد ہیں۔ آپ کسی مذہب، فرقے اور عقیدے سے تعلق رکھیں، اس کا کاروبار سلطنت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول سے اپنے نظام کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ہی مملکت کے شہری ہیں اور مساوی الحیثیت ہیں۔ ہمیں اس مسلک کو اپنے نصب العین کے طور پر سامنے رکھنا چاہیے، پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو ہندو رہے گا اور نہ مسلمان مسلمان! مذہبی اعتبار سے نہیں کیوں کہ یہ تو ذاتی عقاید کا معاملہ ہے، بلکہ سیاسی لحاظ سے ہم سب ایک ہی مملکت کے شہری ہو جائیں گے۔" (خطبات قاید اعظم: مرتبہ سید رئیس احمد جعفری: ص ۵۷۷)

ماضی میں آپ کے تعلقات ایک دوسرے سے خواہ کیسے ہی رہے ہوں اس کا رنگ، نسل، مذہب کچھ ہی ہو، اولاً ثانیاً اور آخراً اسی مملکت کا شہری ہے۔ اس کے حقوق، مراعات اور ذمے داریاں مساوی اور یکساں ہیں تو ہم بے حد ترقی کر جائیں گے۔ ہمیں اسی جذبے کے تحت کام شروع کر دینا چاہیے۔ پھر رفتہ رفتہ اکثریت اور اقلیت کے مسلمان فرقے اور ہندو فرقے کے تمام اختلافات مٹ جائیں گے۔

(خطبات قاید اعظم: مرتبہ سید رئیس احمد جعفری: ص ۵۷۹)

پاکستان کا پرچم، سب کا پرچم:

۱۱ راگست ۱۹۴۷ء: جناح صاحب کے دست راست اور جانشین لیاقت علی خاں کے یہاں بھی قاید اعظم ہی کے جذبات کی بازگشت تھی۔ جب انھوں نے ۱۱ راگست کو کراچی میں آئین ساز اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے اس پرچم کی وضاحت کی تھی جسے وہ اس وقت لہرانے جا رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ "یہ پرچم کسی ایک مخصوص جماعت یا فرقے کا پرچم

نہیں ہے۔ یہ پرچم ان تمام لوگوں کے لیے ہے جو اس کے وفادار ہوں گے۔ آزادی، حریت اور مساوات کا پرچم ہوگا۔ پاکستان کی ریاست کا جو تصور میرے ذہن میں ہے، اس میں کسی مخصوص فرقے یا فرد کے لیے خصوصی مراعات نہیں ہیں، خصوصی حقوق نہیں ہیں۔"
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر پاکستان کیوں؟ (ہندوستان اپنے حصار: ص ۲۸)

پاکستان قوم سے خطاب:

۱۷ اگست ۱۹۴۷ء: سلطنت پاکستان کے قیام کے بعد پاکستان کے شہریوں پر بڑی بھاری ذمے داری عاید ہوگئی ہے۔ انھیں یہ موقع ملا ہے کہ وہ دنیا کو دکھادیں کہ مختلف عناصر کی ایک قوم کس طرح امن و محبت کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہے اور بلا امتیاز مذہب و ملت تمام شہریوں کے بہبود کے لیے کام کرسکتی ہے۔

اندورنی اور بیرونی امن ہمارا مقصد ہونا چاہیے۔ ہمیں امن سے رہنا چاہیے۔ اپنے پڑوسیوں سے دوستانہ تعلقات اور ساری دنیا سے خوش گوار معاملات رکھنا چاہییں۔ (خطبات قایداعظم: مرتبہ سید رئیس احمد جعفری: ص ۵۴۳)

سری پرکاش نے سندھ کے لیگی رہنما مسٹر محمد ایوب کھوڑو کا بیان جو ان کے تحریک پاکستان کے ساتھ ان کے اخلاص و دیانت کا آئینہ دار ہے اپنی کتاب میں ایک اور جگہ بھی نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

"سندھ کے اولین چیف منسٹر اور مسلم لیگ کے رکن اعظم نے خود مجھ سے کہا کہ "دراصل ہم لوگ بٹوارا نہیں چاہتے تھے اور نہ مستقل پاکستان کے ہوا خواہ تھے۔ پاکستان کی تجویز تو صرف اس غرض سے کی گئی کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کو مزید حقوق اور مراعات مل جائیں۔"

ایک انگریز اخبات نویس نے مجھ سے کہا کہ

"پاکستان کا وجود میں آجانا مسٹر جناح کے لیے دردسر بن گیا، نہ تو وہ پاکستان کے خواہش مند تھے اور نہ اس کے لیے تیار تھے۔ جب واقعتاً ان کو پاکستان مل گیا تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔"

میں نے اس اخبار کا یہ قول نقل کر دیا ہے مگر یہ جاننے کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں کہ صحیح بات کیا تھی۔ اس بات سے مجھے ذرا تعجب ہوا کہ اس زمانے میں انگریز اخبار نویس مقیم کراچی مسٹر جناح کی طرف زیادہ مایل نہ تھے۔ امر واقع کیا تھا اس کا مجھے علم نہیں۔ اس نے اس قسم کی باتیں کیوں کیں اور خاص کر مجھ سے؟ اس کی وجہ جاننے سے میں قاصر ہوں۔ بغیر میرے بلائے یہ لوگ میرے پاس آکر اسی انداز کی گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ امر مجھے ناگوار گزرتا تھا۔ صدر حکومت کے خلاف کسی گفتگو کی ترغیب اور ہمت افزائی کسی سفیر کے لیے جو اس ریاست میں متعین ہو سفارتی روایات کے بالکل منافی ہے۔ ان لوگوں کی سن کر مجھے تعجب ہوتا تھا اور ایسی بات چیت ٹالنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

(پاکستان- قیام اور ابتدائی حالات: ص ۱۳۶)

مسٹر کھوڑو کے علاوہ سری پرکاش نے خود بانی پاکستان کے بارے میں جو روایت نقل کی ہے وہ بھی حقیقت کے عین مطابق ہے۔ تقسیم ملک اور مطالبہ پاکستان کے پس منظر سلسلے میں سر محمد یامین کا بیان ان کی کتاب ''اعمال نامہ'' سے نقل کیا جا چکا ہے کہ یہ مطالبہ محض دباؤ ڈال کر زیادہ سے زیادہ مطالبات منوانے کے لیے کیا تھا، جو بعد میں ان کے گلے پڑ گیا۔

یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ بانی پاکستان کو اپنی غلطی کا احساس شدت سے ہو گیا تھا اور وہ اس کا تدارک بھی کرنا چاہتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار بانی پاکستان کے آخری زمانے کے معالج کرنل الٰہی بخش نے ''لاسٹ ڈیز آف قاید اعظم'' میں کیا تھا، جسے لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے ضبط کر لیا تھا۔

بعد میں کتاب کا جو ایڈیشن چھاپا گیا وہ تحریف شدہ ہے اور اسی کا اردو ترجمہ چھپا ہے۔

انگریز ہندوستان نہ چھوڑے:

مسٹر فضل الحق سابق وزیر اعظم بنگال نے فسادات کے سلسلے میں بیان دیتے ہوئے کہ

> ''موجودہ ارباب حکومت فساد کے طوفان پر قابو نہیں پا سکتے اور وہ ناکام ہیں، اس لیے اب ایجی ٹیشن کرنا چاہیے کہ گورنمنٹ برطانیہ اپنا ۲۰ رفروری والا اعلان واپس لے لے۔ اب ایجی ٹیشن انگریز کے نکلنے کے لیے نہیں بلکہ اس

کے رہنے کے لیے ہونی چاہیے۔"

مسٹر فضل الحق کے دل کی یہ صدا ہو یا نہ ہو مگر فسادات اپنے نتائج مرتب کر رہے ہیں اور انگریز کے سامنے ہندوستان ہاتھ جوڑ رہا ہے کہ موجودہ حالت میں ہندوستان کو سنبھالیے۔ چناں چہ راول پنڈی کی اطلاع ہے کہ وہاں اس مضمون کا ایک محضر تیار ہوا ہے اور بلا امتیاز مرد عورت اور ہندو مسلمان سب لوگ دستخط کر رہے ہیں۔ جس میں برطانیہ سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ ہندوستان سے نہ جائے۔ ہمیں نہ مسلم لیگ پر اعتماد ہے نہ کانگریس پر اعتبار۔ ہمارے لیے دونوں ہی مضر ثابت ہو رہے ہیں۔ اس لیے پہلے بھی اسی راول پنڈی سے رہائی کی صدا بلند ہوئی تھی۔

(زمزم-لاہور: ۲۸ر اپریل ۱۹۴۷ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۶۶ھ)

ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا: راول پنڈی اور اس کے ملحقہ اضلاع میں بہت سے لوگ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں، ایک میمورنڈم پر دستخط کر رہے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ انگریزوں کو ہندوستان سے دست بردار ہونے سے روکا جائے۔ ان سے درخواست کی جائے کہ براے خدا اس بدنصیب ملک کو یتیم کر کے انگلستان نہ جائیں۔ اس میمورنڈم پر دستخط کرنے والوں کا خیال ہے کہ موجودہ فسادات اس لیے ہو رہے ہیں کہ انگریز ملک سے جا رہے ہیں۔ اگر وہ ہندوستان میں پھر اپنے قدم جما لیں تو فسادات بند ہو جائیں گے۔ (انصاری-دہلی: یکم مئی ۱۹۴۷ء)

مسٹر فضل حق کا بیان:

"حکومت برطانیہ کے اس اعلان نے کہ وہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان سے دست بردار ہو جائے گی اس ملک کو اختلافات کا جہنم بنا دیا ہے۔ اگر اس وقت انگریز ہندوستان سے رخصت ہو گئے تو ہندوستان کے ہر گوشے میں وسیع پیمانے پر خانہ جنگی پھیل جائے گی اور اتنی خون ریزی ہوگی کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس لیے اس موقعے پر ہمارا نعرہ بجاے اس کے کہ "ہندوستان سے دست بردار ہو جاؤ" یہ ہونا چاہیے کہ "انگریزو! ہندوستان میں رہو۔" (انصاری-دہلی: یکم مئی ۱۹۴۷ء)

مہاجرت کے تین سیلاب:

پاکستان میں ہندوستان کے پہلے قونصل جنرل سری پرکاش جی لکھتے ہیں:

''(۱) آل انڈیا سروس والے: کراچی میں مجھے مہاجرت کے تین سیلابوں سے نمٹنا پڑا۔ پہلا گروہ تو آل انڈیا سروس والے ہندوؤں کا تھا جن میں ریلوے کے چپڑاسی تک شامل تھے۔ ان میں ہر فرد ہندوستان کی سرزمین پر پہنچ جانے کے لیے بے چین تھا۔

(۲) عام ہندو: اس کے بعد عام ہندوؤں کی باری آئی جو میرے سمجھانے بجھانے کے باوجود اپنے قدیم وطن میں رہنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ چند لوگ تو ہوائی جہاز سے چلے آئے۔ ریل کا سفر بے حد خطرناک تھا، اس لیے وسیع پیمانے پر سمندری راستے سے ان کے سفر کا بندوبست کرنا پڑا۔

(۳) ہندوستانی مسلمان: تیسرا طبقہ ان مسلمانوں کا تھا جو جوش کے نشے میں پاکستان پہنچ گئے تھے اور جب وہاں یہ دیکھا کہ ان کے لیے اس ریاست میں کوئی گنجایش نہیں ہے تو وطن کی یاد مذہبی سرگرمی سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوئی اور گھر پلٹ جانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔''

''اپنے دوروں میں میرے دیکھنے میں یہ آیا کہ بڑے بڑے قصبات جہاں کے باشندے مرفہ الحال تھے ویران اور سنسان پڑے ہوئے تھے، ایک ایک ہندو وہاں سے چل دیا تھا۔ ایک موقع پر جب میں اور چیف منسٹر مسٹر کھوڑو ایک ہی موٹر میں ہم سفر تھے انھوں نے مجھ سے کہا کہ پاکستان میں آنے والا ہر مسلمان شہر ہی میں بسنا چاہتا ہے اور ان اندرونی مقامات میں قیام کرنا اس کو گوارا نہیں۔ اگر وہ یہاں آباد کاری کریں اور زراعت میں لگ جائیں تو ان کو بڑا نفع ہو، کیوں کہ ان زمینوں کے مالک ان کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور کھیت وغیرہ بیکار پڑے ہیں۔''

پاکستان اور لیگی رہنماؤں کا اخلاص:

میں نے اور مسٹر کھوڑو نے یہ دورہ بہت دور تک کیا اور باہم دل کھول کر باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ دراصل نہ تو کوئی تقسیم ملک کا حامی تھا، نہ مستقل پاکستان کا خواہاں۔

وہ کہنے لگے کہ میں خود مسلم لیگ کے اندرونی حلقے کا ممبر تھا اور اصل واقعہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ پاکستان کا مطالبہ محض سودے بازی تھا، تاکہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کو مزید حقوق و رعایت حاصل ہو جائیں۔

مسٹر جناح کو صدمہ:

ایک انگریز اخبار نویس نے جو ایک مشہور انگریزی اخبار کا نمایندہ کراچی میں تھا، خود مجھ سے کہا کہ

> ''پاکستان بن جانے سے مسٹر جناح کو ایک دھکا لگا۔ درحقیقت وہ قیام پاکستان نہیں چاہتے تھے اور جب پاکستان بن گیا تو وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کریں۔ اس کے انتظام میں ان کو بڑی دقتوں کا سامنا تھا۔ واقعہ اور اصلیت جو بھی ہو میں ان باتوں کا ذکر کر رہا ہوں جو مختلف لوگوں سے دوران گفتگو میرے کانوں میں پڑیں۔'' (پاکستان- قیام اور ابتدائی حالات: ص۶-۵۵)

سری پرکاش جی نے یہاں جس اخبار نویس کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے، وہ ایم ایس شرما ہیں اور وہ کراچی ہی سے ''دی ڈیلی کراچی گزٹ'' کے نام سے اخبار نکالتے تھے۔ جناح صاحب سے نہایت قریب کا تعلق رکھتے تھے اور بہت مخلص تھے۔ جناح صاحب نے کراچی مستقل قیام کے لیے اصرار کیا تھا اور وہ وطن چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، لیکن جناح صاحب سے ان کے اخلاص اور عقیدت کسی پسند نہ تھی۔ اس لیے مجبوراً انھیں پاکستان چھوڑنا پڑا۔

۱۱/اکتوبر ۱۹۴۷ء: ہندوستان میں رہنے والے اپنے مسلمان بھائیوں کو میں یہی مشورہ دوں گا کہ وہ جس مملکت میں ہیں اس کے ساتھ پوری وفاداری کا ثبوت دیں اور ساتھ ہی ساتھ انھیں یہ بھی چاہیے کہ اپنی تنظیم کریں اور صحیح قسم کی قیادت پیدا کریں، جو اس پرآشوب زمانے میں ان کی ٹھیک رہنمائی کر سکے۔ (خطبات قاید اعظم: مرتبہ سید رئیس احمد جعفری)

پاکستان کا مطلب- لا الہ الا اللہ؟

پنجاب کے وزیر تعلیم (ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور میں) غلام نبی کا ایک مضمون

نوائے وقت، لاہور کی اشاعت مورخہ ۲۷ر جنوری ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ وہ اس میں لکھتے ہیں:

"آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی آخری میٹنگ خالق دینا ہال۔ کراچی میں ہوئی تھی، جس میں قاید اعظم بہت ہی لاغر اور کم زور دکھائی دے رہے تھے۔ جب ایک بزرگ نے ان سے سوال کیا کہ قاید اعظم! ہم قوم سے یہ کہتے آ ئے ہیں کہ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ! تو قاید نے فرمایا کہ یہ درست ہے کہ یہ نعرہ تمام مسلمانوں کی زبان پر ہے اور یہ ان کے دل کی آواز ہے، لیکن یہ نعرہ میں نے ایجاد نہیں کیا اور نہ ہی میری ورکنگ کمیٹی یا کونسل نے کوئی ایسا ریزولیوشن پاس کیا ہے۔" (کاروانِ احرار، ج ۷، ص ۲۵۹)

واضح رہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس قیام پاکستان کے بعد ۱۴، ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں ہوا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام کا خطبۂ ناگ پور ۱۹۴۹ء:

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کو ابھی پورے دو سال بھی نہیں گزرے تھے وطن عزیز کی فضا میں تلاطم موجود تھا۔ طرح طرح کی آوازیں تھیں اور طرح طرح کے تاثرات۔ اس وقت ناگ پور کانفرنس (۱۹۴۹ء) میں حضرت اقدس نے جمعیت علماے ہند کے سالانہ اجلاس میں جو خطبۂ صدارت (زبانی) ارشاد فرمایا وہ اگرچہ وقتی تھا، مگر افادیت کے لحاظ سے وہ گویا صحیفۂ لقمان تھا۔ جس کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے اور اس سے ہمیشہ سبق لینا چاہیے۔ ذیل میں خطبہ ملاحظہ فرمایے:

حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز نے خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا:

"حضرات! جمعیت علماے ہند کوئی نئی جماعت نہیں ہے جو پچھلے دو چار برس میں قایم ہوئی ہو بلکہ یہ وہی جماعت ہے جس نے ہندوستان میں سب سے پہلے آزادی ہند کی جدو جہد شروع کی تھی۔ اس کی بنیاد ۱۸۰۳ء میں رکھی گئی تھی۔"

"ہندوستان میں سب سے پہلے انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں آئے تھے، جن کو

بادشاہ دہلی نے بہ طور ملازم رکھا تھا کہ وہ بنگال، بہار، اڑیسہ وغیرہ کی مال گزاری وصول کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کریں۔ ڈاکٹر ہنٹر نے خود اس کا اقرار کیا ہے، لیکن انگریز نے آہستہ آہستہ ایسی تدابیر اور حیلے اختیار کیے کہ ان کی قوت بڑھتی گئی اور بادشاہ دہلی سے آہستہ آہستہ کچھ اختیارات حاصل کر کے اپنے پیمان اور وعدوں کو توڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء میں انھوں نے شہنشاہ دہلی کو بالکل مجبور اور بے بس کر کے یہ لکھوالیا کہ آج سے تمام ملک کا انتظام کمپنی کے سپرد ہوگا۔''

''ہندوستان انگریزوں کی آمد سے پہلے نہایت خوش حال اور دولت مند ملک تھا۔ یہاں ضروریات زندگی اور سونے چاندی کی اس قدر افراط تھی کہ جس کی نظیر دنیا بھر میں نہ ملتی تھی۔ یہاں صرافوں کی دوکانوں پر سونے چاندی کے ایسے ڈھیر لگے رہتے تھے جیسے کسی منڈی میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں۔ ۱۷۷۲ء میں سونے کے ۲۰۰ سکے رائج تھے۔ اکبر اور جہانگیر کے دور میں نو قسم کی اشرفیاں چلتی تھی۔ جن میں سب سے بڑی اشرفی ایک سو دو تولے کی ہوتی تھی۔ اناج کی یہ کثرت تھی کہ ایک رُپے کا چار من گیہوں ملتا تھا اور ایسا ہی دوسری ضروریات زندگی کا حال تھا۔''

انگریز کی لوٹ مار:

''انگریزوں نے ہندوستان آنے کے بعد نہایت بھیانک اور ظالمانہ طریقوں سے ہندوستان کو لوٹنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ حکومت پر قبضہ کیا، پھر بھاری بھاری ٹیکس لگائے۔ لگان اور مال گذاریاں مقرر کیں۔ تمام بڑے عہدوں پر انگریز افسروں کو مقرر کیا اور ہندوستانیوں کو صرف ادنا درجے کی ملازمتیں دیں اور جابرانہ طریقوں سے ہندوستان کی تمام دولت و ثروت کو لوٹ کر انگلستان پہنچا دیا۔''

''ان بڑھتے ہوئے مظالم اور زیادتیوں کو دیکھتے ہوئے حضرات علما نے یہ محسوس کیا کہ اگر انگریزوں کو ہندوستان سے جلد نہ نکالا گیا تو ہندوستانیوں کی تباہی و بربادی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ چناں چہ ۱۸۰۳ء میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے یہ فتویٰ دیا کہ ہندوستان کی آزادی ختم ہو چکی ہے، ہم سب کا فرض ہے کہ متحد ہو کر جلد بدیشی

حکومت کو ہندوستان سے نکالیں۔ یہ فتویٰ آج بھی ''فتاویٰ عزیزیہ'' میں موجود ہے اور اس پر جمعیت علماے ہند کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اُسی وقت سے آزادی ہند کی تحریک شروع ہوئی ہے۔''

جمعیت علما کا کارنامے:

''جمعیت علما اس وقت سے برابر اپنی جدوجہد میں مصروف رہی۔ شروع میں اس کی تحریک خفیہ طور پر چلائی گئی۔ ۱۸۲۴ء میں صوبۂ سرحد کے اطراف میں مورچہ لگایا، گیا جہاں چھ سال تک برابر انگریزوں سے جنگ ہوتی رہی۔ ۱۹۰۷ء میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ریشمی خط کی تحریک شروع کی اور ۱۹۱۴ء تک اُسے اس حد تک پہنچا دیا۔ اگر اس وقت کچھ ملک کے خاین خیانت نہ کرتے تو اسی وقت ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا۔ اسی دوران ۱۸۸۵ء میں کانگریس قایم ہوئی جو کسی ایک فرقے کی جماعت نہ تھی بلکہ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، غیرہ سب شریک تھے۔''

''سمجھ دار مسلمانوں اور علماے کرام نے جو پہلے ہی سے آزادی وطن کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ کانگریس کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر انگریزوں کو نکالنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دیں۔ ان میں سے بہت سوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ کالے پانی کی سزائیں دی گئیں۔ سخت سے سخت قید میں رکھا گیا، لیکن وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی نہ گھبرائے۔ اگر تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے تو آزادی وطن کی راہ میں کسی کی بھی قربانیاں اتنی نہیں ہیں جس قدر علماے کرام کی ہیں۔''

انگریز کی آخری کوشش:

''بہر حال ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی اس تحریک کو کامیاب ہوتا دیکھ کر انگریزوں نے آخری کوشش یہ کی کہ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھا جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے بہت سے بھائی انگریزوں کے اس فریب کا شکار ہوئے۔ جس کا نتیجہ تقسیم ہند کی بھیانک صورت میں رونما ہوا۔ جس میں لاکھوں ہندو مسلمان قتل ہوئے۔ لاکھوں تباہ و برباد ہوئے۔ ہزارہا

عورتوں کی عصمت دری ہوئی اور کروڑوں رُپیہ کا مال لوٹا گیا اور برباد کیا گیا اور آج تک ان مصیبتوں سے چھٹکارا نہ ملا۔"

"آج کچھ بے وقوف کہتے ہیں کہ جمعیت علما فرقہ پرست جماعت ہے۔ حال آں کہ میں نے آپ کو بتایا کہ جمعیت علما کوئی نئی جماعت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ سے آزادیٔ وطن کے لیے سب فرقوں کی مشترک جماعت کانگریس کے ساتھ قربانیاں دیتی رہی ہے۔ اس نے کبھی فرقہ واریت کو اپنے اندر نہ آنے دیا۔ اس کے فارمولے، تجاویز اور ریکارڈ موجود ہیں۔ دیکھو! اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ تمام فرقے باہم میل جول کے ساتھ ملک کی خوش حال کے لیے کوشش کریں اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہیں۔ جیسے وہ انگریزوں کے آنے سے پہلے مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے گھر، دکانیں، کھیت اور باغات کے معاملات، لین دین ایک دوسرے سے ملے جلے ہوئے تھے، ان میں باہم کوئی نفرت اور دشمنی نہیں تھی۔ بے شک بادشاہ اور رجواڑے لڑا کرتے تھے مگر وہ حکومتوں کی لڑائی ہوتی تھی۔ ان سب کی فوجوں میں سب فرقوں کے لوگ ہوتے تھے۔"

حضرت مولانا نے تقسیم کے بعد پیدا شدہ حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

"محترم بزرگو! ہندوستان ہمارا وطن ہے، ہم اور ہمارے آباؤ اجداد یہیں پیدا ہوئے تھے اور یہیں مرے۔ ہم سب کو یہیں رہنا ہے۔ ہماری ترقی اور خوش حالی آپس کے اتحاد اور اتفاق سے ہو سکتی ہے۔ لڑائی ہمیشہ تباہی لاتی ہے۔ ہم بگڑیں گے تو ہمارا ملک بگڑے گا۔ ہم نبھتے ہیں تو ہمارا ملک بھی نبھتا ہے۔ ہم سب ہندوستانی ہیں اور ایک قوم ہیں۔ اس لیے ہم سب کو بھائی بھائی کی طرح محبت کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے، جیسے ہم پہلے رہا کرتے تھے۔"

پریشانیاں جلد ختم ہو جائیں گی!

"مسلمانو! یہ ٹھیک ہے کہ آج تقسیم کے بعد ہماری حالت بہت نازک ہو گئی ہے اور ہمیں طرح طرح کی پریشانیاں درپیش ہیں، لیکن یہ سب پریشانیاں جلد ختم ہو جانے والی ہیں۔ اور آخر ہم سب کو یہیں مل جل کر رہنا ہے۔ ہندوستان کی حکومت ہندو حکومت نہیں

ہے۔ وہ غیر مذہبی حکومت ہے۔ وہ سب فرقوں کو ان کے برابر حقوق دیتی اور دینا چاہتی ہے۔ اور یہی اس کا اعلان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نیچے درجے کے بعض افسر اور سرکاری ملازم اپنی الگ پالیسی چلاتے ہیں، لیکن یہ اسی مشین کے پرزے ہیں جو انگریز نے چلائی تھی اور جس کے ذریعے وہ حکومت کرتا تھا، لیکن انگریز ہندوستان سے جا چکا ہے، اس کا اثر جو کچھ باقی ہے وہ جا کر رہے گا۔ اس لیے ہمیں گھبرانا اور بھاگنا نہیں چاہیے بلکہ پورے صبر اور استقلال کے ساتھ اپنا وطن سمجھتے ہوئے یہیں رہنا چاہیے۔......... تم حیدرآباد بھاگ کر گئے تھے تو اس کا نتیجہ شرمندگی کے سوا کیا ہوا؟ اور آخر تم یہیں لوٹ کر آئے۔ اس لیے تمھیں بتاتا ہوں کہ اگر تم صبر و استقلال کے ساتھ رہو گے، سچائی پر قایم رہو گے، سب کی بھلائی اور بہتری چاہو گے تو خدا تمہارے ساتھ ہوگا اور جس کے ساتھ خدا ہوا پھر اس کو کسی چیز کا ڈر ہو سکتا ہے؟''

آزمایش:

''تم مسلمان ہو، تمہارے باپ دادا تو موت کے ایسے شیدائی تھے کہ اس کی آرزو کیا کرتے تھے اور تم آج موت اور پریشانیوں سے ڈرتے ہو؟

اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ اگر تم صبر اور استقلال کے ساتھ یہاں رہو گے اور سچائی کی راہ پر قایم رہو گے تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔ چوں کہ قرآن کریم نے تمھیں بار بار اس کی تاکید کی ہے۔ اس کے بعد اگر تم کہیں کسی ظالم کے ہاتھ سے مارے بھی جاؤ تو تمھیں اس موت سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ چوں کہ وہ شہادت کی موت ہوگی۔ اور تم جانتے ہو کہ شہادت کی موت کا کتنا بلند رتبہ ہے۔ جس کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بار بار آرزو کی اور فرمایا: میرا دل چاہتا ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، تو پھر کیوں تم ایسی موت سے ڈرتے ہو؟ مصیبتیں آیا ہی کرتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ایمان والو! تمھیں دنیا میں ہر طرح سے آزمایا جائے گا، لیکن اگر تم نے صبر کیا اور استقلال کے ساتھ سچائی کی راہ پر قایم رہے تو پھر تمہارے ساتھ خدا کی مدد ہوگی اور تمہارے لیے کامیابی کی خوش خبری ہوگی۔''

جمعیت علما کا نصب العین:

تقریر ختم کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا؛

بھائیو! یہی وہ تبلیغ اور تعلیم ہے جو اب جمعیت علما کا نصب العین ہے۔ وہ مسلمانوں کی جہالت، بے علمی اور مذہب سے ناواقفیت کو ختم کرنا چاہتی ہے اور اسی کے لیے برابر کوشش کر رہی ہے اگرچہ کچھ مالی مشکلات کی وجہ سے اور کچھ کارکنوں کی کمی کی وجہ سے وہ ایسی کوشش نہ کرسکی جیسی ہونی چاہیے تھی، لیکن آپ حضرات کی مدد سے امید ہے کہ وہ پوری کوشش کرتی رہے گی۔ پس آج یہی مذہبی خدمات اور تعلیم کی ترویج اس کا نصب العین ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ آپ بھی اس کے نصب العین کو اپنائیں۔"

"دینی اور دنیاوی تعلیم کو مسلمانوں میں پھیلائیں، جابجا مدرسے اور نایٹ اسکول قایم کریں، دین کو پھیلائیں اور سب کو دین کا پابند بنانے کی کوشش کریں!

اسی نصب العین کی طرف جمعیت علما آپ کو بلاتی ہے۔ سیاسی نصب العین تو حاصل ہو چکا ہے۔ ملک بدیشی راج سے آزاد ہوگیا ہے۔ اب بھی جو سیاسی امور ہیں وہ جمعیت علما کے پلیٹ فارم سے نہیں بلکہ مشترک جماعت کے پلیٹ فارم سے انجام دیے جائیں گے اور ان میں مسلمانوں کو برابر حصہ لینا چاہیے۔ انھیں چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ جمعیت علماے کے بھی ممبر بنیں اور کانگریس کے بھی، تاکہ وہ سیاسی معاملات میں کانگریس کی راہ سے حصہ لے سکیں اور مذہبی خدمات میں جمعیت علما کی راہ سے!"

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

۱۴ ستمبر ۱۹۵۰ کو پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس کے صدارتی انتخاب اور ناسک میں ہونے والے کانگریس کے اجلاس سے متعلق ایک بیان جاری کیا کہ بین الاقوامی امور، اقتصادی امور اور فرقہ وارانہ مسایل پر کانگریس اپنی آیندہ پالیسی کی وضاحت کردے تاکہ کسی غلط فہمی کی گنجایش ہی باقی نہ رہے۔

۲۰ ستمبر ۱۹۵۰ء ناسک کے ساڑھے سات لاکھ مربع فٹ کے علاقے کے عین وسط میں لکڑیوں کا خوب صورت پنڈال بہ نام "گاندھی نگر" جو بزمِ جمشید وقیصر کے تاریخی آثار کو اپنے حسن ودل آویزی سے گرم کر رہا تھا، ہزاروں عقیدت مندوں، مندوبین اور اخباری نمایندوں کی موجودگی میں بابو پرشوتم داس ٹنڈن صدر ۵۷ ویں سالانہ اجلاس نے ۱۵ فٹ بلند چبوترے سے ترنگے کو لہرایا۔ پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور ملک کے نمایندے موجود تھے۔ صدر استقبالیہ وینکٹ راؤ بھاؤ صاحب ہیرے تھے۔ مجلس موضوعات میں کانگریس کے دستوری ترمیم سے متعلق ایس کے پاٹیل کی پیش کردہ قرارداد پر مباحثہ جاری رہا۔ تب پنڈت نہرو نے فرقہ واریت سے متعلق قرارداد پیش کرتے ہوئے بڑی جوشیلی تقریر کی۔ ڈاکٹر پی سی گھوش نے تائید میں کہا کہ ہندوستان کا دستور جمہوری ہے جو ایک فرقہ دوسرے فرقے میں امتیاز نہیں کرتا۔ پنجاب کے سیتاپال نے تائید میں کہا کہ بہت سے کانگریسی اپنے آپ کو قوم پرست کہتے ہیں لیکن دراصل وہ فرقہ پرست ہیں۔ ان لوگوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ عوام یہ کہنے لگے کہ کانگریس اور ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے اس قرارداد کی تائید میں کہا کہ یہ کہنا کہ پاکستان کی فرقہ پرست پالیسی ہندوستان میں فرقہ واریت کی ذمے دار ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوستان کے لیڈروں کی کوئی پالیسی نہیں ہے۔ بلکہ یہاں بھی پاکستان کی مسلم لیگ کی پالیسی چلتی ہے، لیکن یہ طریقہ غلط ہے، ہمیں اپنے مؤقف کو مضبوط کرنا اور پھر پاکستان کو اپنا مؤقف بدلنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ آج صدر اجلاس نے اپنے خطبے میں ہندی، خارجہ پالیسی، دولت مشترکہ، ایشیا وغیرہ عنوانات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمارے عوام ہمارے اس مطالبے کے جو اقوامِ متحدہ میں پیش ہے، ہمارے ساتھ ہیں کہ پاکستان کو کشمیر میں حملہ آور قرار دیا جائے۔ آگے صدر اجلاس (پرشوتم داس ٹنڈن) کہتے ہیں کہ ہم پاکستان کے قیام کو تو نہ روک سکے، لیکن ہندوستان میں ہماری پالیسی، ہندو مسلمان، سکھ، بدھی، جین، پارسی، اور عیسائی میں امتیاز نہیں کرتی۔ ان کو ایک قوم کی طرح رہنا چاہیے۔ ہمارے دستور کے تحت ہماری حکومت لادینی ہے اور ہر شہری کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی شرافت و دوراندیشی کا ثبوت ہے۔ ۲۱ ستمبر کو رات گیارہ بجے یہ کہہ کر جو کھادی پہنتا ہے

وہی کانگریسی کہلانے کا حق دار ہے اور اجلاس ختم ہوگیا۔

(مولانا آزاد۔ایک سیاسی ڈاری: ص۳۶۲-۳۶۳)

۱۱ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو صدر کانگریس بابو ٹنڈن نے دہلی سے یہ اپیل شایع کی کہ ہندوستان میں کسی مذہبی کتاب پر کوئی حکومت قایم نہیں کی جاسکتی۔ کیوں کہ یہاں بہت سی مذہبی کتابیں موجود ہیں۔ لہٰذا مذہبی حکومت کے قیام کا مطالبہ ہندوؤں کی آپس میں خانہ جنگی کا باعث ہوجائے گا۔ اس لیے کہ وہ خود مختلف کتابوں کے پیرو کار ہیں۔ چناں چہ یہاں تمام مذہبی فرقوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔

۱۳ر اکتوبر کو یہ خبر گشت کر گئی کہ ٹنڈن بابو کی کانگریس کمیٹی میں کوشش کے باوجود پنڈت جواہر لال نہرو نے شرکت سے انکار کر دیا ہے اور اگر نہرو شریک نہ ہوئے تو مولانا ابوالکلام آزاد اور سی راج گوپال اچاری بھی شریک نہ ہوں گے اور دیگر ارکان بھی شرکت سے گریز کریں گے، لیکن ۱۵ر اکتوبر کو ٹنڈن بابو نے کہا کہ سردار پٹیل کی قیام گاہ پر پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، سردار پٹیل کی نوے منٹ طویل گفتگو کے بعد ایک ماہ سے جاری تعطل ختم ہوگیا۔ بابو جی نے کہا کہ مولانا آزاد نے یہ ذمے داری سنبھال لی تھی کہ وہ پنڈت جی کے خیالات بدلنے کی کوشش کریں گے۔

چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ اس طرح ۱۶ر اکتوبر کو صدر کانگریس نے اپنی مجلس عاملہ کے ناموں کا اعلان کر دیا:

(۱) بابو پرشوتم داس ٹنڈن (۲) کلاونکٹ راؤ سیکریٹری
(۳) موہن لال گوتم سیکریٹری (۴) مولانا ابوالکلام آزاد
(۵) پنڈت جواہر لال نہرو (۶) سردار ولبھ بھائی پٹیل
(۷) راج گوپال اچاری (۸) بابو جگ جیون رام
(۹) پنڈت گووند ولبھ پنت (۱۰) ایس کے پاٹیل
(۱۱) کامراج ناڈر (۱۲) سردار پرتاب سنگھ کیروں
(۱۳) این جی رنگا (۱۴) اتولیہ گوش
(۱۵) شدھی ناتھ شرما (۱۶) لکشمی ناراین سدھانشو

(۱۷) بی ایس ہرے (۱۸) سیٹھ گووند ولبھ پنت

(۱۹) گرکل لال اسوا (۲۰) شریمتی پشپا مہتا۔

(مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈائری: ص ۶۵-۴۶۴)

ذبیحۂ گاؤ کی اجازت حکومت ہند اور حکومت بمبئی کی پالیسی:

۱۳/ مارچ ۱۹۵۱ء: ۱۳/ مارچ ۱۹۵۱ء کو حکومت بمبئی کے وزیر داخلہ مرار جی دیسائی نے ذبیحہ گاؤ کے متعلق کہا کہ دودھ دینے والے کارآمد مویشیوں کا ذبیحہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اور عمر رسیدہ بیمار مویشیوں کو ذبح کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔آں جہانی سردار ولبھ بھائی پٹیل نے بھی کہہ دیا تھا کہ ذبیحہ گاؤ کو کامل طور پر ممنوع قرار دینے سے ہندوستان کی معاشیات پر سخت برا اثر پڑے گا اور پھر یہ بات حکومت ہند کے منشا کے مطابق بھی ہے۔

(مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈائری: ص ۴۶۸)

وزیراعظم پاکستان کا دورۂ ہند:

۱۴/ مئی ۱۹۵۵ء: ۱۴/ مئی ۱۹۵۵ء کو پانچ روزہ دورہ پر آئے ہوئے وزیراعظم پاکستان مسٹر محمد علی نے دہلی پالم ہوائی مستقر پر اخبار نویسوں کو بتلایا کہ مسٹر نہرو سے مذاکرات کے لیے کوئی نئی تجویز نہیں لایا ہوں۔ البتہ دورانِ گفتگو اگر کوئی نئی صورت سامنے آئی تو وہ شریک گفتگو کر لی جائے گی۔ آج ۱۵/ تاریخ کی گفتگو میں دونوں وزرائے اعظم کے علاوہ وزیر داخلہ میجر جنرل اسکندر مرزا اور وزیر داخلہ پنڈت پنت نیز مولانا ابوالکلام آزاد بھی شریک رہے۔ سرحدی واقعات کے سدباب کے سوال پر اور ان واقعات کی روک تھام کے سلسلے میں دونوں وزرائے داخلہ میں اصولی طور پر اتفاق ہو گیا اور ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ گو کہ اس ضمن میں معلومات فراہم کرنے کے لیے مزید دو اعلا افسران لاہور سے کل دہلی آجائیں گے۔ آج صدر جمہوریہ نے مہمانوں کو راشٹر پتی بھون کے مغل گارڈن میں شان دار اعزازی استقبالیہ دیا۔ کل ۱۶/ مئی کی گفتگو میں کشمیر کا مسئلہ پیش نظر تھا۔ آج ان وزرا کے ساتھ مولانا آزاد، اسکندر مرزا، پنڈت پنت بھی حصہ لے رہے ہیں۔ آج رات کا کھانا مہمانوں نے پنڈت نہرو کے ساتھ کھایا۔ (مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈائری: ص ۵۲۴)

دوستی نہ کہ جنگ! گورنر جنرل پاکستان کا بیان:

یکم مارچ ۱۹۵۶ء: لندن میں گورنر جنرل پاکستان میجر جنرل اسکندر مرزا نے ایک بیان دیا ہے کہ کوئی ذمے دار پاکستانی ہندوستان کے خلاف جنگ کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ہندوستان پاکستان کی دوستی و تعاون میں صرف مسئلہ کشمیر رکاوٹ ہے۔ معاہدۂ بغداد جو ہندوستان کے نزدیک خطرہ ہے پاکستان کے لیے امن کی ضمانت ہے۔ پاکستان بیرونی فوجی امداد کو ہندوستان کے خلاف استعمال کرنے کا کوئی خیال نہیں رکھتا۔

(مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈائری: ص ۵۲۴)

چند اندراجات
ان میں سے اکثر کا تعلق لیگ کی اخلاقیات سے ہے
اور عام طور پر ان کا نشانہ علمائے دین
یا جمعیت علمائے ہند کے رہنما اور کارکن ہیں

جمعیت کے کارکنوں کے متعلق غلط اور جھوٹا
پروپیگنڈا کہ وہ کانگریس کے تنخواہ دار ہیں:

بہت مرتبہ یہ پروپیگنڈا کیا گیا اور مفسدوں نے شہرت دی کہ جمعیت والے کانگریس کے تنخواہ دار ہیں اور ہندوؤں کے خریدے ہوئے ہیں، مگر یہ بالکل جھوٹ اور افترا تھا اور ہے۔ بارہا برسر اجلاس حضرت مولانا احمد سعید صاحب، مولانا مفتی کفایت اللہ اور کاتب الحروف نے قسمیں کھائیں کہ کبھی ایسا نہ شخصی طور پر ہوا نہ اجتماعی طور پر۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے تو یہاں تک بھرے مجمع میں کہہ دیا کہ اگر میں نے یا جماعت کے کسی ذمے دار نے ایسا کیا ہو تو خدا ہم کو مرتے وقت کلمہ نصیب نہ کرے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم کردے! اس سے زیادہ اطمینان دلانے کے لیے ہمارے پاس کیا طریقے ہوسکتے تھے۔ واقعہ یہی ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ذمے دار جمعیت ایسی بے غیرتی اور بے ایمانی کا مرتکب نہیں ہوا۔ اگر ہم کو ایمان فروشی کرنی ہی ہوتی تو انگریز کے ہاتھ کرتے، جس کے پاس دولتوں کے خزانے اور حکومت کی طاقت ہے۔ کانگریس تو ہماری

طرح غلام اور مسکین ہی ہے۔ اس کے پاس جو کچھ سرمایہ ہے وہ انگریز کے سرمایے کے سامنے ایسی بھی نسبت نہیں رکھتا جو کہ ذرے کو پہاڑ سے ہوتی ہے۔ ہم نے قسمیں کھا کھا کر اور مغلظ قسمیں کھا کر مجامع میں لوگوں کو یقین دلایا، مگر وہ بے ایمان جو کہ اغراض فاسدر کھتے ہیں یا حکومت کے ایجنٹ ہیں یا خود اسی کے عادی ہیں اپنی زبانوں اور قلموں کو نہیں روکتے۔ اس کا علاج بہ جز تفویض الی اللہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

قد قیل ان الالہ ذو ولد — وقیل ان الرسول قد کھنا

ما نجی اللہ والرسول معا — من لسان الوری فکیف انا

محمد علی جناح کا علما کے خلاف اظہارِ نفرت:

۲۶ر فروری ۱۹۴۲ء: مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیرِ اہتمام راول پنڈی میں ہونے والے دوسرے سالانہ جلسے کی مجلس استقبالیہ کے صدر منظور الحق صدیقی ایم اے کے نام ایک پیغام میں اجلاس کی کامیابی کی توقع ظاہر کی ہے۔ اس پیغام میں انھوں نے اپنی علما بیزاری کا اظہار بھی کیا ہے اور ''انھیں سب نے ناپسندیدہ رجعت پسند عناصر'' قرار دیا ہے اور اسے اپنا کارنامہ بتایا ہے کہ قوم ان کے اثرات سے پاک ہوگئی ہے۔ مسٹر جناح لکھتے ہیں:

> ''ہم بڑی حد تک اپنی قوم کو سب سے ناپسندیدہ عناصر سے پاک کر چکے ہیں۔ ہم نے کسی حد تک اس خاص طبقے کے اثر کو زائل کر دیا ہے جو مولانا اور مولوی کہلاتے تھے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ہماری جدوجہد میں ہماری خواتین ساتھ رہیں۔ جہاں جہاں میں گیا انھوں نے اجتماعات میں شرکت کی اور بہت سی چیزوں میں بڑی ہی دل چسپی ظاہر کی۔''

(مآثر الاجداد: از منظور الحق صدیقی ایم اے، ۱۹۶۴ء لاہور: ص ۴۰۴)

جمعیت کے جلسے سے عدم سروکار کی نصیحت:

۴ر مارچ ۱۹۳۹ء: نئی دہلی، ۲ر مارچ قاید اعظم محمد علی جناح نے اعلان کیا ہے کہ مسلم لیگ کا کوئی آدمی دہلی میں ہونے والی جمعیت علما کانفرنس کے ساتھ کسی قسم کا سروکار نہ

رکھے۔ کیوں کہ اس جمعیت کی کارروائیاں مسلم لیگ کے مفاد کے خلاف ہیں بلکہ مسلم لیگ کو تباہ کرنے کی غرض سے اختیار کی جارہی ہیں۔ (روزنامہ انقلاب۔لاہور:۴رمارچ ۱۹۳۹ء:ص ۱)

علماے دین کے بارے میں

قایدین لیگ کے توہین آمیز ارشادات:

مسلم لیگ کے صدر قایداعظم محمد علی جناح نے ۱۶رمارچ ۱۹۴۵ء میں کوئٹہ میں کہا:

''قوم پرور مسلمان، مسلمان ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ ہندوؤں کے زرخرید خیمہ بردار ہیں۔''

قایداعظم نے ۳راپریل ۱۹۴۵ء کو بی بی سی کے نمایندے کے سامنے مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''ہرقوم میں کوئزلنگ ہوا کرتے ہیں۔آپ کے لارڈ ہاہا کہاں ہیں ❶۔''

۱۷، ۱۸راپریل ۱۹۳۸ء کو لیگ کے صدر نے کلکتہ میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا:

''ہم نے نام نہاد مولاناؤں کے اقتدار کا خاتمہ ایک حد تک کردیا ہے جو دوسروں کی انگیخت پر قوم کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ہمیں پورے انہماک اور جوش سے اپنی جدوجہد کو جاری رکھنا چاہیے۔ اس جنگ آزادی میں ہمیں اپنی عورتوں کو بھی ساتھ رکھنا چاہیے۔''

(سیرت محمد علی جناح مکتبہ لیگ ،بھنڈی بازار، بمبئی ۳:ص ۲۰۲)

لیگی رہنماؤں کی تائید میں لیگ کے ترجمان ''ڈان'' نے ۲۷ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو اپنے افتتاحی مقالہ میں لکھا کہ

''جہاں تک اس سلوک کا تعلق ہے، جو لیگی لیڈروں کی جانب سے مولانا کے ساتھ ہوتا بیان کیا جاتا ہے، ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ گلدستے کے مقابلے میں تو ان لوگوں کے حصے میں اینٹ پتھر ہی آئیں گے۔ جو شوبوائے کا کام کرتے ہیں۔'' (کاروان احرار: ج ۶،ص ۳۱۰-۳۱۱)

حاشیہ ❶ مسٹر ولیم جالیس جو لارڈ ہاہا کے لقب سے معروف تھے۔اہل برطانیہ اسے غدار کہتے ہیں۔

لیگی رہنماؤں کی اشتعال انگیزی:

پاکستان حاصل کریں گے یا تباہ ہو جائیں گے۔ (نواب ممدوٹ، ۴ر اپریل ۱۹۴۶ء)

پاکستان کی جنگ کے لیے خون کا ہر قطرہ محفوظ رکھو۔ سب سے پہلے میں اس جنگ میں اپنا خون بہاؤں گا، مسلمان ایک منظم فوج ہیں۔ (نواب زادہ علی گڑھ، ۳ر اپریل ۱۹۴۶ء)

ہمارا مطالبہ یہی ہے پاکستان کے بغیر نیا سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ ہم اس کے لیے لڑیں گے اور ختم ہو جائیں گے۔ (لیگی ممبران کنونشن دہلی)

پاکستان دس کروڑ مسلمانوں کی آواز ہے۔ پاکستان نہ ماننے والے کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ بنگال کے مسلمان سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

(مسٹر سہروردی)

ایک کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی کی زبردست مخالفت ہلاکو اور چنگیز کے خونی باب کی پھر سے تقلید کریں گے...... ہم بہترین حالات کی امید کرتے ہیں لیکن بدترین کے لیے تیار ہیں، ہمیں پاکستان سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ (مسٹر جینا، ۸ر اپریل ۱۹۴۶ء، کنونشن دہلی میں)

پاکستان کے لیے کوئی قربانی زیادہ نہیں ہے۔ (خان بہادر اسماعیل گاندھی، ۱۰ر اپریل ۱۹۴۶ء)

ہم بہار کے مسلمان پاکستان کے لیے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔

(خان بہادر اسماعیل، ۱۱ر اپریل ۱۹۴۶ء)

اگر انگریز اور ہندوؤں نے پاکستان تسلیم نہ کیا تو روس کی مدد سے ہم پاکستان حاصل کریں گے اور روس کی دوستی کریں گے۔ (سر فیروز خان نون، ۱۲ر اپریل ۱۹۴۶ء)

پاکستان کو منظور نہ کرنے سے ہندوستان کا امن اور سلامتی خطرے میں پڑ جائیں گے۔ (نواب سر مخدوم، ۱۳ر اپریل ۱۹۴۶ء)

مسلمانوں کو تیار رہنے کا حکم۔ (سر بدرالدین، ۲۱ر اپریل ۱۹۴۶ء)

ہم لڑیں گے اور دنیا کے لیے مر جائیں گے لیکن ایک اسمبلی منظور نہیں ہو گی۔

(مسٹر عبدالقیوم کی تقریر، ۲۶ر اپریل ۱۹۴۶ء)

بہار کے مسلمان طلبہ پاکستان کے لیے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔

(بہار مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکریٹری کا بیان، ۲۷ر اپریل ۱۹۴۶ء)

مسلمان پاکستان کے لیے سب کچھ قربان کر دینگے۔ (عبدالمجید خاں، ۲۹ر اپریل ۱۹۴۶ء)

ہم پاکستان کی بھیک نہیں مانگتے بلکہ اسے بہ زور شمشیر حاصل کریں گے۔

(اورنگ زیب خان کی تقریر، ۲۹ر اپریل ۱۹۴۶ء)

اگر پاکستان نہ دیا گیا تو ہم وہ تباہی مچائیں گے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں بھی نہ ملے گی۔ (مسلم نیشنل گارڈ جمشید پور کا ریزولیوشن، ۸ر مئی ۱۹۴۶ء)

اگر ضرورت پڑی تو حصول پاکستان کے لیے ہم طاقت کا استعمال کرنے سے بھی نہ ہچکچائیں گے۔ اگر پاکستان حاصل کرنے کے لیے ملّت اسلامیہ کے پیروؤں کو خون خرابہ بھی کرنا پڑا تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ (نواب مظفر خاں دولتانہ، جھنگ میں تقریر، ۱۵ر مئی ۱۹۴۶ء)

آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ پاکستان کے لیے خون بہا دیں گے۔

(خان بہادر اسماعیل کا مسٹر جینا کو تار، ۶ر جون ۱۹۴۶ء)

ہر مسلمان قوم کی خدمت اور پاکستان حاصل کرنے کے لیے مسلم نیشنل گارڈ میں شامل ہو جایے۔ (مسٹر حسن اے شیخ کی اپیل، ۱۴ر جون ۱۹۴۶ء)

ہم پاکستان کے لیے لڑنے کو تیار ہیں۔ (حاجی اسحاق سیٹھ، ۱۴ر جون ۱۹۴۶ء)

قایداعظم کے حکم پر ہم لڑنے کو تیار ہیں۔ (غضنفر علی خاں، ۳ر جولائی ۱۹۴۶ء)

اب وقت آ گیا ہے کہ لیگ تقریروں کی بجائے کوئی عملی قدم اُٹھائے، کانگریس اور انگریز کی سازش کا مقابلہ کرنا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ جو دھوکا کیا گیا ہے اس کا بدلہ لیا جائے۔ (لیگ کونسل میں سر غلام حسین کی تقریر، ۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء)

آنے والی جدوجہد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مسلمانوں کو صدائے عام پاکستان حاصل کرنے کے لیے سب کچھ قربان کر دیں۔

(مسٹر لیاقت علی خاں کی تقریر بمبئی میں، ۳۱ر جولائی ۱۹۴۶ء)

اب پہلا قدم برٹش یا کانگریس اٹھائے۔ ڈایریکٹ ایکشن سے پاکستان حاصل کریں گے۔ انگریز اور کانگریس پر سازش کا الزام۔ کانگریس کی زبردست تنظیمی تیاریوں کا الزام۔ ہم بھی اس طرح مسلح رہیں گے۔ (مسٹر جینا پریس کانفرنس میں تقریر، یکم اگست ۱۹۴۶ء)

انگریز اور کانگریس کو کھلا چیلنج، کانگریس کی مرکزی حکومت کو ناکام بنانے کا عزم۔

مسلمانوں کو بدترین حالات کے لیے تیار رہنے کی دعوت۔ (میاں ممتاز دولتانہ، ۹راگست ۱۹۴۶ء)

ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ ہماری تاریخ میں اور ہماری پالیسی میں ایک انقلابی قدم ہے۔ ہمیں پاکستان کی جنگ کے لیے تیار رہنا ہے۔ (مسٹر جینا، ۱۵راگست ۱۹۴۶ء)

پاکستان کے لیے انقلابی جنگ شروع کر دی گئی۔ (ممتاز دولتانہ، ۲۱راگست ۱۹۴۶ء)

مسلمانوں کو ایک زبردست جنگ کرنی ہے اتحاد اور ضابطے کا حکم۔ خطرناک اور سنگین صورت پیدا ہو گئی ہے۔ ہم اس جدوجہد کی آگ سے کامیاب نکلیں گے۔

(مسٹر جینا کا عید کا پیغام، ۲۸راگست ۱۹۴۶ء)

وائسرائے پر ڈبل دھوکا دہی کا الزام، قوم پروروں کو لیگ میں شمولیت کی دعوت۔

(مسٹر جینا کی اپیل، ۳۱راگست ۱۹۴۶ء)

پنجاب کے مسلمان، ہونے والی جدوجہد کے لیے تیار رہیں۔

(پنجاب لیگ ورکنگ کمیٹی کا اعلان، ۴رستمبر ۱۹۴۶ء)

جہاد شروع ہونے والا ہے، تیار ہو جاؤ۔ (نواب ممدوٹ، ۵رستمبر ۱۹۴۶ء)

مسلم قوم کو ایک سنگین صورت کا مقابلہ کرنا ہے۔ اپنی طاقت منظم کرو۔

(مسٹر فضل الحق کی اپیل، ۱۱رستمبر ۱۹۴۶ء)

ہندوستان میں زبردست خانہ جنگی ہونے والی ہے۔ نئے سرے سے گفت وشنید شروع کی جائے۔ ملک کے سامنے دو راستے ہیں، خانہ جنگی یا گفت شنید کے ذریعے باہمی سمجھوتا۔ (مسٹر جینا کا بیان، ۱۴رستمبر ۱۹۴۶ء)

انگریزوں اور رام راج کا شور مچانے والے ہندوؤں کے مل جانے کے بعد مسلمانوں کے سامنے جہاد اور ڈائریکٹ ایکشن کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہا ہے۔ مسلمانوں کی موت اور زندگی کا سوال ہے۔ لڑائی میں فتح پانے کے لیے اپنے سپاہیوں کو تیار کرو۔

(مولانا شبیر احمد عثمانی، ۲۱رستمبر ۱۹۴۶ء)

دس کروڑ مسلمان بہ زورِ شمشیر پاکستان حاصل کریں گے اور اس کے بعد تمام ہندوستان پر اپنا دعویٰ کریں گے۔ اور پھر تمام ہندوستان پر اسلامی راج قایم کریں گے۔

(مسٹر عبدالقیوم کی تقریر، ستمبر ۱۹۴۶ء)

مسلمان پاکستان کے لیے مرنے کو تیار رہیں۔اپنی لڑائی کے درمیان ہم بالکل تیار اور منظم ہیں۔(پانی پت میں خواجہ ناظم الدین کی تقریر ۱۹۴۶ء)

مولانا آزاد اور مولانا مدنی کی توہین:

۱۳؍اپریل ۱۹۴۵ء: مسٹر جناح نے بی بی سی کے نمایندوں کے سامنے مولانا آزاد اور مولانا مدنی کو انگریزی زبان کی سب سے بڑی گالی دی اور کہا ہر قوم میں کویزلنگ ہوا کرتے ہیں۔آپ کے لارڈ ہاہا کہاں ہیں۔(مدینہ بجنور)

اسی طرح چودھری خلیق الزماں صاحب لیڈر لیگ پارٹی یو پی اسمبلی نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ میں نے مولوی حسین احمد مدنی کے سامنے سے پلاؤ کا پلیٹ چھین لیا ہے، (علماے حق) غالباً چودھری صاحب بھی انگریز ٹوڈیوں ہی کے چہیتے بیٹے تھے۔

(حسرت موہانی-ایک سیاسی ڈائری)

ابوالکلام کے خلاف مظاہرہ:

۱۷؍جولائی ۱۹۴۵ء: دہلی کے اسٹیشن پر جو افسوس ناک واقعہ پیش آیا تھا اس سے متاثر ہوکر ایڈیٹر زمزم لاہور نے ''جوش کا غلط استعمال'' کے عنوان سے ذیل کا اداریہ لکھا ہے:

''۱۷؍جولائی کو شملے سے مولانا ابوالکلام کی واپسی پر مسلم لیگی دوستوں کی طرف سے دہلی اسٹیشن پر مولانا کے خلاف جو مظاہرہ ہوا وہ لیگ کی سیاست کا ایک نہایت ہی سیاہ باب ہے۔مولانا کی شخصیت ہندوستان کے بے شمار مسلمانوں کی نگاہ میں جو محبوبیت رکھتی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر یہ بات نہ ہوتی تب بھی کسی کی ذات کے خلاف ایسا دھمکی آمیز رویہ اختیار کرنا جو پولیس کی لاٹھیوں پر ختم ہوا نہایت ہی شرم ناک چیز ہے۔ چناں چہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن جب جناح صاحب بمبئی جاتے ہوئے دہلی سے گزرے تو مولانا کے عقیدت مندوں نے لیگ کے غلط کارکنوں کا جواب دینے کے لیے ان کو سیاہ جھنڈیاں دکھانے کی کوشش کی۔مگر وہ تو ''قایداعظم'' نے خطرے کی نوعیت کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا اور آخر وقت تک اندر سے دروازہ بند کیے خاموش بیٹھے رہے، ورنہ کسی ناگوار صورتِ حالات کے پیدا ہونے کا قوی اندیشہ تھا، لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر مولانا

ابوالکلام کے خلاف چند لیگیوں کی طرف سے انسانیت سوز قسم کی حرکات نہ ہوتیں تو مولانا کے عقیدت مندوں کی طرف سے بھی قاید اعظم کے خلاف ہرگز کوئی مظاہرہ نہ ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ لیگ کے پریس اور پلیٹ فارم سے جو زبان استعمال ہو رہی ہے اس کا لازمی نتیجہ ہی یہ ہے کہ پرجوش قسم کے نوجوانوں میں فساد انگیزی کو شہ ملے۔ اس لیے اگر لیگ کے لیڈروں کی طرف سے اس کی روک تھام ابھی سے نہ کی گئی تو حالات کے بد سے بد تر ہو جانے کا خطرہ یقینی ہے۔ اس موقعے پر جناح صاحب کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ لیگیوں کی اس حرکت کے خلاف آواز بلند کریں، لیکن اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو ہم یہ سمجھنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ وہ اس قسم کے فساد انگیز عنصر کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں۔

(زمزم-لاہور: ۲۳ر جولائی ۱۹۴۵ء: ص ۲)

قاید اعظم سے التجا:

۱۱ر اگست ۱۹۴۵ء: قاید اعظم مسٹر جناح مسلم لیگ کے صدر ہیں اور ہر طبقے کے نزدیک قابل احترام، لیکن ہمیں ندامت ہے کہ موصوف مسلمانوں کی واحد نمایندگی کے ادعا کے ساتھ اپنے کیریکٹر کو اسلام کی سطح پر نہ لا سکے اور کبھی اپنی روش سے یہ ثابت نہ کیا کہ وہ پارلیمنٹری دماغ کے ساتھ اعتدال اور سلامت روی میں بھی کچھ حصہ رکھتے ہیں۔ آپ نے حال ہی میں بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے کانگریس اور اس کے لیڈروں کو جن الفاظ میں یاد کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کی شان کے شایان نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ کانگریس وایسرایے کے بوٹ چاٹنے کے لیے شملہ پہنچ گئی اور اس نے ذلت اور رسوائی کے ساتھ وزارتوں کے حصول کی خواہش کی وغیرہ۔ ممکن ہے کانگریس کے متعلق ان کا یہ خیال صحیح ہو لیکن اسی مفہوم کو شریفانہ لب و لہجے میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے، آخر شرافت اور رذالت میں مابہ الامتیاز کیا ہوگا؟ ایک اخلاق سے گرا ہوا انسان بھی اگر کانگریس کے خلاف کچھ کہے گا تو اس کا لب ولہجہ اس سے زیادہ دل خراش نہ ہوگا جو قاید اعظم نے اختیار کیا ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ مسٹر جناح کی اپنی سیرت کیسی ہے لیکن جب تک وہ مسلمانوں کے ترجمان کی حیثیت سے بولتے رہیں گے، ہمیں حق ہوگا کہ انھیں اسلامی اور انسانی اخلاق کا واسطہ اور ان سے عرض کریں کہ اپنے اخلاقی تسفل کا مظاہرہ اسلام کے

دایرے سے علاحدہ ہو کر کریں اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ فرمائیں کہ آں جناب کی سیرت کی تشکیل میں اسلام کا بھی کچھ حصہ ہے۔ (زمزم۔لاہور: ۱۱راگست ۱۹۴۵ء)

مولانا حسین احمد مدنی سے توہین آمیز سلوک:

نئے انتخابات کا اعلان کیا ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں باہم سر پھٹول شروع ہو گئی۔ اچھے بھلے لوگ بھی الیکشن کے چوراہے میں برہنہ ناچنے لگے۔ اس پر ستم یہ کہ قرآن حکیم اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنی اغراض کے لیے بازیچہ اطفال بنایا گیا۔ قلم اور زبان کی لڑائی ہاتھا پائی تک آن پہنچی۔ علاوہ احرار رہنماؤں کے جمعیت علماے ہند کے صدر مولانا حسین احمد مدنی، کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد، دیگر مخالف سیاسی جماعتوں کے مقررین پر جلسوں میں پتھراؤ، گالیاں، دست اندازی اور توہین آمیز سلوک سے تنگ آ کر مسلم لیگ کے رہنماؤں کو مجلس احرار، جمعیت علماے ہند اور خاکسار وتحریک کے رہنماؤں کی طرف سے حسب ذیل انتباہ یا چیلنج دیا گیا ہے:

''۲۸راکتوبر مولانا مظہر علی اظہر ایم ایل اے سیکریٹری جنرل مجلس احرار نے مسلم لیگ کے اس بیان پر کہ احرار کے مقابلے پر مسلم لیگ کے مسلح مجاہدین منظم کیے جائیں گے لکھا کہ

یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب ہمارے والنٹیر تو منادی کرتے جاتے تھے تو ان کو پیٹا جاتا تھا، لیکن اس پر بھی لیگی ہمارے جلسے نہ روک سکے تو اب کیا روکیں گے۔ مجلس احرار کو لاٹھیوں سے مسلح نوجوان منظم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے پاس لاہور میں دس ہزار کلہاڑیوں سے مسلح نوجوان ہیں، مگر ہم کسی سے دنگا فساد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ایسا کرنا شکست خوردہ لوگوں کا کام ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ لیگی دنگا فساد کر کے پاکستان کا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ ہم نے کبھی لیگ سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر ہم چاہتے تو مسٹر جناح کا سیال کوٹ میں جلوس نہیں نکل سکتا تھا اور نہ جلسہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ مگر ہماری شرافت کہ ہم نے لیگ کا جلسہ سیال کوٹ میں ہونے دیا اور اب بھی ہونے دے رہے ہیں۔ مگر مسٹر جناح نے اس کا بدلہ یہ دیا

کہ سیالکوٹ میں ہم کو ختم کرنے کا اعلان کیا۔ مسٹر جناح ڈنڈے سے اپنی لیڈری منوانا چاہتے ہیں۔ اس کا یہ خواب کبھی پورا نہ ہوگا۔ ہماری شرافت ہے کہ ہم لیگ کے جلسے ہونے دے رہے ہیں، اگر ہم چاہیں تو کہیں بھی جلسہ نہیں ہوسکتا ہے۔''

(ہفت روزہ سیرت۔ لاہور: ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ایک بیان میں کہا کہ

''مجھے آج کے اخباروں میں یہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا ہے کہ سید پور میں مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیت علمائے ہند پر مسلم لیگیوں نے حملہ کر دیا اور ان کی پگڑی اتار پھینکی۔ مگر مولانا نے اپنے پیروؤں کو جو مسلم لیگیوں سے زیادہ تعداد میں تھے، اس کا جواب دینے سے روکے رکھا۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلم لیگ کے اپنے مخالفین سے برتاؤ کے ایسے طریقوں کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔ مسٹر جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کو میں مطلع کرتا ہوں کہ مسلم لیگیوں کے اس غنڈے پن کو روکیں اور سید پور کے اس واقعے کی پبلک طور پر مذمت کریں، ورنہ مسلم لیگیوں کی ایسی حرکات کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔''

(سہ روزہ زمزم۔ لاہور: ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۵ء)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی:

''میں سفر میں تھا کہ لیگی اخبارات میں اس توہین آمیز سلوک کی تفصیلات پڑھیں جو صدر جمعیت علما شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالیٰ کے ساتھ لیگیوں نے روا رکھا۔ یہ غیر اسلامی، قابل نفرت و حقارت اور یہ بداخلاقی کے مظاہرے ناقابل برداشت ہیں اور ہمارے صبر و ضبط کے لیے بڑی آزمائش ہے۔

سیاسیات سے جدا بھی حضرت مدنی کے لاکھوں عقیدت مندوں میں اس طرز عمل کے خلاف نفرت اور بے چینی کے جذبات مشتعل ہو رہے ہیں۔ میں جمعیت علمائے ہند کے ذمے دارانہ پوزیشن میں مسٹر جینا اور لیگ کی ہائی کمانڈ کو وارننگ دیتا ہوں کہ وہ جلد از جلد اس مذموم طریق عمل کے خلاف لیگی حلقوں کو تنبیہ کر دیں، ورنہ اس کے نتائج بد کی تمام تر ذمے داری مسٹر جینا اور لیگ کی ہائی کمان پر ہوگی۔

چوں کہ الیکشن کا زمانہ قریب سے قریب تر ہوتا جارہا ہے اور تمام جماعتیں اپنے نمایندگان کے لیے پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں، اس لیے میں حکومت ہند اور گورنر جنرل کو بھی متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی ناپاک غنڈہ گردی کے خلاف اپنی ذمے داریوں کا احساس کریں، ورنہ من جملہ دیگر امور کے یہ صورت حال بھی اس حقیقت کے لیے روشن دلیل سمجھی جائے گی کہ حکومت آزادی خواہ جماعتوں کے خلاف لیگ کی غنڈا گردی کی حمایت کو اپنے مقاصد کے لیے مفید سمجھتی ہے۔" (کاروانِ احرار: ج ۶،ص ۶۸-۳۶۶)

۱۹/اکتوبر ۱۹۴۵ء: دہلی، (بہ ذریعہ ڈاک) مجلس احرار صوبہ دہلی کی طرف سے جامع مسجد دہلی میں جلسہ منعقد ہوا، جس میں حضرت مدنی پر سید پور میں جو حملہ ہوا اس کی شدت سے مذمت کی گئی اور مسٹر جناح سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس قسم کی حرکات کو روکیں اور علمائے کرام سے معافی مانگیں۔ (زمزم-لاہور: ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۵ء: ص ۶)

مولانا حسین احمد مدنی پر قاتلانہ حملہ:

۲۱/اکتوبر ۱۹۴۵ء: مظفر پور (بہ ذریعہ ڈاک) سید پور کے اسٹیشن پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی پر جو حملہ لیگیوں نے کیا اس کے خلاف ایک جلسے میں مظفر پور کے مسلمانوں نے احتجاج کیا۔

عالم گڑھ: جامع مسجد میں جلسہ احتجاج منعقد ہوا جس میں مولانا حسین احمد صاحب پر جو حملہ سید پور میں ہوا اس کی شدید مذمت کی گئی اور اس کے خلاف اظہار نفرت کیا گیا۔

(نامہ نگار)

آج مورخہ ۱۲/ذی قعدہ ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹/اکتوبر ۱۹۴۵ء یوم جمعہ کو مولانا محمد انور صاحب ناظم اعلا جمعیت علما قصبہ اپرہ نے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ پر قاتلانہ حملے کے متعلق جو بیان مولانا ریاض الدین احمد صاحب نے اخبارات میں دیا پڑھ کر سنایا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی پر جو قاتلانہ حملہ مسلم لیگیوں نے کیا ہے علاقے بھر میں غصے اور ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ تمام طرف نفرت کا اظہار کیا جارہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مدنی مدظلہ کی عمر دراز کرے۔

میمن سنگھ (بہ ذریعہ ڈاک) جمعیت علما کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں سید پور میں مولانا سید حسین احمد مدنی پر جو حملہ کیا گیا ہے اس کی پرزور مذمت کی گئی اور لیگ والوں کو اس قسم کی حرکات کے نتائج پر متنبہ کیا گیا۔ (غلام ربانی)

مراد آباد: حضرت شیخ الہند پر جو حملہ ہوا اس کا حال سن کر سخت صدمہ ہوا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں اپنے پیروؤں کو روکیں۔ (بشیر احمد غازی پوری)

دربھنگہ: حکیم شمس الحق صاحب انصاری مومن انصار لیڈر نے ایک بیان میں مولانا حسین احمد صاحب پر لیگیوں کے حملے کی سخت مذمت کی ہے اور انصار نوجوانوں کو اس قسم کے حملوں کا سد باب کرنے کے لیے تنظیم کی دعوت دی ہے۔ (عبدالوحید انصاری)

قصبہ گھلہ ضلع سورت کے ایک جلسے میں بھی مولانا حسین احمد پر کیا گیا اور سید پور میں لیگیوں کے حملے کی مذمت کی گئی۔ (عبدالحمید خان)

ڈہری (بہار) ایک جلسے میں بھاگل پور اور سید پور کے مخالفین حق کی حرکات ناشائستہ پر اظہار نفرت کیا گیا۔ (نامہ نگار)

راندیر ضلع سورت میں جامعۂ حسینیہ میں جلسہ ہوا جس میں لیگ والوں کے اس اشتعال انگیز رویے کے خلاف احتجاج کیا گیا کہ وہ علما پر خصوصاً مولانا حسین احمد مدنی پر متشددانہ حملے کرتے ہیں۔ (نامہ نگار)

کرت پور میں بھی اشرف صاحب کی صدارت میں احتجاجی جلسہ ہوا۔

(ابوالکلام بہاری)

سہارن پور میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے جلسے میں جو مولانا عبدالحق ایڈووکیٹ کی صدارت میں منعقد ہوا مولانا حسین احمد پر حملے کی مذمت کی گئی۔

جالندھر میں مجلس احرار کے زیر اہتمام جلسۂ مذمت منعقد ہوا۔ (بایزید احمد)

مسلم پارلیمنٹری بورڈ کا نیشنل گارڈ:

نگینہ ۲۱ اکتوبر: شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی کے ساتھ گستاخی کے ردِ عمل اور آیندہ الیکشنوں میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے امیدوار کو کامیاب بنانے اور انھیں مسلم لیگ کے

شرارت پسند حامیوں کی یورش سے بچانے کے لیے ہم دوہزار نوجوانوں کو تربیت دے رہے ہیں۔ (قاضی محمد یوسف علی) (زمزم- لاہور: ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۵ء)

اوکاڑا میں مجلس احرار اسلام کا جلسہ- مولانا مدنی پر حملے کی مذمت:

۲۹/اکتوبر ۱۹۴۵ء: مجلس احرار اسلام اوکاڑا کی طرف سے مسلمانان اوکاڑا کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا، جس میں حکیم محمد بخش صاحب کامل جالندھری نے لیگیوں کے رویے کی پرزور مذمت کی اور فرمایا کہ موجودہ اراکین مسلم لیگ شرعی پاکستان میں رہنے کے قابل نہیں۔ ایک قرارداد میں مولانا حسین احمد پر سید پور میں حملہ ہوا، اس کی مذمت کی گئی۔

مولانا سید حسین احمد کی توہین- ہر طرف سے اظہار ناراضگی واحتجاج:

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب اور امام الہند ابوالکلام آزاد کے ساتھ لیگیوں نے جو سلوک کیا وہ یقینی طور پر ناقابل برداشت ہے۔ مسٹر جناح کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو ان حرکتوں سے روک دے۔ (عبدالمجید خان)

پانی پت: مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی ایم ایل اے تقریر کے لیے تشریف لائے، مگر لیگی گروہ نے ان کی تقریر میں شور مچایا، مگر جلسہ درہم برہم نہ کر سکے۔ یہ حرکات نہایت ناشایستہ ہیں۔ شرفا ان سے برا مناتے ہیں۔

چونڈہ: ایک جلسے میں لیگ والوں کے خلاف مولانا حسین احمد صاحب پر حملے کی سخت مذمت کی گئی اور فلسطین میں یہودیوں کے داخلے کو روکنے کا مطالبہ کیا گیا۔ (نامہ نگار)

سہ گاؤں، الہ آباد: مولانا مسیح الدین ایک مراسلے میں علمائے کرام پر حملوں کی مثالیں دیتے ہوئے، حضرت مولانا حسین احمد پر حملے کی مذمت کرتے ہیں۔

دادا آباد: جامع مسجد میں احرار کارکنان اور جمعیت انصار کا مشترکہ اجلاس ہوا، جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی پر لیگی کارکنوں کے حملے کی شدید مذمت کی گئی اور فلسطین کو عربوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ انڈین نیشنل آرمی کے افسروں اور سپاہیوں پر مقدمہ چلانے کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ (نامہ نگار)

گیا میں لیگی کارکنوں کی افسوس ناک روش:

مدرسۂ قاسمیۂ اسلامیہ گیا کا سالانہ جلسہ میں مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی ایم ایل اے (یوپی) وغیرہ تقریریں کرنے والے تھے، نماز کے بعد مسلم لیگ کے بھیجے ہوئے آدمی مسجد میں گھس آئے اور انھوں نے علما پر آوازے کسے۔ ابوالکلام مردہ باد، حسین احمد مردہ باد وغیرہ کے نعرے لگائے۔ اس کے بعد باقاعدہ حملہ کر دیا۔ اس گڑبڑ میں مقامی جمعیت کے سیکریٹری کو پیٹا گیا اور ان کے دانت سے خون بہنے لگا۔ انھیں گھسیٹ کر مسجد سے باہر نکال دیا گیا۔ بڑے بڑے لیگی حضرات مثلاً آنریبل حسین امام وغیرہ موجود تھے۔ انھوں نے ان حرکتوں کو نہیں روکا۔ (نامہ نگار)

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا بیان:

۲ر نومبر ۱۹۴۵ء: جو بدعنوانیاں میرے ساتھ سید پور، کٹھیار، بھاگل پور میں اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالوفا، مولانا محمد قاسم شاہ جہان پوری اور مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کے ساتھ علی گڑھ، گیا اور کلکتہ میں لیگیوں نے جو خلاف انسانیت اور اسلامیت سوز شوخیاں کی ہیں، یا دہلی اور کان پور میں آزادی پسند مسلم جماعتوں کے ساتھ عمل میں لائی جا رہی ہیں وہ یقیناً ملتِ اسلامیہ کے لیے شرم ناک ہیں۔ میں ان تمام حضرات کی ہمدردیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے جلسے کر کے یا انفرادی طور پر احتجاجات کیے ہیں۔ مگر میں تمام مسلمانوں سے التجا کرتا ہوں۔ کہ وہ صبر اور استقلال کو ہاتھ سے نہ (جانے) دیں اور ان بدنام کنندگان ملت اسلامیہ کے جواب مین کسی بدتہذیبی کو عمل میں نہ لائیں۔ حقیقی جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے امن وسکون کے ساتھ مہذب طور پر پوری جدوجہد کی جائے کہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے نامزد کردہ امیدوار کامیاب ہوں۔ اگر آپ ایسا کرنے میں فائز المرام ہو گئے تو لیگ اور اس کی مجرمانہ شوخیاں خود بہ خود مر جائیں گی اور ہندوستان آزادی کے کنارے پر پہنچ جائے گا۔

(دفتر جمعیت علمائے ہند-دہلی)

(زمزم-لاہور: ۳ر نومبر ۱۹۴۵ء)

لیگی غنڈوں کی مذمت۔ مسلمانان مبارک پور کا جلسہ:

۳ر نومبر ۱۹۴۵ء: ۲۶ر اکتوبر بعد نماز جمعہ قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں مسلمانان مبارک پور کا ایک جلسہ ہو صدارت صدر المدرسین مدرسہ احیاء العلوم نے فرمائی۔ مولانا عبدالباری صاحب قاسمی رکن جمعیت علماے ہند نے لیگ کی غنڈہ نواز پالیسی پر تنقیدی تقریر فرمائی اور ایک تجویز پاس ہوئی جس میں مسلم لیگ کی غنڈا گردی اور شرارت پسندی کے خلاف جو مسلم لیگ ہائی کمانڈ کی شہ پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی نیز دوسرے رفقاے کار کے خلاف قاتلانہ حملوں اور سوقیانہ حرکات کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں زبردست نفرت و غصے کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور لیگ کو متنبہ کیا گیا کہ اگر اب اس قسم کی کوئی غیر انسانی اور وحشیانہ حرکت ہوئی تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے، جس کی ذمے دار خود لیگ ہوگی۔ (زمزم۔ لاہور، ۳ر نومبر ۱۹۴۵ء)

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ساتھ لیگیوں کا گستاخانہ سلوک:

حضرت مولانا کا اپنا بیان

حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے سید پور میں لیگیوں نے جو بدسلوکی کی، اس کے متعلق مولانا ریاض الدین صاحب بانی دارالعلوم سید پور کا مفصل بیان اخبارات میں شایع ہوا، جو زمزم کے ۲۷ر اکتوبر کے شمارے میں بھی نکلا ہے۔ اس کے متعلق زمزم نے حضرت مولانا کی خدمت میں ایک رجسٹری شدہ نیاز نامہ کے ذریعے سے درخواست کی کہ آپ ان واقعات کے متعلق اپنا بیان بھی زمزم میں اشاعت کی غرض سے بھیجیں، چناں چہ حضرت مولانا نے ازراہِ کرم مکتوب ذیل ارسال فرمایا ہے۔ جو اپنی تفسیر آپ ہے۔ اس کے بعد لیگ کے ہائی کمانڈ کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اِن واقعات کی غیر جانب دارانہ تحقیق کرا کے اس کے نتائج شایع کرے۔ ورنہ لیگ کے سربرآوردہ ارکان بالعموم اور مسٹر جینا بالخصوص اس کے ذمے دار قرار پائیں گے۔

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ یادآوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس ہمدردی کا مزید شکریہ پیش کرتا ہوں جو لیگیوں کی انسانیت سوز حرکات کے خلاف ظاہر فرمائی ہے۔ واقعہ اصل وہی ہے جو مولانا ریاض الدین صاحب نے ذکر فرمایا ہے۔ مولانائے موصوف کے صاحب زادے مولوی محمد صالح صاحب میرے رفیق سفر تھے۔ موصوف سید پور محلہ بنگالی ٹولہ کے باشندے ہیں۔ عرصے سے مجھ کو ان سے شرف تعارف حاصل ہے۔ میں سونارائی ایک اپنے دوست آفندی احسان الحق مرحوم کی تعزیت کے لیے ان کے ورثا (بیوی بچوں اور اعزہ) کے پاس گیا تھا، میری آمد کی اطلاع پر یہ حضرات آگئے تھے، سید پور کو وہاں سے لوٹتے وقت یہ حضرات ریل میں ساتھ ہی لوٹے تھے۔ احباب اہل سید پور کو پہلے سے اطلاع دے دی گئی تھی کہ ہم شام کو ۹ بجے وہاں پہنچیں گے اور پھر صبح کو واپس ہو جائیں گے۔ اس اطلاع پر بغیر پوچھے ہوئے ہمارے ایک عنایت فرما حاجی محمد سعید صاحب پنجابی تاجر چرم نے شہر میں اعلان تحریری کر دیا کہ حسین احمد آج فلاں گاڑی سے آئے گا اور فلاں جگہ تقریر کرے گا۔ ہم بالکل بے خبر اسٹیشن سید پور پر اترے۔ نہ ہم کو وہم وگمان جلسہ یا اس قسم کے ہلڑ کا تھا اور نہ اہل سید پور احباب کو اور نہ ہمارے رفقا کو۔ اترنے کے ساتھ ہی ان بے وقوف لیگیوں نے وہ معاملات کیے۔ مولانا ریاض الدین صاحب موصوف اور ان کے اولاد واصحاب ڈھال بنے ہوئے حملوں کو روکتے اور دفع کرتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے بلا مبالغہ اور صحیح ہے۔ ہاں میرے بعد کے جو واقعات لکھے ہیں ان کا مجھ کو علم نہیں۔

والسلام

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ

وارد حال بجنور (یوپی)

اوکاڑا میں مجلس احرار اسلام کا جلسہ:

۷رنومبر ۱۹۴۵ء: مجلس احرار اسلام اوکاڑا کی طرف سے مسلمانان اوکاڑا کا ایک عظیم

الشان جلسہ منعقد ہوا، جس میں حکیم محمد بخش صاحب کامل جالندھری نے لیگیوں کے رویے کی پرزور مذمت کی اور فرمایا کہ موجودہ اراکین مسلم لیگ شرعی پاکستان میں رہنے کے قابل نہیں۔ایک قرارداد میں مولانا حسین احمد پر سید پور میں حملہ ہوا۔اس کی مذمت کی گئی۔

برہان-دہلی کا فکر انگیز اداریہ:

نومبر ۱۹۴۵ء: سید پور میں حضرت شیخ الاسلام کی توہین کے اندوہ ناک واقعے پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے برہان کے نظرات میں بہ ایں الفاظ اپنے رنج و غم کا اظہار فرمایا ہے:

''پچھلے دنوں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے ساتھ سید پور وغیرہ بعض مقامات پر جو انتہائی ناروا اور ناشایستہ معاملہ کیا گیا ہے اس کی تفصیلات اخباروں میں شایع ہو چکی ہیں، ان کو پڑھ کر کوئی مسلمان تو کیا، ایک شریف انسان بھی ایسا نہ ہوگا جو رنج وافسوس اور شرم وندامت سے اپنی گردن جھکانے پر مجبور نہ ہو۔مولانا کی سیاسی راے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور کیا جارہا ہے لیکن ورع وتقویٰ، علم وعمل، فداکاری وایثار پیشگی تو مولانا کی وہ روشن صفات ہیں جن سے ان کے بڑے سے بڑے شدید مخالف کو بھی انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی۔وہ بے شبہ ہندوستان کے علماے اسلام میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔اس بنا پر جن لوگوں نے مولانا کی توہین اور ایذا رسانی کر کے اپنی وحشت و بربریت کا ثبوت دیا ہے کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنے اس فعل سے پوری قوم کو رسوا اور ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ہر جماعت اور ہر شخص کو اپنی راے آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے کا پورا حق حاصل ہے، لیکن لاٹھیوں سے حملہ کرنا اور ٹوپی سر سے اُتار کر اسے جلا ڈالنا تو ایک ایسی کمینہ حرکت ہے جو کسی ایک معمولی درجے کے انسان کے حق میں بھی روا نہیں رکھی جاسکتی، چہ جاے کہ ایک عالم جلیل القدر اور وارثِ علوم نبویہ کے لیے؟'' اگر اخلاقی حس کی آخری رمق بھی ہندوستان کے تیرہ نصیب مسلمانوں سے سلب نہیں کر لی گئی ہے تو انھیں سوچنا چاہیے کہ جس قوم کو حالتِ غیظ وغضب میں بھی بدگوئی اور

زشت کلامی سے منع کیا گیا ہے، اگر وہ اپنے کسی سربرآوردہ رہنما کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرتی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے دین اور شرافت انسانی سے بیزاری کا ہی اعلان نہیں کرتی بلکہ دوسری قوموں کو اپنے اوپر ہنسنے کی دعوت بھی دیتی ہے اور جب کوئی قوم اخلاقی اعتبار سے اس درجے پست سطح پر اُتر آئے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہوگئی ہے اور اس کے فوز وفلاح کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ دوسری قوموں کے بڑے آدمیوں کا بھی اعزاز واکرام کرو۔ پھر مسلمانوں کے لیے یہ کس طرح جایز ہوسکتا ہے کہ وہ خود اپنی ہی قوم کے کسی بزرگ کے حق میں خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، سب و شتم کریں اور اس کی توہین و اذیت رسانی کے درپے ہوں۔ مسلمانوں نے موجودہ بحرانی دور میں اگر اس ارشادِ نبوی کا پاس اور لحاظ رکھا تو وہ دوسروں کے لیے مکارمِ اخلاق کا ایک اچھا نمونہ بن سکتے اور بہت سے آفات ومصایب سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

(برہان- دہلی: نومبر ۱۹۴۵ء: ص ۳، ۴)

ایک افسوس ناک حادثے کے جواب میں:

ملتان میں کوئی افسوس ناک واقعہ پیش آیا تھا۔ اس پر اظہار ہمدردی اور رنج کے جواب میں حضرت شیخ الاسلامؒ نے مولانا ابوسعید خدا بخش ملتانی کے نام ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا: (یہ بیان حضرت کی للّٰہیت کا منہ بولتا ثبوت ہے)

''۲۴؍ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ

ملتان سے واپسی پر جو کچھ پیش آیا اس پر کوئی افسوس نہ ہونا چاہیے۔ انبیاے علیہم السلام اور اسلاف کرامؒ کو کیا کیا نہیں پیش آیا؟ ہم جیسے کوئی چیز ہی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے اور قبولیت واخلاص سے نوازے۔ آمین!

جو کہ تکدر فضا میں لیگیوں کی حماقت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، جس قدر عظیم الشان

نقصان مسلمانوں کو پہنچا ہے، اس سے عبرت حاصل کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہے اور اپنے اپنے مقام پر امن وامان قایم کرنا اور فتن وفسادات کی شعلہ باری کی روک تھام کرنا از بس ضروری ہے۔ غافل مت ہوجیے۔ انگریز کی مساعی اور اس کے مقاصد وہی ہیں۔ چرچل کی تقریر اب بھی دیکھ لیجیے۔" (الجمعیۃ - دہلی، شیخ الاسلام نمبر ۱۹۵۸ء: ص ۱۶۸)

کانگریس کی غلامی سے برطانیہ کی غلامی بہتر ہے۔

قاہرہ میں جناح کا بیان:

۴ر دسمبر ۱۹۴۶ء: مسٹر جناح نے ایک بیان دیتے ہوئے مصر کی آزادی کی جدوجہد کی حمایت کی۔ ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر آزادی کی وجہ سے مسلمان کانگریس کے غلام بنتے ہیں تو پھر ہمیں برطانیہ سے آزادی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(انصاری - دہلی: ۹ر محرم ۱۳۶۶ھ مطابق ۴ر دسمبر ۱۹۴۶ء)

اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ کانگریس تو کانگریس انھوں نے خود ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت کا وفادار رہنے کی تلقین فرمائی۔

(۳)

مسلم لیگ کی اخلاقیات

عورتوں کو والنٹیر بنانا ضروری ہے!
آل انڈیا لیگ کانفرنس میں قاید اعظم کا لیکچر

اخبار آزاد (کلکتہ) ۲۵؍دسمبر ۱۹۴۳ء آل انڈیا لیگ کانفرنس میں مسٹر محمد علی جناح نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"عورتوں کو والنٹیر بنانا ضروری ہے، ہندوستان کے ہر گاؤں اور ہر جگہ میں ایسا عمل درآمد ہونا چاہیے ورنہ پاکستان نہیں ہوسکتا۔"

(اخبار آزاد- کلکتہ، ۲۶؍دسمبر ۱۹۴۳ء)

لیگ اور مذہب- مسلم لیگ کے جلسۂ کراچی کی شانِ اہتمام:

دسمبر ۱۹۴۳: مدینہ، مورخہ یکم فروری میں دسمبر کے آخری ہفتے میں کراچی میں منعقد ہونے والے لیگ کے اکتیسویں سالانہ اجلاس کے متعلق ایک عینی شاہد کے تاثرات بہ حوالہ "بیان" شایع کیے گئے ہیں، جن کے اقتباسات حسب ذیل ہیں:

"ایک شخص نے سیاحت یورپ کے بعد اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ یورپ میں ہر چیز ہے اور یہاں سے ہزار درجے بہتر حالت میں ہے۔ البتہ ایک چیز نہیں ہے یعنی- خدا-...... یہی حالت میں نے کراچی کے اجلاس لیگ میں دیکھی۔ بھیڑ بھاڑ تھی، شان و شوکت تھی، شور وغل تھا، خوش نما پنڈال اور خوب صورت گیٹ تھے، جلوس تھا، جلسہ تھا، غرض ہر چیز تھی اور اعلا پیانے پر تھی مگر افسوس جو چیز وہاں نہیں تھی- بالکل نہیں تھی، وہ اسلام کی سادگی اور سچائی تھی اور نہ خدا اور اس کے رسولِ برحق کے احکام کی پیروی تھی۔ جلوس نکلا، جلسہ ہوا، لمبی لمبی تقریریں کی گئیں۔ اسی درمیان میں نماز کے وقت آئے اور نکل بھی

ہو گئے، مگر کسی نے خدا کے آگے سر بہ سجود ہونا ضروری نہیں سمجھا۔"

آگے چل کر یہی شاہد کہتا ہے:

"اسلام کے احکام کی اس توہین پر ماتم کرنے میں جلدی نہ کیجیے، آیے اور ایک نظارہ اور دیکھیے! نوجوان عورتوں کا ایک دستہ، سروں کو کھولے، چوٹیوں کو پیٹھ پر ایک خاص انداز سے لٹکائے اور ایک پٹی سینے پر باندھے لہرا لہرا کے جلوس کے ساتھ ساتھ مارچ کرر ہا ہے۔ دورویہ لوگ اُن کے نظارے میں مصروف ہیں، مگر یہ رضا کار عورتیں ہیں کہ پوری بے حجابی سے جلوس کے ساتھ مردانہ وار مارچ کرتی چلی جارہی ہیں...... دیکھیے! انھی نوجوان لڑکیوں کے بیچ میں وہ کون بیٹھا ہے؟ مسٹر جناح؟" قایداعظم؟" جی ہاں! قایداعظم۔ وہ دیکھیے چاروں طرف سے غیر ممالک کے اخبار نویس اور سینما والے اس نظارے کے فوٹو لے رہے ہیں اور اب اس کی نمایش ہندوستان اور ہندوستان کے باہر ہر جگہ ہوگی اور لوگ دیکھیں گے کہ مسلمان عورتوں نے بھی جدید مغربی تہذیب میں کتنی ترقی کر لی ہے... کیا اس قسم کے حیا سوز نظارے کی شفاعت کے لیے کوئی وجہ جواز لائی جاسکتی ہے؟ نامحرموں کے ساتھ کھلے منہ، کھلے ستر، جاہلانہ بناؤ سنگار کر کے جسے خدا کی کتاب قرآن حکیم نے "تبرّجِ جاہلیت" قرار دیا ہے۔ مارچ کرنا اسلامی شرافت اور اپنی غیرت کا خون کرنا نہیں، تو خدارا بتاؤ کیا ہے؟...... کیا مسلمانوں کو ساری دنیا کی نظر میں ذلیل و رسوا کرنے کی اس سے زیادہ خطرناک صورت اور بھی ہوسکتی ہے؟ کیا یہی وہ اسلامی تہذیب ہے جس کی حفاظت کا کام لیگ اور اسکے قایداعظم نے اپنے ذمے لیا ہے۔" (سہ روزہ مدینہ، بجنور، یکم فروری ۱۹۴۴ء)

اب پاکستان کی خواتین نے "تبرّج جاہلیت" کا جو مقام حاصل کر لیا اور ان کی آزادی کا کاروان برق رفتار جن منازل کو طے کر چکا ہے اس کا کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔

مردوں اور عورتوں کا مشترکہ ناچ اور مسلم لیگ:

مئی ۱۹۴۴ء: کراچی سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وہاں ایک کلب میں انگریزی

طرز پر عورتوں اور مردوں کا مشترکہ ناچ ہوتا ہے۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ لیگی وزیر اعظم سندھ کی صدارت میں کلب کا ایک جلسہ ہوا۔ ایک صاحب نے تحریک پیش کی کہ مردوں اور عورتوں کا مشترکہ ناچ بند ہونا چاہیے۔ ووٹ لیے گئے، تو ممبروں کی اکثریت نے اس قسم کے ناچ کے حق میں فتویٰ دے دیا۔ سندھ کے لیگی وزیر اعظم سر غلام حسین ہدایت اللہ نے بھی اپنا ووٹ مشترکہ ناچ کے حق میں دیا۔ (سہ روزہ مدینہ۔ بجنور: ۲۸ مئی ۱۹۴۴ء)

مسلم لیگ اور اسلام کا شعار نماز:

اگست ۱۹۴۴: مدینہ بہ حوالہ ''کوثر'' لاہور رقم طراز ہے کہ

''سیال کوٹ مسلم لیگ کانفرنس کے موقعے پر شہر کی مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح کو ایک شان دار پارٹی دی گئی۔ کمپنی باغ میں کوئی دو سو مسلمان مدعو تھے۔ ساڑھے چھ بجے مسٹر جناح بینڈ کی سلامی لیتے ہوئے آئے۔ سات بجے تک اکل و شرب کا سلسلہ جاری رہا۔ چوں کہ نماز عصر کا وقت ہو گیا تھا لہٰذا حکیم محمد صادق صاحب نے ایک رقعہ انگریزی زبان میں مسٹر جناح کی خدمت میں ارسال کیا، جس میں لکھا تھا کہ ''نماز کا وقت ہو گیا ہے، آیے ہم سب مل کر پروردگار عالم کے حضور سر بہ سجدہ ہو جائیں۔ اور دعا کریں کہ وہ اپنے برکتیں نازل فرمائے اور ہر گزند سے محفوظ رکھے۔'' مسٹر جناح نے یہ تحریر لی اور اپنے دائیں طرف سردار عبد الرب نشتر وزیرِ مالیات صوبۂ سرحد کو دے کر کہا: اسے پڑھیے۔ نشتر صاحب نے یہ تحریر پڑھ کر سنائی اور پھر دونوں ایک منٹ خاموش رہے۔ حکیم صاحب حکم کے انتظار میں کھڑے تھے کہ نشتر صاحب نے فرمایا ''مہربانی کر کے تشریف لے جایے۔''

(سہ روزہ مدینہ۔ بجنور: ۱۷ اگست ۱۹۴۴ء، بہ حوالہ ہفت روزہ کوثر۔ لاہور)

ایک لیگی مولوی کا فتویٰ:

اخبار آزاد، ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۴ء مطابق ۲۸-۱ سوج ۱۳۵۱ (بنگلہ) فتویٰ از جانب ابو

نفر مولانا عبدالحی پھر پھری شایع ہوا کہ اس زمانے میں عورتوں کو والینٹر بنانا ضروری ہے۔ نیز شیعی، سنی، خارجی، رافضی، قادیانی، فاسق، فاجر فرقہ وار قرار دینا جایز نہیں۔ گانا بجانا، پردہ ان تمام چیزوں میں حکم سابق کو بدلنا ضروری ہوگا۔ (اخبار آزاد۔کلکتہ: ۱۴را کتوبر ۱۹۴۴ء)

جنرل سیکریٹری مسلم لیگ بزمِ شراب میں:

دہلی، ۲۸ر اکتوبر: ایم علی معتمدی تونصل جنرل ایران متعینہ ہند نے شاہ ایران کی سال گرہ کی تقریب پر کاک ٹیل پارٹی دی۔ حاضرین میں کمانڈران چیف مع میم صاحبہ، سر فیروز خان نون، سر جکندر سنگھ، نواب زادہ لیاقت علی خاں (جنرل سیکرٹیری آل انڈیا مسلم لیگ) اور ممالک غیر کے نمایندے موجود تھے۔ (سہ روزہ مدینہ۔بجنور: ۵ر نومبر ۱۹۴۴ء)

مسلم لیگ کا اسلامی کلچر اور اسلامی اخلاق:

ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت مسلم لیگ کے ایک رہنما سید اعزاز رسول صاحب کی ''دعوتِ مےنوشی'' میں شرکت کا افسانۂ رنگین ابھی زبانوں ہی پر تھا کہ کٹر لیگی اخبار ''انقلاب'' نے ایک اور کاک ٹیل پارٹی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''کاک ٹیل پارٹیاں مسلم لیگ کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ سید اعزاز رسول صاحب توبہ کر کے اور معافیاں مانگ کر اس چکر سے نکلے ہی تھے کہ نواب زادہ لیاقت علی خاں بھی اس میں پھنس گئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایران کے تونصل جنرل نے نئی دہلی میں شاہ ایران کی ستائیسویں سال گرہ کی تقریب پر ایک کاک ٹیل پارٹی (شراب کی پارٹی) دی تھی، جس میں دوسرے معززین کے علاوہ سر فیروز خان نون اور نواب زادہ لیاقت علی خاں بھی شریک ہوئے تھے۔'' (مدینہ، ۲۱ر نومبر ۱۹۴۴ء)

پاکستان میں قرآنی حکومت کا نقشہ:

مسٹر جناح کی بہن اور قاضی عیسیٰ کی بیوی پردہ توڑ کر انگریز ریجنٹ گورنر جنرل کے

حضور میں باریاب ہوئیں۔

کوئٹہ، ۱۸؍اکتوبر: ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا (اخباری ایجنسی جو سرکاری خبریں دینے میں نہایت معتبر راوی کی حیثیت رکھتی ہے) کا نامہ نگار یہ خبر دیتا ہے کہ کل مسٹر جناح کی بہن اور مسلم لیگ ہائی کمانڈ کے رکن قاضی عیسیٰ کی بیوی ریجنٹ گورنر جنرل بلوچستان کے حضور میں باریاب ہوئیں۔ اسلام کی یہ دونوں بیٹیاں جو اس وقت [تحریکِ] پاکستان کے آسمان پر چاند اور سورج کی طرح چمک رہی ہیں پردے سے بے نیاز تھیں اور دونوں نے ہزایکسی لنسی کے ساتھ ایک میز پر ڈنر کھایا۔ کھانے کی میز پر ان کی شائستگی اور نئی تہذیب سے مکمل مطابقت قابل داد تھی۔ پاکستانی بعض لیڈر بھی اس تقریب میں موجود تھے۔

(سہ روزہ مدینہ۔ بجنور: ۲۵؍اکتوبر ۱۹۴۵ء)

سکریٹری یو پی مسلم لیگ کی طرف سے دعوت مے نوشی:

دہلی سے ہمیں سایرہ خاتون حیران بیگم حکیم رشید احمد زیبا کے نام سے چھپا ہوا انگریزی میں ایک پوسٹر موصول ہوا ہے۔ اس کے شروع میں ایک دعوت نامہ کا فوٹو بلاک دیا گیا ہے جو سید اعزاز رسول اور بیگم اعزاز رسول نے اپنے احباب وغیرہ کو جاری کیا تھا۔ دعوت نامے کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے:

> ''ہزایکسی لینسی گورنر یو پی اور ان کی بیگم صاحبہ کو بہ تاریخ ۲۵؍مارچ سوا سات بجے شام کو دعوت شراب نوشی (کاک ٹیل پارٹی) دی جارہی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ بھی غریب خانہ واقع قیصر باغ پر تشریف لاکر شرکت فرمائیں۔''

سایرہ صاحبہ نے دعوت نامے کے تمام الفاظ کے معانی ومطالب ڈکشنریوں کی مدد سے تلاش کر کے لکھا ہے کہ اعزاز رسول یو پی اسمبلی میں مسلمانوں کے نمایندہ سندیلہ ضلع ہردوئی کے تعلقہ دار اور صوبائی لیگ کے سکریٹری ہیں اور بیگم اعزاز رسول مسلمانوں کی نمایندگی یو پی اسمبلی میں فرماتی ہیں۔ کونسل کی ڈپٹی پریزیڈنٹ، آل انڈیا لیگ کی خواتین کی سب کمیٹی کی سکریٹری، لکھنؤ شہر کی مسلم لیگ کی نایب صدر، مسلم طلبا فیڈریشن کی صدر ہیں۔ اس کے بعد قاید اعظم جناح سے نہایت ادب واحترام سے درخواست کی ہے کہ وہ ان

دونوں کے خلاف انضباطی کارروائی کریں اور دونوں کو لیگ سے خارج کردیں۔ سایرہ صاحبہ کی نیت اور جذبہ بلاشبہ بہت اچھا ہے۔ مسلمانوں کی رہنمائی اور نمایندگی کا حق تو کجا ایسے مغرب زدہ انگریز پرست، اقتدار پسند اور اسلام کے باغی لوگوں سے معاشرتی تعلقات قایم رکھنا بھی جایز نہیں، لیکن ہمیں سایرہ صاحبہ حیران کی اس بات پر سخت حیرانی ہے کہ وہ قایداعظم سے ان کے اخراج کا مطالبہ کررہی ہیں، حال آں کہ لیگ کی قیادت کی کان نمک میں از اول تا آخر سب نمک ہے اور جو اس حلقے میں داخل ہوتا ہے نمک بن کر داخل ہوتا ہے یا داخل ہوتے ہی نمک بن جاتا ہے۔ اگر اخراج واحتجاج کا سلسلہ شروع ہوگیا تو قایداعظم بھی قیادت عظمیٰ کی مسند سے نیچے آرہیں گے، کیوں کہ وہ اسلام کے احکام وشرایع سے قطعاً آزاد ہیں۔ حتیٰ کہ انھیں رمضان کے زمانے میں برسرعام روزے کے احترام سے بے نیاز ہوکر دن کے وقت سگریٹ کا دھواں اڑانے اور دعوتیں کھانے میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ قایداعظم، نماز اس کے ارکان اور فرایض وواجبات سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ قیادت کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد بھی کبھی انھوں نے نماز سیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ جب لاہور میں انھیں ایک موقع پر نماز پڑھنا پڑگئی تو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آپ پوچھتے تھے What Next یعنی اس کے بعد کیا ہے؟ اور ایک نیازمند انھیں بتاتا جاتا تھا کہ اب یہ کیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں تو اوپر سے نیچے تک آوے کا آوا ہی ایسا ہے۔ فاسقوں کو اپنا مطاع بنا کر اس قسم کی انفرادی حرکتوں پر مشتعل ہونا اور کسی بڑے فاسق کی دہائی دینا مضحکہ خیز ہے اور اپنی مذہب دوستی کی سراسر رسوائی۔

(۲)

قایداعظم سے انضباطی کارروائی کی درخواست دہلی سے سارہ خاتون حیران بیگم حکیم رشید احمد زیبا کے نام سے چھپا ہوا ایک انگریزی پوسٹر موصول ہوا ہے۔ اس کے شروع میں ایک دعوت نامے کا فوٹو دیا گیا ہے جو سید اعزاز رسول اور بیگم اعزاز رسول نے اپنے احباب وغیرہ کو جاری کیا تھا۔ دعوت نامے کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ ہزایکسیلنسی گورنر یوپی اور ان کی بیگم صاحبہ کو بہ تاریخ ۲۵ر مارچ سوا سات بجے شام دعوت شراب نوشی (کاک ٹیل پارٹی) دی جارہی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ بھی غریب خانہ واقع قیصر باغ تشریف

لاکر شرکت فرمائیں۔

سید اعزاز رسول اودھ کے تعلقہ دار، یوپی اسمبلی میں مسلمانوں کے نمایندے اور صوبائی لیگ کے سکریٹری ہیں۔ بیگم اعزاز رسول بھی یوپی کونسل مین مسلمانوں کی نمایندگی فرماتی ہیں۔ کونسل کی ڈپٹی پریزیڈنٹ آل انڈیا لیگ کی خواتین کی سب کمیٹی کی سکریٹری، مسلم لیگ لکھنؤ کی نایب صدر اور مسلم طلبہ کی فیڈریشن کی صدر ہیں۔

دعوت کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد سارہ خاتون نے ''قایداعظم'' جینا سے نہایت ادب واحترام سے درخواست کی ہے کہ وہ ان دونوں کے خلاف انضباطی کارروائی کریں، لیکن خود قایداعظم کا کیا حال ہے؟ اسی سلسلے میں ''مدینہ'' رقم طراز ہے کہ وہ خود اسلام کے احکام وشرائع سے قطعاً آزاد ہیں۔ حتی کہ انھیں رمضان کے زمانے میں برسرعام روزے کے احترام سے بے نیاز ہو کر دن کے وقت سگریٹ کا دھواں اڑانے اور دعوتیں کھانے میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ (سہ روزہ مدینہ۔ بجنور: ۵رمئی ۱۹۴۵ء)

شملہ میں شراب نوشی:

شملہ سے ۱۸ روز کے بعد واپس آیا ہوں..... آپ سسل ہوٹل میں تشریف لایے، پاکستان کے ارباب تقوی جمع ہیں۔ جتنے مرد ہیں اس سے زیادہ عورتیں۔ سب تشریف فرماہیں۔ نماز اور ناچ کا ایک وقت ہے۔ کون ہے جو اذان سنے اور کون ہے جو نماز سے مطلب رکھے۔ مسلمانوں کی بیویاں، بیٹیاں، پوتیاں کبھی ایک کے پہلو میں ہیں کبھی دوسرے کے، ناچ سب کے سامنے جاری ہے۔ لباس انگریزی، تمدن انگریزی، ہنسنے بولنے کا انداز انگریزی..... معتبر روایات ہیں کہ شاید کوئی ہوگا جسے دس بجے رات کے بعد اپنا ہوش ہو۔ سسل ہوٹل کے بل اٹھا کر دیکھ لیجیے! جہاں پر سب تھے لیکن انگریز سے کم کوئی نہ تھا۔ آپ کس کس کو لکھیے گا اور کیا کیا کہیے گا؟ (ہفت روزہ صدق۔ لکھنؤ: ۷راگست ۱۹۴۵ء)

جناح فنڈ کے لیے کلکتہ مین عجب تماشے کا اعلان:

جناح فنڈ کی تائید کے لیے عجب تماشا۔ کلکتہ کے کالجوں اور اسکولوں کے لڑکوں اور

لڑکیوں کا ۱۴؍اکتوبر کو اتوار کے دن اسلامیہ کالج ہال اور مسلم انسٹی ٹیوٹ میں مشترک ناچ ہوگا۔ جس میں ناچنے والے لڑکے مندرجہ ذیل ہوں گے: محمد حسین، عبدالاحد، ابن مجمدار، ممتاز علی خان، شیخ لطف الرحمٰن، عباس الدین۔

اور ناچنے والی لڑکیاں مندرجہ ذیل ہوں گی: انوارہ چودھری، زہرہ بتول، حسن بانو خانم۔

اس کے فوائد قومی بیان کرنے اور ترغیب دینے کے لیے مندرجہ ذیل حضرات تقریر کریں گے۔ شہید سہروردی، تمیز الدین خان، مسٹر ابوالہاشم، حبیب اللہ، مولانا اکرم خان۔

ٹکٹ: (۱) ۲۵ رُپے، (۲) ۱۰ رُپے (۳) ۵ رُپے (۴) ۲ رُپے (۵) ایک رُپے

اس کو "قومی جہاد" قرار دیا گیا ہے۔ (اخبار آزاد۔ کلکتہ: ۸؍اکتوبر ۱۹۴۵ء)

لیگ کے غیر حامیین علما، صلحا و اتقیا کے قتل کا حکم:

لیگی لیڈروں کا فرمان یہ ہے کہ جو علما، صلحا اور اتقیا لیگ کی حمایت نہ کریں وہ اگرچہ سراپا اسلام کے اصول پر عامل ہوں لیکن ان کا سر مونڈ کر گدھے پر تشہیر کرا کے سنگ سار کر کے مار ڈالو۔ (شہباز: ۲۳؍نومبر ۱۹۴۵ء بہ حوالہ ڈان۔ دہلی)

لیگ کے رہنما اور کارکن:

۱۱؍جنوری ۱۹۴۶ء: کمیونسٹوں اور ملحدوں کو مسلم لیگ کی الیکشن کمپین کے پس پردہ، مذہب، اس کے عقاید، خدا اور رسول اور علماے دین کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور نفرت پھیلانے کا خوب موقع مل رہا ہے، لیکن سنجیدہ حضرات پر ان کی توقع کے خلاف اس کا اثر ہوتا ہے۔ اس کا اندازا ایک خط کے مضمون سے کیا جا سکتا ہے جو علی گڑھ سے ایک صاحب نے جو ہر وقت یونی ورسٹی کو قریب سے دیکھتے رہتے ہیں، ایڈیٹر زمزم (لاہور) کے نام لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "مولانا! آپ میرے خیالات سے واقف ہی ہیں کہ میں اور میرا سارا خاندان پاکستان کا حامی اور لیگ کی پالیسی کا پیرو ہے، مگر چند امور ایسے ہیں جن کا تصور

مجھے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ اگر میری بے چینی حد سے نہ بڑھ گئی ہوتی تو میں آپ پر ان کا اظہار کبھی نہ کرتا۔ میں نے ہمیشہ تعلیم یافتہ حضرات کو جاہل عوام پر ترجیح دی ہے۔ کیوں کہ علم، خواہ وہ کیسا ہی ہو بہ ہر حال جہل پر فوقیت رکھتا ہے، لیکن جب سے میں نے یونی ورسٹی کے طلبہ کی غنڈا گردی دیکھی ہے تو علم کے نام سے میری روح کانپنے لگی ہے۔ اللہ میری بے چینی دور کرے اور مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ پر رحم فرمائے۔ ان کی حرکتوں کو دیکھ کر تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موجودہ تعلیم انسان کو حیوان اور حیوان کو درندہ بنانے میں خاص کمال رکھتی ہے۔ خدا کی قسم! جاہل ان تعلیم یافتہ حضرات سے ہزار درجے بہتر ہے۔ رام پور کا شہدہ پھر شریف ہے کہ وہ اپنے آپ کو شریف نہیں سمجھتا۔ کہاں سے وہ الفاظ لاؤں کہ ان روشن خیالوں کی سیرت کا ہلکا سا تصور ہی دماغ میں پیدا ہو جائے۔ دیکھتا ہوں اور تعلیم پر ہزار ہزار لعنت بھیجتا ہوں۔ دنیا کی وہ کون سی بدزبانی ہے جو ان کی زبان پر نہ ہو۔ اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت ان کی زبان سے سن لیجیے:

خدا سے جنگ مولوی کو گالی:

مولوی .... سور کا بچہ، حرام زادہ۔ جہاں کسی کتے کو دیکھا اور ہنس کر بولے ”دیکھنا ذرا مولوی فلاں تشریف لے جا رہے ہیں۔“ اور جب سے الیکشن کے سلسلے میں انھوں نے باہر قدم نکالا ہے، زمین تھرا اٹھی ہے۔“

(زمزم-لاہور: ۱۱؍جنوری ۱۹۴۶ء)

لیگ اور اس کے رہنما:

مولانا دین محمد وفائی مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ہندوستان میں پچھلے آٹھ برسوں میں مسلم لیگ نے اتنا زور پکڑا ہے کہ اسے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا زعم پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہی مسلمانوں کے تمام مسایل حل کر سکتی ہے اور مسلمانوں کی خوش حالی اور فلاح و بہبود کے تمام

کام اسی کے ذریعے انجام پائیں گے۔ مسلمان سمجھنے لگے کہ وہ پاکستان میں قرآنی حکومت اور اسلامی نظام قایم کرے گی اور تمام مسایل کے حل اور انجام وہی کے لیے مسلم لیگ کا وجود بس کرتا ہے، لیکن دوسری طرف صورت حالت یہ تھی کہ مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ کو اسلام کے کسی رکن یا شعار سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کی شکل وصورت اور زندگی کے طور طریقے اسلام کے قطعاً خلاف تھے۔ سوٹ بوٹ میں رہتے تھے، ڈاڑھیاں منڈاتے تھے، نماز کے قریب نہ جاتے تھے، روزے کبھی نہ رکھتے تھے، شرابیں پیتے تھے، حرام اور پلید چیزیں کھاتے تھے، مسلمانوں کے لیڈر ہونے کی حیثیت سے ان میں کچھ تو اسلام اور مسلمانوں کے طور طریقوں کا رنگ ہونا چاہیے تھا جن کی پیروی سے عام مسلمانوں میں بھی اسلامی زندگی کا کچھ اثر ظاہر ہوتا، لیکن افسوس کہ ایسی کوئی امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔..........

لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھو کہ ان کی زندگیوں کے اطوار کیا ہیں! کیا مسٹر جناح اور لیاقت علی کو دیکھ کر کسی کو خدا یاد آسکتا ہے؟ ان کی زندگیوں کے اعمال دیکھ کر کسی مسلمان کے دل میں اسلامی احکام پر عمل کرنے اور اسلامی شعار کو اپنانے کی تحریک پیدا ہوسکتی ہے؟ اور ان کے شب وروز کے معمولات دیکھ کر کسی مسلمان کی نظر میں اسلامی اخلاق وسیرت کی عظمت وبرتری کا نقشہ پھر سکتا ہے؟

میرا مطلب یہ ہے کہ مغرب زدگی اور الحاد وبے دینی اور اخلاق ومذہب سے مادر پدر آزادی سے بچانے کے لیے ہمارے ان لیڈروں نے کیا سبیل نکالی ہے؟ جس پر چل کر مسلمان نوجوانوں کو بے دینی کے طوفان سے بچایا جاسکے۔"

(ماہ نامہ توحید- کراچی: جون، جولائی ۱۹۴۶ء: ص ۲ تا ۴)

لیگ کی علمائے دین سے نفرت:

مولانا دین محمد وفائی اسی ادارتی مقالے میں "علمائے کرام سے نفرت" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"مسلم لیگ نے پچھلے آٹھ برسوں میں پاکستان کے مسئلے پر مسلمانوں کے دلوں میں ان علمائے کرام کے خلاف شدید نفرت پیدا کردی ہے، جن کا خیال ہے کہ تقسیم ملک کی تجویز ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے مسئلے کا واقعی حل نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سارا

ہندوستان مسلمانوں کا ملک ہے، اس لیے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی آبرومندانہ
اور عزت ووقار کی زندگی تلاش کرنی چاہیے، نہ کہ اس میں ایک ٹکڑا اپنے لیے الگ کر کے تمام
ہندوستان اور اس کی صدیوں پر پھیلی ہوئی اسلامی تاریخ اور آثار وروایات سے دست بردار
ہو جانا اور ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کو ہندوؤں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ مگر افسوس
کہ لیگی لیڈر ہندوستان کے کل دس کروڑ مسلمانوں کے لیے عزت ووقار کی زندگی کے حصول
کے لیے سوچنے کے بجائے ان علمائے حق، بہی خواہانِ ملّت، فدایانِ اسلام اور مخلصانِ قوم کو
بے دھڑک ہندوؤں کے غلام اور ان کے ایجنٹ کہتے ہیں۔ وہ ان پر پاکستان میں قایم
ہونے والی خالص اسلامی اور قرآنی حکومت کی مخالفت کا الزام لگاتے ہیں اور مسلمانوں کو
ہندوؤں کا غلام بنانے کی سفارش کا انھیں مجرم گردانتے ہیں اور خدا کا دل میں ذرا خوف نہیں
لاتے (اور نہیں سوچتے کہ حسین احمد مدنی اور ابوالکلام آزاد اسلام کے غدار ہیں تو پھر مسلمان
اور اسلام کا وفادار کون ہے؟ (ا۔س۔ش)) اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہے کہ عام مسلمان
تمام علمائے دین اور کل مذہبی گروہ سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ تو
مسلمانوں میں اسلام سے سچی محبت اور واقفیت رہی ہے، نہ انھیں عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ وہ
مسٹر جناح کی مغرب زدگی اور یورپین اخلاق واطوار ہی کو خالص اسلام اور ان کے طرزِ
معاشرت کو اسلامی زندگی کا نمونہ سمجھنے لگے ہیں۔ حال آں کہ ان میں نہ خدا شناسی کی صفت
ہے، نہ قرآن دانی کا جوہر ہے اور نہ ان کے کسی عمل سے اسلام کے احترام کا پتا چلتا ہے۔

مسلم لیگ نے پورے آٹھ برس اس مقصد سے کہ ''لے کے رہیں گے پاکستان''
ہنگامہ برپا کیا اور اسی بنیاد پر حضرت شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام
آزاد کی ہر طرح بے عزتی کرائی۔ آزاد خیال اور حریت پرست مسلمانوں پر تشدد کروایا اور
غنڈہ گردی اور بے حیائی کا کوئی عمل نہ تھا جس کا بے شرمانہ بھرپور مظاہرہ نہ کیا ہو۔ انھوں نے
''اسلامی نظام حکومت'' کے قیام کے نام پر اخلاق وتہذیب کی اقدار کو ملیا میٹ کروایا اور
شرافت کی حدوں کو تڑوایا اور اعلان کیا کہ چوں کہ یہ علمائے دین اور آزاد خیال مسلمان قیام
پاکستان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس لیے یہ ملّت کے دشمن، کافر اور واجب
القتل ہیں۔ یاللعجب!

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کا قیام نہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے، نہ علمائے کرام کے پاس اس مسئلے کا حل ہے اور نہ آزاد خیال اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے پاس۔ یہ سارا معاملہ برطانیہ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اسی کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے اور ہندوستان کو کیا دیا جائے اور کیا نہ دیا جائے؟ (ایضاً)

مملکت خداداد پاکستان:

۳ رنومبر ۱۹۴۹ء: مملکت خدادادِ پاکستان کی ترقی میں پڑھی لکھی خواتین کو شریک کرنے کا جو اہتمام کیا گیا اس کا اندازہ اس اشتہار سے کیا جا سکتا ہے جو ۳۰ رنومبر ۱۹۴۹ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا:

پاکستان اکیڈمی آف آرٹ

''مشہور پاکستانی رقاصہ آزوری (بیگم نزہت محمود) نے بیان کیا کہ آیندہ سال کے شروع میں پاکستان میں جسم بنانے اور جسمانی حرکات میں تناسب و ہم آہنگی پیدا کرنے کا پہلا ادارہ قایم ہو جائے گا۔ اس کا اصل مرکز کراچی اور ضمنی مراکز مغربی اور مشرقی پاکستان کے اہم شہروں میں ہوں گے۔ اس ادارے کا مقصد پاکستانی عورتوں اور بچوں میں تال، سر، صحت اور جسمانی انضباط کا شعور پیدا کرنا ہے۔ بیگم محمود نے کہا کہ وہ اپنی اس اسکیم کے سلسلے میں مسٹر غلام محمد صاحب، وزیر خزانہ پاکستان اور بیگم لیاقت علی خاں سے ملاقات کر چکی ہیں۔ ان دونوں نے اس کام میں پوری مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میرے پیش نظر سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس رقص کو جو اکابر شاہان مغلیہ کی سرپرستی میں اپنے کمال کو پہنچ گیا تھا اور اب پاکستان میں روبہ زوال ہے، پھر سے زندہ کیا جائے۔ بین الاقوامی نمایش فنون میں جو ۱۹۵۱ء میں لندن میں منعقد ہو رہی ہے پاکستان کو دنیا کے تہذیبی نقشے پر جگہ دلائی جائے۔ اس عظیم الشان کام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلا قدم یہ ہوگا کہ آزوری راول پنڈی میں ۱۰ ردسمبر ۱۹۴۹ء کو رقص اور جسم بنانے کے فن کی نمایش کریں گی.....

یکم ستمبر ۱۹۵۲ء: کراچی کے انگریزی روزنامہ سی سام گزٹ میں اپوا (آل پاکستان ویمنس ایسوسی ایشن) کی طرف سے ایک اعلان شائع ہوا تھا اس پر مولانا عبدالماجد دریا

بادی نے اپنے اخبار ہفت روزہ صدق جدید۔لکھنؤ میں ۱۹ ر ستمبر ۱۹۵۲ء (ص ا و ۲) کو اپنے مشہور کالم ''سچی باتیں'' میں ''بے غیرت بیگمات'' کے عنوان سے تبصرہ کیا تھا۔ یہاں یہ اعلان اور تبصرہ شامل کیا جاتا ہے۔اس پر مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

''آل پاکستان ویمنس ایسوی ایشن نے اعلان کیا ہے کہ اب کی سنیچر ۶ ر ستمبر کی رات میں ہوٹل میٹروپول کے پائیں باغ میں ایک رقص کا اہتمام ہوگا۔اس رقص کی آمدنی سے مہاجرین کی مدد کی جائے گی اور یہ پروگرام سفیر اٹلی کی خاتون صاحبہ کی سرپرستی میں ہوگا۔مسز ڈیوڈ مورس جو اپوا کے پروگراموں کی صدر تھیں انھوں نے پروگرام یہ بتایا ہے کہ رقاصی اور موسیقی کلاسکی قسم کی ہوگی اور مختلف ملکوں کی بھی پروگرام کے آخر میں ''بفے ڈنر'' (کھڑے کھڑے کھانا) اور رقص ہوگا....یہ ٹولیاں برما، بوٹان، انڈونیشیا، ہالینڈ، اسکاٹ لینڈ، امریکا اور خود پاکستان کی ہوں گی۔کمیٹی کی ممبروں میں بیگم نذیر احمد، بیگم ایچ ایم ایس چودھری، بیگم افضل حبیب اور بیگم ایس اے رحیم شامل ہیں۔

یہ اعلان وہ ہے جو کراچی کے مشہور انگریزی روزنامہ سی سام گزٹ یکم ستمبر کے صفحۂ اول پر دہری نمایاں سرخیوں کے ساتھ شایع ہوا ہے۔خبر پر تبصرہ معتدل اور محتاط لفظوں میں کیوں کر کیا جائے؟ اپنی بہنوں کی اتنی کھلی ہوئی بے غیرتی پر کس مسلمان مرد کے لیے صبر و ضبط ممکن ہے؟ ناچ تو ہماری اسلامی تہذیب و معاشرت میں فسق کی شاید پست ترین اور ذلیل ترین صورت تھی۔شریف بہو، بیٹیاں، بیواؤں کے سایے سے دور رہتی تھیں، ان سے باقاعدہ پردہ کرتی تھیں، جس طرح نامحرم مردوں سے کیا جاتا ہے اور اگر کہیں اتفاق سے ان کا سامنا ہو جاتا تو جھوٹ بول بول کر اپنی شخصیت کو چھپا دیا جاتا تھا۔اور اب یہ نوبت ہے کہ یہ ناچنے والی اور نچانے والی ''بیگمات'' فخر کے ساتھ اپنے ناموں کا اعلان کر رہی ہیں اور شاید متوقع ہیں کہ اب بھی ان کی ''شرافت'' و ''عزت'' کا احترام بدستور جاری رہے گا؟ پاکستان اسی بے غیرتی کے مظاہرہ کے لیے بنا تھا؟ بانیٔ پاکستان اقبال کے ذہن میں شایبہ بھی اس بے حیائی کی آزادی کا آیا تھا؟ کراچی اور پاکستان کا سارا اسلامی پریس ان ساری بے ہودگیوں کو دیکھ رہا ہے اور خاموش ہے! بہ جز ان معدودے چند مستثنیات کے جن کا علم اس شذرے کے عین پریس میں جانے کے وقت ہوا۔

(۴)

قومی اور ملّی اتحاد

کوششیں-توقعات اور نتایج

معاہدات کانگریس با جمعیت مسلمانان (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۹ء):

(الف) پہلی دستاویز: جمعیت علماے ہند نے اپنی اختلافی رپورٹ میں نہرو رپورٹ کے خلاف احتجاج کیا۔ کانگریس نے جمعیت علماے ہند کے احتجاج پر نہرو رپورٹ کے مجوزہ آئین کو دریاے راوی میں غرق کر دیا اور لاہور کانگریس ۱۹۲۹ء میں یہ تجویز پاس کی:

لاہور ریزولیوشن:

چوں کہ نہرو رپورٹ کو منسوخ کر دیا ہے اس لیے فرقہ وارانہ مسایل کے متعلق کانگریس کا پالیسی کی اعلان کرنا غیر ضروری ہے۔ کانگریس کو یقین ہے کہ آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسایل کو قومی اصول پر حل کیا جا سکتا ہے، لیکن چوں کہ سکھوں نے خاص کر اور مسلمانوں نے اور دوسرے فرقوں نے عام طور پر اس فرقہ وارانہ حل سے بے اطمینانی ظاہر کی ہے جو نہرو رپورٹ میں پیش کیا گیا ہے۔ کانگریس سکھوں اور مسلمانوں کو یقین دلاتی ہے کہ کسی آیندہ آئین میں اس مسئلے کا کوئی ایسا حل کانگریس کے لیے قابل قبول نہ ہوگا جو تمام متعلقہ جماعتوں کے لیے اطمینان بخش نہ ہو۔ (تجویز اجلاس لاہور، دسمبر ۱۹۲۹ء)

(ب) دوسری دستاویز: لاہور کے ریزولیوشن میں چوں کہ سکھوں کا خاص طور پر ذکر تھا اس لیے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت علماے ہند نے صدر کانگریس سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ خاص طور پر ایک تحریری دستاویز کے ذریعے جمعیت علماے ہند کے سامنے یہ عہد کریں کہ مسلمانوں کے خلاف کوئی دستور منظور نہیں کیا جائے گا۔ چناں چہ نہرو رپورٹ کے مصنف پنڈت موتی لال نہرو نے ایک تحریری عہد لکھ کر بھیج دیا۔ اس کا

ایک حصہ دیا جا چکا ہے۔ آج مکمل خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

پنڈت نہرو کا تحریری عہد نامہ:

آنند بھون۔ آلہ آباد،

۲۹/اپریل ۱۹۳۰ء

کرم فرمائے من مفتی صاحب!

میں مشکور ہوں گا، اگر ارکان جمعیت کو انڈین نیشنل کانگریس کی جانب سے پیام تبریک ودعائے کامیابی پہنچادیں گے۔ اس موقعے پر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ امور متنازعہ فیہ کے متعلق کانگریس کی حقیقی پوزیشن کو واضح کردوں۔ دہلی کے ایک پیغام سے جو آج کے اخباروں میں شایع ہوا ہے معلوم ہوا ہے کہ نہرو کمیٹی کی رپورٹ اور فرقہ وارانہ مسایل کے متعلق کانگریس کا طرز عمل ابھی تک اشتباہ انگیز خیال کیا جاتا ہے اور کانگریس کے صدر یا مجلس عاملہ سے یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ وہ اس امر کا اعلان کریں کہ نہرو رپورٹ زایدالمیعاد ہوچکی ہے اور برطانوی حکومت سے کوئی سمجھوتا اُس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک کہ ملک کا مسلمان طبقہ اس سے مطمئن نہ ہو۔ میں خیال کرتا تھا کہ لاہور کانگریس میں جو قرار دادیں منظور کی گئی ہیں اُن سے اس قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ ہوگیا ہوگا۔ کیوں کہ اجلاس لاہور کی چوتھی قرار داد میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے کہ نہرو کمیٹی کی رپورٹ زایدالمیعاد ہوچکی۔ مذکورہ اجلاس کی آٹھویں قرار داد میں فرقہ وارانہ معاملات سے بحث کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

> ''نہرو رپورٹ کے زایدالمیعاد ہوجانے کی وجہ سے فرقہ وارانہ مسایل کے بارے میں کانگریس کی پالیسی کا اعلان غیر ضروری معلوم ہوتا ہے اور کانگریس کو اس کا یقین ہے کہ آزاد ہندوستان کے اندر فرقہ وارانہ مسایل صرف قومی اصول پر طے ہوسکتے ہیں، لیکن چوں کہ مسلمان اور دیگر اقلیتیں عموماً نہرو رپورٹ کے تجویز کردہ دستور سے مطمئن نہیں ہیں، اس لیے کانگریس مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ کسی آیندہ دستور میں فرقہ وارانہ مسایل کا

کوئی تصفیہ اُس وقت تک منظور نہیں کرے گی جب تک کہ جماعت متعلقہ کو اُس سے پورا اطمینان نہ ہو جائے۔"

پس یہ ظاہر ہے کہ جس اعلان کا مطالبہ آج کیا جا رہا ہے وہ لاہور کانگریس کے کھلے ہوئے اجلاس میں پہلے ہی کیا جا چکا ہے اور وہ کانگریس کے صدر یا مجلس عاملہ کے انفرادی حیثیت رکھنے والے اعلان سے کہیں زیادہ وزنی ہے۔ بہر حال مجھے قایم مقام صدر کی حیثیت سے اس اعلان کی تصدیق میں کوئی تامل نہیں جو لاہور میں کیا گیا تھا اور میں اس کو صاف اور واضح ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ کوئی مسلمان جو مادرِ وطن کی آزادی کی اس عظیم الشان جنگ میں شرکت کرے گا اس حق سے محروم نہیں ہو سکتا جو فرقہ وارانہ مسایل کے معاملے میں اس کو حاصل ہے۔

میں مشکور ہوں گا اگر آپ میرا یہ خط اُن علمائے کرام کو جو جمعیت کے اجلاس میں تشریف لائیں پڑھ کر سنا دیں گے۔ میرے دل میں علمائے کرام کی بے حد عزت ہے۔

آپ کا مخلص موتی لال نہرو

(قایم مقام صدر آل انڈیا کانگریس کمیٹی)

پنڈت موتی لال کا یہ تحریری عہد نامہ جمعیت علمائے ہند کی طرف سے اس عنوان سے شایع کیا گیا "صدر کانگریس کا مکتوب صدر جمعیت علمائے ہند کے نام" اگر مسلمان مطمئن نہ ہوں گے تو برطانیہ سے کوئی سمجھوتا نہ کیا جائے گا۔

(حوالے کے لیے دیکھیے اخبار مدینہ مورخہ ۱۳رذی الحجہ ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۳رمئی ۱۹۳۰ء، ج ۱۹ نمبر ۳۵ ص ۱)

(ج) تیسری دستاویز۔ کانگریس کی تجویز الہ آباد:

صدر کانگریس کا تحریری عہد نامہ اگرچہ اہم خبر تھی، مگر تھا انفرادی۔ اس لیے جمعیت علمائے ہند نے کانگریس سے مطالبہ کیا کہ کانگریس جمعیت علمائے ہند کو تسلیم کرے اور بہ حیثیت جماعت یقین دلائے۔ چناں چہ اس کی تعمیل کرتے ہوئے حسب ذیل تجویز پاس کی گئی۔ جمعیت علمائے ہند نے اس تجویز کو یہ دو عنوان دے کر شایع کیا:

(۱) "جمعیت علمائے ہند کا خیر مقدم۔"

(۲) ''مسلمانوں کے ساتھ کانگریس کا معاہدہ۔''

''انڈین نیشنل کانگریس کی یہ ورکنگ کمیٹی جمعیت علماے ہند کی ان تجاویز کا خیر مقدم کرتی ہے جو اس نے اپنے سالانہ اجلاس نہم منعقدہ امروہہ میں منظور کی ہیں، جن میں سول نافرمانی اور حصولِ آزادی کے لیے کانگریس سے اشتراک عمل کرتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ اپنے مذہب اور ملک کی آزادی کے لیے کوشش بلیغ کریں اور پورے جوش کے ساتھ جنگ آزادی میں حصہ لیں۔ یہ کمیٹی دوبارہ اقرار کرتی ہے کہ فرقہ وارانہ مسایل کا کوئی ایسا حل کانگریس کے لیے قابل قبول نہ ہوگا جو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لیے کامل تسلی بخش نہ ہو اور عام مسلمانوں اور جمعیت علما کو یہ کمیٹی اطمینان دلاتی ہے کہ کانگریس ہندوستان کے تمام کلچروں، تمدن، مذہبی روایات، زبان اور مذاہب کی کامل آزادی کا احترام کرے گی اور مسلمانوں سے استدعا کرتی ہے کہ ان شکوک وشبہات کو (جو خود غرض لوگوں نے پیدا کر دیے ہیں) دور کر دیں۔ کمیٹی کو امید ہے کہ ہندو مسلمان جنگ آزادی میں دوش بہ دوش لڑکر اشتراک عمل کا ایسا جذبہ پیدا کریں گے جو قومی جھگڑوں کو دور رکھنے میں ایک پختہ اور مستحکم ضمانت ہوگی۔''

یہ ہیں تین اہم سیاسی دستاویزیں جن کی روشنی میں جمعیت علماے ہند اور کانگریس کے تعلق کی بنیادیں متعین ہوتی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمعیت علماے ہند اور کانگریس کے درمیان ایک معاہدہ موجود ہے اور اس کی بنیاد ان امور پر ہے۔

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود مستقل ہے۔

(۲) جمعیت علماے ہند مسلمانوں کا جداگانہ ملی نظام ہے اور کانگریس اس کو تسلیم کرتی ہے۔

(۳) کانگریس جانتی ہے کہ جمعیت علما کی جنگ مذہب اور ملک کی آزادی کے لیے ہے اور جمعیت علماے ہند کے سامنے تحریری عہد کرتی ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، روایات، زبان اور مذہب کی آزادی کا کامل احترام کرے گی اور اس کی پابند ہوگی۔

(۴) کانگریس مسلمانوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ شکوک وشبہات کو دور کریں۔

(۵) آخر میں جمعیت علما سے توقع رکھتی ہے کہ وہ جنگ آزادی میں ایک ساتھی کی

طرح اشتراک عمل کرے گی۔

تیسری دستاویز جمعیت علمائے صوبۂ بہار کی طرف سے ۱۹۳۰ء میں شایع ہو چکی ہے اور اس کے نیچے یہ نوٹ شایع کیا گیا ہے:

''اس تجویز میں کانگریس کا مسلمانوں سے اور جمعیت علما سے ایک معاہدہ ہے جو مکرر کیا گیا ہے اور اس معاہدے کی مزید تنسیخ و توثیق ہے جو لاہور کانگریس میں ہوا تھا اور یہ اعادہ و تکرار وضاحت کے ساتھ محض اس لیے کیا گیا کہ جمعیت علمائے ہند نے اپنے اجلاس امروہہ میں کانگریس کو اس طرف توجہ دلائی تھی کہ وہ ایسا کرے۔ جو مسلمان باب حقوق میں کاغذی سمجھوتے کے دلدادہ ہیں اب ان کو بھی آزادی کی جنگ میں کود جانا چاہیے۔ جمعیت علما اس معاہدے کی پابند ہے۔ کانگریس اس معاہدے کی بنیاد پر قانون و دستور کی ترتیب کے ہر اہم مرحلے پر صدر جمعیت علمائے ہند سے مشورہ کرتی ہے اور آج تک اپنے عہد پر قایم ہے۔ ان حالات میں جمعیت علمائے ہند حق بہ جانب ہے اور مسلم لیگ اور مسلم لیگی جمعیت علمائے اسلام اس کو الزام دے کر مسلمانوں کے سامنے سرخرو نہیں ہو سکتی۔

(مدینہ۔بجنور: ۲۷ر صفر ۱۳۶۵ھ مطابق یکم فروری ۱۹۴۶ء)

(۲)

جمعیت علما نے تجویز امروہہ مجوزہ ۵ر مئی ۱۹۳۰ء میں شریعت کی حفاظت، مسلمانوں کے قومی استقلال، مذہبی اور قومی مفاد کی حفاظت کا اعلان کرتے ہوئے یہ طے کیا تھا کہ کانگریس کا کوئی عملی پروگرام اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگا جب تک جمعیت علمائے ہند اس کی تصدیق نہ کر دے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند اور کانگریس کا تعلق غیر مشروط نہیں ہے اور مسلم لیگ جمعیت علما پر الزام عاید کرنے میں کسی طرح حق بہ جانب نہیں۔ چوں کہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے بعض رہنما انفرادی خیالات کی بنا پر مذہب کے بارے میں آزادانہ طور پر نامناسب باتیں کہہ چکے تھے، اس لیے جمعیت علمائے ہند نے صدر کانگریس کو یہ اعتراف کرنے پر مجبور کیا کہ جمعیت علما کی جدوجہد مذہب کے لیے ہے اور کسی حالت میں مذہبی تصورات سے علاحدہ ہو کر اور مسلمانوں کی قسمت کو نظر انداز کر کے کانگریس کا

ساتھ نہیں دے سکتی۔ چناں چہ کانگریس ورکنگ کمیٹی سے کہا گیا اور اُس نے جمعیت علماے ہند کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا کہ

"حصول آزادی کے لیے جمعیت علماے ہند کی کانگریس سے رفاقت اپنے مذہب اور ملک کی آزادی کے لیے ہے۔ کانگریس جمعیت علما کو یہ یقین دلاتی ہے کہ وہ ملکی دستور میں مذہب کی کامل آزادی کا احترام کرے گی۔"

(تجویز کانگریس ورکنگ کمیٹی ۸ر جون ۱۹۳۰ء) (مدینہ - بجنور: ۱۴ر ربیع الاول ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۷ر فروری ۱۹۴۶ء)

(۳)

جمعیت علماے ہند اور کانگریس:

اسلامی حقوق کا تحفظ، مساعی اور ضمانت - قدم بہ قدم - ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۷ء

چوں کہ نیشنل کانگریس نے اجلاسِ لاہور میں مکمل آزادی کا اعلان کر دیا ہے، جو جمعیت علما کا پہلے سے نصب العین ہے اور نہرو رپورٹ کو جس سے جمعیت علما کو شدید اختلاف تھا، کالعدم کر دیا ہے اور یہ بھی طے کر دیا ہے کہ آیندہ کوئی دستوار اساسی متعلقہ جماعتوں کے اطمینان کے بغیر کانگریس منظور نہ کرے گی۔ اس لیے بہ حالت موجودہ کانگریس سے علاحدہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مسلمانوں کے قومی، مذہبی مفاد کو مدنظر رکھ کر یہ اجلاس اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہے کہ کانگریس کا آیندہ عملی پروگرام اُس وقت تک مسلمانوں کے لیے آخری فیصلہ نہ ہوگا جب تک جمعیت علماے ہند اس کی تصدیق نہ کر دے۔ وطن کو غلامی اور افلاس سے نکالنے، ظالمانہ قوانین سے بچانے، تمام مفاسد کے سدِ باب، ناموس شریعت کی حفاظت کی آخری صورت یہ ہے کہ ملک و ملّت کو (برٹش) حکومت کی گرفت سے مکمل طور پر آزاد کرا لیا جائے۔ اس لیے یہ اجلاس مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ مسلمان پورے جوش و خروش کے ساتھ اور کامل استقلال سے کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے ہوئے سرفروشانہ پر امن جنگ آزادی کی راہ میں گامزن ہوں۔

(مدینہ - بجنور: ۹ر مئی ۱۹۳۰ء)

اس سے مندرجۂ ذیل نتائج نکلتے ہیں:

(الف) جمعیت نے پہلے کامل آزادی کو نصب العین بنایا، اس کا ساتھ کانگریس نے دیا اور

۱۹۳۰ء میں کامل آزادی کی تجویز پاس کی۔

(ب) جمعیت علماے ہند مسلمانوں کا جداگانہ ملّی نظام ہے، جب تک جمعیت علما تصدیق نہ کرے، کانگریس کا کوئی عملی پروگرام مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل نہیں۔ جمعیت علما کانگریس کی پابند نہیں ہے بلکہ اپنے فیصلے میں آزاد ہے۔ مسلمانوں کو ہر وقت اپنے کامل استقلال کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

(ج) جمعیت علما کی ہر تحریک اسلامی رنگ میں ڈوب کر اُبھرتی ہے اور اس کی رہنمائی میں اسلام اور مذہب کے لیے کوئی خطرہ بروے کار نہیں آسکتا۔ (مدینہ-بجنور: ۱۳؍فروری ۱۹۴۶ء)

(۴)

تجویز: بمبئی ۱۹۳۰ء:

جمعیت علماے ہند کی ورکنگ کمیٹی نے سہارن پور کا فارمولا ۳؍اگست ۱۹۳۱ء کو پاس کیا تھا۔ ۴؍اور ۵؍اگست کے اخباروں نے اسے شایع کیا اور ۴ روز بعد یعنی ۸؍اگست ۱۹۳۱ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اس کا جواب ایک تجویز میں دیا، جس کے الفاظ یہ تھے:

> ''کوئی کانسٹی ٹیوشن (ملکی دستور) جو کانگریس کی طرف سے طے پائے یا اس کے لیے ہندوستان کی آزاد حکومت قایم کی جائے اس میں اور اُمور کے علاوہ اقلیتوں کے مذہبی اور قومی حقوق کا تحفظ لازم ہے۔''

(رسالہ ''آزاد ہندوستان میں اقلیتوں کے مذہبی اور قومی حقوق کا تحفظ'': ص ۳۵، طبع جمالی پریس-دہلی)

کانگریس ایک دن ضایع کیے بغیر جمعیت علما کے سامنے جھک جاتی ہے۔ مسلمانوں کو اطمینان دلاتی ہے اور اُن کے مذہب کے تحفظ اور قومی حقوق کی حفاظت کا باقاعدہ تحریری عہد کرتی ہے۔ یہ ہے کانگریس کا تعلق جمعیت علما سے! بمبئی کی اس تجویز میں جن مذہبی اور قومی حقوق کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے ان کی وضاحت اور تفصیل بنیادی حقوق اور فرایض کے ذریعے سے کی گئی ہے۔ (مدینہ-بجنور: ۲۱؍فروری ۱۹۴۶ء)

کراچی میں ۳۱؍مارچ ۱۹۳۱ء کو چھ گھنٹے تک گرما گرم بحث ہوئی اور بنیادی حقوق کے متعلق پنڈت جواہر لال کی تجویز پاس کی گئی۔ تجویز کے ابتدائی الفاظ میں یہ کہہ دیا گیا کہ کانگریس کی مخالفت کا رخ اپنے ہم وطنوں کے مذہبوں اور تمدنوں کے خلاف نہیں بلکہ

''اس کانگریس کی رائے ہے کہ غریبوں کی بربادی کو ختم کرنے کے لیے ہندوستان کی سیاسی آزادی کے مسئلے میں اقتصادی آزادی بھی شامل ہونی چاہیے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ اُن کو آزادی ملی ہے تو آزادی کے ساتھ کیا حاصل ہوا ہے۔''

اس کے بعد کانگریس نے بنیادحقوق کا اعلان ۲۰ دفعات میں کیا۔ یہ اعلان ''کراچی کا اعلان بابت بنیادی حقوق وفرایض مجوزہ ۳۱ر مارچ ۱۹۳۱ء'' کے نام سے ملک میں مشہور ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۱۰ر جولائی ۱۹۳۱ء کو اس پر نظر ثانی کی اور مزید اضافے کیے۔ اس اعلان حقوق کا پہلا بنیادی پتھر ہندوستان کے ہر فرد کی آزادی اور مذہب کی آزادی پر رکھا گیا ہے اور پہلی دوسری دفعات میں شہری آزادی اور مذہبی آزادی کا یقین دلایا گیا ہے۔ کانگریس جانتی ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں نے ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی، ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت میں، ۱۹۳۰ء کی جنگ آزادی اور ۱۹۴۲ء کی تحریک انقلاب میں مل جل کر ایک ساتھ خون بہایا اور ہندوستان کے چمن کو سرسبز وشاداب کیا ہے۔ اس نئے کانگریس کے نظام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا برابر حق ہے، اس لیے جب انگریزی شہنشاہیت اور انگریزی شہنشاہیت کے مسلمان ایجنٹ مل کر اس کے خلاف نفرت پھیلاتے ہیں، اس کے خلاف جھوٹ باتیں مشہور کرتے ہیں تو وہ مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے بے چین ہو جاتی ہے، اس کا دل تڑپنے لگتا ہے، اس کا سینہ پگھلنا شروع ہو جاتا ہے اور وہ ایک کے بعد ایک تجویز پاس کرتی ہے اور ان کے مطابق عملی نمونے پیش کرتی ہے۔ چناں چہ اس نے مارچ ۱۹۳۱ء میں حقوق کا اعلان کیا۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں اس پر اضافہ کیا اور اگست ۱۹۳۱ء میں اطمینان دلانے کے لیے خاص تجویز پاس کی۔ اور آخر اکتوبر ۱۹۳۷ء میں بہ مقام کلکتہ ایک واضح تحریری عہد کیا اور ایک مرتبہ پھر بنیادی حقوق کو اس تجویز کے ساتھ دوہرایا۔

اعلان کراچی ۳۱ر مارچ ۱۹۳۱ء

بنیادی حقوق اور فرایض کا تحریری وثیقہ

''(۱) ہر باشندۂ ہندوستان کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی

سے کر سکے گا اور اپنے مذہب کے فرایض و رسوم آزادی سے برت سکے گا اور یہ آزادی عوام کے اخلاق اور امن عامہ کے پیش نظر ہوگی۔

(۲) ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور اُن کی زبان اور رسم تحریر محفوظ ہوں گے، نیز ملک کے وہ مختلف رقبے جو باعتبار اختلاف زبان قایم ہیں اُن کا تحفظ ہوگا۔

(۳) تمام باشندگان ہندوستان بلا امتیاز مذہب و ملک یا ذات و قوم یا جنسیت کے قانون کی نظر میں برابر ہوں گے۔

(۴) کوئی باشندہ ہندوستان خواہ مرد ہو یا عورت بہ وجہ اپنے مذہب یا ذات یا جنسیت کے کسی پبلک ملازمت یا عہدے یا اعزاز سے یا کسی تجارت یا پیشے سے ممنوع نہیں سمجھا جائے گا۔

(۵) تمام باشندگان ہندوستان کو متعلق استعمال آبِ چاہ اور تالابوں کے نیز تعلیم گاہوں اور مقاماتِ تفریحِ عامہ کے استعمال کے متعلق کہ جن کی برقراری اور انتظام اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے یا لوکل فنڈ (ڈسٹرکٹ و میونسپل بورڈ) سے ہوتا ہو یا جن کو پرائیوٹ اشخاص نے پبلک فایدے کے واسطے مخصوص کر دیا ہو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

(۶) ہر باشندۂ ہندوستان کو ہتھیار رکھنے اور لگانے کا حق اُن قواعد و ضوابط کے تحت میں جو اس بارے میں مقرر کر دیے جائیں گے، حاصل ہوگا۔

(۷) کسی شخص سے اُس کا حقِ آزادی چھینا نہیں جا سکتا اور نہ اس کے کسی مکان یا جائیداد میں مداخلت کی جا سکتی ہے اور نہ وہ ضبط اور قرق کی جا سکتی ہے، سوائے اس کے کہ وہ قانون کے مطابق ہو۔

(۸) مذہب کے معاملے میں اسٹیٹ (حکومت وقت) غیر جانب دار رہے گی۔

(۹) حق رائے دہندگی ہر عاقل و بالغ کو حاصل ہوگا۔

(۱۰) مفت جبری ابتدائی تعلیم کا انتظام اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے ہوگا۔

(۱۱) اسٹیٹ (حکومت وقت) کی جانب سے کوئی خطاب نہیں ملے گا۔

(۱۲) ہر باشندۂ ملک کو اختیار ہوگا کہ ملک بھر میں جہاں اُس کا جی چاہے سکونت اختیار

کرے، جائیداد حاصل کرے یا کوئی تجارت یا پیشہ وہاں کرے اور اُس کے خلاف قانونی کارروائی یا اُس کا قانونی تحفظ ہندوستان کے ہر حصے میں مساوی طور پر ہوگا۔

(۱۳) غیر ملکی کپڑے اور غیر ملکی سوت کو ملک بدر کر کے دیسی کارگاہوں کی صنعت پارچہ بافی کی حفاظت کی جائے گی۔

(۱۴) شراب اور نشیلی چیزوں کی قطعاً ممانعت کر دی جائے گی۔

(۱۵) نمک پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔

(۱۶) شرح تبادلہ اس طرح رکھی جائے گی جس سے ملکی صنعت و حرفت کی ترقی ہو اور ملک کے باشندوں کو اُس سے فایدہ پہنچے۔

(۱۷) ملک کی خاص صنعتیں اور کانیں قومی ملکیت ہوں گی۔

(۱۸) ہر قسم کے سود کے خلاف حکومت روک تھام کی کارروائی کرے گی اور سود پر کنٹرول رکھے گی۔

(۱۹) فوجی اخراجات نصف کر دیے جائیں گے۔

(۲۰) گورنمنٹی ملازموں کی (بڑی بڑی) تنخواہیں کم کر دی جائیں گی۔"

اس علان پر غور فرمایے! اس کی کون سی دفعہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہے؟ کانگریس کیوں مسلمانوں کی دشمن ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ کہتی ہے کہ ہر مسلمان ایک شہری کی حیثیت سے اپنی راے میں آزاد ہوگا۔ ہر مسلمان کا مذہب آزاد ہوگا اور اس پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔ مسلمان کا تمدن، زبان، عربی ہو یا اردو باقی رہے گی، ترقی کرے گی۔ کانگریس تمام مذہبوں کو برابر سمجھے گی۔ یہ نہ ہوگا کہ ہندو مذہب کے ساتھ ترجیحی سلوک کرے۔ تمام مسلمانوں کو دوسرے ہندوستانیوں کی طرح ہتھیار رکھنے کی آزادی ہوگی۔ حکومت مذہبوں کے بارے میں پوری طرح غیر جانب دار رہے گی۔ کانگریس ابتدائی تعلیم عام اور مفت دے گی۔ ان باتوں میں وہ کون سی بات ہے جو مسلمانوں کی دشمنی پر مبنی ہے۔

کانگریس کہتی ہے کہ آزاد ہندوستان میں شراب بند کر دی جائے گی! کیا لیگ ہائی کمانڈ کے بدمستوں کو یہ بات ناگوار ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شراب کا بند کرنا اسلام کے خلاف اعلان جنگ ہے؟ کانگریس کہتی ہے کہ سود کی روک تھام کی جائے گی۔ کیا سود کی

روک تھام بھی اسلام کی دشمنی کا کوئی بڑا نمونہ ہے؟ کانگریس کہتی ہے کہ آزاد ہندوستان میں غیر ملکی کپڑے اور سوت کو بند کر کے کروڑوں مومن انصار بھائیوں کی صنعت کرگھ کو ترقی دی جائے گی۔ کیا مسلم لیگ اس بات کو اپنے ہاتھ میں لے کر سہ بسورتی ہے اور کہتی ہے کہ کانگریس مسلمانوں کو تباہ کرنا چاہتی ہے؟ کانگریس چاہتی ہے کہ آزاد ہندوستان میں لوہے اور لکڑی کی صنعت ترقی کرے، فوجی اخراجات کم ہوں۔ گورنروں، کلکٹروں، کمشنروں کی تنخواہیں کم ہوں اور ان سے رُپیہ بچا کر عوام کی بہتری پر صرف کیا جائے۔ ہر ہندوستانی کو تعلیم مفت، علاج مفت اور روزگار مہیا کیا جائے۔ اور ہر بے روزگار کو تنخواہ دی جائے۔ بوڑھے کو بڑھاپے کا الاؤنس دیا جائے۔ فقیروں محتاجوں کو کھانا، کپڑا، مکان دیا جائے۔ ان میں سے کون سی بات اسلام کے خلاف مذہب کے خلاف، مسلمانوں کے خلاف، مسلمانوں کے نظام ملی اور مسلم حقوق کے خلاف ہے؟

چند اور دستاویزیں:

ہم نے دستاویزوں کا ذکر کیا ہے، اُن کو اسی ماہ کانگریس الیکشن بورڈ یو پی نے باضابطہ دستاویزی شکل میں شایع کیا ہے، جس کے آخر میں نماز، مساجد، قربانی اور اُن اُمور کے تحفظ کا تحریری عہد کیا گیا ہے، جن کا ذکر جمعیت علما کے فارمولے ۱۹۳۰ء میں موجود ہے۔ یہ ایک باضابطہ دستاویز ہے جس کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔

کانگریس کی پالیسی اور مسلمانوں کے حقوق:

آج جب کہ غرض کے پجاری، سیدھے سادھے مسلمانوں کو کانگریس کے خلاف جھوٹی باتیں بتا کر غلط راستے پر لے جانا چاہتے ہیں اور آزادی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے سامنے صحیح باتیں رکھ کر اُن کو سوچنے اور سمجھنے اور پھر ایمان داری کے ساتھ فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔

بنیادی حقوق اور فرایض (۸؍اگست ۱۹۳۱ء):

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے ۸؍اگست ۱۹۳۱ء کے بمبئی والے اجلاس میں

بنیادی حقوق اور فرایض کو ان الفاظ کے ساتھ پاس کر کے ملک کے ہر حصے میں شایع کیا تھا کہ کوئی کانسٹی ٹیوشن (ملکی قوانین کا اعلان) جو اُس کی طرف سے طے پائے یا اس کے ذریعے سے سوراج گورنمنٹ تیار کرے، اس میں ذیل کی باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ہر ہندوستانی کو ذیل کے حقوق حاصل ہوں گے۔

(۱) اپنی رائے کا پوری آزادی سے اظہار کرنا۔

(۲) باہمی میل جول میں پوری آزادی۔

(۳) ہندوستان کے ہر باشندے کو ضمیر کی آزادی ہوگی۔ وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی سے کر سکے گا اور مذہبی فرایض کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ بہ شرطے کہ اس سے انتظام عام اور اخلاق میں کوئی نقص نہ پیدا ہو۔

(۴) ملک کی اقلیتوں کے تمدن، اُن کی زبان اور رسم الخط محفوظ ہوں گے نیز ملک کے وہ صوبے جو زبان کے اعتبار سے قایم ہیں اُن کا تحفظ ہوگا۔

(۵) ہندوستان کے تمام باشندے بلا امتیاز مذہب و مسلک یا ذات و قوم یا حیثیت کے قانون کی نظر میں برابر ہوں گے۔

اقلیتوں کے حقوق (۲۶/اکتوبر ۱۹۳۷ء):

اس کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی نے ۲۶/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو کلکتہ کے اجلاس میں ذیل کے الفاظ میں اس کو دہرایا:

"کانگریس نے ہندوستان کی اقلیتوں کے بارے میں اپنی پالیسی کا کئی بار اعلان کیا ہے اور صاف بتا دیا ہے کہ کانگریس اُن کی حفاظت کرنا اور اُن کو آگے بڑھنے دینے کا موقع دینا اپنا پہلا فرض سمجھتی ہے۔ کانگریس کا مقصد ملک کو آزاد کرانا ہے اور اُسے یک جہتی اور پریم کے بندھن میں باندھنا ہے۔ فرقے اکثریت یا اقلیت کسی دوسرے کو اپنے فایدے کے لیے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ آزادی کے یہ معنی نہیں کہ ہندوستان کی مختلف تہذیبوں میں سے کسی ایک تہذیب کو اختیار کرنے کے لیے کسی پر دباؤ ڈالا جائے۔ بلکہ سب تہذیبوں کو

باقی رکھا جائے گا، تاکہ سب لوگوں کو اور ہر فرقے کو اپنے اپنے رجحان کے مطابق بغیر کسی رکاوٹ کے ترقی کا موقع مل سکے۔ چوں کہ اس مسئلے پر کانگریس کی پالیسی کے بارے میں غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنی پالیسی کا پھر اعلان کرتی ہے۔''

مذہب اور شریعت کی آزادی:

اقلیتوں کے بنیادی حقوق والی تجویز کی یہ دفعات اس بات کو بالکل صاف کر دیتی ہیں کہ ذاتی خیالات، مذہب اور تہذیب کے بارے میں اقلیت کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی نہ ہوگی۔

وہ اپنے ذاتی قانون ''پرسنل لا'' یعنی شرعی اور مذہبی قانون کو قایم رکھ سکیں گے اور اکثریت ان میں تبدیلی کرانے کے لیے زور نہیں دے سکتی۔ کمیونل ایوارڈ کے بارے میں کانگریس ایک تجویز منظور کر کے اپنی پالیسی کا بار بار اظہار کر چکی ہے اور آخر میں پچھلے سال چناؤ کے مسودے میں اُس نے اپنی پالیسی کو صاف کر دیا ہے۔ کانگریس ''کمیونل ایوارڈ'' کے خلاف ہے کیوں کہ کمیونل ایوارڈ قومی اتحاد اور جمہوریت کے خلاف ہے اور ہندوستان کی آزادی کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ پھر بھی کانگریس نے اعلان کر دیا ہے کہ اس ایوارڈ میں اگر کوئی تبدیلی ہو یا رد کیا جائے تو اس سے تعلق رکھنے والے فرقوں کے آپس کے سمجھوتے ہی سے ہو سکے گا۔ کانگریس نے باہمی سمجھوتے کا ہمیشہ استقبال کیا ہے۔

اقلیت سے تعاون:

سب ایسے کاموں میں جن کا اقلیت سے تعلق ہے، کانگریس اقلیت کو ساتھ لے کر ہی ان کاموں میں آگے بڑھنا چاہتی ہے یعنی آزادی کی منزل تک پہنچنا اور سب کی حالت کو سدھارنا۔ (کانگریس بلیٹن: شایع کردہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی، الہ آباد، مورخہ ۲ر دسمبر ۱۹۳۰ء: ص ۹ تا ۱۲)

ہری پور کانگریس کا اعلان متعلق حقوق (۱۹۳۷ء):

ہری پور ضلع سورت کا اجلاسِ عام منعقدہ ۱۹، ۲۰، ۲۱ر فروری ۱۹۳۸ء میں اسی تحفظ کو

ذیل کے الفاظ میں پاس کیا گیا:

''ورکنگ کمیٹی نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اپنی کلکتہ کی میٹنگ میں اقلیتوں کے حقوق پر جو تجویز پاس کی تھی اُسے یہ کانگریس منظور کرتی ہے اور نئے سرے سے اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کی اقلیتوں کے تمدنی، مذہبی اور لسانی حقوق کی حفاظت کرنا کانگریس کا پہلا فرض اور بنیادی پالیسی ہے، تاکہ حکومت کی کسی بھی ایسی اسکیم میں جس میں کانگریس شریک ہو اقلیتوں کو ترقی اور نشو ونما کا زیادہ سے زیادہ موقع مل سکے اور وہ قوم کی سیاسی اقتصادی اور کلچرل زندگی میں پورا پورا حصہ لے سکیں۔''

نماز، مساجد، قربانی وغیرہ کا تحفظ:

بنابریں مسلمانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ آزاد ہندوستان کی حکومت میں اُن کا مذہب اور مذہبی فرائض، اذان، نماز، جمعہ، عید، روزہ، حج، زکوٰۃ، مذہبی تبلیغ، مساجد، مقابر، قربانی، مذہبی جلوس، مذہبی جلسے وغیرہ جملہ مذہبی رسوم اور مذہبی ادارے محفوظ ہوں گے اور اسی طرح اُن کی تہذیب و تمدن، اُن کے تعلیمی ادارے، خانقاہیں، امام باڑے، عیدگاہیں، تکیے، کربلائیں، آثار قدیمہ، اوقاف وغیرہ سب محفوظ ہوں گے اور اسی طرح اُن کی زبان، شاعری، رسم الخط وغیرہ سب کے سب آزاد اور محفوظ ہوں گے۔ کسی پر کوئی رکاوٹ اور قید نہ ہوگی۔

مسلمانوں کو ہرگز دھوکا دینے والے خود غرض اور خود غرضوں کے آلہ کار لوگوں کے دام فریب میں نہ آنا چاہیے اور پورے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ کانگریس میں داخل ہو کر جنگ آزادی میں جدو جہد کرنا چاہیے۔

(شائع کردہ یوپی کانگریس الیکشن بورڈ نیشنل ہیرالڈ پریس۔ لکھنؤ ۱۰ ازفروری ۱۹۴۳ء)

ہم جو دستاویزیں پیش کرنا چاہتے تھے، پیش کر چکے ہیں۔ اس کے بعد جمعیت علمائے ہند اور قوم پرور مسلمانوں کا بدترین مخالف بھی انصاف کے ساتھ غور کر سکتا ہے کہ آزادی کے محاذ پر اتفاق و اتحاد کا رخ مسلمانوں کے خلاف نہیں بلکہ انگریزی شہنشاہیت اور انگریزی

غلامی کے خلاف ہے اور یہ اتحاد حصول آزادی تک لازماً باقی رہے گا۔

(مدینہ۔ بجنور: مورخہ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۴۶ء)

مسٹر محمد علی جناح کا بیان اور اس کا جواب:

شملہ، ۱۹ اگست (۱۹۳۷ء) مسٹر محمد علی جناح نے مولانا حسین احمد مدنی کی ایک تقریر کے سلسلے میں جو آخرالذکر نے ۱۵ اگست کو غازی آباد میں کی تھی، ایک بیان میں کہا:

"مولانا حسین احمد کے متعلق میں نے سنا ہے کہ انھوں نے اپنی اس تقریر میں کہا کہ عام انتخابات کے موقعے پر ہم نے مسلم لیگ کی اس لیے مخالفت نہ کی تھی کہ اس وقت ہمیں مسٹر جناح نے یقین دلایا تھا کہ مسلم لیگ کی پالیسی اب بدل گئی ہے اور مسلم لیگ اب آزادیٔ کامل کی حامل ہے، لیکن انتخابات ختم ہونے کے بعد جب مسٹر جناح نے ہی یہ کہا کہ وہ گفتگو محض ایک سیاسی چال تھی، تو ہماری آنکھیں کھل گئیں۔"

مسٹر جناح نے اپنے بیان میں کہا:

"مولانا حسین احمد کا یہ بیان سرتاپا غلط ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جمعیت علماے ہند کے بعض ارکان کیوں مسلم لیگ کے ساتھ مل گئے تھے اور لیگ کے امیدواروں کی انھوں نے کیوں تائید اور حمایت کی تھی اور پھر فوراً ہی وہ کیوں الگ ہو گئے؟ میرے لیے یہ ایک پراسرار معمہ ہے، جسے میں حل نہیں کر سکا۔"

اس کے جواب میں مولانا حسین احمد مدنی کہتے ہیں:

"مذکورہ بالا بیان دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے لیے یہ تمام بیان ایک مایوس کن، چیستان ہو کر رہ گیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ مسٹر جناح اور ان کے مراسلہ نگاروں کی قوتِ حافظہ بالکل بے کار ہو کر رہ گئی ہے اور شدتِ ماؤفیت کی بنا پر وہ صحیح حالات کے انکشاف کے خوف سے بھٹکتے جاتے ہیں یا جان بوجھ کر یہ سب اس یوربین ناپاک پروپیگنڈے کے تحت عمل میں لایا گیا ہے، جس کی مشق اہلِ لیگ الیکشن کے ختم ہونے کے بعد سے برابر کر رہے ہیں۔ واقعات ذیل ملاحظہ ہوں:

(ل) ۱۴، ۱۵، ۱۶ راگست کو میں دیوبند ہی میں مقیم رہا، کہیں باہر نہیں گیا۔ پھر غازی آباد میں میری تقریر ۱۵ راگست کو کس طرح ہوئی؟

(ب) کئی سال سے غازی آباد میں مجھے کسی سیاسی یا مذہبی تقریر کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور وہاں کے متعدد حضرات کے تقاضوں کے باوجود آج تک مجھ کو وہاں تقریر کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ پھر اس افترا کے کیا معنی ہیں؟

(ج) بے شک ۱۲ راگست کو یہ نااہل ضلع میرٹھ سے واپسی پر میں غازی آباد ہوتا ہوا، دیوبند آیا تھا۔ مگر وہاں اس وقت اتنا موقع ہی نہ تھا کہ کوئی تقریر کی جاتی۔

(د) غازی آباد کے علاوہ مختلف مقامات پر مجھ سے پوچھا گیا کہ تو کیوں لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں الیکشن کے زمانے میں شریک ہوا اور کیوں آج علاحدہ ہے؟ تو میں نے یہ جواب ضرور دیا کہ ہمیں مسٹر جناح نے یقین دلایا تھا کہ ہم رجعت پسند اور خود غرض لوگوں سے تنگ آگئے ہیں۔ بنابریں ہم چاہتے ہیں کہ آہستہ آہستہ ایسے عناصر کو لیگ سے خارج کردیں اور آزاد خیال، ترقی پسند قومی اور مخلص لوگوں کی بھرتی کثرت سے کرکے ان کی آواز کو قوی کردیں۔ (یہ الفاظ یا ان کے ہم معنی جواب میں ہمیشہ کہے گئے۔)

(ہ) میں نے کبھی اور کسی مجلس میں وہ جواب نہیں دیا جو کہ مسٹر جناح کو ان کے مراسلہ نگاروں نے پہنچایا ہے کہ مسلم لیگ کی پالیسی اب بدل گئی ہے اور مسلم لیگ اب آزادیٔ کامل کی حامی ہے۔ مجھ کو بہ خوبی معلوم ہے کہ مکمل آزادی کا نصب العین باہزار دقت اگست ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کے اجلاس میں پاس ہوا تھا۔ اگرچہ عرصے سے بہت سے غیور اور انتہا پسند مسلمان اس کے لیے کوشاں تھے، مگر کامیاب نہ ہوئے تھے۔ اس وقت سے پہلے تو لیگ کا فل رسپانس بل گورنمنٹ ہی تھا، جو کہ صرف داخلی آزادی تک ہی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

بے شک مسٹر محمد علی جناح نے نہایت زوردار الفاظ اور طریقوں سے ہم کو اطمینان دلایا کہ رجعت پسند طبقہ اور خود غرض لوگوں کو ہم آہستہ آہستہ لیگ سے نکالیں گے اور آزاد خیال قوم پرست مخلص لوگوں کی اکثریت کی کوشش کریں گے اور ایسے ہی لوگوں کے انتخاب کو عمل میں لائیں گے۔

ہم نے بعد بحث و مباحثہ اس پر اطمینان کیا اور تعاون پر آمادہ ہوگئے، جس کی زوردار

خواہش مسٹر محمد علی اور ان کے رفقائے کار کی اس وقت تھی۔ مگر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ الیکشن ختم ہو جانے کے بعد ہی جب کہ لکھنؤ میں بورڈ کی پہلی میٹنگ ہوئی تو مسٹر محمد علی جناح نے اپنے تمام وعدوں کو بھلا دیا اور انتہائی جد و جہد فرمائی کہ ایگریکلچرسٹ پارٹی اور انڈیپنڈنٹ پارٹی کو لیگ میں شامل کرلیا جائے۔ حال آں کہ ایام الیکشن میں ان پارٹیوں کے ساتھ سخت مقابلے کرنے کی نوبت آچکی تھی۔

دوران بحث جب کہ مولانا محمد میاں صاحب فاروقی الہ آبادی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی نے مسٹر جناح کو وعدہ ہائے سابقہ یاد دلائے تو جواب میں فرمایا کہ وہ سیاسی وعدے تھے۔

مسٹر جناح فرماتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء میں جمعیت علما کے بعض ارکان کیوں مسلم لیگ کے ساتھ مل گئے اور لیگ کے امیدواروں کی کیوں انھوں نے تائید و حمایت کی تھی اور پھر فوراً ہی وہ کیوں لیگ سے الگ ہو گئے؟ میرے لیے خود یہ ایک پر اسرار معمہ ہے، جسے میں حل نہیں کر سکا۔ انتہائی تعجب خیز اور حیران کن ہے۔

کیا مسٹر جناح اور ان کے رفقائے کار مندرجۂ ذیل اُمور کا انکار کر سکتے ہیں؟

(۱) کیا یہ واقعہ نہیں کہ خود مسٹر جناح، مولانا شوکت علی، چودھری عبدالمتین، چودھری خلیق الزماں، نواب اسماعیل خاں وغیرہ حضرات مارچ ۱۹۳۶ء سے آیندہ الیکشن کے لیے بورڈ وغیرہ بنانے میں بے قرار نظر آتے تھے۔ جلسے اور اجتماعات اس کے لیے کیے جاتے تھے اور ان میں غور کیا جاتا تھا کہ کس طرح اس میں حسب منشا کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے اور جس طرح یونیٹی بورڈ میں کوشش کر کے جمعیت علما کو داخل کیا گیا تھا ان کی مختلف جماعتوں میں صلح کرائی گئی تھی، اسی طرح آیندہ بورڈ کے لیے ان کی امداد و اعانت حاصل کرنے کی مساعی کی جاتی تھیں، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلم عوام پر جمعیت کے ارکان کا اثر تھا۔

(۲) کیا یہ واقعہ نہیں کہ مسٹر جناح نے اراکین یونیٹی بورڈ کو مشورہ دیا کہ وہ زیر قیادت مسلم لیگ مشترک بورڈ بنائیں، جو کہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی، جمعیت علما، خلافت کمیٹی، مجلس احرار وغیرہ سب پر حاوی ہو؟ اس کے لیے خصوصی جلسے کیے گئے اور اراکین جمعیت کو بار بار بلایا گیا اور تبادلۂ خیالات اور بحث و مباحثہ کی نوبت آئی اور انتہا پسند جماعتوں اور اشخاص کو

متحد العمل بنانے اور لیگ میں شامل کرنے کی سعی بلیغ کی گئی۔

(۳) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دو یا تین اجتماع کے بعد قرار پایا کہ حسین احمد کو بلایا جائے اور اس کو اس مفاہمت میں شریک کیا جائے؟ اور باوجود کہ بعض رجعت پسندوں نے یہ کہا کہ سب کے ساتھ اشتراک عمل کر سکتے ہیں، مگر حسین احمد کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کر سکتے، تاہم مجھ کو تار دے کر ملتان سے (جب کہ میں وہاں بعض جلسوں میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا) بلایا گیا۔

(۴) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ملتان سے میرے دہلی پہنچنے پر اراکین جمعیت کا اجتماع مسٹر جناح کے کمرے میں جب کہ وہ نئی دہلی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، کرایا گیا؟ جس میں حسب ذیل لوگ شریک تھے۔

مولانا کفایت اللہ صدر جمعیت علما، مولانا احمد سعید ناظم جمعیت علما، مولانا سجاد احمد نایب امیر شریعت بہار، مولانا عبدالحلیم صدیقی اور راقم الحروف۔

(۵) کیا یہ واقعہ نہیں کہ صبح کو تقریباً آٹھ بجے سے دس بجے تک تبادلۂ خیالات اور گفت وشنید ہوتی رہی اور مسٹر جناح نے زور دیا کہ پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو کر آپ لوگوں کو الیکشن میں حصہ لینا اور عمدہ سے عمدہ آزاد خیال لوگوں کو امیدوار اور کامیاب بنانا چاہیے؟ آپ لوگ اس وقت جب کہ آرڈیننس ایکٹ موجود ہے؟ دوسری کوئی صورت ملکی خدمات کی بہ جز اس کے نہیں کہ آزاد خیال قومی لوگوں کو الیکشن میں کامیاب بنائیں اور ان کو اسمبلیوں کے لیے منتخب کریں۔ اس پر کافی دیر تک بحث ہوتی رہی۔

(۶) کیا یہ واقعہ نہیں کہ اراکین جمعیت نے جب یہ عذر کیا کہ ہمارا نصب العین کامل آزادی ہے اور لیگ کے اراکین میں بہت سے رجعت پسند اور خود غرض لوگ ہیں، وہ برطانیہ کے ازلی وفادار اور صرف ڈومینین اسٹیٹس تک چلنے والے ہیں۔ ہمارا ان کا اجتماع کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اس پر مسٹر جناح نے پرزور طریقے سے فرمایا کہ مولانا! ہر شخص کامل آزادی ہی کا عقیدہ رکھتا ہے، مگر مصلحت وقت کی بنا پر زبان پر نہیں لاتا۔ کامل آزادی دینے سے نہیں حاصل ہوتی، وہ صرف دھکیل دینے سے ہی حاصل ہوگی۔ ہم بورڈ میں اکثریت قومی آزاد خیال مسلمانوں کی رکھیں گے۔

(۷) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسٹر جناح نے اسی مجلس اور اس سے پہلے کی مجالس میں نہایت زوردار الفاظ میں وعدہ کیا تھا کہ ہم مرکزی بورڈ اور صوبہ جاتی بورڈوں میں صرف آزاد خیال قومی لوگوں کی اکثریت رکھیں گے؟ ہم خود اس رجعت پسند طبقے سے تنگ آ گئے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ آہستہ آہستہ ان میں سے ایک ایک کو لیگ سے خارج کر دیں۔

(۸) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ خود مسٹر جناح نے مرکزی بورڈ کے چھپن ممبروں میں سے بیس ممبر صرف جمعیت علما اور دو احرار کے چنے تھے؟ جن میں صدر جمعیت علما، ناظم صاحب اور میں بھی تھا۔

(۹) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مرکزی بورڈ کی ان آسامیوں میں ان اراکین جمعیت اور احرار کا نام خود چن کر جب کہ وہ کشمیر میں تھے شایع کرایا؟ اور پھر لاہور کے اجلاس میں دعوتی خطوط بھیج کر سب کو بلوایا۔

(۱۰) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میری اور صدر و ناظم جمعیت علما کے یہ نام چن لیے گئے تھے؟ اور پھر میرا نام بلا میری خواہش صوبۂ یوپی کی مجالس میں بھی چن لیا گیا اور باوجود ہر قسم کی مشکلات اور اعذار کے مجھ پر کام کرنے اور ہر امیدوار کے حلقے میں جانے کا حکم دیا گیا، جس کو میں نے بغیر کسی قسم کے لالچ و نفع مالی کے انجام دیا۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ ماہ کی تنخواہ دارالعلوم سے چھوڑ کر کام کرنا پڑا۔ اور مدرسہ سے بلا معاوضہ رخصت لینا پڑی۔

محترم صدر مسلم لیگ مسٹر جناح سے ابتدائی جو گفتگو ہوئی اس کو سن کر معمولی تعلیم کا آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اراکین جمعیت بلا اطمینان حاصل کیے کیسے امیدوارانِ مسلم لیگ کی تائید کے واسطے تیار ہو گئے تھے۔

صورت واقعہ یوں پیش آئی کہ ۲۹ر مارچ ۱۹۳۶ء کو جب کہ جمعیت علما صوبۂ دہلی کا اجلاس ہو رہا تھا، انھی تاریخوں میں یونیٹی بورڈ کا اجلاس قیام گاہ سید مرتضیٰ بہادر ایم ایل اے آف مدراس شروع ہوا۔ سب سے پہلے اس مسئلے پر غور کیا گیا کہ چوں کہ ہندوستان کے ہر صوبے میں ایکٹ ۱۹۳۵ء کے مطابق الیکشن ہوں گے، لہٰذا مسلم یونیٹی بورڈ کی شاخیں صوبہ وار اور ضلع وار کس طرح قایم کی جائیں تا کہ ہر جگہ سے امیدوار کھڑے کیے جا سکیں۔ چوں کہ مسلم یونیٹی بورڈ کی ترکیب مختلف جماعتوں کے نمایندوں سے ہوئی ہے، لہٰذا جس ضلعے اور

صوبے میں وہ جماعت قایم نہیں ہے وہاں کس طرح مسلم یونٹی بورڈ قایم کیا جائے؟ بہت دیر تک بحث کے بعد اس پر غور شروع ہوا کہ اس مقصد کے واسطے کوئی دوسری جماعت بنائی جائے۔ چودھری عبدالمتین (جو کہ مسٹر جناح پارٹی کے بہ منزلہ سیکرٹری تھے) نے فرمایا کہ کسی دوسری جماعت کی ضرورت نہیں۔ مسٹر جناح مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا چاہتے ہیں، آپ بھی اس میں شریک ہوجائیں۔ اس پر نواب اسماعیل خاں صاحب، چودھری خلیق الزماں صاحب نے فرمایا کہ مسٹر جناح کا ماحول ایسا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ چودھری عبدالمتین صاحب نے فرمایا کہ جناح صاحب فرماتے ہیں کہ میں آزاد خیال امید وار لانا چاہتا ہوں۔ اس پر کہا گیا کہ یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے اور وہ اس جماعت کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کی تائید مولانا شوکت علی نے بھی کی۔ اس پر بہت دیر تک بحث رہی۔ آخر یہ طے پایا کہ ایک وفد اسی وقت منتخب ہوجائے، جو خود جناح صاحب سے اس کی گفتگو کرے۔ چناں چہ نواب اسماعیل، مولانا شوکت علی، چودھری خلیق الزماں، سید محمد احمد کاظمی اور چودھری عبدالمتین منتخب ہوئے۔ ان حضرات نے گفتگو کی اور واپس ہوکر یہ فرمایا کہ جناح صاحب پوری جماعت کے سامنے گفتگو کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا اس غرض کے واسطے کل گیارہ بجے مولانا شوکت علی کی قیام گاہ پر جلسہ ہوگا اور اس میں جناح صاحب بھی شریک ہوں گے۔ چناں چہ دوسرے روز وقت مقررہ پر جلسہ ہوا۔ اس وقت جس قدر حضرات شریک تھے، ان میں سے جو نام مجھ کو یاد ہیں، وہ تحریر کرتا ہوں:

مولانا شوکت علی، جناح صاحب، چودھری عبدالمتین، نواب اسماعیل خاں، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبدالحامد، سید طفیل احمد منگلوری، سید محمد احمد کاظمی، مولانا منظور النبی، بشیر احمد، سید ذاکر علی، چودھری خلیق الزماں۔ ان سب کی موجودگی میں گفتگو شروع ہوئی کہ آزاد خیال حضرات کا پارلیمنٹری بورڈ کس طرح بنایا جاسکتا ہے؟ اس دوران اولاً جناح صاحب نے ایک مفصل تقریر بھی فرمائی اور بڑی شدت سے ظاہر کیا کہ میں رجعت پسندوں سے تنگ آگیا ہوں اور میں ان کو بالکل علاحدہ کردینا چاہتا ہوں۔ حتیٰ کہ خود جناح صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ یہ اس قسم کے رجعت پسند ہیں کہ میری پارٹی میں ہونے کے باوجود اسمبلی میں گورنمنٹ کی رائے دیتے ہیں۔ تب ان

سے کہا کہ جب مسلم لیگ میں اکثریت رجعت پسندوں کی ہے پھر کس طرح آزاد خیال بورڈ منتخب ہو سکتا ہے؟ اس پر چودھری عبدالمتین نے ممبران کونسل مسلم لیگ کی فہرست پیش کی اور اس پر غور کیا کہ آزاد خیال آدمی کس قدر ہیں اور رجعت پسند کس قدر؟ بہت سے نام گنائے گئے۔ تین نام مجھ کو یاد ہیں، جن کو ظاہر کر کے بحث کی گئی۔ سر محمد یعقوب، سر محمد یامین خاں، مولوی مظہرالدین۔ خصوصیت سے جناح صاحب نے سر محمد یعقوب کو علاحدہ کرنے کو کہا۔ بہ ہر حال یہ گفتگو ہوتی رہی کہ کیا طریقہ آزاد خیال بورڈ بنانے کا اختیار کیا جائے؟ تب یہ ظاہر کیا گیا کہ اول تو رجعت پسندوں کی جماعت وہاں زیادہ جائے گی نہیں اور پھر یہ کہ آزاد خیال آدمیوں کے جانے کی پوری سعی کی جائے۔ تب یہ بتلایا گیا کہ اکثر آزاد خیال آدمی مسلم لیگ کونسل کے ممبر ایسے ہیں جو بمبئی جانے کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی تعداد اور مصارف کا اندازہ کیا گیا۔ اس پر جناح صاحب نے وعدہ فرمایا کہ ایسے حضرات کے واسطے میں بمبئی جا کر ایک ہزار روپیہ بھیجوں گا۔ اس کے بعد خواہش تو سب بڑے آدمیوں کی تھی مگر تکلفاً کہنا پسند نہیں کرتے تھے کہ جناح صاحب سے وعدہ لیا جائے۔ چناں چہ میں اور مولوی عنایت اللہ قریب بیٹھے تھے۔ ان کے اشارے پر میں نے عرض کیا کہ اور حضرات تو نہیں کہنا چاہتے، میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہی پارٹی (رجعت پسند) بمبئی زیادہ پہنچ گئے تب آپ کیا کریں گے؟ تو آپ نے یہ فرمایا کہ اس وقت آپ یہ کوشش کیجیے کہ پارلیمنٹری بورڈ بنانے میں مجھ کو تنہا اختیار دے دیے جائیں۔ چوں کہ دوسری پارٹی بھی مجھ سے مطمئن ہے، وہ اس سے اختلاف نہیں کریں گے۔ تب میں نے مکرر ان سے کہا کہ یہ احتمال بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کو ہمارے ان جلسوں کی خبر ہو جائے اور وہ آپ پر اعتماد نہ کریں۔ لہٰذا ہم کو یہ بتلا دیا جائے کہ اگر ہم یا آپ کسی طرح کامیاب نہ ہو سکے کہ پارلیمنٹری بورڈ میں آزاد خیال منتخب ہوں، پھر آپ کی کیا پوزیشن ہوگی؟ اس پر (جناح صاحب نے) بڑے جوش کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ میں اگر کسی طرح بھی اس پر قادر نہ ہوا تو مسلم لیگ چھوڑ کر آپ کے ساتھ آ جاؤں گا۔ اس پر بے انتہا خوشی کا اظہار کیا گیا اور سب حضرات نے فرمایا کہ ہم یہی چاہتے تھے اور پوری مسرت کے ساتھ جلسہ ختم ہو گیا۔"

(سہ روزہ مدینہ۔ بجنور: ۵/ مارچ ۱۹۴۴ء)

جمعیت علمائے ہند کی تجویز:

جنوری ۱۹۳۸ء: جیسے ہی یہ افواہ ملک میں پھیلی کہ کانگریس فرقہ وارانہ مسایل پر مسٹر جناح سے گفتگو کرنے کا ارادہ کر رہی ہے، مولانا احمد سعید ناظم جمعیت علمائے ہند نے پریس کے ذریعے حسب ذیل تجویز پیش کی:

> ''یہ افواہ عام گشت کر رہی ہے کہ کانگریس بمبئی فیصلے کے مطابق مسٹر محمد علی جناح سے بات چیت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔
>
> اس موقع پر میری تجویز ہے کہ کانگریس سے بات چیت کرنے سے پیشتر تمام مسلم جماعتوں کا ایک کنونشن بلالیا جائے۔ کیوں کہ اس سے پیشتر مسلمانوں کا باہم اتحاد بڑا ضروری ہے اور یہ کنونشن بہتر نتایج پیدا کر سکتا ہے۔''

(ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' -دہلی: ۶/جنوری ۱۹۳۸ء)

مسٹر جناح کا انکار:

مولانا احمد سعید کی مندرجۂ بالا تجویز کی تائید میں بہار جمعیت کے سیکرٹری جنرل نے مسٹر محمد علی جناح کو حسب ذیل تار دیا:

> ''کانگریس سے فرقہ وارانہ مسایل پر گفتگو کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ آپ مولانا احمد سعید کی تجویز کے مطابق مسلمانانِ ہند کی تمام جماعتوں کا ایک کنونشن طلب کریں، تاکہ باہم مل کر بات طے ہو سکے اور انھی شرایط کے تحت کانگریس سے گفتگو کی جائے۔''

اس تار کے جواب میں مسٹر جناح نے کہا:

> ''کانگریس کے ساتھ گفتگوے صلح کے آغاز سے پیشتر شرایط طے کرنے کے لیے ایک آل مسلم کانفرنس منعقد کرنا مولانا احمد سعید کی تجویز قبل از وقت اور غیر معقول ہے۔ میں اس تجویز کے سخت خلاف ہوں۔''

مسٹر جناح بہ نام جواہر لال:

بمبئی سے مسٹر محمد علی جناح نے ۱۰/جنوری کو ایسوسی ایٹیڈ پریس کی وساطت سے ایک

بیان شایع کرایا، جس میں انھوں نے جواہر لال کے بیان کا جواب دیا:

''ہم آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں اس تجویز پر غور کریں گے جو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی طرف سے رسمی طور پر منظور کی گئی ہے۔ گو پنڈت نہرو کے بیان کا حقیقی مطلب نہایت واضح ہے اور میں اسے خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس بیان کے بعض حصوں کا ظاہر مطلب مصلحت آمیز معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گذشتہ چند مہینوں کے واقعات نے کانگریس رہنماؤں پر واضح کر دیا ہے کہ مسلم لیگ کی حیثیت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔''

(روزنامہ انقلاب - لاہور، ۱۳ر جنوری ۱۹۳۸ء)

یومِ نجات پر مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان:

قاید اعظم کے یوم نجات کے اعلان پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۳ر دسمبر کو کلکتہ سے ایک بیان کے دوران کہا:

''گزشتہ دو سال سے میں نے بار بار کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات دور ہو جائیں۔ اس کوشش میں میں نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ میرا پورا یقین ہے کہ آزادی حاصل کرنے کی تمام کوششیں ثابت قدمی اور پوری دیانت داری اور نیک نیتی سے کرنی چاہییں۔ مگر مجھے یہ کہنے میں دکھ ہوتا ہے کہ جب بھی کانگریس نے گفت وشنید کے دروازہ کو کھولا اچانک ہی مخالف سمت سے ایسا ہاتھ نمودار ہو گیا جس نے اسے نہایت اہم مرحلے پر بند کرنے کی کوشش کی۔ یہ ہاتھ مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ مسٹر محمد علی جناح کے سوا اور کوئی نہیں۔

مسٹر جناح کے بیان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ اس میں، ایک ایسی تجویز ہے جو کوئی خود دار مسلمان جسے ذرا بھی اپنی سیاسی ہستی پر احساس ہے اپنے ہم مذہبوں کے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔

آٹھ صوبوں میں کانگریس وزارتیں پوری ذمے داری اور اسمبلیوں کے مکمل

اعتماد سے کام کر رہی تھیں۔

وائسرائے اور گورنروں حتی کہ مسلم لیگ کے ممبروں کو بھی ان کے مستعفی ہونے پر افسوس ہوا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے فرض کا احساس کرتے ہوئے بلا ہچکچاہٹ استعفے دے دیے اور اب جب کہ کانگریس نے اپنی آزادانہ مرضی سے آٹھ صوبوں میں وزارتیں ترک کردی ہیں۔ مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ نے مسلمانانِ ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ مسجدوں میں جائیں اور خدا کا شکر کریں کہ اس نے مسلمانوں کو ان کانگریس وزارتوں سے نجات دلادی ہے، جنھوں نے حکومت کے مقابلے میں اپنے فرائض کو ترجیح دی اور نہ صرف آزادیٔ وطن کے سوال پر مستعفی ہوئیں بلکہ مشرق کی تمام پس ماندہ اور روندی ہوئی اقوام کے لیے بھی۔ میرے لیے تو یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ ایسے نازک مرحلے پر مسلمانوں کی کوئی بھی پارٹی جو کانگریس کے کسی قدر ہی خلاف کیوں نہ ہو، اسی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کرنا گوارا کرے گی۔ مسلمان اپنے حقوق اور مفاد کی حفاظت کے لیے جو بھی جدوجہد کرنا مناسب سمجھیں اس کے لیے انھیں حق حاصل ہے مگر یہ ایک اندرونی جھگڑا ہے، انھیں کسی حالت میں بھی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جسے آزادیٔ وطن کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر جناح کا موجودہ رویہ انھیں اس افسوس ناک پوزیشن کی طرف لے جارہا ہے۔

کانگریس وزارتوں کے مظالم:

آگے جا کر مولانا آزاد نے کانگریس وزارتوں کے خلاف مظالم کے الزامات کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے کہا کہ ''اگر فی الحال یہ تسلیم کرلیں کہ مسٹر جناح نے کانگریس وزارتوں کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ درست ہے تو ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ آٹھوں صوبوں کی گورنمنٹیں انٹی مسلم تھیں اور وہ مسلمانوں کے مذہبی اور سوشل معاملات میں مداخلت کرتی رہی ہیں۔ انھوں نے ان کے تمدن کو تباہ کرنے کی کوشش کی اور یہ سب کچھ صرف چند دن میں ہی نہیں ہوا بلکہ اڑھائی سال تک۔ آخر

ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں نے ان ناممکن واقعات کے خلاف کیا کارروائی کی؟ یہی کہ وہ کانگریس وزارتوں کے ازخود استعفوں کا تیس ماہ تک انتظار کرتے رہے اور جب ان کا یہ خواب ثابت ہوگیا تو خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے لگے اور اسرائیل کی اولاد کی طرح دنیا پر واضح کرنے لگے کہ آخر کار ان کا یومِ نجات آہی گیا۔ مسٹر جناح ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ عجیب ہی نظریہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی اس رذیل نظریے کو برداشت کروں۔"

آخر میں مولانا موصوف نے کہا کہ "میں نے پہلے بھی کئی بار اعلان کیا ہے اور اب بھی اپنی پوری ذمے داری محسوس کرتا ہوں کہ کانگریس وزارتوں کے خلاف یہ تمام الزامات سراسر بے بنیاد ہیں۔ یہ دروغ گوئیوں کا ایک سرچشمہ ہیں اور یہ کہنا غلط بیانی ہے کہ کانگریس وزارتیں قطعی طور پر اینٹی مسلم تھیں اور وہ مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حقوق کو کچل رہی ہیں۔

مسٹر جناح یا کسی دوسرے شخص کے لیے جو یہ الزامات پیش کرے، فرض ہے کہ وہ دنیا کے کسی ایک عام طریقے کے مطابق انھیں ثابت کرے اور اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو ہر ایک ہوش مند انسان ان سے کم از کم اس قدر ضرور توقع کرے گا کہ وہ اپنی تقریر و تحریر میں ضبط سے کام لے گا۔ (سہ روزہ زمزم-لاہور: ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۹ء)

۱۵ر دسمبر ۱۹۳۹ء: مولانا احمد سعید ناظم جمعیت علمائے ہند نے قاید اعظم کی اس اپیل پر حسب ذیل تبصرہ کیا:

"ٹھیک ایسے وقت میں جب کہ ملک، مسٹر جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو کی گفت و شنید کا منتظر تھا اور ہندوستان کا ہر بہی خواہ اس امر کا خواہش مند تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی ایسا سمجھوتا ہو جائے، جس سے ملک کی دو بڑی قوتیں باہمی اطمینان اور اعتبار کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں اور اپنے ملک کو آزاد کرانے اور سامراجی طاقتوں سے نجات دلانے کے لیے مل جل کر کوشش کریں، مسٹر جناح نے ایک ایسا بے موقع اور بے معنی بیان دیا ہے جس سے ملک کے ترقی پسند طبقے میں مایوسی پیدا ہوگئی ہے۔ اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کا بہترین آدمی کسی کی دشمنی یا دوستی میں اپنا دماغی توازن کھو

بیٹھے اور اتنا بے قابو ہو جائے کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہے کہ کل اس نے کیا کہا تھا۔

مسٹر جناح ان صوبوں کے مسلمانوں سے ۲۲ر دسمبر کو "یومِ نجات" منانے کی خواہش کرتے ہیں، جن صوبوں سے کانگریسی وزارتوں نے بہ طور احتجاج استعفے دے دیے ہیں اور جہاں آج انیسویں صدی کی طرح گورنروں کی حکومت ہو رہی ہے۔ جہاں تک کانگریسی حکومتوں کا تعلق ہے میں ان کی جانب سے کوئی صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ دوسری حکومتوں کی طرح کانگریسی حکومتوں نے بھی غلطیاں کیں۔ کیا جن صوبوں میں کانگریسی حکومتیں نہیں ہیں، کیا ان صوبوں کے باشندے مطمئن ہیں؟ پنجاب میں تو کانگریسی حکومت نہیں ہے، لیکن مجلس احرار اور اس کے معزز کارکنوں کے ساتھ جو رقیبانہ اور منتقمانہ سلوک ہو رہا ہے اس جیسی ایک مثال بھی کانگریسی حکومتوں میں نہیں مل سکتی۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ حکومت اور حکمرانی کے لیے جس فراخ حوصلگی اور وسعت قلب کی ضرورت ہے وہ بنیا پن کی پالیسی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کنوئیں سے نکل کر کھائی میں گر جانے کو نجات کہا جائے۔

کانگریسی حکومتوں کے جن مظالم کو مسٹر جناح بار بار دہراتے ہیں کیا ان کو معلوم نہیں کہ ان مظالم کی تمام ذمے داری ان گورنروں پر عاید ہوتی ہے جو مداخلت کا اختیار رکھنے کے باوجود خاموشی کے ساتھ تمام مظالم کا تماشہ دیکھتے رہے اور انھوں نے اپنے اختیارات کا استعمال نہیں کیا اور جب گورنر بھی کانگریسی حکومتوں کے ساتھ ظلم میں برابر کے شریک ہیں تو ایک ظالم کے اقتدار سے نکل کر دوسرے ظالم کی سرپرستی میں جانا، نہ معلوم کس قسم کی نجات ہے؟ مسٹر جناح جس پر "یومِ نجات" منانا چاہتے ہیں۔

اس موقع پر مسٹر جناح سے کچھ عرض کرنا بے سود ہے۔ البتہ میں نہایت ادب کے ساتھ مسلم لیگ کے ترقی پسند عناصر سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ جمعیت علمائے ہند پر اعتماد نہیں رکھتے، یا مجلس احرار جیسی فعال جماعت پر ان کو اعتماد نہیں ہے اور مسلمانوں کی ان جماعتوں سے اشتراک عمل میں اپنی توہین خیال کرتے ہیں تو کم از کم لیگ کے بنیادی اصولوں کا احترام قایم رکھیں اور اپنی خانہ ساز واحد نمایندہ جماعت کی قیادت موقع شناس لوگوں کے سپرد کریں، جن کا دماغی توازن صحیح ہو اور جو جنگ اور صلح کے دونوں موقعوں پر صحیح

رہنمائی کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ورنہ آزادخیال مسلمان یہ سمجھنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ مسلم لیگ ایک ایسی جماعت ہے جو ہندوستان کی آزادی کی دشمن اور مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی پر قانع رکھنا چاہتی ہے۔'' (سہ روزہ زمزم-لاہور، ۱۵؍دسمبر ۱۹۳۹ء)

قایداعظم کا جواب:

ان دونوں بیانات کے جواب میں مسلم لیگ کے لیڈر قایداعظم محمد علی جناح نے ۱۹؍دسمبر کے اخبارات میں حسب ذیل بیان دیا:

''میں غیر جانب دارانہ تحقیقات کا مخالف نہیں ہوں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ حکومت برطانیہ ایک غیر جانب دارانہ کمیشن قایم کرے، جس میں پریدی کونسل کے جج بھی شامل ہوں۔'' (کاروانِ احرار: ج ۴، ص ۳۵۳-۳۵۰)

تجاویز مصالحت:

اگست ۱۹۴۲ء: قوموں کی سیاسی کش مکش میں بعض موڑ آتے ہیں کہ بلاسود وزیاں کے بھی سوچنا پڑتا ہے کہ کمی بیشی پر کچھ سودا چکا لینا چاہیے، لیکن اس بیٹھک میں اگر ضد کارفرما ہو اور فریقین کسی نتیجے پر پہنچے بغیر محفل سے اٹھ آئیں تو عقل و خرد اپنی جگہ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔

متحدہ قومیت کے خلاف مسلم لیگ کا مطالبہ کہ مسلم اکثریت کے علاقے اپنے اندر خود مختار ہوں کسی حد تک علمائے ہند نے ۱۹۴۰ء کو اپنی لاہور قرارداد میں مان لیا تھا:

''جمعیت علمائے ہند ہندوستان میں صوبوں کی کامل خودمختاری اور آزادی کی زبردست حامی ہے۔ جمعیت علمائے ہند کے نزدیک ہندوستان کے صوبوں کا سیاسی وفاق ضروری اور مفید ہے۔''

کریس فارمولا میں بھی یہ بات درج تھی کہ

''برطانوی ہند کے ہر صوبے کو جو نئے دستور کو منظور کرنے پر راضی نہ ہو۔ اسے حق ہے کہ وہ اپنی موجودہ دستوری حیثیت کو قایم رکھے۔ مگر دستور میں اس کی

گنجایش رکھی جائے کہ اگر وہ چاہے تو بعد کو یونین میں شامل ہو جائے۔
ہز میجسٹی کی حکومت اس پر راضی ہوگی کہ ان اصولوں کے ساتھ جو یونین میں
شامل نہ ہو ایک نئے دستور کے مطابق معاملہ کر کے بہ شرطے کہ صوبے خود ایسا
چاہیں۔''

لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر چودھری خلیق الزماں نے بھی کرپس کی مندرجہ بالا تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا:

''ہم کو رائے شماری سے پنجاب اور بنگال میں کوئی خطرہ نہیں، کیوں کہ وہاں
ہماری اکثریت ہے۔''

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۶/اگست ۱۹۴۲ء کے اجلاس بمبئی میں ایک قرارداد کے ذریعے اعلان کیا کہ

''کانگریس کے نظریے کے مطابق یہ آئین جو نمایندہ اسمبلی مرتب کرے گی،
فیڈرل ہونا چاہیے۔ اس فیڈرل میں شریک ہونے والے یونٹوں کے لیے
زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہیے اور اختیارات انھیں یونٹوں کے ہاتھ میں
ہونے چاہییں۔''

مندرجہ بالا اعلانات کے بعد بہ ظاہر کانگریس اور جمعیت علمائے ہند، مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کے بہت قریب آ چکی تھی، کیوں کہ علاحدگی کے حق کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ سوائے لفظی بحث کے جو بعد میں ختم ہو سکتی تھی، باقی نظریاتی طور پر کوئی بات ایسی نہ تھی کہ اس پر لڑائی ختم نہ کر دی جاتی۔ (کاروانِ احرار: ج ۵، ص ۲۵-۲۲۴)

کیا لیگ اور جمعیت میں اتحاد ہو سکتا ہے؟

۱۹۴۳ء:...... دوسری چیز یہ ہے کہ مسلم لیگ کے سردار زبان سے چاہے کچھ کہیں لیکن عملاً ان کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ اصولاً اُسی یورپی نظریے کے قایل ہیں جس میں مذہب کو سیاست سے علاحدہ رکھا جاتا ہے۔ اس لیے لیگ مسلمانوں کی فرقہ وارانہ جماعت تو ضرور ہے، لیکن مذہبی جماعت ہرگز نہیں۔ لیگ کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بالکل

ایسی ہی ہے جیسے یورپ میں مختلف قومیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے تنظیم کرتی رہی ہیں، لیکن اپنا الہام (Inspiration) وہیں سے لیتی ہے، لیکن جمعیت علما کا حال اس کے برعکس ہے۔ وہ مذہب اور سیاست میں اتحاد وہم رنگی دیکھنا چاہتی ہے اور اپنا الہام صرف قرآن وحدیث اور اسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) واسوۂ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) سے لیتی ہے۔ جمعیت علما اور اسی قسم کی دوسری جماعتیں سنیں مسلمان جماعتیں (احرار وغیرہا) کی یہی وہ ادا ہے جس کی بنا پر خود کانگریسی ہندو بھی اس سے کھٹکتے ہیں اور انگریزی حکومت بھی بدکتی ہے۔ (سہ روزہ مدینہ۔ بجنور، یکم ستمبر ۱۹۴۳ء)

مسٹر جناح کی ناکامی کے بعد دعوتِ اتحاد:

مدینہ، ۲۵ رمئی ۱۹۴۴ء، جلد ۳۳ ایڈیٹوریل کالم

وزارت پنجاب کے مقابلے میں شکست کھا جانے کے بعد صدر مسلم لیگ مسٹر محمد علی جناح نے سیال کوٹ میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ''میں احرار، جمعیت علمائے، شیعوں، سنیوں، جاٹوں، راجپوتوں، افغانوں، مومنوں اور دوسرے تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ خدا کے لیے چھوٹے موٹے اختلافات کو ختم کر دیجیے او. مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر اور مسلمانوں کے ایک جھنڈے تلے آ جایے۔ ہم سب کو مل کر بیٹھنا اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اگر ہم غلطی پر ہوں تو ہمیں مشورہ دیجیے اور ہماری رہنمائی فرمایے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ضرور کسی ایک نتیجے پر پہنچ جائیں گے جو قطعی طور پر مسلمانوں کے لیے مفید اور فایدہ مند ہوگا۔ میں انھیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنی سیاسی زندگی کے نہایت نازک مرحلے سے گزر رہے ہیں۔''

صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے مسٹر جناح کی یہ پہلی تقریر ہے جس میں مسلمانوں کو متحد ومتفق ہونے اور اپنے اختلافات کو باہمی رضامندی سے دور کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس لیے اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

دورِ جدید:

مسلم لیگ کا دور جدید ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے، جب کہ مسٹر جناح کو ۳۵ ممبروں پر مشتمل ایک پارلیمنٹری بورڈ بنانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ مسٹر جناح نے اسی زمانے میں مختلف صوبوں کا دورہ کر کے جگہ جگہ لیگ کی شاخیں قایم کیں اور لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ نے ایک طویل مینی فسٹو شایع کیا جس میں اپنا نصب العین حسب ذیل قرار دیا:

(۱) مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت۔

(۲) تشدد آمیز قوانین کی تنسیخ۔

(۳) ان تمام قوانین کی مخالفت جو ہندوستان کے مفاد کے لیے مضر ہوں، جو افراد کے حقوق پر اثر انداز ہوں یا ملک میں اقتصادی تصرفات کا دروازہ کھول دیں۔

(۴) ملک کے نظم و نسق کے خرچ کو کم کر کے آمدنی کا بڑا حصہ ملک کے تعمیری اداروں پر خرچ کرنا۔

(۵) ہندوستان کا فوجی خرچ گھٹانا اور فوج کو ہندوستانی بنانا۔

(۶) ملکی صنعتوں کو فروغ دینا۔

(۷) کرنسی، مبادلہ اور قیمتوں کو ملک کے اقتصادی فایدے کے لیے منظم کرنا۔

(۸) وطنی قرضوں میں تخفیف کے لیے قواعد بنانا۔

(۹) ابتدائی تعلیم کو عام اور لازمی بنانا۔

(۱۰) اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کرنا۔

(۱۱) دیہاتی آبادی کی اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی فلاح کی کوشش کرنا۔

(۱۲) مسلمانوں کی حالت کو مجموعی حیثیت سے بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کرنا۔

(۱۳) ہندوستانیوں پر سے محاصل کے بوجھ کو کم کرنا۔

(۱۴) ملک میں صحیح رائے عامہ اور سیاسی بیداری پیدا کرنا۔

(۱۵) موجودہ صوبائی آزادی اور مجوزہ وفاقی اسکیم کو بدل کر اس کی جگہ جمہوری طرز کی حکومت خود اختیاری قایم کرنا۔

(۱۶) جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو مسلم لیگ مختلف مجالس قانون ساز کے ذریعے وہ مفاد

حاصل کرنے کی کوشش کرے گی جو اہل ملک کی قومی زندگی اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے خود ضروری ہوں گے۔

مذکورہ بالا مقاصد جس جماعت یا ادارے کے ہوں اور اس کی طرف عوام کا متوجہ نہ ہونا کس طرح ممکن ہوتا؟ چناں چہ اس مینی فسٹو کے شایع ہوتے ہی ملک نے مسٹر جناح کو خوش آمدید کہا اور مسلمانوں کی فعال جماعتوں نے دست تعاون دراز کیا۔ چناں چہ گذشتہ صوبائی انتخابات میں جمعیت علما اور احرار کے قایدین وزعما نے لیگی امیدواروں کے حق میں پروپیگنڈا کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ سب ایک دوسرے سے متحد و متفق تھے۔ علاحدہ اگر تھا تو صرف وہ گروہ جو تحریک ترکِ موالات یا خلافت ایجی ٹیشن کے زمانے میں امن سبھا کے نام سے مشہور تھا، لیکن اس گروہ کا عوام پر کوئی اثر نہ تھا اور اس کی آواز خود اسی سے ٹکرا کر گم ہو جاتی تھی۔ مگر جب انتخابات کے نتایج شایع ہوئے تو پتا چلا کہ لیگ کے امیدواروں کو انھیں مقامات پر کامیابی ہوئی ہے جہاں علما اور احرار نے زور لگایا تھا۔ مگر یہ نشستیں باعتبار تعداد کم تھیں گویا بہ حیثیت مجموعی لیگ کو ناکامی ہوئی اور وہ اپنے پہلے ہی وار میں سرکاری گرگوں کا اثر واقتدار فنا نہ کرسکی۔

انقلاب:

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس ناکامی کا اثر مسٹر جناح پر یہ ہوا کہ انھوں نے اسلامی سیاسیات پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے امن سبھائی گروہ کا تعاون ضروری سمجھا، لیکن دنیا نے یہ ضرور دیکھا کہ لیگ کی ہیئت ترکیبی میں اور نظم و نسق میں جمہوریت کی جگہ نطائیت کو فروغ دے دیا گیا اور لیگ کے اغراض و مقاصد میں غیر معمولی تبدیلیاں کر دی گئیں۔ چناں چہ لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ کے مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کی جگہ حسب ذیل اغراض و مقاصد شایع کر دیے گئے:

(۱) مسلم لیگ ایک جداگانہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے قایم رہے گی۔ کانگریس میں ضم نہ ہوگی۔

(۲) کانگریس نے مسلم عوام کے ساتھ براہِ راست رابطہ پیدا کرنے کی جو تحریک جاری کی

ہے اسے ترک کردے۔

(۳) فرقہ وارانہ مسایل میں مسلم لیگ پوری طرح آزاد ہوگی۔

(۴) میونسپلٹی وغیرہ (لوکل بورڈ) کا انتخاب جداگانہ انتخاب کے اصول پر ہوگا۔ کانگریس مشترکہ انتخاب کو رائج کرنے کی جدوجہد ترک کردے۔

(۵) کانگریس موجودہ سہ رنگی جھنڈے کے ساتھ لیگ کے جھنڈے کو بھی قبول کرلے۔

(۶) کانگریس ''بندے ماترم'' کا ترانہ ترک کردے۔

(۷) کانگریس ہندی کی حمایت چھوڑ دے۔

(۸) ہندوستان کا طرزِ حکومت وفاقی ہو۔

(۹) کوئی ایسا مسودہ قانون منظور نہ ہو جس پر کسی فرقے کی تین چوتھائی اکثریت کو مذہبا کوئی اعتراض ہو۔

(۱۰) صوبے اور مرکزی حکومت میں مسلم نشستوں کی مخصوص تعداد ہو۔

(۱۱) پنجاب اور بنگال اور دوسرے مسلم اکثریت والے صوبوں کی نشستیں اس طرح محفوظ ہوں کہ مسلمانوں کی اکثریت کسی طرح بھی اقلیت میں تبدیل نہ ہو۔

(۱۲) مرکزی وصوبائی وزارتوں میں مسلمانوں کو ان کا جایز حق دیا جائے۔

(۱۳) صوبۂ سرحد اور صوبۂ بلوچستان کو دوسرے صوبوں کی مانند اصلاحات دی جائیں۔

(۱۴) صوبۂ سندھ کو صوبۂ بمبئی سے علاحدہ کردیا جائے۔

(۱۵) مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمایندگی دی جائے۔

(۱۶) دستور اساسی میں اس وقت تک کوئی ترمیم نہ ہو جب تک تمام وفاقی اجزا اس کی خواہش نہ کریں۔

(۱۷) مسلمانوں کی تعلیم، زبان، کلچر وغیرہ کا تحفظ۔

(۱۸) مسلمانوں کے پرسنل لا (قانون شریعت) کا تحفظ۔

مقابلہ:

سابقہ اغراض ومقاصد اور ان جدید اغراض ومقاصد کے مقابلے سے معلوم ہوگا کہ

لیگ نے جہاں مسلمانوں کے لیے جذباتی باتیں رکھ دی ہیں۔ مثلاً دفعات نمبر ۳، ۵، ۷، ۹، ۱۱، ۱۲، وہاں سابقہ مئی فسٹو کے وہ تمام اغراض و مقاصد بھی بالائے طاق رکھ دیے ہیں جو حکومت سے متعلق تھے اور جن کا ہندوستان کے عوام سے بہت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً متشددانہ قوانین کی منسوخی، مفاد عامہ کے لیے مضر قوانین کی مخالفت، ملک کی اقتصادی بہبودی کا خیال، نظم و نسق کے خرچ میں کمی کی تجویز، فوجی اخراجات میں کمی، کرنسی وغیرہ کو منظم کرنے کا نظریہ، وطنی قرضوں میں تخفیف، ابتدائی تعلیم کا لازمی قرار دینا، محاصل میں تخفیف، دیہاتی آبادی کی فارغ البالی وغیرہ وغیرہ۔ پھر حکومت کی نظر میں عزت حاصل کرنے اور حکومت پرستوں کو لیگ میں شریک کرنے کے لیے مجوزہ وفاقی اسکیم کو بدل کر اس کی جگہ جمہوری حکومت خود اختیاری پر قایم کرنے کا مقصد ترک کر دیا گیا۔ مزید برآں جداگانہ انتخاب اور مجالس آئین ساز میں مخصوص نشستوں وغیرہ کا تذکرہ کر کے سرمایہ داروں کو بھی دعوت شرکت دے دی گئی۔ الغرض لیگ کے بنیادی مقاصد میں ان اہم تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیگ سے تمام فعال جماعتیں علاحدہ ہو گئیں۔

مولانا مدنی کا بیان:

اسی سلسلے میں حضرت شیخ الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی (اسیر فرنگ) نے علاحدگی اختیار کرتے وقت ایک بیان شایع فرمایا جو ذیل میں درج ہے:

> ''ہم لوگ لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں اس لیے شریک ہوئے کہ مسٹر جناح نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ لیگ کا مقصد بھی ترقی پسند اور آزاد خیال ارکان کو اسمبلی میں بھیجنا ہے۔ سرکار پرست عنصر کو کم کرنا اور ان کی جگہ آزاد خیال، ترقی پسند ارکان کو لیگ میں لانا ہے۔ مگر یہ کام بہ تدریج ہوگا۔ دفعتہً سرکاری عنصر کو علاحدہ کرنا مشکل ہے اور بہ تدریج اس کام کو پورا کرنے میں خود میں (مسٹر جناح) آپ کے ساتھ پوری کوشش کروں گا۔ مسٹر جناح کے اس وعدے پر ہم لوگوں نے بھروسا کیا اور پارلیمنٹری بورڈ کی شرکت اور اس کے امیدواروں کی حمایت کا اقرار کر لیا۔ مگر افسوس کہ لیگ اور مسٹر جناح کا طرز عمل ان کے

وعدوں کے مطابق نہ رہا اور انھوں نے تمام تر سرکاری آدمیوں کو لیگ میں لے لیا اور انھی کی حمایت اور طرف داری کرتے رہے۔ مسٹر جناح نے ہم سے جو وعدے کیے تھے اور اس سلسلے میں ان سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ مجھ سے تنہا نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب (مرحوم)، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب صدر مجلس احرار، مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا عبدالحلیم صاحب وغیرہ بھی شریک تھے۔"

فعال جماعتوں کی علاحدگی کے بعد لیگ کے قایدین اور خود مسٹر جناح نے مسلمانوں کی فعال جماعتوں کے خلاف جس طرح زبان طعن دراز کی اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، لیکن اتنا ضرور کہنا پڑے گا کہ لیگ اور مسٹر جناح نے اس سلسلے میں جو طرز عمل اختیار کیا وہ مناسب نہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیگ کام کرنے والی اسلامی جماعتوں اور ان کے ارکان سے دور ہوتی چلی گئی۔ لیگ میں آج ایسے لوگوں کی بے انتہا کمی ہے جو مسلمانوں کے حقوق کے لیے قربانیاں پیش کر سکتے ہوں۔ مگر لیگ میں آج ہر وہ شخص معزز ہے جس نے تحریک خلافت کے زمانے میں مسلمانوں کا ساتھ، ساتھ دینے کے بجاے حکومت کا ساتھ دیا تھا، یا جس نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں ہمیشہ ہندوستانیوں کی مخالفت کی ہے۔ بہ ہر حال اب ان مسایل پر بحث کا وقت نہیں۔ سوال ہے مسٹر جناح کی دعوت اتحاد کا جس کے سلسلے میں ہم نے لیگ کی کچھ ضروری تاریخ پیش کر دی ہے، تا کہ یہ حقیقت سامنے آجائے کہ لیگ اور دیگر اسلامی جماعتوں میں بُعد کیوں ہے؟

جواب دعوت:

پنجاب کی ناکامی کے اثرات نے مسٹر جناح کو مجبور کیا یا ان کے دل میں یہ بات از خود پیدا ہوئی کہ وہ دوسری اسلامی جماعتوں سے بھی تعلقات قایم کریں، ہمیں اس کا کچھ پتا نہیں۔ البتہ ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس دعوت میں کوئی خلوص ہے تو یہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے لیے فال نیک سے ہرگز کم نہیں۔ ہم نے اتنی ہی مسرت کے

ساتھ حضرت مولانا احمد سعید صاحب کا یہ جواب بھی پڑھا ہے کہ

''میں نے اخبارات میں جناب کی وہ تقریر پڑھی جو آپ نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے ۲ مئی کو سیال کوٹ میں فرمائی ہے۔ اس تقریر میں آپ نے جن جماعتوں سے اپیل کی ہے ان میں جمعیت علما اور احرار بھی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لیے تقریباً چار سال قبل حضرت العلامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، مولانا حبیب الرحمان صاحب لدھیانوی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے نئی دلّی میں آپ سے ملاقات کی تھی اور تقریباً تین گھنٹے تک آپ سے ان حضرات نے تبادلۂ خیالات کیا تھا اور خلوص قلب کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں وہ نہایت خطرناک دور ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق بین المسلمین کی ضرورت گذشتہ تمام زمانوں سے زیادہ شدید ہے۔ اگر چار سال کے بعد بھی آپ اس کو محسوس کرتے ہیں کہ غداروں کو شکست دینے کے لیے آپ کو آزاد خیال جماعتوں کی مدد حاصل کرنے اور آزاد خیال مسلمانوں کو ''رایٹ ونگ'' بنانے کی ضرورت ہے تو میں آپ کے اس جذبۂ اتحاد و اتفاق کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ آپ جمعیت علمائے صوبۂ دہلی کے اجلاس میں جو ۲۶ر، ۲۷ر، ۲۸ر کو دہلی میں ہو رہا ہے شرکت فرمائیں تاکہ ہم اور آپ باہمی تبادلۂ افکار و آرا سے ملت اسلامیہ کے صحیح اور حقیقی مفاد پر غور کر سکیں۔''

حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے مسٹر جناح کی دعوت قبول فرما کر ان کی خدمت میں جوابی دعوت پیش کی ہے، مگر ابھی تک مسٹر جناح نے اس جوابی دعوت کی قبولیت و عدم قبولیت کے متعلق کوئی جواب نہیں دیا۔ ممکن ہے وہ کشمیر کی لطافتوں میں زیادہ مصروف ہوں، لیکن اگر ان کی یہ دعوت بھی ان کے اسی اعلان کی طرح ہے جو انھوں نے گاندھی جی کے متعلق دہلی میں کیا تھا اور پھر گاندھی جی کے خط لکھ دینے پر بہانے کی تلاش کرتے پھرے تھے تو ہم سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ مسٹر جناح کی قیادت سے ہندوستاں کے

مسلمانوں کو جس قدر جلد نجات مل جائے اسی قدر اچھا ہے۔

(سہ روزہ مدینہ۔ بجنور: ۲۵ رمئی ۱۹۴۴ء)

لیگ کے عناصر ترکیبی:

۲۸ رمئی ۱۹۴۴ء: پنجاب میں لیگ کو جو حادثہ پیش آیا ہے اس کے اثرات نے لیگی قایدین کو اصلاح حال کی طرف متوجہ کر دیا ہے اور ہر گوشے سے مسلم لیگ کو پاک کرنے کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ چناں چہ ایک اطلاع اخبارات میں یہ بھی شایع ہوئی ہے کہ کراچی ۹ رمئی مسٹر جی ایم سید نے لاہور میں لیگ کی مجلس عمل کے جلسے میں شرکت کے بعد واپسی پر ایک بیان دیتے ہوئے مسلم لیگ سے خراب عنصر کے اخراج کی طرف اشارہ کیا کہ ان کے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ لیگ کو خراب عنصر سے پاک کر کے اس کی تنظیم کی جائے معاصر زمیندار اسی سلسلے میں رقم طراز ہے:

> ''سرمایہ دار مسلمانوں نے اپنے لیڈر کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کا مستحق کوفیوں نے مسلم ابن عقیل کو بھی نہ سمجھا تھا۔ ان حقایق سے ظاہر ہے کہ سرمایہ دار قربانی و ایثار کے میدان میں نہ آئے ہیں نہ آ سکتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ! لہٰذا جب تک لیگ جاگیرداروں، نوابوں، سرمایہ داروں، سب رجسٹراروں، آنریری مجسٹریٹوں اور سرمایہ داروں کی آبائی میراث ہے اغیار کا مقابلہ تو در کنار اپنے پاؤں پر بھی کھڑی نہیں ہو سکتی، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ سینۂ قیادت سے یہ رستے ہوئے ناسور دور کیوں کر کیے جا سکتے ہیں؟ اس کام کے لیے مسلم لیگ کے نظام نامے میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ صوبائی اسمبلی کا ہر مسلمان ابتدائی مسلم لیگ کارکن بننے کے بعد صوبہ مسلم لیگ کی کونسل کا خود بہ خود رکن بن جاتا ہے۔''

آزاد مسلمان لیگ میں شریک نہیں ہو سکتے:

(ا) ۱۹۳۶ء مطلب براری کے بعد مسٹر جناح نے آزاد خیال مسلمانوں سے آنکھیں پھیر لیں۔ انفرادی طور پر جو لوگ لیگ سے منسلک رہے یا جذبۂ اصلاح لے کر داخل

ہوئے، اُن کا حشر بھی سبق آموز ہے۔ لیگ نے مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی، مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی، ڈاکٹر عبداللطیف وغیر کے ساتھ جو کچھ کیا یا جو کچھ کر رہی ہے اُس سے کون واقف نہیں؟

(ب) پاکستان کا مفہوم لے کر داخل ہونا اور تسلیم کرنا ضروری ہے۔ مسٹر جناح نے ایک تقریر کے دوران میں فرمایا:

''پہلے پاکستان حاصل کرو پھر جیسا چاہے نظام حکومت قایم کر لینا۔''

(ج) لیگ کا ہائی کمانڈ جن لوگوں سے مل کر بنا ہے یا جن لوگوں کو لیگ میں اقتدار حاصل ہے وہ یا تو وہ لوگ ہیں جو جنرل ایلنبائی کے ساتھ فتح بیت المقدس میں شریک تھے، یا وہ جو گیلی پولی کی جنگ میں ترکوں سے لڑے تھے، یا وہ جنھوں نے خانۂ کعبہ پر گولی چلانے والوں کو مدد دی تھی، یا وہ جو پہلے خان صاحب، پھر خان بہادر، پھری آئی اے اور پھر سر بن گئے۔ کیا ان لوگوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو قوم کی خاطر اپنے عہدوں پر لات ماردیں گے یا حکومت سے ٹکرانے کے لیے میدان میں آئیں گے؟ دور جانے کی ضرورت نہیں، پنجاب کا لیگی حادثہ زبان حال سے ہمارے نظریے کی تصدیق کر رہا ہے۔ یہ لوگ کسی حال اور کسی وقت میں بھی حکومت کا ساتھ چھوڑنے کے لیئے تیار نہیں ہوسکتے۔ تحریک خلافت کے زمانے میں جب خالص اسلامی مسئلہ تھا یہ لوگ مسلمانوں سے الگ حکومت کی آغوش میں مصروف استراحت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لیگ نے مسجد شہید گنج کی واپسی کا مطالبہ کیا اور خاموش ہوگئی۔ پھر لیگ نے ستیارتھ پرکاش کی ضبطی کا مطالبہ کیا اور بھول گئی۔ جب صورت حال یہ ہے کہ لیگ پر جن لوگوں کا قبضہ ہے وہ اول تا آخر حکومت پرستی میں طاق اور اپنے رنگ کے پختہ ہیں تو ان کی اصلاح کا سوال بالکل فضول ہے۔

(سہ روزہ مدینہ۔ بجنور: ۲۸ر مئی ۱۹۴۴ء)

۱۰ر جون ۱۹۴۴: ...... مسلم لیگ اور جمعیت علما میں بنیادی اختلافات ہیں۔ لیگ برطانوی اقتدار کے سایے میں قیام پاکستان کی طالب ہے، جیسا کہ مسٹر جناح کے اس بیان سے ثابت ہو چکا ہے جو انھوں نے ولایتی اخبارات کے نمایندوں کو دیا تھا۔ جمعیت انگریزی انتداب کے خاتمے نیز آزاد و سربلند ہندوستان کے احیا کی خواہش مند ہے۔ لیگ

کے اراکین میں وہ سر اور خان بہادر بھی شامل ہیں جو سرکار کی خوشامدوں کو اپنی ترقیوں کا ذریعۂ تصور کرتے ہیں۔ جمعیت کے اراکین میں وہ مجاہدین شامل ہیں جو قید فرنگ کو بازی طفلانۂ دل خیال کرتے ہیں۔ لیگ کانگریس کی مخالفت کو اصل الاصول گردانتی ہے۔ جمعیت علمائے ہند استخلاص وطن کی جدوجہد میں کانگریس سے تعاون واجبی خیال کرتی ہے۔ لیگ ہندوستان کی ترقی کی راہ میں مزاحم ہو رہی ہے اور جمعیت علما ترقی پسند رجحانات کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ نظریات، نصب العین، طریق کار، فکر و عمل، غرضے کہ ہر میدان میں دونوں جماعتیں ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئی ہیں۔ اس لیے اگر اتحاد ہو بھی جائے تب بھی یہ اتحاد نبھنے والا نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنے کسی گزشتہ مقالے میں جمعیت علما کے اراکین کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک لاحاصل اور ناپائیدار اتحاد کے لیے جو خود جمعیت کے مفاد کے لیے بھی نقصان رساں ثابت ہوگا، جدوجہد نہ کریں۔ ورنہ انھیں پھر اُسی پشیمانی کا سامنا کرنا پڑے گا جس کا سامنا وہ ۱۹۳۷ء کے لیگ جمعیت اتحاد میں کر چکے ہیں۔

مسٹر جناح نے بلاشبہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو دعوت اتحاد دی ہے مگر اُن کے نزدیک اتحاد کے معنی ہیں اطاعت و انقیاد کے! وہ جب احرار یا جمعیت علما کو دعوت اتحاد دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ جماعتیں لیگ کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ ان کے اراکین لیگ کی پالیسی کو بے چوں و چرا تسلیم کر لیں اور وہ حریت پسند رہبر جو اپنی اصابتِ فکر، آزادیٔ عمل اور بے باکی گفتار کے لیے ہمیشہ نمایاں رہے ہیں فکر، گفتار اور عمل کی تمام آزادیاں لیگی ہائی کمان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔ یہ جماعتیں توڑ دی جائیں، ان کے ممبران لیگ کے تابع فرمان ہو جائیں اور اس طرح مسلمانانِ ہند کے حریت پسند طبقے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رجعت پسندی کے سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ مسٹر جناح کی یہ روش کسی حریت پسند جماعت کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ کوئی غیور اور حساس انسان ان کی اندھی تقلید کو برداشت نہیں کر سکتا اور کوئی باعزت جماعت اس اتحاد کو قبول نہیں کر سکتی، جس کے معنی مکمل غلامی کے ہوں۔ اس لیے جمعیت ہو یا مجلس احرار جب تک ان کے قایدین میں عزتِ نفس موجود ہے، ان سے مسٹر جناح کا کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔ مسٹر جناح جمعیت علما کو جو اہمیت دیتے ہیں وہ اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اس کے

انفرادی وجود تک سے انکار کرتے ہیں۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کا واحد ادارہ بتلانا دراصل دوسرے مسلمان اداروں سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ پھر مسٹر جناح وہی شخص ہیں جو کلکتہ کے اجلاس مسلم لیگ میں علما کے اقتدار کے خاتمہ پر ''ترانۂ طرب'' بلند کر چکے ہیں۔ ان کے دل میں علما کا کوئی وقار نہیں ہے اور وہ لیگ میں بھی علما کو صاحب اقتدار بننے سے روکنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جمعیت علما کے اجلاس میں بھی شرکت گوارا نہیں کی اور عین انھی دنوں میں جب کہ جمعیت علما کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا دہلی سے کشمیر روانہ ہو گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جمعیت کو کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں۔ ایسی حالت میں جمعیت کے اراکین ان سے کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ وہ جمعیت سے برابر والوں کا سا معاہدہ کریں گے یا جمعیت کے اراکین کو لیگی سیاست کے مستقبل پر اثر انداز ہونے کی اجازت دے دیں گے۔ (ہفت روزہ اجمل۔ بمبئی: ۱۰ر جون ۱۹۴۴ء)

کیا مسلم لیگ پر قبضہ ممکن ہے؟

مدینہ۔ بجنور مورخہ ۹ر جولائی ۱۹۴۴ء نمبر ۵۰، جلد ۳۳ مقالہ افتتاحیہ بہ عنوان ''مسلم مجلس کی بجائے مسلم لیگ پر قبضہ کیوں نہ کیا جائے؟'' جب مسلم لیگ کی بے عملی یا بے اصولی کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند و سرفروش مسلمان آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کیوں نہیں کر لیتے؟ پھر جب سے مسلم مجلس قایم ہوئی ہے یہ بات اور زیادہ زبانوں پر آ رہی ہے۔ اس اشاعت میں مولانا عبدالمجید خواجہ اور حافظ محمد ابراہیم کی جو تقریریں درج کی جا رہی ہیں ان میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جب ہمیں نہ تو مسلم لیگ کے اصول پاکستان سے اتفاق ہے اور نہ اس کے طریق عمل سے تو پھر اس میں شرکت کیسے کی جا سکتی؟ رہا یہ سوال کہ پہلے شرکت کر لو اور پھر اندر پہنچ کر پورا نظام بدل ڈالو، سو یہ شکل لیگی دوستوں کے لیے تو قابلِ قبول ہو سکتی ہے لیکن جو لوگ دیانت اور ضمیر کے قایل ہیں، ان سے یہ منافقت نہیں ہو سکتی کہ ممبری کے حلف نامے پر دستخط بھی کیے جائیں اور دل میں یہ خیال بھی رکھا جائے کہ ہم تو یہ دستخط محض دکھاوے کے لیے کر رہے ہیں، ورنہ ہم نہ تو پاکستان کے فلسفے کو مانتے ہیں، نہ لیگ کے موجودہ نواب اور راجہ قسم کے قایدوں کے معتقد ہیں اور نہ اس کے

طریق کار اور پالیسی کو پسند کرتے ہیں۔

لیکن اس کے سوا بہت سے اور اعتراضات بھی ہیں جن کی وجہ سے ایثار پسند مخلص اور سرفروش و سربہ کف قسم کے افراد مسلم لیگ میں اپنے لیے کوئی گنجایش نہیں پاتے۔ ذیل میں ہم اس قسم کے تمام اعتراضوں کو مختصر طور پر پیش کیے دیتے ہیں، تاکہ سوال کا ہر رخ روشن ہو کر سامنے آجائے۔ ان اعتراضوں کو نقل کرنے سے ہمارا مقصد لیگ کے حامیوں کی دل آزاری کرنا ہرگز نہیں ہے؟ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ غور و فکر کا ایک موقع دونوں فریقوں کو دیا جائے۔ اس لیے اگر لیگ کی طرف سے کوئی صاحب جواب میں کچھ تحریر فرمائیں گے تو مدینہ کے کالم بڑی خوشی سے ان کے خیر مقدم کے لیے حاضر ہیں، لیکن یہ بات جتلا دینا ضروری ہے کہ اس سلسلے میں صرف وہی تحریر شایع کی جا سکے گی جو ٹھوس حقایق اور صحیح منطقی نتایج پر مبنی ہوگی۔ یہ اس لیے عرض کر دیا کہ ادیبانہ عبارت آرائی کرنے والے اور محض خیالات و اوہام کی خوابی دنیاؤں میں رہ کر منطقی مغالطوں کے ساتھ عوام کے جذبات کو ابھارنے والے حضرات جو عموماً لیگ کی حمایت میں قلم فرسائی کیا کرتے ہیں وہ بعد میں برا نہ مانیں اور ان کی محنت اکارت نہ جائے۔

ہمیں گوے وہمیں چوگاں:

اب ان اعتراضات کو نہایت مختصر طور پر درج کیا جاتا ہے:

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں
آئے یہ گو ہے، اور یہ چوگاں

(۱) لیگ نے ۱۹۳۷ء میں آزادی کامل کی تجویز پاس کی مگر کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔ پھر ۱۹۴۰ء میں پاکستان طے کیا مگر اس کے لیے بھی آج تک کچھ نہ کیا۔ پھر جب لیگ نہ تو آزادیٔ کامل کے لیے کوئی جدوجہد کرتی ہے اور نہ پاکستان کے لیے کوئی قدم بڑھاتی ہے اور اس کے بجائے ہندو مسلم اختلافات کی آگ ہی کو ہوا دیتی رہی ہے تو یہ کہنا غلط کیوں ہے کہ لیگ ہندوستان کی آزادی کا راستہ رو کے کھڑی ہے اور دانستہ یا نادانستہ وہی کر رہی ہے جو انگریز چاہتا ہے۔ یعنی ہندوستان میں انگریزی شہنشاہیت کی حامی ہے۔

(۲) آیندہ کے لیے بھی لیگ سے عمل کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی، اس لیے کہ قاید اعظم بار بار یہ اعلان کر چکے ہیں کہ لیگ ڈایریکٹ ایکشن ''سیدھے عمل'' کے مخالف ہے۔ یعنی عدم تعاون یا سول نافرمانی کی قسم کا کوئی ایسا عمل لیگ کے اصول میں جایز نہیں ہے، جس کا سیدھا اثر حکومت پر پڑتا ہو اور جس میں براہِ راست حکومت سے ٹکر لینی پڑے۔ اس اصول کو مان کر گویا لیگ نے ایثار و قربانی کا وہ دروازہ ہی بند کر دیا جو آزادی کے حصول کے لیے سب سے پہلی منزل ہے:

ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

(۳) اس لیے لیگ کی سیاست صرف شیرانِ قالین کی سیاست ہو کر رہ جاتی ہے، جس میں صرف وہی لوگ لیڈر بن سکتے ہیں جو زیادہ مال دار ہوں، جو زیادہ باتیں بنا سکیں، جو انگریز سے نہ بگاڑیں لیکن ہندو کے خلاف زیادہ سے زیادہ زہر اُگل سکیں۔

(۴) اسی کا نتیجہ ہے کہ لیگ کے عہدہ داروں میں معدودے چند کو چھوڑ کر تقریباً تمام اعلا عہدہ دار وہ لوگ ہیں جو انگریز کے پرانے وفادار اور شہنشاہیت کے قدیمی نمک خوار ہیں اور جن کے زریں کارناموں سے خلافت اور ترکِ موالات کی گزشتہ تاریخ بھری پڑی ہے اور آج بھی یہ عالم ہے کہ سرکاری خطابات کی جب بھی کوئی نئی فہرست شایع ہوتی ہے وہ لیگ کے اعلا عہدہ داروں کے ناموں سے خالی نہیں ہوتی۔

(۵) ان اسباب نے لیگ کے ممبروں کا معیارِ سیاست بے حد پست کر دیا ہے۔ ہر منافق لیگ کی اگلی سے اگلی صف میں جگہ پا سکتا ہے، لیکن خاموش، مخلص اور بے لوث کام کرنے والے کے لیے پچھلی صف میں بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔

(۶) لیگ کی سیاست جب ایثار و عمل سے خالی ہو گئی تو اب اس کا دار مدار صرف اس پر ہے کہ ہندو کو جتنی گالیاں دی جا سکتی ہیں دی جائیں اور اس سے جو وقت بچے اس میں ان مسلمانوں کو کوسا پیٹا جائے جو لیگ میں شریک نہیں ہیں۔

(۷) یہ تو ہوا لیگ کی سیاست کا وہ پہلو جس کا تعلق عوام سے ہے، لیکن خواص کی سیاست کا محور یہ ہے کہ انگریزی راج کے زیرِ سایہ اپنے مخصوص معاشی مفاد کو محفوظ رکھا جائے۔ چناں چہ لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت کہنے پر زور دینا اور کسی دوسری

مسلم جماعت سے مسلمانوں کے کسی کام میں بھی اشتراک نہ کرنا، حتیٰ کہ بنگال میں یورپین گروپ سے ساز باز کر کے وزارت بنالینا لیکن کرشک پرجا پارٹی کے مسلمان ممبروں سے میل جول نہ رکھنا! یہ سب صرف اس لیے ہے کہ سرکاری عہدوں کی تقسیم جب ہو تو مسلمانوں کے نام پر سارے عہدے صرف لیگ ہی کے لیڈروں کو مل سکیں اور اس ''حلوے مانڈے'' میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو سکے۔

(۸) لیگ کے لیڈروں کا یہ خیال جس سے مسٹر جناح کو بھی مستثنٰی نہیں کیا جاسکتا کسی بدگمانی پر مبنی نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ مسلمانوں کے نام پر صرف اقتدار کے خواہش مند نہ ہوتے اور ان کے دل میں واقعی عام مسلمانوں کے مفاد اور اسلام کی ترقی و سربلندی کا حقیقی جذبہ ہوتا تو یہ چیز خود ان کی روزمرہ کی زندگیوں میں نظر آتی، لیکن دنیا جانتی ہے کہ ان کی زندگیاں اسلام اور اسلامیات سے کتنی دور ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی دولت کا پورا نہیں تو کوئی نہ کوئی حصہ تو مفادِ عامہ کے کاموں پر صرف ہونا چاہیے تھا، لیکن یہ بات بھی نہیں۔ اگر لیگ کے ان لیڈروں میں مسلمانوں کے مفاد کا سچا جذبہ ہوتا اور وہ اپنی دولت کا دس فیصدی بھی مفادِ عامہ کے کاموں کے لیے وقف کر سکتے تو آج مسلم قوم کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہوتی۔

(۹) عوام میں لیگ کے لیڈروں کی ہر دل عزیزی دو نعروں پر موقوف ہے:

اول: ''ہندو مسلم اتحاد کو ناممکن بنانا۔'' دوم: ''یہ اعلان کرنا کہ ہم مسلمانوں کو اسلام اور قرآن سے قریب کرنا چاہتے ہیں۔''

لیکن خود ان لیڈروں کا عمل یہ ہے کہ ایک طرف تو میونسپلٹیوں، اسمبلیوں اور سرکاری اداروں میں ہندوؤں سے ان کا پورا پورا اتحاد ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ خود اپنی زندگیوں کو اسلام اور قرآن سے قریب تر کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ مذکورہ بالا دونوں نعرے محض عوام کے جذبات کو ابھارنے اور انھیں خوابوں کی دنیا میں بسا کر انھیں اپنا معمول بنانے کے لیے بلند کیے جاتے ہیں، ورنہ خود ان لیڈروں کو ان دونوں نعروں میں سے کسی سے بھی اتفاق نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نواب اسماعیل خاں (صدر صوبۂ یوپی لیگ) کستوربا میموریل فنڈ کے صدر نہ بنتے، جس کی رقم خالصتاً گاندھی جی کی مرضی سے خرچ ہوگی۔ اور نہ لیگ کا کوئی لیڈر شعائرِ اسلام سے دور نظر آتا۔

(۱۰) مسٹر جناح نے ایک تقریر میں بڑے فخر سے کہا تھا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے ہندوستان کی سیاست سے علما کا اقتدار ختم کر دیا۔ کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں کہ لیگ انگریز کی ایک بہت پرانی آرزو کے مطابق اسلام کو یورپ کا بپتسمہ دینا چاہتی ہے، جیسے مسٹر جناح خود ہیں۔

(۱۱) لیگ کو صرف اس بات پر اصرار ہے کہ اسے مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت مان لیا جائے، لیکن اگر اس کا مقصد واقعی حصول آزادی ہوتا تو اس جھگڑے میں پڑنے کی بجائے وہ مجلس احرار و جمعیت علما قسم کی ان تمام جماعتوں سے اشتراک کر سکتی تھی جو حصول آزادی کی داعی و حامی ہیں، مگر چوں کہ اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ لیگ صرف یہ چاہتی ہے کہ دوسروں کی کوشش سے جب ہندوستان کو کچھ ملے تو اس وقت مسلمانوں کی واحد نمایندگی کے نام پر حصہ بٹانے کے لیے پہنچ جائے، خود کوئی عمل نہ کرے۔ ایسی صورت میں مجلس احرار، جمعیت علما، جمعیت خاک سار اور مسلم مجلس کے وہ سرفروش و جان باز مجاہد جو صرف اس کے قایل ہیں کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

لیگ کے دایرے میں کیسے آسکتے ہیں۔

(۱۲) سیاسی اقتدار مل جانے کے بعد لیگ جو کچھ کرے گی اس کا نمونہ بھی بنگال، سندھ، سرحد میں آنکھیں دیکھ رہی ہیں، جہاں کھلے طور پر وزارت کے پردے میں گورنر راج کر رہا ہے۔ اس لیے کوئی ترقی پسند و آزادی طلب مسلمان لیگ میں شامل ہو کر اس قسم کی وزارتوں کو اپنی وزارتیں کہہ کر اپنے ضمیر کو آلودہ کرنا کیسے گوارا کر سکتا ہے؟

(۱۳) پاکستان قایم کرنے کی غرض یہ بتائی جاتی ہے کہ ہندوؤں کی حکومت میں مسلمانوں کے حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے، جس کا ثبوت کانگریسی وزارتوں کے زمانے کو بتایا جاتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ مظالم ان صوبوں میں ہوتے جن میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں پاکستان بن جانے کے بعد بھی بدستور اقلیت میں رہتے ہوئے کانگریسی راج کے ماتحت رہیں گے۔ اس لیے جب پاکستان ان صوبوں کے مسلمانوں کی کوئی حفاظت نہیں

کرسکتا تو پھر ہم یہ کیوں نہ سمجھیں۔ لیگ کی طرف سے ہندوستان کے بٹوارے پر زور دینے کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ لیڈر فقط اتنا چاہتے ہیں کہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے نام پر عہدوں کی چند کرسیاں ہمیشہ ان کے لیے مخصوص رہیں۔ اس طرح گویا پاکستان کا نعرہ لیگ کے ان اعلا عہدے داروں کو عہدہ اور منصب دلانے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن مسلم عوام بہ دستور مصیبت میں پڑے رہیں گے۔ پھر کیا کوئی حق پرست انسان ان اغراض کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے لیگ کا ساتھ دینے پر تیار ہو سکتا ہے؟

(۱۴) رہا یہ سوال کہ مسلم اکثریت کے علاقے ہندوؤں کی زد سے محفوظ رہیں، سو اس کے لیے مسلمانوں کی ہر جماعت یہ اصول مان چکی ہے کہ صوبوں کو مرکز سے علاحدگی کا حق دے دیا جائے۔ یعنی اگر کسی وقت پنجاب یا بنگال کی قسم کا کوئی صوبہ یہ محسوس کرے کہ ہندوستان کا مشترک مرکز ہندوؤں کا محکوم بنا رہا ہے تو وہ اپنی علاحدگی کا اعلان کر سکتا ہے، لیکن لیگ اس اصول کو صرف اس لیے نہیں مانتی کہ اس طرح سرکاری عہدوں پر جو اجارہ داری واحد مسلم جماعت ہونے کی صورت میں اسے مل سکتی ہے وہ باقی نہیں رہتی۔

(۱۵) لیگ کی یہ پالیسی کہ ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوائی جائے، لیڈروں کے لیے تو بے حد مفید ہے کہ اس طرح حکومت کے اداروں میں عہدوں کا ایک مخصوص حصہ ان کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے، لیکن وہ مسلم عوام جو عہدوں سے تعلق نہیں رکھتے اور جو گاؤں، قصبوں اور شہروں میں، کھلیانوں اور کھیتوں میں، دکانوں اور منڈیوں میں، سڑکوں اور گلیوں میں ہندوؤں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں وہ اپنے لیڈروں کی اس ہوس اقتدار پر قربان ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ہندو مسلم فساد لیگ کے لیڈروں کی جیت ہے، کیوں کہ اس سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ دیکھو ہندو مسلمان ایک نہیں ہیں، لیکن جب ایک نہ ہونے کے نتیجے میں کوئی آئینی اختیار ملتا ہے تو بھی فساد کے شہیدوں اور زندانیوں کی حالت وہی رہتی ہے جو پہلے تھی بلکہ اپنے پڑوسیوں سے تعلقات خراب ہونے کی وجہ سے اور زیادہ بدتر ہو جاتی ہے۔

(۱۶) لیگ کہتی ہے دس کروڑ مسلمان ہمارے ساتھ ہیں۔ گویا سارے مسلمان لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہیں، لیکن دوسری طرف ہر تقریر اور ہر بیان میں یہ کہا جاتا ہے کہ

مسلمانو! اگر تم سب لیگ کے جھنڈے تلے آجاؤ تو جیت تمہاری ہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک سارے مسلمان لیگ میں نہیں آئے۔ اس تضاد بیانی کا مطلب کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک طرف تو سارے مسلمانوں کو اپنے ساتھ کہہ کر انگریز اور ہندو کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ عہدوں اور نشستوں کے باب میں چند غرض مندوں کی مراد بر آئے اور دوسری طرف مسلمانوں سے تنظیم اور اتحاد کی اپیل کر کے اپنی بے عملی کو چھپایا جاتا ہے۔ یعنی انھیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ابھی تو ہم تنظیم ہی کر رہے ہیں۔ جب تنظیم کر چکیں گے تب کچھ اور کریں گے۔

(۱۷) لیگ کی مذکورہ بالا سیاست کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو ہندو کو خوف زدہ کر کے اس سے اپنا حصہ منوالیا جائے اور دوسری طرف اپنے حریف مسلمانوں کو دہشت زدہ کر کے میدان سے باہر کر دیا جائے اس چیز نے مسلم لیگ کی سیاست میں ''غنڈہ گردی'' کو شامل کر دیا ہے، جس کے مظاہرے اگر زیادہ سخت نہیں ہوتے تو کچھ شرافت واخلاق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف قانون کی گرفت سے ڈر کر، لیکن کبھی کبھی اس ''ڈر'' کی حدود بھی پھاند دی جاتی ہیں۔ ویسے تحریر وتقریر میں خشونت اور درشتی اور ''تنابز بالالقاب'' تو ایسی چیز ہے کہ آپ جب چاہیں اس کا امتحان کر سکتے ہیں۔

ان حالات میں کسی ایسے مسلمان کا لیگ میں شریک ہونا قطعاً ناممکن ہے جو اُصول کا حامی ہو۔ مسلمانوں کا واقعی ہمدرد ہو، جوش عمل کا مالک ہو اور کٹر سے کٹر مخالف کے ساتھ بھی شرافت وانسانیت سے پیش آنا اپنا ایمان سمجھتا ہو۔ فتدبروا یا اولی الالباب!

جمعیت علماے ہند اور لیگ کا نصب العین

حقایق اور واقعات کی روشنی میں

از جناب مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ۔ ناظم جمعیت علماے ہند

''منشور'' مورخہ ۲۹/ جولائی ۱۹۴۵ء ہمارے سامنے ہے۔ اس میں جناب ابوعلی صاحب اعظمی کا ایک طویل مضمون ہماری اس مختصر تحریر کا محرک ہے۔

یوں تو نہ صرف منشور بلکہ اُس کے تمام ہم نوا اخبارات کا محبوب مشغلہ یہی ہے کہ جمعیت علماے ہند پر بے بنیاد اعتراضات کیے جائیں اور علماے کرام کے اقتدار کو (معاذ اللہ) خاک میں ملایا جائے۔ افسوس! اس محبوب مشغلے کی بدمستی نے نہ صرف صداقت اور راست گوئی سے اُن کو بے نیاز کر دیا ہے، بلکہ تہذیب و متانت بھی سب و شتم کی نذر ہوگئی۔ اس ننگِ صحافتِ تہذیب معکوس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے جو خود بھی اخلاق و تہذیب کے متاع سے تہی داماں ہو، مگر جن کو قرآن پاک کی یہ تنبیہ یاد ہو کہ بئس الاسم الفسوق بعد الایمان وہ تو لامحالہ اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما پر عمل کرنے کو اپنی سعادت تصور کریں گے۔

مگر جناب ابوعلی صاحب کا مضمون اس اسلوب سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا اس کے جواب کے لیے طبیعت آمادہ ہوتی ہے، مگر تنگی وقت کے ساتھ اخبارات کے صفحات کی کمی ہمیں اختصار پر مجبور کر رہی ہے اور مختصر طور پر مندرجۂ ذیل چند فقروں میں جوابات کے وسیع دامنوں کو سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(ا) بے شک جمعیت علماے ہند کا مقصد یہی ہے کہ پیش آنے والے سیاسی اُمور کے تمام پہلوؤں پر قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں غور و خوض کر کے شریعت غرا کے بہ موجب مسلمانوں کی رہنمائی کی جائے اور الحمد اللہ! جمعیت علما کا ہر رکن اس منشا اور مقصد سے آگاہ ہے اور اس کی تکمیل کے بعد ہی اس کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اور جب تعلیمات

اسلام کے بہ موجب وہ صحیح فیصلہ اور غیر مبہم حکم حاصل کر لیتا ہے تو پھر نہ وہ کسی قوت وشوکت سے مرعوب ہوتا ہے اور نہ اپنوں یا بے گانوں کا اچھا یا برا سلوک اس کے قدم استقلال کو ڈگمگا سکتا ہے۔ وہ صرف دوسروں کو مشورہ نہیں دیتا بلکہ ابتلا وامتحان کے میدان میں خود سینہ سپر ہوتا ہے اور دوسروں کے چلنے کے لیے اپنے قدم کے نشانات چھوڑ دیتا ہے۔

(۲) اغیار کے غلبے سے وطن عزیز کو نجات دلانا اور طلب جو نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیاے اسلام کو مغلوب اور مقہور کیے ہوئے ہے، اس کو آخری امکانی حد تک کم زور کرنا ہر ایک مسلمان کا مذہبی اور شرعی فرض ہے۔

ہندوستان کی دوسری قوموں کے سامنے صرف اُن کا وطن ہے، لیکن مسلمانوں کے پیش نظر وطن عزیز کے علاوہ تمام اسلامی ممالک بھی ہیں، جو مغرب اور بالخصوص برطانیہ کے پنجۂ جبر واستبداد میں کسے ہوئے ہیں اور جن کی بے کسی، مجبوری اور غلامی کا بار ہندوستانی مسلمانوں کی گردن پر ہے، کیوں کہ انھیں کی غلامی نے ان تمام ممالک کو غلام بنا رکھا ہے۔

شاہ عالم اور علماے کرام:

علما نے اس حقیقت کو اُسی وقت سمجھ لیا تھا جب ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم بادشاہ دہلی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنجۂ استعمار کا شکار ہوا اور اُسی وقت سے وہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مدافعانہ جدوجہد کی فرضیت کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا، چناں چہ علما مجاہدین کی جماعتوں نے بار بار اس فتوے پر عمل کر کے اپنا فرض انجام دیا اور جامِ شہادت نوش کیا۔ ڈبلو ڈبلو ہنٹر کی کتاب جس کا ترجمہ اردو میں ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس سلسلے میں خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔ پھر جب کانگریس نے بلا تفریق مذہب وملت ملکی بنیاد پر ہندوستانیوں کے لیے اختیارات کا مطالبہ کیا تو علماے کرام کے لیے از روے اجتہاد شرعی اس مطالبے کی مخالفت قطعاً ناجائز تھی۔ غلط فہمی یہ ہے کہ علماے کرام نے کانگریس کی ہم نوائی کی، حال آں کہ واقعہ یہ ہے کہ علماے کرام کے نصب العین کی کانگریس نے موافقت کی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ شرکت یا تائید کانگریس کا فتویٰ آج دیا جا رہا ہے، حال آں کہ تقریباً پچیس سال پیشتر علماے ربانی شرکت کانگریس کا فتویٰ دے چکے تھے! آج اُس کی

صرف اتباع ہے۔ (ملاحظہ ہو نصرۃ الابرار)

(۳) حقوق کی رٹ لگانے والوں سے اگر حقوق کی تفصیل دریافت کی جائے تو وہ تفصیل نہ بتا سکیں گے، حتیٰ کہ لفظ پاکستان کی بھی آج تک واضح تفسیر نہ کی جا سکی۔ مگر الحمدللہ! علماے کرام خوب پہچانتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی حقوق کیا ہیں اور مسلم حقوق کیا اور اُن کے حاصل کرنے کی قابل عمل صورت کیا ہے؟

مگر علما اس کو دناءت، پست ہمتی، بزدلی اور درحقیقت مسلمانوں کے لیے موت کے مرادف سمجھتے ہیں کہ جب انگریز سے مطالبۂ اختیارات کی جنگ ہو تو فقط ہندو اس میدان کا مردِ مجاہد بنے اور جب کچھ اختیارات ہندوستان کو ملنے لگیں تو کاسۂ گدائی لے کر حقوق کی بھیک مانگنے لگیں اور دوسری طاقت کو موقع دیں کہ وہ مسلم اقلیت کی حفاظت کے نام پر ہندو مسلم اختلاف کو بہانہ بنا کر تفویض اختیارات میں خاطر خواہ بخل کر سکے۔

علما اور مسٹر جناح:

آج علما پر حقوق مسلم سے بے اعتنائی کا الزام لگایا جاتا ہے، حال آں کہ مسٹر جناح اور اُن کے یارانِ طریقت ہی وہ مجرم ہیں جنھوں نے اسلامی حقوق اور مسلم حقوق کا آج تک گلا گھونٹا ہے اور اب بھی پاکستان کا مبہم لفظ بول کر اسلامی حقوق اور مسلم حقوق کو ہمیشہ کے لیے پامال کر رہے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ۱۹۱۶ء میں مسٹر جناح کی سرکردگی میں صوبۂ پنجاب کے لیے پچاس فی صدی اور صوبۂ بنگال کے لیے چالیس فی صدی نشستوں پر سمجھوتا کر کے اُن صوبوں کی اکثریت کو اقلیت کے عشوۂ ناز کی نظر کر دیا گیا؟

کون نہیں جانتا کہ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فی صدی اور چون فی صدی تھی۔ اگر ۱۹۱۶ء میں آبادی کی نسبت سے ممبریاں لے لی جاتیں تو اس وقت پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی مغلوبیت کو تیس سال ہو چکے ہوتے۔ علماے کرام نے اُسی وقت اس غلطی پر تنبیہ کی تھی، مگر جو مسٹر جناح اگست ۱۹۳۶ء تک لکھنؤ میں طلبا کی فیڈریشن کی صدارت کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو کے متعلق فرمارہے تھے کہ:

”ان کی صداقت، ایمان داری اور ملکی ہمدردی لاجواب ہے اور نہرو سے زیادہ

سچا اور وفادار دوست کوئی نہیں۔" (مسلم ووٹروں کی فریاد، ص ۳۲)

وہ ۱۹۱۶ء میں علما کی تنبیہ پر کب توجہ فرما سکتے تھے۔

مسئلہ امارت شرعیہ کو ایک مذاق سمجھ کر یونٹی بورڈ الہ آباد کے موقعے پر مطالبۂ قضا کی مخالفت کر کے خداوندانِ لیگ نے یہ ظاہر کر دیا کہ کلچرِ اسلام اور تمدن وتہذیب اسلام کا نعرہ ان کی زبانوں پر صرف اس لیے ہے کہ اسمبلی کی چند نشستوں کے لیے ووٹ حاصل ہو جائیں۔

کاش! مسٹر جناح مرکزی اسمبلی میں شریعت بل کی مخالفت نہ کرتے، قاضی ایکٹ کو ناکام نہ کرتے تو اسلامی حقوق کا بڑا حصہ ہندوستان میں محفوظ ہی نہیں بلکہ نفاذ پذیر ہو چکا ہوتا۔

کس قدر ستم ظریفی ہے کہ مسٹر جناح اسمبلی میں سول میرج ایکٹ کی موافقت کریں، ساردا ایکٹ کی موافقت میں بیان دیں علما کے اقتدار کے ختم ہونے پر مسرت ظاہر کریں۔ مسلمانوں کو عورتوں کی آزادی کا مشورہ دیں اور پھر بھی محافظ ملت، امام المسلمین اور قاید اعظم !!؟

بہ سوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

علما اور کانگریس:

یاد رکھو! مسلم کلچر کا تحفظ صرف مسلم کر سکتا ہے۔ یہ عمل کی چیز ہے، خیال اور فکر نہیں۔ پاکستان کی بھول بھلیاں میں پڑ کر مسلمان رہا سہا کلچر بھی تباہ کر دے گا۔

کانگریس یا انگریز مسجدوں میں اذانیں دلوانے اور نمازیں پڑھوانے کے لیے اپنے والینٹیر یا سپاہی نہیں بھیجیں گے۔ یہ عملی فرض آپ ہی کو ادا کرنا ہوگا۔ کانگریس صرف آزادی کا وعدہ کر سکتی ہے۔ چناں چہ اُس کے بنیادی حقوق میں یہ ایک مسلمہ حق ہے۔

(۴) کانگریس نام نہاد آزادی چاہتی ہے یا حقیقی آزادی چاہتی ہے؟ اس کا فیصلہ بالکل واضح ہے۔ دنیا کی سیاست اور اقتصاد سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی تردد نہیں کر سکتا کہ جو سوالات کانگریس نے ملک کے سامنے رکھے ہیں اور جو عوام کے ذہن میں اس

درجے پیوست ہو چکے ہیں کہ اگر کانگریس اُن کو فراموش کرانا چاہے تو خود ختم ہو جائے گی اور سوالات فراموش نہ ہوں گے اور جن کی ہمہ گیری اور عام مقبولیت نے آج رجعت پسند اور استعمار پرست جماعتوں کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ آزادیٔ کامل کو اپنے مقاصد میں داخل کریں۔

وہ سوالات مکمل آزادی کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ برطانوی شہنشاہیت اور دورِ حاضر کے اقتصادی سوالات دن اور رات، آگ اور پانی کی نسبت رکھتے ہیں۔ ہاں! نوزائید جمعیت علماے اسلام کلکتہ کی تہی دستیٔ تدبر قابل افسوس ہے کہ لیگ جیسی رجعت پسند جماعت کی پیروی میں تلاش کر رہی ہے اور پاکستان کے تصور کو سارے ہندوستان کے لیے مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ بنانا چاہتی ہے۔

بریں عقل و دانش بہ باید گریست

کیا انھوں نے کبھی روس اور ٹرکی کے انقلاب کی تاریخ نہیں پڑھی؟ ان ممالک میں انقلاب کے سیلاب نے مذہب اور مذہبی جماعتوں کو اسی لیے فنا کیا کہ وہ تقاضاے انقلاب کے برخلاف رجعت پسند طاقتوں کے ساتھ پیوست ہو گئے تھے۔

یاد رکھو! رجعت پسند طاقتیں فنا کے کنارے پر ہیں۔ تم اگر بقا چاہتے ہو تو انقلاب کی باگ اپنے ہاتھ میں لو۔

ہندوستان کی تقسیم:

مولانا ابو علی صاحب نے منشور میں کئی کالم صرف اس بات کے سمجھانے کے لیے رنگے ہیں کہ تقسیم کوئی نئی چیز نہیں۔

بے شک تقسیم کوئی نئی چیز نہیں مگر مولانا کو یہ خیال نہ رہا کہ تقسیم کی ایک صورت وہ بھی ہے جو دول یورپ نے ترکی ممالک کے ساتھ کی۔ فلسطین علاحدہ ملک ہے۔ شام علاحدہ، لبنان علاحدہ، مصر علاحدہ، حجاز علاحدہ وغیرہ وغیرہ۔ افسوس! تقسیم کی درجنوں مثالیں تحریر کرتے وقت مولانا کو حال کی تقسیم کا خیال نہ آیا کہ جب ہندوستان کو کچھ اختیارات دیے جا رہے تھے تو برما کو علاحدہ کر دیا گیا۔ آج برما اور ہندوستان کے متعلق برٹش امپایر کے طرز

عمل سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

بلوچستان اب بھی علاحدہ ہے۔ معلوم نہیں مولانا اس کی علاحدگی پسند کرتے ہیں یا ہندوستان کے ساتھ الحاق؟ اور اُس میں صوبۂ سرحد کی طرح آئینی حکومت کا قیام!

آج یورپ کی سیاست جس اسلوب کو اختیار کیے ہوئے ہے کہ بڑے بڑے ملکوں کے چھوٹے چھوٹے حصے کر کے اُن پر اپنے اقتدار کا پرچم لہرایا جائے۔ اُس کے پیش نظر ہر ہمدرد ملت کے سامنے تقسیم کی یہ مثالیں رہنی چاہییں جو دورِ حاضر کی مثالیں ہیں۔

مسٹر راج گوپال آچاریہ نے ایک آواز اُٹھائی ہے کہ جو صوبے ویول پلان کے بہ موجب اختیارات لینا چاہیں ان کا فیڈریشن بنا دیا جائے، باقی صوبے بعد میں شامل ہوتے رہیں گے۔

اگر وہایٹ ہاؤس یہ آواز سن کر ہندو ہندوستان سے کوئی سمجھوتا کرلے تو یہ مسلم صوبوں کے لیے غلامی کی طرف رجعت قہقہری ہوگی یا آزادی کی جانب اقدام؟

کاش! مسلمانوں کی تاریخ پیش فرماتے ہوئے مولانا یہ بھی بتادیتے کہ مسلمان فاتحین نے ہندوستان کو تقسیم کیا یا اُس کو متحد کیا؟ یہ بات تو تاریخ کے مبتدی کو بھی معلوم ہے کہ کابل ہندوستان کا ایک صوبہ تھا، لیکن یہ بات جناب کے لیے یقیناً اجنبی ہوگی کہ سلطان عالم گیرؒ نے پورے ہندوستان کو دولت مغلیہ کے زیرنگیں کر کے دارالاسلام بنا دیا تھا۔

اگر دارالاسلام، دارالحرب بنا دیا جائے تو مسلمانوں کا فرض کیا ہے اور آیا تمام دارالاسلام کو کسی نہ کسی نوع سے پھر دارالاسلام بنانا ضروری ہے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک حصے کے لیے جدو جہد کو مخصوص کر کے باقی حصہ دارالحرب یا دارالکفر کے لیے ہمیشہ کے واسطے وقف کردیں؟ یہ ایک فقہی نظر کی چیز ہے۔

اس کا فتویٰ مسٹر جناح نہیں دے سکتے، جو بہ آسانی تین کروڑ مسلمانوں کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا فتویٰ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب دے سکتے ہیں۔ یا اُن مقدس مشاہد و مزارات کی زبانِ حال جو ہندو ہندوستان کے گوشے گوشے میں موجود ہیں اور جو ہر بہی خواہ ملت اور دردِ جگر رکھنے والے کو اپنی بیش بہا قربانیاں یاد دلا رہے ہیں۔

پاکستان یا دارالاسلام:

کاش! پاکستان اور اسلامی حکومت ہم معنی ہوتے تو صبر کی جگہ تھی۔ مگر افسوس! اس دل فریب لفظ کی تعریف مسٹر جناح تو بار بار یہ فرما رہے ہیں ''پاکستان کی حکومت جمہوری ہوگی اور سارا نظم ونسق عوام کے نمایندوں کے ہاتھ میں ہوگا۔''

(انجام - مورخہ ۲۷/ اگست ۱۹۴۵ء، مسٹر جناح کی احمد آباد کی تقریر)

یعنی اُس اسمبلی کے ہاتھ میں جس میں کم وبیش ۴۵ فی صدی غیر مسلم ہوں گے، جو قانون بنانے میں شریک ہوں گے اور جس کی وزارت میں غیر مسلموں کا حصہ بھی شایانِ شان ہوگا۔ ان الحکم الا اللہ کی پاکستانی تفسیر ملاحظہ ہو۔ کیا یہی دارالاسلام اور یہی اسلامی حکومت ہے؟ اگر اس کا نام اسلامی حکومت ہے تو پھر ہندو اکثریت کے صوبوں کو بھی دارالاسلام کیوں نہ کہا جائے؟ حکومت میں فی الجملہ مسلمانوں کا حصہ تو ان صوبوں میں بھی ہوگا۔

پھر اگر کچھ اور غور وفکر سے کام لے کر پنجاب و بنگال کی ۴۵ فی صدی والی خوش حال اقلیت اور ہندوستان کی اوسطاً سات آٹھ فی صدی والی مفلوک الحال اقلیت کا مقابلہ کریں اور ان دونوں حصوں کے معدنی تجارتی اور اقتصادی تفاوت کا موازنہ نہ کریں تو آپ کی دیانت اور آپ کے انصاف کا فیصلہ یقیناً حضرات علمائے کرام کی موافقت اور تائید کرے گا۔

ایک وہ حصہ ہے جس کے صوبہ جات ایک دوسرے سے متصل۔ جس کے پاس درآمد و برآمد کے ذرائع بہت کافی ہیں۔ جس کے معدن کھلے ہوئے سونا اُگل رہے ہیں۔ جس کے باشندے خوش حال، جس میں بے شمار کارخانوں کا جال بچھا ہوا۔ دوسرا حصہ اُس کے مقابل ان تمام باتوں میں نسبت سے بہت زیادہ پست۔ تو کیا ان دونوں حصوں میں مقابلے کا چیلنج مسلمانوں کے لیے مفید ہوسکتا ہے؟

(۶) مولانا ابوعلی صاحب کی خواہش یہ ہے کہ

> ''جس خطۂ زمین میں جس قوم کی اکثریت ہو اُسی کی حکومت ہو، وہی آئین و قانون بنائے، وہی نافذ کرے۔'' (منشور: ۱۹/ جولائی ۱۹۴۵)

ہمیں تعجب ہے۔ اگر واقعی مولانا کی یہ خواہش ہے تو پھر جمعیت علمائے ہند یا انڈین نیشنل کانگریس پر وہ اعتراض کیوں کر رہے ہیں اور اس قسم کے طویل مضامین لکھ کر عام

مسلمانوں کے دماغوں کو کیوں منتشر کرتے ہیں؟ مولانا کو معلوم ہونا چاہیے کہ جمیعت علماے ہند اس سے بہت آگے تک جا چکی ہے اور انڈین نیشنل کانگریس اس کو منظور کر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو! جمیعت علماے ہند کے اجلاس لاہور کے الفاظ یہ ہیں:

(الف) ہمارا نصب العین آزادیٔ کامل ہے۔

(ب) وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، اُن کا مذہب آزاد ہوگا۔ مسلم کلچر اور تہذیب وثقافت آزاد ہوگی۔ کسی آئین کو قبول نہ کریں گے، جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج) ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خودمختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یک ساں ہو۔

آزاد صوبوں کا وفاق:

(د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے، مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب وثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی۔ یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصولوں پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

یہ ہے اجلاس لاہور ۱۹۴۲ء کا تاریخی ریزولیوشن جو ہندوستان کی عظیم الشان وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے اُن تمام خطرات کو ختم کر دیتا ہے جو مسلمانوں کو بہ حیثیت ثانوی اکثریت کے پیش آسکتے ہیں۔

پھر مجلس عاملہ کے اجلاس مورخہ ۳۱ر جنوری تا ۲ر فروری ۱۹۴۵ء نے اس کی مزید تشریح کر دی، جس کو جمیعت علماے ہند کے اجلاس سہارن پور نے تقریباً سات گھنٹے کی گرما گرم بحث وتمحیص کے بعد لفظ بہ لفظ منظور کر لیا۔ اس تشریح میں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ

''وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے حق

خوداارادیت تسلیم کرلیا جائے۔'' (ملاحظہ ہو رپورٹ اجلاس سہارن پور)

اجلاس لاہور جمعیت علماے ہند سے چندروز بعد انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس مورخہ ۱۰/اپریل ۱۹۴۲ء بہ مقام دہلی میں ایک طویل تجویز کے ضمن میں یہ اعلان کیا:

''کمیٹی کسی علاقے کے لوگوں کو مجبور نہیں کرسکتی کہ وہ اپنی اعلانیہ اور قایم کی ہوئی مرضی کے خلاف کسی یونین میں شامل ہوں۔'' (تیج: مورخہ ۱۳/اپریل ۱۹۴۲ء)

پھر چند ماہ بعد اسی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲/اگست ۱۹۴۲ء بہ مقام بمبئی میں آئین ہندوستان سے متعلق ایک طویل ریزولیوشن میں یہ طے کیا کہ:

''کانگریس کے نظریے کے مطابق یہ آئین فیڈرل (وفاقی) ہونا چاہیے اور اس فیڈریشن میں شریک ہونے والی یونٹوں کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہیے اور اختیارات ماتحی بھی انھیں یونٹوں کے ہاتھ میں ہونے چاہییں۔'' (تیج: مورخہ ۸/اگست ۱۹۴۲ء، کالم ۴، ص ۲)

ان تمام تصریحات کے بعد کیا مولانا ابوعلی صاحب کے اس مضمون کو یا اس جیسے اور مضامین کو جن میں حریت پرور طبقے اور بالخصوص علماے اسلام پر زیادہ سے زیادہ بہتانوں کی بارش کی جاتی ہے، شرم ناک پروپیگنڈا نہیں کہا جائے گا؟ جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مذہب اور مذہبی علما کے اقتدار کو ختم کیا جائے۔ مسلم عوام کو راہ آزادی سے گم راہ کرکے ہندوستان کی غلامی کی عمر کو دراز کیا جائے اور ہندوستان کی آئینی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکا کر اس یورپین گروپ کو خوش کیا جائے جو ہندوستان کی سربلندی کو ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کرسکتا اور جس کی موافقت کرکے مسٹر جناح نے شملہ کانفرنس میں فہرست پیش کرنے سے انکار کیا اور اس طرح شملہ کانفرنس کو ناکام کیا۔ یالیت قومی یعلمون!

(زمزم۔لاہور: ۱۳/ستمبر و ۱۷/ستمبر ۱۹۴۵ء)

اتحاد واشتراک (مسلم ہندو) کی تلقین:

بمبئی ۲۸/دسمبر ۱۹۴۵ء: کل رات یہاں مسلم میمن چیمبر آف کامرس کے ایک جلسے میں مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک تقریر کی اور کہا کہ

"اگر ہندو ہماری جدوجہد میں ہمارا ساتھ نہیں دیتے تو مسلمانانِ ہند اور مسلم لیگ تن تنہا اپنی منزل مقصود یعنی پاکستان اور آزادی ہند کے لیے اقدامات شروع کر دیں گے۔ مسٹر جناح نے ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ حقایق کا مقابلہ کریں اور انھیں دعوت دی کہ وہ مشترکہ طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آزادی کے لیے قدم بڑھائیں۔ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان برطانوی حکمرانوں کے غلام ہیں۔ جب ہم پاکستان کی جنگ لڑتے ہیں تو ہم انگریز کے خلاف جنگ کرتے ہیں، ہندو کے خلاف نہیں۔ ہمیں اپنی آزادی انگریزوں سے حاصل کرنی پڑے گی اور اسی کے بعد پاکستان قایم کرنا پڑے گا۔ ہندوؤں سے ہم پاکستان حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم پاکستان کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آزادی کا حصول ہے۔ اسی لیے ہمیں مشترکہ طور پر اپنی آزادی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔"

ایڈیٹر: مسٹر جناح نے یہ تقریر ایک ٹی پارٹی کے موقع پر کی، جو میمن چیمبر آف کامرس نے آپ کی سترویں سال گرہ پر دی تھی۔ مسٹر محمد علی جناح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

"مسلم لیگ برطانیہ سے لڑ رہی ہے، ہندوؤں سے نہیں۔ یہ کہنا ایک شرارت پسند (کذب ہے) کہ ہم ہندوؤں سے لڑ رہے ہیں۔ ہم عظیم ہندو قوم سے نہیں لڑ رہے ہیں۔ ہم تو کانگریس ہائی کمان سے لڑ رہے ہیں۔ جو مسلمانوں کی آزادی کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں اور ہندوؤں کی آزادی میں بھی۔ ضرورت ہے کہ ہندو ہماری جدوجہد آزادی میں ہمارے ساتھ شریک ہوں اور اگر وہ شرکت نہ کریں گے تب بھی ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے اور تن تنہا اپنی منزل مقصود یعنی پاکستان اور آزادی کی منزل کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے۔" (انصاری - دہلی، ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۵ء)

احرار، جمعیت علماے ہند اور خاک ساروں سے صدر مسلم لیگ کی اپیل:

۲۸ر اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح نے عید الفطر کے موقع پر

اپنے پیغام میں مسلمانانِ ہند خصوصاً مجلسِ احرار، جمعیت علماے ہند، خاک سار اور دیگر نیشنلسٹ مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اسلام کے تحفظ کی خاطر مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔

اس بیان کی وضاحت میں قایداعظم نے کہا:

''مسلمانانِ ہند سیاست کے اس نازک مرحلے پر ہر قسم کی آزمایشوں پر پورا اترنے کے لیے متحد و منظم ہو جائیں۔ وایسراے اور برطانوی حکومت نے کانگریس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اب ان کی طرف سے اعلان ہونا باقی ہے کہ وہ ہندوستانی فرماں روائی سے دست بردار ہو رہے ہیں۔

لہٰذا میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ منظم اور اپنی سرگرمیوں اور اپنی طاقت کو مجتمع کر کے ہر قسم کی آزمایش کے لیے تیار ہو جائیں۔

میں چاہتا ہوں کہ اس مبارک تقریب پر مسلمان مرد، عورت، بچے اور بوڑھے عہد کریں کہ وہ منظم سپاہی کی طرح کام کریں گے۔ فضا بہت تاریک ہے۔ برطانوی حکومت اور وایسراے کی کارفرمائیاں پراسرار پردوں میں جاری ہیں۔ ہر وقت دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ ہمیں بدنام کیا جارہا ہے۔ وایسراے اس سلسلے میں اندر اندر اس انداز سے قدم بڑھا رہے ہیں جو حد درجہ غیر مآل اندیشانہ اور غیر ذمے دارانہ ہے۔

میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ غیر مشروط طور پر مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ مسلمان آپس میں ہرگز نبرد آزما نہ ہوں۔ ہم آج تہیہ کرلیں ایک عظیم قوم کی طرح متحد ہو کر ناگفتہ بہ صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم کامیاب ہو کر دم لیں گے۔''

صدر مسلم لیگ کے جواب میں:

۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء: جلسے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے مجلس احرار کے صدر کی حیثیت سے لاہور بیرون دہلی دروازہ قایداعظم محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۸ر

اگست کی تقریر کے جواب میں کہا:

''مجلس احرار دین داروں کی جماعت ہے، اس لیے ہم دین داروں کے ساتھ مل سکتے ہیں، ان کے ساتھ ہمارا اتحاد نہیں ہوسکتا ہے جو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو گالیاں دیتے ہیں اور اپنے کتوں اور بلیوں کو صحابۂ کرام او حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہم نہ ہی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں جن کی ساری زندگی غیر اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔ ہمارا ان لوگوں کے ساتھ میل جول نہیں ہوسکتا جو صبح کچھ اور شام کچھ فیصلے کرتے ہیں اور رات گزرنے پر نئے سرے سے سوچنا شروع کردیتے ہیں۔

مسلم لیگ کے صدر قاید اعظم نے ہمیں مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی ہے۔ ہم انھیں اور تمام مسلم لیگیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ برے عقیدوں سے تایب ہوکر مجلس احرار میں شامل ہوجائیں۔

مسلم لیگ نے وزارتی مشن کی تجویز کو قبول کرکے ایک مرکز اور ایک قوم کے اصول کو تسلیم کرلیا اور پاکستان کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا تھا لیکن ڈیڑھ ماہ کے بعد اسی مسلم لیگ نے اپنے اس فیصلے کو واپس لے لیا۔ اب سارا معاملہ اور جھگڑا نشستوں کا ہے کہ مسلمان کو پانچ ملیں، چھ نہ ملیں۔ میں مسٹر جناح سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کون سا بد بخت مسلمان ہوگا جو کانگریس کی طرف سے حکومت میں شامل ہوکر اسلامی مفاد کی حمایت نہیں کرے گا۔ ہم نے کانگریس کے سامنے پینتالیس، پینتالیس اور دس کا فارمولا رکھا تھا لیکن مسلم لیگ نے پینتالیس کے بجائے پینتیس فی صد قبول کرلیا۔ اب ہم کس منہ سے کانگریس سے کہیں کہ وہ مسلمانوں کو پینتالیس فی صد نیابت دے۔

مسلم لیگ کے لیڈر ملک میں تشدد کی دھمکیاں نہ دیں اور آتشیں تقریریں نہ کریں۔ اس طرح وہ ملک کے امن کو خراب نہ کریں۔ مسلم لیگ کو چاہیے کہ وہ ظہیر الحسن لاری کی بات مان کر نئی عارضی حکومت میں شامل ہوجائیں۔ اس لیے کہ وہ حکومت کے اندر جاکر مسلمانوں کی بہتر خدمت کرسکتے ہیں اور جو چیز

مسلمانوں کے لیے مفید ہوگی احرار اس کی باہر رہ کر حمایت کریں گے اور جو بات اسلامی اصولوں کے خلاف ہوگی ہم اس کی ڈٹ کر مخالفت کریں گے۔ لیگی دوستو! کانگریس کو اکیلے حکومت کرنے کا موقع مت دو۔''

کلکتہ کے فساد کا ذکر کرتے ہوئے شاہ جی نے کہا:

''اس فساد سے سب کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ یاد رکھو! ایسے فسادات سے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔''

تقریر کے آخر میں شاہ جی نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی تجویز کے انعقاد کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک انکشاف کیا کہ

''ہم نے گزشتہ سال ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے نمایندہ مسٹر محمد اقبال کے توسط سے مسٹر جناح کے سامنے اس قسم کی ایک تجویز رکھی تھی اور اس کے لیے تمام جماعتوں کے لوگوں کو مولانا آزاد کے مکان پر جمع کرنے کا ذمہ لیا تھا، لیکن مسٹر جناح نے ہماری اس اپیل کو بہرے کانوں سے سنا۔ ہم چاہتے تھے کہ مسٹر جناح اس کانفرنس میں بتائیں کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان کس طرح مفید ہے؟

ایک طرف وہ غیر لیگی مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں مانتے اور دوسری طرف انھیں لیگ میں شمولیت کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس واحد نمایندگی کے زعم میں جب انھیں ہندو اور انگریز سے منہ کی کھانی پڑی تو نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ مجلس احرار کو بھی دعوت دی جا رہی ہے۔

میں نے گزشتہ سال کشمیر سے واپسی پر دہلی میں اور پھر امرتسر میں قاید اعظم کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ وہ مجھے اپنے ہاں بلا کر پاکستان کا مفہوم سمجھا دیں۔ اگر ان کی بات میرے ضمیر اور دل نے قبول کر لی تو پھر قاید اعظم آپ آرام سے بمبئی بیٹھیں۔ میں تنہا ہندو اور انگریز سے لڑ کر انھیں پاکستان لے کے دکھاؤں گا، لیکن مجھے افسوس ہے کہ انھوں نے میری بات کا جواب تک بھی دینا نامناسب سمجھا۔ میں اب بھی انھیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ آل پارٹیز مسلم

کانفرنس میں شریک ہوکر اپنی بات سمجھائیں۔

میری بات یادرکھو! اگر قاید اعظم اپنی ضد پر اڑے رہے، پھر ہندوستان ہی تقسیم نہیں ہوگا، پاکستان بھی تقسیم ہوگا۔

میں آج جہاں کھڑا ہوکر بول رہا ہوں ایک ویرانہ بننے والا ہے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ قافلے آرہے ہیں اور قافلے جارہے ہیں۔ ہندوستان، مسلمانوں کے لیے ایک زندہ قبرستان ہوگا۔

یادرکھو! تقسیم اگر ہوئی تو امرتسر تک کا علاقہ ہندوستان لے جائے گا اور پاکستان پر رفتہ رفتہ وہی لوگ قابض ہوجائیں گے جو آج بھی انگریز کے غم خوار اور نمک خوار ہیں۔ یہ امرا کی ایک جنت ہوگی، لیکن ننانوے فی صد عوام کے لیے یہی شب وروز ہوں گے اور اسلام ایک مسافر کی طرح ہوگا۔

میں مسلمانوں میں تصادم نہیں چاہتا۔ نکتہ نگاہ کی بات ہے۔ قاید اعظم مسلمان جماعتوں کی ایک مجلس مشاورت بلائیں۔ مجھے اپنے نکتۂ نگاہ پر قایل کرلیں تو میں ان کا سپاہی ہوجاؤں گا۔ مجھے کیا لینا ہے؟ کچھ نہیں۔ لیکن اس صورت میں انکی جنگ میں لڑوں گا۔ جنگ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ہندو سے بھی لڑوں گا اور انگریز سے بھی۔ قاید اعظم بڑے ہیں، ہم چھوٹے ہیں، لیکن بڑوں کا کام چھوٹوں کو دھتکارنا نہیں، سمجھانا ہے۔'' (روزنامہ ''انقلاب'' - لاہور، ۴ ستمبر ۱۹۴۶ء)

جلسے کے آخر میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی:

'' آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی نے آج اپنے اجلاس میں فیصلہ کیا ہے کہ اگر مسلم لیگ کوئی تحریک چلائے گی تو احرار کسی صورت میں بھی اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ نیز یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ مسٹر جناح نے غیر مسلم لیگیوں سے جو اپیل کی ہے اس کے پس منظر میں ایک کمیٹی ترتیب دی گئی ہے، جس میں مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ حسام الدین اور شورش کاشمیری شامل ہیں۔ انھیں اختیار دیا گیا ہے کہ مسلم لیگ یا کسی دوسری جماعت سے مصالحت کی گفتگو کرسکتے ہیں۔''

صدر مجلس احرار کے بعد جمعیت علمائے ہند کے ناظم اعلا مولانا احمد سعید دہلوی نے مسٹر محمد علی جناح کی اپیل کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''جمعیت علمائے ہند مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کے اس بیان کا خیر مقدم کرتی ہے، جس میں انھوں نے لیگ کے علاوہ باقی مسلمان سیاسی جماعتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اتحاد باہمی کے ساتھ انگریز اور ہندو کا مقابلہ کریں۔ بلاشبہ اس وقت کی ضرورت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں باہم ربط ہو، لیکن جناح صاحب یہ سوچ لیں کہ ان کے واحد نمایندگی کے دعوے کا کیا ہوگا؟ جب کہ وہ خود غیر لیگی مسلمانوں کو کافر قرار دے چکے ہیں۔ اس کے باوجود میں ان کے اس جذبے کی قدر کرتے ہوئے ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ غیر مسلم لیگی جماعتوں کے اجلاس میں شریک ہو کر ان کے سامنے اپنا موقف بیان کرنے پر آمادہ ہیں؟ اگر تیار ہوں تو نیشنلسٹ مسلمان جماعتیں ان کی رہنمائی قبول کرنے کو تیار ہیں۔''

(سہ روز ''الجمعیۃ'' دہلی)

اسی طرح خاک سار تحریک کے رہنما علامہ عنایت اللہ مشرقی نے ۲۳ر ستمبر کو اورینٹ پریس کو مندرجہ ذیل بیان دیا:

''میں نے ۹ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح کو لکھا تھا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا کہ ''اگر مسٹر جناح مجھے بہ ذریعہ تحریر یقین دلا دیں کہ وہ پاکستان کو ہندوستان کی مجموعی آزادی کے طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہندوستان کو انگر[illegible] کے پنجے سے آزاد کرانے کے واضح اصول پر مسٹر گاندھی کے سات[illegible] گے تو میں خاک سار نظام کی ساری جمعیت ان کے حوالے کر دو[illegible]''

یہ خط میں [illegible] مسٹر جنا[illegible] اپیل کے جواب میں بھیجا تھا جو انھوں نے عید کے [illegible] مسلم [illegible] جماعتوں کے علاوہ خاک ساروں سے بھی اپیل کی تھی کہ وہ مسلم لیگ میں [illegible] کر آزاد[illegible] کی لڑائی لڑیں، تا کہ ہندوستان کو غلامی سے

نجات دلائی جائے۔

لیکن اس خط کا مسٹر جناح نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چناں چہ آج میں نے مسٹر جناح کو رجسٹری قانونی نوٹس بھیج دیا ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ ''اگر انھوں نے دس روز کے اندر اندر میرے خط کا جواب نہ دیا تو میں عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دایر کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا اور اس طرح مرد، عورتیں اور بچوں کی اس خون ریزی کو بند کرادوں گا جس کا حکم مسٹر جناح نے اس وقت دے رکھا ہے۔''

نوٹ: مسلم لیگ کے صدر قایدِ اعظم محمد علی جناح نے ۲۸ راگست عید الفطر کے موقع پر ایک بیان کے ذریعے مسلم لیگ سے باہر کی جماعتوں کو جو دعوت دی اس کے جواب میں ہر سہ جماعتون کے رہنماؤں نے اپنی اپنی سوچ اور فکر کے مطابق اخبار اور خطوط کے ذریعے قایدِ اعظم کو بات پہنچادی کہ ہم آپ کے حکم کی تعمیل میں حاضر ہیں لیکن غیر مشروط نہیں۔ باہم مل بیٹھ کر طے کرلیں کہ نئی لاینوں پر چلنا ہے اور کس طرح چلنا ہے۔ خیال تھا کہ لیگ کے صدر نے ان کے جواب میں کچھ کہا ہوگا۔ مگر واقعات کی چھان بین سے جواب تلاش کرنے میں مایوسی ہوتی ہے۔

(جاں باز مرزا، کاروانِ احرار: ج ۷، ص ۳۶۸-۶۹)

لیگ کی سیاست حضرت شیخ الاسلام کا تجزیہ!

۱۱ راکتوبر ۱۹۴۶ء:

.......(۱) آج اُن لوگوں کی پالیسی پر بحث کی ضرورت ہے جنھوں نے اپریل ۱۹۴۲ء میں سر اسٹیفورڈ کی تجاویز کو اس بنا پر مسترد کر دیا تھا کہ ان میں پاکستان کا غیر مشتبہ اقرار و اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ (مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں: ص ۳۶۱) لیکن ۶ رجون کو انھوں نے پاکستان کے غیر مشتبہ اقرار و اعلان کو بالکل فراموش کر دیا اور اب بھی معاملے کی عام صورت یہی ہے۔

(۲) اُن لوگوں کی پالیسی پر بحث کی ضرورت ہے جنھوں نے اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی مجوزہ نیشنل گورنمنٹ کو اس بنا پر ردّ کیا تھا کہ اس کا نتیجہ ہندو راج ہوگا یا ہندو

اکثریت کی حکومت (مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں: ص ۳۸۳)، لیکن ۲۶ رجون کو انھوں نے ہندو اکثریت قبول فرمائی۔

(۳) پھر انھوں نے دستور ساز اسمبلی سے اس بنا پر اختلاف کیا تھا کہ اس میں بہت بڑی اکثریت ہندوؤں کو حاصل ہوگی۔ تاہم انھوں نے ۶ رجون کو یہ اکثریت بھی بے تکلف قبول کر لی۔

(۴) انھوں نے زیادہ سے زیادہ خود مختار عناصر کے ساتھ آل انڈیا فیڈرل گورنمنٹ کو نامنظور کر دیا تھا اور دلیل یہ دی تھی کہ مسلمانوں کو جن علاقوں میں اکثریت حاصل ہے وہ بھی تمام اہم معاملات میں مرکز کی ہندو اکثریت کے تابع ہو جائیں گے۔ (مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں: ص ۳۸۴) لیکن ۶ رجون اور ۲۶ رجون کو یہ سب کچھ بھی اس طرح مان لیا گیا گویا مقصود و مطلوب یہی تھا۔

(۵) بحث اُن لوگوں کی پالیسی پر ہونی چاہیے جنھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے تیئسویں اجلاس ۲۴ راپریل ۱۹۴۳ء میں فرمایا تھا کہ بعض لوگ ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن کی باتیں کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''وفاقی عناصر کو زیادہ اختیارات دے دیے جائیں اور باقی ماندہ حقوق بھی انھیں کے حوالے کر دیے جائیں، لیکن یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں کی ساری دستوری تاریخ کو فراموش کر رہے ہیں۔ فیڈریشن کی کوئی تعبیر کر لی جائے، اس کے لیے کوئی شرطیں تجویز فرمائی جائیں، لیکن انجام کار فیڈریشن وفاقی عناصر کو تمام اہم امور میں اختیارات سے محروم کر دے گی۔ اگر فیڈرل حکومت کی اصل مان لی گئی تو وفاقی عناصر خواہ کچھ کریں، لیکن وہ مرکزی ادارے کو زیادہ سے زیادہ اختیارات سونپنے پر مجبور ہوں گے۔ یہاں تک کہ بالآخر انھی عناصر کے ہاتھوں ایک مضبوط مرکزی حکومت قایم ہو جائے گی۔

محض یہی نہیں بلکہ اس دعوے کے ثبوت میں جمہوریہ امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، جرمنی اور بعض دوسرے ممالک کی مثالیں دی گئیں پھر اصل دعوے کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

''ہم ایسی ہر اسکیم کے مخالف ہیں اور کسی ایسی تجویز پر راضی نہیں ہو سکتے جس کی بنیاد مرکزی حکومت، فیڈرل یا کنفیڈرل کے خیال یا تصور پر رکھی جائے۔ اس

لیے کہ یہ حکومت پایاں کار ساری ملت اسلامیہ کو اقتصادیات، معاشرت، تعلیم، کلچر اور سیاست میں بے دست و پا بنا دے گی (اصل الفاظ میں خصی کر کے رکھ دے گی) اور اس برِ کوچک (یعنی ہندوستان) میں ہندو اکثریت کا راج قایم ہو جائے گا۔ (مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں: ص ۳۶۵ تا ۳۸۶)۔ لیکن ظاہر ہے کہ ۶/ جون کو یہ حقایق بالکل بھلا دیے گئے اور آج بھی جو گفتگو ہو رہی ہے ان حقایق کی فراموشی ہی کی بنا پر ہو رہی ہے۔''

(انقلاب- لاہور، ۱۵/ذی قعدہ ۱۳۶۵ھ/ ۱۱/اکتوبر ۱۹۴۶ء)

........یہ مقاصد اپنی حقیقی صورت میں قایداعظم کے بیان مورخہ ۱۵/ جولائی ۱۹۴۵ء میں درج ہیں، جو مختصراً یہ ہیں:

(۱) ویول پلان ہندو کانگریس، ہندوستان کی جغرافیائی وحدت کے نئے مبلغ لارڈ ویول اور گلنسی خضر اتحاد کا ایک جال ہے۔ اگر اس میں پھنس جاتے تو اپنی موت کے محضر پر دستخط کرتے۔

(۲) ہم کسی انٹریم گورنمنٹ میں اس وقت تک شریک نہیں ہو سکتے جب تک کہ برطانوی حکومت یہ وعدہ نہ کرلے کہ وہ پاکستان قایم کر دے گی اور تجویز لاہور ۱۹۴۰ء کا خیال رکھے گی۔

(۳) ہماری دوسری شرط یہ ہے کہ ہم ایک اقلیت نہیں، ایک قوم ہیں۔ ہم عبوری حکومت میں صرف اسی وقت شریک ہو سکتے ہیں جب ہماری شرطوں کو مان لیا جائے، جن کی نفی ویول پلان میں کی گئی ہے۔

(۴) صرف اندھا ہی اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ صرف لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہے۔

خلاصہ یہ کہ پاکستان کی منظوری، مسلمانوں کی علاحدہ قومیت کا اعتراف اور واحد نمایندگی کا اقرار، مسلم لیگ کے مطالبے کی تین بنیادیں تھیں۔ جن کے ساتھ حکومت میں ہندو مسلم مساوات چوتھی شرط تھی۔ قایداعظم فرماتے ہیں:

''اگر ہم ان بنیادوں سے الگ ہو جاتے تو شملہ کانفرنس سے ہر چیز کھو کر نکلتے۔

مسلمانوں سے غداری کرتے۔" (بیان ۱۵/جولائی ۱۹۴۵ء)

پہلی اور دوسری شملہ کانفرنس میں یہ بنیادیں منظور نہیں کی گئیں، اس لیے مسلم لیگ نے انکار کر دیا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ لیگ نے عارضی حکومت میں شریک ہونا منظور کر لیا ہے۔ ہم اس منظوری سے خوش ہیں، کیوں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعات کی عدالت میں ہمارا مقدمہ صحیح تھا۔ ہماری حکمت عملی حقیقی تھی اور ہمارے خیالات اور نظریات ہی سچے تھے۔ البتہ ہم جانتے ہیں کہ اگر یہی فیصلہ ہماری جماعت کا کوئی رہنما کرتا تو جناحی مسلمانوں کی رائے کا عذاب اس پر مسلط کر دیتی۔ ہم اپنے مسلم لیگی عزیزوں اور دوستوں سے عرض کریں گے کہ اب انھیں سکونِ قلب سے ہماری جگہ آ کر سوچنا چاہیے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ ہندو کانگریس اور انگریز کا اتحاد کتنا مکروہ تھا، مگر آج مسلمان بھی اسی اتحاد کا حقیقی عنصر بن گئے۔ پاکستان کی منظوری پہلی شرط تھی، مگر یہ شرط موسم خزاں کے پتے کی طرح زرد ہو کر جھڑ گئی۔

ہم پوچھ سکتے ہیں کہ کیا لارڈ ویول نے مسلمانوں کو ایک مشتعل قوم مان لیا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ انھیں واحد نمایندگی کا سوال بھی زاید المیعاد ہو گیا۔

مسلم لیگ کے سیاسی شعور کی اس ترقی کے لیے ہم اس کے رہنماؤں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ ہم دل سے ان کے اس فیصلے کو بابرکت سمجھتے ہیں، تاہم جو بات اس طرح ختم ہو سکتی تھی اس کو اب سے پہلے ختم کر دیا جاتا تو مسلمانوں کا اتحاد ضایع نہ ہوتا۔

ہندو مسلم مساوات کے مسئلے کی اہمیت سے ہم خود متفق ہیں، لیکن اس کو ختم کرنے کی ذمے داری لیگ پر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو انگریز اتحاد میں شگاف نہیں آیا۔ پاکستان کے لیے منظوری نہیں دی گئی۔ مسلمانوں کو علاحدہ قوم نہیں مانا گیا۔ واحد نمایندگی کا خاتمہ فرما دیا گیا۔ ہندو مسلم مساوات ایک ہریجن کو مسلمانوں کے حصہ میں شامل کر کے ختم کر دی گئی۔ ہمیں کہنے کی جرأت نہیں مگر قاید اعظم کا ارشاد ہے کہ

"اگر یہ بنیادیں باقی نہ رہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے سب کچھ کھو دیا۔ مسلمانوں سے غداری کی اور مسلم لیگ کو تباہ کر دیا۔"

ہمیں بھولنا نہ چاہیے کہ قاید اعظم نے ۱۰/ستمبر کو فرمایا تھا:

"میرے چھرا گھونپا گیا ہے، وہ الفاظ سے مندمل نہیں ہو سکتا۔"

انھوں نے ۳؍ستمبر کے بیان میں واضح کردیا تھا:

''اب پاکستان کے سوا اور کوئی فیصلے کا راستہ نہیں۔''

اس سے پہلے ۲۰؍اپریل کو نواب زادہ صاحب نے فرمایا تھا: لیگ پاکستان کا اصول منظور ہوئے بغیر عبوری حکومت میں شریک نہیں ہوگی۔ آج یہ سب دعوے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اُڑ گئے۔ غور فرمایئے! قافلہ کتنی بلندی سے روانہ ہوا تھا اور کتنی پستی میں گر کر پانچ عہدوں پر ختم ہوگیا۔ پہلے پاکستان کی شرط کے ساتھ عبوری حکومت کی منظوری کا اعلان تھا، پھر مرکزی حکومت کے مقاطعے کا اعلان ہوا، پھر ۱۲؍مئی کو فہرست مطالبات پیش کی گئی اور شرکت کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۶؍مئی کو وزارتی اسکیم کا اعلان ہوا۔ ۲۴؍مئی کو قاید اعظم نے ۹ وجوہ پیش کرکے اس اسکیم کو غضب ناک لہجے میں نامنظور کردیا۔ تمام اسلامی ہند آگ بگولہ ہوگیا۔ اب قاید اعظم شملہ سے دہلی پہنچے اور ۶؍جون کو پھر وزارتی تجاویز کو منظور کرلیا گیا اور اس کا نام ''تاریخی فیصلہ'' رکھا گیا۔ ۲۵؍جون کو کانگریس نے تجاویز پر اپنی منظوری صادر کی، اس لیے لیگ منظوری کے قلعے سے پھر باہر آگئی اور ۲۹؍جولائی کو بمبئی کے اجلاس میں عبوری حکومت اور نمایندہ اسمبلی کا پھر مقاطعہ کردیا گیا اور اس کا نام ''انقلابی فیصلہ'' رکھا گیا۔ دو ماہ نہ گزرے تھے یہ انقلابی فیصلہ بھی رد کردیا گیا۔ اور اس مرتبہ ایک ''سیاسی فیصلہ'' صادر کیا گیا، جس میں عبوری حکومت میں پانچ عہدے قبول کرلیے گئے، جن میں سے ایک اچھوت کو دے دیا گیا۔

ہم اس تمام صورت حال پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلم لیگ ہائی کمانڈ مسلمانوں کی عزت برقرار رکھنے میں بری طرح ناکام رہی ہے اور اس نے ہندوستان اور دنیا میں مسلمانوں کی سیاسی ساکھ کو تہ و بالا کردیا ہے۔ اس کے باوجود ہم اُسے معاف کرسکتے ہیں۔ اگر وہ ہندوستان کے ہندوؤں، ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوستان کی اقلیتوں کی آزادی کے لیے سچے دل سے متحد ہوکر میدان میں آئے۔ ہمارے دل کو اس سے سکون ہوتا ہے کہ اس نے انجام کار ہمارے نظریات کو مان لیا اور اُن اصولوں کو تسلیم کرلیا جن کو قوم پرور مسلمان پیش کررہے تھے۔ لیگ متحدہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں شریک ہورہی ہے۔ اب فوری پاکستان اس کا نصب العین نہیں ہے۔ اس نے مسلمانوں کی علاحدہ قومیت پر زور

دینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتی۔ وہ قوم پرور مسلمانوں کے وجود کو بھی مانتی ہے اور ان کے ساتھ مل کر بیٹھنے کے لیے تیار ہے۔ اور ہندو مسلم مساوات کو خود اپنے ہاتھوں ختم کر چکی ہے۔ سیاست کی ٹھوکریں کسی جماعت، کسی قوم، کسی فرقے کے لیے نیک فال نہیں، لیکن یہ سب کچھ اگر ملک کی تقدیر بدلنے کے لیے ہوا ہے تو ہم اسے قبول کرتے ہیں اور مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ وہ اس زہر کے گھونٹ کو تریاق سمجھ کر پی جائیں۔

(مدینہ۔ بجنور: ۲۵ رذی قعدہ ۱۳۶۵ھ/ ۲۱ راکتوبر ۱۹۴۶ء)

صدر کانگریس مولانا آزاد نے ایک اخباری بیان میں کانفرنس کی ناکامی پر رائے زنی کی اور آئندہ کے لیے حکومت کو مشورے بھی دیے، تاکہ مستقبل میں کی جانے والی مساعی کو پھر سے ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور ملک کی ترقی ایک گروہ کے عدم تعاون اور ضد بازی کی وجہ سے متاثر نہ ہو۔ انھوں نے کہا:

”موجودہ صورت حال سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔

پہلا یہ ہے کہ کانفرنس کی ناکامی کا ذمے دار وہ رویہ ہے جو مسلم لیگ نے اختیار کیا۔

دوسرا یہ ہے کہ اب جو مسلم لیگ نے انکار کر دیا ہے تو لارڈ ویول کو طے کرنا ہے کہ وہ آگے بڑھیں گے یا نہیں؟ فی الحال انھوں نے طے کیا ہے کہ آگے نہ بڑھیں گے۔

میں نے کانفرنس میں ایک بات کہی تھی کہ برطانوی حکومت اپنے آپ کو فرقہ واری مسئلے میں بری الذمہ نہیں کر سکتی۔ چاہے آج ہو یا کل، ایک نہ ایک دن اسے عدل وانصاف پر مبنی فیصلہ کر کے اس پر قایم رہنا ہوگا۔ اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہوگا۔ جو اس کے لیے تیار ہیں انھیں موقع ملنا چاہیے اور جو تیار نہیں ہیں انھیں الگ چھوڑ دیا جائے۔ فیصلہ کرنے کے بعد تامل اور ہچکچاہٹ تعریف کی بات نہیں بلکہ قطعی کمزوری کی علامت ہے۔

کانگریس نے جو رویہ اختیار کیا اس پر مجھے بالکل افسوس نہیں ہے۔ ہم نے جس حد تک ممکن تھا مسٹر جناح کی خواہشوں کا لحاظ کیا، مگر ہم ان کے اس دعویٰ کو تسلیم

نہیں کر سکتے تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد مختار نمایندہ جماعت مسلم لیگ ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلم لیگ کی وزارت نہیں ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمایندگی کرتی ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کا مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" (انڈیا ونس فریڈم)

راہ کی مشکلات کانگریس، لیگ اور نیشنلسٹ مسلمان:

۲۵ر مارچ ۱۹۴۷ء: زمزم میں آج کی اشاعت میں "راہ کی مشکلات کانگریس، لیگ اور نیشنلسٹ مسلمان" کے عنوان سے ایک دل چسپ اور فکر انگیز "مقالہ افتتاحیہ" شایع ہوا ہے۔ اس میں ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں:

"حقایق انسان کی کسی منطق سے نہیں بدل سکتے اور نہ آنکھوں والے واقعات سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ کانگریس اور کانگریسی ہندوؤں کی روش نے نہ صرف ہندوستان کے مسایل کو پیچیدہ بنا دیا ہے بلکہ ان لوگوں کی پوزیشن کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے جو نازک سے نازک اوقات میں بھی اس کی حمایت کرتے رہے ہیں! وہ مسلمان جنھیں نیشنلسٹ کہا جاتا ہے اور وہ م ن جنھوں نے کانگریس کے جھنڈے کے نیچے اپنی قربانیوں سے تمام پچھلے ریکارڈ مات یے ہیں، سخت پریشان ہیں، سخت مضطرب ہیں اور انتہائی طور پر مایوس ہیں کہ کانگریس کیا رہی ہے، کانگریسی ہندو کس راہ پر چل رہے ہیں اور ان کی پوزیشن کو کس طرح نازک بنایا ہا ہے؟ جب وہ سنتے ہیں کہ کانگریس، پنجاب کو تقسیم کرنے کا مشورہ دے رہی ہے، جب نا کے کانوں میں یہ آواز آتی ہے کہ ہندو اکثریت کے اضلاع پر مسلم اکثریت کا صوبہ کو قتدار قایم نہیں کر سکتا، تو وہ گردن نیچی کر کے سوچتے ہیں کہ پھر پاکستان کی مخالفت کا کیا ب؟ اور مسلم لیگ سے الجھنے اور متحدہ ہندوستان کا نعرہ بلند کرنے کا کیا مقصد؟ آخر پا ان کا مقصد اس کے سوا کیا ہے کہ مرکز کی ہندو اکثریت سے مسلم اکثریت کے صوبو نجات مل جائے اور پنجاب و بنگال، سرحد اور سندھ پر مرکز کو اکثریت کے خلاف حکومت نے کا اختیار حاصل نہ رہے؟ اگر پاکستان کا مطلب

یہی ہے اور بلاشبہ یہی ہے کہ مرکز کی دست درازیوں کا قصہ تمام ہو جائے تو بتایے پنجاب کی تقسیم کا مطلب کیا ہے؟ کیا اس کا منشا یہ نہیں کہ پنجاب کے جن اضلاع میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ پنجاب کی مسلم اکثریت سے نجات حاصل کرلیں اور پنجاب کا مرکز ہندوؤں کی عددی اکثریت پر اثر انداز ہو؟ اگر تقسیم پنجاب کا یہی مقصد ہے تو پاکستان اور تقسیم پنجاب میں جوہری بنیادی فرق کیا رہا؟ اگر کوئی فرق نہیں اور یقیناً نہیں تو کانگریس کس بنیاد پر پاکستان کی مخالفت کرتی ہے؟ ایک طرف پاکستان کی مخالفت کہ کانگریس متحدہ ہندوستان کی حامی ہے دوسری طرف پنجاب کی تقسیم کا مشورہ! کیوں کہ مشرقی پنجاب کی ہندو اکثریت فی نفسہ کوئی اصول ہے تو پاکستان بھی اسی اصول پر قایم ہے، پھر اس کے کیا معنی کہ جو اصول مغربی پنجاب کے لیے درست ہے وہی اصول مسلم اکثریت کے صوبوں کے لیے نادرست اور متحدہ ہندوستان کے منافی اور مناقض ہے۔

نیشنلسٹ مسلمان یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کانگریس نے پنجاب کی تقسیم کا مشورہ دے کر اپنے قول کی آپ ہی تردید کردی کہ دوسری طرف پنجاب اور بہار کے فسادات نے کانگریسی ہندوؤں کی ذہنیت کو بھی بے نقاب کر ڈالا۔ اسی پنجاب میں سب نے دیکھا، ہندو نے بھی اور مسلمان نے بھی، کانگریس نے بھی اور مسلم لیگ نے بھی اور حکومت کے کارندوں نے بھی کہ کانگریس کا ہر لیڈر فساد میں پیش پیش تھا۔ کانگریس اور فساد؟ کانگریس اور کانگریسیوں کی فساد پرور رہنمائی؟ سچر صاحب ہوں یا پنجاب کے دوسرے کانگریسی لیڈر، فساد کی ذمے داریوں سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ ہر کانگریسی لیڈر پاگل بنا ہوا تھا، ہر کانگریسی ہندو، دیوانہ وار ہندوؤں کو فساد پر اُبھار رہا تھا۔ لیگ اور کانگریس کی مخالفت کو تو نیشنلسٹ مسلمان برداشت کرسکتا ہے اور کرتا رہا ہے مگر وہ ہندو مسلم فساد کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔ لیگ کے پردے میں مسلمانوں سے مقابلہ و مصارعہ، لیگ کے پردے میں اسلام کے خلاف نعرے نہ کبھی نیشنلسٹ مسلمان کے لیے قابل برداشت ہوئے ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ غریب نیشنلسٹ مسلمانوں کو کانگریسی ہندوؤں نے چوراہے میں کھڑا چھوڑ دیا ہے۔ وہ سوچ رہے ہیں کہ کہاں جائیں اور کس طرف کا رخ کریں؟ اور نتیجہ یہ کہ ان میں اضطراب پھیل رہا ہے، ان پر مایوسی طاری ہے اور وہ اپنی شکست پر نادم ہیں اور ثبوت یہ کہ تقسیم پنجاب

اور فسادات کی نوعیت سے متاثر ہو کر یہ لوگ کانگریس سے مستعفی ہو رہے ہیں اور ان کی علاحدگی سے ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔

افسوس! ہماری باتوں کو کرپلانی اور پٹیل سننے کے لیے تیار نہیں۔ ٹنڈن ار سمپورانانند کو یہ توفیق کہاں کہ حالات کی نزاکت کا احساس کریں اور جن غریبوں نے ان کا آخر دم تک ساتھ دیا ان کی حالت پر رحم فرمائیں۔ اس کے بعد تعجب ہی کیا ہے، اگر کانگریس سے ان کا رشتہ ٹوٹ جائے اور وہ یا تو کانگریس سے علاحدہ ہو کر اپنی برأت کا اعلان کر دیں یا لیگ میں شامل ہو کر اسے اس کی بے اعتدالیوں کا مزہ چکھائیں۔

بہ ہر حال تقسیم پنجاب کی حمایت اور پاکستان کی مخالفت ایک معمہ ہے۔ لیگ اور کانگریس کے اختلاف کو ہندو مسلم فساد میں تبدیل کر دینا بھی ہر مسلمان کے لیے قابل غور ہے اور کانگریسی ہندوؤں کی وہ ذہنیت جو پنجاب اور بہار کے فسادات میں ظاہر ہوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے۔ (زمزم- لاہور، ۲۵ر مارچ ۱۹۴۷ء)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا ایک خط اور اس پر ردِ عمل:

۲۵ر مارچ ۱۹۴۷ء: ہم یہاں محمد ریاض درانی کے شکریے کے ساتھ قاید اعظم پیپرز سے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا ایک خط اور اس پر مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح اور مسلم پریس کے ایک نمایندہ اخبار مدینہ بجنور کا ردِ عمل پیش کرتے ہیں، اس کے علاوہ مرزا جاں باز کی تالیف کاروانِ احرار جلد ہشتم سے ایک اقتباس اور مولانا شبیر احمد عثمانی کا ایک تاریخی انٹرویو بھی نقل کرتے ہیں۔ ان تحریرات کے مطالعے سے مسلم لیگ کے صدر کی سیرت اور ذوق کے ایک پہلو پر روشنی پڑتی ہے، جس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

مجاہد ملت کا یہ ایک تاریخی خط ہے اور اس سے پہلے الجمعیۃ- دہلی، مدینہ- بجنور اور زمزم- لاہور میں بھی چھپا تھا۔ میرے سامنے ماہنامہ زندگی- الہ آباد (جون ۱۹۴۷ء: ص ۴۰-۳۹) کی اشاعت ہے۔ اس کے ساتھ مکتوب الیہ کا جواب بھی ہے۔ ''زندگی'' میں جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس مورخہ ۱۳-۱۵ر مارچ ۱۹۴۷ء کی قرار داد شامل نہیں ہے۔ مکتوب الیہ کا جواب ''زندگی'' سے لے کر شامل کر دیا ہے۔

مولانا کا خط مذکورہ بالا اخبارات کے علاوہ خواجہ رضی حیدر کی تالیف ''قاید اعظم -خطوط کے آئینے میں'' (کراچی ۱۹۸۵ء) میں بھی مکتوب الیہ کے جواب کے ساتھ شامل ہے، جو زندگی الہ آباد سے اخذ کیا گیا ہے۔

اس خط کی تاریخی سیاسی اہمیت کے علاوہ دینی فقہی لحاظ سے اس کا آخری پیراگراف بہت اہم ہے۔ مولانا نے چند آسان جملوں میں بہت بڑا دینی مسئلہ بیان فرما دیا ہے۔ مولانا کا یہ فرمانا:

> ''مسلمانوں کی کسی خاص سیاسی جماعت کا کوئی فیصلہ خواہ اس کی پشت پر وقتی طور پر عوام کی کتنی ہی زبردست اکثریت ہو، ''شرعی فیصلہ'' کہلانے کا مستحق نہیں۔ انعقاد شوریٰ کے بغیر کسی پارٹی کی ہنگامی اکثریت کو یقیناً یہ حیثیت نہیں دی جا سکتی کہ اس کے خاص قسم کے فیصلوں سے اختلاف رکھنے والے اصحاب رائے اور اربابِ علم ملت کے اجتماعی فیصلوں کا خلاف کرنے والے سمجھے جائیں۔''

ایک مستند فتوے کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ا۔س۔ش)

یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۵ر مارچ ۱۹۴۶ء

صدر محترم آل انڈیا مسلم لیگ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

مزاج گرامی! جمعیت علمائے ہند متعدد مرتبہ مسلم لیگ کو دعوت دے چکی ہے کہ ہندوستان کے موجودہ نازک دور میں یہ طریق عمل مسلمانانِ ہند کے لیے انتہائی خطرناک ہے کہ ہر ایک مسلم جماعت ''خواہ اس کو مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ نمایندگی حاصل ہو یا کم سے کم'' اپنے نقطۂ ہائے نظر کو جدا جدا حکومت کے سامنے اور دیگر اقوام ہند کے روبہ رو اور خود مسلمانوں میں پیش کرتے اور اس پر اصرار کرتے رہیں اور حاصل یہ نکلے کہ کوئی نقطۂ نظر بھی مثمر اور نتیجہ خیز نہ ہو سکے اور مسلمانوں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑے۔

نقطۂ نظر کا یہ اختلاف جمعیت علمائے ہند اور مسلم لیگ کے درمیان فروعی ہوتا تو وحدت واتحاد کی آسان شکل یہ تھی کہ اگر مسلم لیگ اپنے وقار کے نام پر پیش قدمی کو اپنی توہین سمجھتی تو

جمعیت علمائے ہند اس کو نظر انداز کر کے خود ہی پیش قدمی کرتی اور مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد عمل کا اعلان کر دیتی۔

لیکن جب کہ اس مسئلے میں کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے بلند و باعزت مقام کیا ہو! جو اُن کے دین اور دنیا دونوں کے تحفظ کا ضامن ہو؟ جمعیت علمائے ہند اور آل انڈیا مسلم لیگ کے درمیان بنیادی اختلاف ہے اور وہ اختلاف مسلمانانِ ہندوستان کے سامنے جانبین سے ظاہر ہو چکا ہے، تو ایسی صورت میں اسلامی احکام اور عقلی تقاضے کے پیش نظر صرف ایک ہی طریق کار رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ ممبروں کی تعداد اور مؤیدین کی کثرت و قلت سے قطع نظر ایک مرتبہ تمام مسلم جماعتوں کے اہل الرائے چیدہ بزرگ جمع ہو کر مجلس مشاورت کے ذریعے ہر ایک نقطۂ نگاہ پر جماعتی تعصب سے بالاتر ہو کر وسیع النظری کے ساتھ تبادلۂ خیالات کریں۔ موجودہ نقطہ ہائے نظر میں سے کسی ایک کو یا بحث و مباحثہ سے پیدا شدہ کسی نئے نظریے کو قبول کر کے اس کو متحدہ نظریہ بنالیں اور متفقہ قربانیوں کے ذریعے حکومت اور دیگر اقوام ہند سے اس کو تسلیم کرالیں۔

اس باہمی گفت و شنید کے نتیجے میں یہ بات بھی بہ آسانی طے ہو سکتی ہے کہ اتحاد مسئلے کی خاطر سیاسی پروگرام سے متعلق تمام جماعتوں کی آواز ایک ہی آواز بن جائے۔

آپ جیسے سیاسی مفکر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جون ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کو سیاسی طاقت منتقل کرنے کا جو اعلان برٹش حکومت کی جانب سے ہوا ہے، اس سے ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے اور اب وقت نہیں ہے کہ جماعتی تعصب یا ذاتی اور جماعتی تفریق و برتری کی قربان گاہ پر مسلمانوں کی جماعتی زندگی کو قربان کر دیا جائے اور یہ سمجھ کر کہ ہمارا فیصلہ الہامی ہے، دوسری جماعتوں کے مخلص رہنماؤں سے صرف اس لیے کنارہ کش رہا جائے کہ بعض خصوصی حالات کی بنا پر مسلم لیگ کو مسلمانوں کو آئینی اکثریت حاصل ہے۔ بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے اکثریت کی مدعی جماعت پر یہ فرض اور زیادہ عاید ہوتا ہے کہ وہ اس اتحاد کے لیے اقدام کرے جس پر جمعیت علمائے ہند اس وقت اقدام کر رہی ہے اور اس سے قبل بھی متعدد مرتبہ پیش کش کر چکی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اگر غیر لیگی جماعتوں کے نزدیک اسلامی احکام ہی کی روشنی میں

ہندوستان کے اندر آیندہ مسلمانوں کو بلند اور باعزت مقام حاصل کرنے کے لیے لیگ کا فیصلہ صحیح نہیں ہے بلکہ مضرت رساں ہے تو ایسی صورت میں مسلم جماعتوں اوران کے فیصلوں کو نظرانداز کر کے محض یہ دعوت دینا کہ وہ بغیر چون و چرا اپنے ضمیر کے خلاف مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں، اسلامی اور قرآنی حکم "وشاورھم فی الامر" اور "وامرھم شوری بینھم" کے قطعاً منافی ہے۔

اس لیے میں جمعیت علماے ہند کی مجلس شوریٰ کی حالیہ تجویز کے پیش نظر" جو اس مکتوب کے ساتھ منسلک ہے، "مسلم لیگ اور صدر مسلم لیگ کو دعوت اتحاد کی پیش کش کرتا ہوں اور اسلامی غیرت وحمیت کا واسطہ دے کر مخلصانہ اور دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس پر لبیک کہیں تا کہ مسلمانوں کے لیے کوئی متفقہ لایحۂ عمل بن سکے اور یہ انتشار دور ہو کر آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل روشن ہو سکے۔

میں جمعیت علماے ہند کی جانب سے یقین دلاتا ہوں کہ مجلس مشاورت کے اس اسلامی اصول کو اگر مسلم لیگ نے تسلیم کر لیا اور مسلم جماعتوں کے نمایندوں سے مشاورت کو ضروری سمجھا تو اس کے انعقاد کے لیے مسلم لیگ کی جانب سے جو طریق کار بھی آپ تحریر فرمائیں گے جمعیت علماے ہند اس پر لبیک کہے گی۔

آخر میں مجھے یہ بھی ظاہر کر دینا چاہیے کہ جب تک آپ مجلس مشاورت مرتب نہیں فرمائیں گے، مسلمانوں کی کسی خاص سیاسی جماعت کا کوئی فیصلہ خواہ اس کی پشت پر وقتی طور پر عوام کی کتنی ہی زبردست اکثریت ہو، "شرعی فیصلہ" کہلانے کا مستحق نہیں۔ انعقاد شوریٰ کے بغیر [کسی] پارٹی کی ہنگامی اکثریت کو یقیناً یہ حیثیت نہیں دی جا سکتی کہ اس کے خاص قسم کے فیصلوں سے اختلاف رکھنے والے اصحابِ راے اور اربابِ علم ملّت کے اجتماعی فیصلوں کا خلاف کرنے والے سمجھے جائیں۔ میں آپ کے جواب کا تختی کے ساتھ منتظر ہوں۔

آپ کا مخلص

محمد حفظ الرحمٰن

ناظم اعلا جمعیت علماے ہند

تجویز نمبر ۳ منظور کردہ مجلس عاملہ جمعیت علماے ہند، منعقدہ ۱۹ رتا ۲۱ ر ربیع الثانی

۱۳۶۶ھ/۱۳/تا۱۵/مارچ ۱۹۴۷ء

جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ اُن نئے حالات کی بنا پر جو وزیر اعظم برطانیہ کے بیان سے پیش آرہے ہیں اور ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کی آزادی سے پیش آنے والے ہیں، مسلمانوں کے باہمی اتحاد و اتفاق کو اُن کے مذہبی و قومی تحفظات کے لیے ضروری و لازمی سمجھتا ہے اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں سے پرزور درخواست کرتا ہے کہ اس وقت تمام مسلم جماعتوں کے نمایندوں کا ایک جگہ جمع ہوکر اس بات پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی و قومی تحفظات کے استحصال کی کیا صورت ہے اور وہ کس طرح حاصل ہوسکتے ہیں؟

اگر اس وقت مسلمانوں نے اس کی طرف سے لاپروائی برتی اور ضد و منافست سے کام لیا تو آزاد ہندوستان میں اُن کے لیے کوئی مناسب مقام نہ ہوگا اور اُن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

قاید لیگ مسٹر جناح کا جواب:

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلا جمعیت علماے ہند کے مندرجۂ بالا خط کے جواب میں مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے حسب ذیل جواب دیا ہے:

"ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ مالا بار ہل
بمبئی۔

۳/اپریل ۱۹۴۷ء

ڈیر سر!

مجھے آپ کی مرسلہ قرارداد اور آپ کا خط مورخہ ۲۵/مارچ ملا۔ میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ برطانوی حکومت کے قرطاس ابیض مورخہ ۲۰/فروری کے شایع ہوجانے کے بعد جو نئی صورتِ حال پیدا ہوچکی ہے اور اس نازک صورتِ حال کے پیشِ نظر جس سے ہم کو قریب ترین مستقبل میں دوچار ہونا ہے، میں آپ سے مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کے مسئلے میں قطعی متفق ہوں۔ اور میں نے اس مسئلے پر متعدد بار زور دیا ہے۔ خصوصاً دو باتیں

گزشتہ ہفتوں کے درمیان میں نے ہر مسلمان سے اپیل کی ہے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے۔ ہمارے لیے اب یہ وقت نہیں ہے کہ ہم اپنے داخلی اختلافات کے متعلق کوئی مسئلہ کھڑا کردیں اور یہ صرف ہمارا ہی کام ہونا چاہیے کہ ہم ایک منظم جماعت کی حیثیت سے اپنے دستور اساسی اور اپنے قواعد و ضوابط کی روشنی میں اس کو رفع کریں۔ یہ گھڑی وہ گھڑی نہیں کہ ہم اپنے گھریلو (اندرونِ خانہ) اختلافات میں الجھ جائیں۔ حال آں کہ ہمیں ایک شدید بیرونی خطرہ دھمکا رہا ہو۔ میں اس لیے آپ سے نہایت دردمندانہ درخواست (اپیل) کرتا ہوں کہ آپ بغیر کسی مزید تاخیر کے مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں اور مسلمانوں کے ملی مفاد کی حمایت فرمائیں اور پاکستان کا محبوب نصب العین حاصل کرلیں۔ یہ ہمارے اتفاق و اتحاد پر ہی منحصر ہے اور مسلم لیگ کی وفادارانہ تائید پر موقوف۔ جو مسلمانانِ ہند کی واحد بااختیار اور نمائندہ تنظیم ہے۔

میں نے واضح کردیا ہے کہ ہر مسلمان جو مسلم لیگ میں شریک ہونے پر رضامند ہے چاہے گزشتہ دور میں (اب سے پہلے) اس کے نظریات کچھ ہی رہے ہوں، خیر مقدم کا مستحق ہے اور میں جمعیت علماے ہند کے ہر رکن کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہوں۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ اس صورتِ حال پر دردمندانہ غور کریں گے۔ میں تو جدید رفتارِ واقعات کی روشنی میں جو سرزد ہو رہے ہیں اور ہندوؤں کی اہم سیاسی جماعتوں کی روش دیکھتے ہوئے کوئی دشواری اس امر میں نہیں پاتا ہوں کہ آپ میری استدعا پر لبیک فرمائیں۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے بھی اس صورتِ حال کا پسندیدہ احساس کر کے اس امر پر زور دیا ہے کہ اس نازک مرحلہ پر ہمارے لیے دوش بہ دوش کھڑا ہونا کس قدر اہم ہے۔

ایم اے جناح

ہندوستان کے مسلمانوں کا باہمی اتحاد

مجاہد جلیل مولانا حفظ الرحمٰن اور قاید اعظم محمد علی جناح کے درمیان پیغامات کا تبادلہ:

......مسلمانوں کے اتحاد کی سرگزشت۔ اگر ہم ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں اور اس سے ایک جماعت کو اختلاف ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی قدر و قیمت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ حال آں کہ دس کروڑ مسلمانوں کا مسلمان ہونا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی ہستی ایک عالم گیر ملی اتحاد کا نمونۂ کامل ہے۔ وہ لوگ جو سال ہا سال سے اسلام اور آزادی کے محاذ پر کام کر رہے ہیں کبھی مسلمانوں کے باہمی اتحاد سے غافل نہیں رہے۔ اگر کچھ مسلمانوں نے اس کے خلاف اپنی رائے قایم کر لی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حقیقت سے باخبر نہیں ہیں۔ اور انھیں یہ علم نہیں ہے کہ جمعیت علماے ہند اور قوم پرور مسلمان بارہا اس راہ میں سچے دل سے قدم بڑھا چکے ہیں اور اگر اس میں ناکامی ہوئی تو قصور ان کا نہیں بلکہ ان حالات کا ہے جن پر عبور حاصل نہیں کیا جا سکا۔

ہمیں خوشی ہے کہ گزشتہ ماہ جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ نے مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے متعلق ایک تجویز پاس کی اور تمام مسلم جماعتوں کو خلوص کے ساتھ، دردمندی کے ساتھ اور کھلے ہوئے دماغ اور سچے دل کے ساتھ پکارا۔ مولانا حفظ الرحمٰن جمعیت علماے ہند کے ناظم ہیں۔ اس تجویز کے بعد اُن کا ایک فرض تھا اور انھوں نے اس کو پورا کرنے کے لیے قاید اعظم محمد علی جناح کے نام اتحاد کا پیغام بھیجنے میں پیش قدمی کی۔ قاید اعظم نے اس کا جواب دیا اور ہمارے علم کے مطابق پچھلے دس سال میں یہ پہلا جواب ہے جس میں شریفانہ طور پر سیاسی زبان استعمال کی گئی ہے۔ دونوں رہنماؤں کے پیغام ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں انتظار تھا کہ واقعات کا رخ اس معاملے میں ترقی کی طرف ہوگا اور ہم زیادہ واضح ماحول میں اس مسئلے کی پرانی تصویر پیش کر کے نئی پیش کش پر اپنی رائے ظاہر کر سکیں گے۔ آج

ہم انتظار کے بعد اپنے اس ارادے کو پورا کر رہے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ مسلمانوں کے افکار و آرا کا فرق دور کرنے کے لیے تمام مسلم جماعتوں کی ایک بڑی پارلیمنٹ (شوریٰ) کا جلسہ طلب کیا جائے۔ وقت کم ہے، صورت حال نازک ہے۔ ہمارا فرض اہم اور ذمے داری عظیم ہے۔ ضرورت اسی امر کی ہے کہ ہم اختلافات سے بالا ہو کر اتفاق و اتحاد کو حاصل کرنے کے لیے ایک جگہ مل کر بیٹھیں۔ ایمان داری سے گفتگو کریں اور مسلمانوں کا آخری نصب العین طے کر کے اُٹھیں اور دس کروڑ مسلمان اس نصب العین کے لیے میدان میں اس طرح نکلیں کہ ان کی صفوف میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ اُن کے دلوں کا رخ ایک اور مقصد ایک ہو۔ ارادے ایک ہوں اور قول و فعل کی رفتار ایک ہو۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی اس پر خلوص اپیل کے جواب میں قاید اعظم نے اپنے پیغام میں کہا کہ مجھے آپ کے جذبے سے اتفاق ہے اور وقت کی نزاکت کا احساس ہے۔ آیے! ایک قدم اور بڑھ کر لیگ میں شامل ہو جایئے۔ جو کام آپ شوریٰ سے لینا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ کے نئے قانون سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس جواب کے بعد دونوں جماعتوں کے تعلق کی رفتار اپنی جگہ باقی ہے اور اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ ہم مسلمانوں کے علم میں یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اتحاد کے لیے قوم پرور مسلمانوں کا یہ اقدام پہلا اقدام نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی کئی قدم اُٹھ چکے ہیں اور تاریخ کے صفحات پر اپنی جگہ پیدا کر چکے ہیں۔ یہاں ہم چند واقعات درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

(الف) ۱۹۲۹ء میں سر محمد شفیع اور مسٹر جناح کے درمیان شدید اختلاف تھا۔ مسلمان دو جہتوں میں تقسیم تھے۔ ان دونوں رہنماؤں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر ان کو ایک خیال اور ایک تجویز پر جمع کر دینا جمعیت علماے ہند کے صدر ہی کا کام تھا۔

(ب) ۱۹۳۶ء سے پہلے مسٹر جناح اور سر آغا خان کی سیاست کا رخ الگ الگ تھا۔ سر آغا خان کی مسلم کانفرنس نے مسٹر جناح کی مسلم لیگ کو قبر کے کنارے پر پہنچا دیا تھا۔ سر آغا خان یورپ چلے گئے۔ مسٹر جناح نے ۱۹۳۶ء میں اسی اپریل کے مہینے میں مسلم جماعتوں اور رہنماؤں کو ایک اسلامی پارلیمنٹ میں طلب کیا۔ جمعیت علما اور مجلس احرار کے رہنماؤں

نے امپیریل ہوٹل میں ان سے مکمل گفتگو کی۔ مسٹر جناح نے فرمایا: مجھے آپ کی امداد کی ضرورت ہے۔ گفتگو کے بعد ایک شریفانہ معاہدہ طے پایا گیا؛

(الف) مسلم لیگ کو رجعت پسند طاقتوں سے پاک کر دیا جائے گا اور اصل طاقت آزادی پسند مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔

(ب) اگر جناح صاحب ایسا نہ کر سکے تو وہ لیگ کو توڑ دیں گے یا چھوڑ دیں گے اور آزادی کی طاقتوں سے مل کر مسلمانوں کی قسمت بنائیں گے۔

۱۹۳۶ء کے باغیوں کی جماعت:

اس معاہدے کے بعد جمعیت علماے ہند نے مسٹر جناح کی لیڈر شپ میں تازہ روح ڈالی۔ مسلم لیگ کو زندہ کیا اور نئے الیکشن میں اتنا بے پناہ کام کیا کہ مسلم لیگ مسلم لیگ نام پانے کی مستحق ہوگئی۔ اسلام اور وطن کے وہ باغی جو آج قائد اعظم کے تخت و تاج کو اُٹھائے ہوئے ہیں گورنروں کے حکم سے میدان میں آئے۔ ان باغی جماعتوں کا نقشہ یہ تھا:

شمار	صوبہ	پارٹی	پارٹی لیڈر
۱	پنجاب	یونینسٹ پارٹی	سر سکندر حیات خان
۲	سندھ	یونائیٹڈ پارٹی	سر غلام حسین ہدایت اللہ ❶
۳	یوپی	نیشنل ایگریکلچر پارٹی	نواب چھتاری
۴	آسام	یونین پارٹی	سر سعد اللہ
۵	بنگال	کسان پرجا پارٹی	مسٹر فضل الحق

حاشیہ ❶: یونائیٹڈ پارٹی خان بہادر اللہ بخش سومرو کی پارٹی تھی۔ اللہ بخش سر غلام حسین ہدایت اللہ کے بعد سندھ کے وزیر اعظم ہوئے تھے۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی پارٹی مسلم پولی ٹیکل پارٹی تھی۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں اسی نے حصہ لیا تھا، لیکن وزارت بنانے کا مرحلہ آیا اور غیر مسلم ممبروں کے تعاون کی ضرورت پڑی تو ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کے نام سے ایک نئی پارٹی قایم کی گئی۔ سندھ میں مسلم لیگ اس وقت تھی ہی نہیں، نہ اس کے پلیٹ فارم سے کسی نے انتخاب لڑا تھا۔ (ا۔س۔ش)

انتخاب کے نتیجے میں گورنر کانگریس کے مقابلے میں ناکام ہو گئے۔ اب ان لیڈروں کو لیگ پر قبضہ کرنے کا حکم ملا، وہ آگے بڑھے۔ قاید اعظم نے اپنے وفادار جرنیلوں کو دھکا دے دیا اور گورنروں کی منشا کے مطابق باغیوں کو فوج کی کمان سپرد کر دی۔ انھوں نے معاہدے کو توڑ دیا۔ مسلم لیگ کی خلیج میں جب گندہ پانی آ گیا تو صاف پانی خود بہ خود نکل گیا۔ مگر قاید اعظم نے اس کی ذرا پروانہ کی۔ وہ نئے آدمیوں سے اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے پرانے ساتھیوں کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس طرح لیگ ۱۹۳۶ء کے باغیوں کی جماعت بن کر رہ گئی۔

بہ ہر حال جمعیت علما نے ۱۹۳۶ء میں بھی مسلمانوں کے اتحاد کی خاطر مسٹر جناح کی دعوت کو قبول کیا، مگر ملت کے مخلصین نے ۱۹۳۶ء میں مسلمانوں کا جو محاذ انتہائی قربانیوں کے بعد قایم کیا تھا وہ گورنروں اور ملت کے پرانے باغیوں کے اتحاد کی بنا پر ٹوٹ گیا۔

(ج) ۱۹۳۷ء میں ابھی اختلاف ابتدائی منزل پر تھا کہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے مسٹر جناح کو تار دیا کہ مسلمانوں کا اتحاد ضروری ہے۔ مسلم کنونشن بلایئے۔ جواب ملا ''آپ کی تجویز عاجلانہ، لغو اور قبل از وقت ہے۔'' اتحاد کی خواہش کا یہ جواب دیکھیے اور جمعیت علما کو الزام دیجیے کہ وہ مسلمانوں میں اختلاف پیدا کر رہی ہے۔

(د) مولانا احمد سعید صاحب نے مسلم لیگ ہائی کمانڈ سے مسلمانوں کے اتحاد کے لیے خط و کتابت کی، مگر جواب انکار کی صورت میں ملا۔

(ہ) اگر دو آدمیوں میں اختلاف ہو تو اتحاد کی تین صورتیں ممکن ہیں۔ ان میں سے ایک اتحاد کی دعوت دے۔ دوسرا اتحاد کے لیے بلائے۔ کوئی تیسرا دونوں کو جمع کر دے۔ جمعیت علما نے اپنے اجلاس دہلی، لاہور، سہارن پور میں مسٹر جناح کو شرکت کی دعوت دی۔ وہ نہیں آئے۔ خود انھوں نے کبھی اتحاد کی دعوت نہیں دی۔ خان بہادر جان محمد صاحب نے دونوں کو جمع کرنا چاہا تو مسٹر جناح نے مولانا آزاد کے ساتھ ایک میز پر بیٹھنے اور اسلامی اتحاد کے مسئلے پر مشورہ کرنے سے انکار کر دیا۔ واقعات کی یہ تصویر ہماری سیاسی تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کو حق ہے کہ وہ جس کو چاہے ملزم گردانے اور جس کو چاہے بری قرار دے۔

جمعیت علماے ہند نے پھر ایک قدم بڑھایا ہے۔ اتحاد ہوسکتا ہے مگر اس کی صورت یہی ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی یہ تجویز منظور کرلی جائے کہ تمام مسلم جماعتیں خلوص کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوں اور ایک دوسرے کے نظریوں کو سن کر ایک نصب العین مقرر کریں۔ ہم قایداعظم سے کہیں گے کہ انھوں نے جمعیت علما کی تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا۔ انھیں اس تجویز کو منظور کرنا چاہیے، کیوں کہ یہی ایک تجویز ہے جو مسلمانوں کو ایک مرکز پر متحد کرسکتی ہے۔ (سہ روزہ مدینہ۔ بجنور: ۲۱/اپریل ۱۹۴۷ء، نمبر ۳۰، جلد ۳۶)

قایداعظم کا ذوق تشتت:

قایداعظم محمد علی جناح کے بارے میں جمعیت علماے ہند نیشنلسٹ مسلمانوں اور قوم پرور جماعتوں کو یہ شکایت رہی ہے کہ انھوں نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کے بعد مسلمانوں کے اتحاد اور کوئی متفقہ لایحہ عمل تلاش کرنے پر کبھی توجہ نہیں کی، بلکہ وہ خود اتحاد کے راستے کی رکاوٹ بنے رہے۔ بنگال، پنجاب، سندھ وغیرہ اور خود آل انڈیا مسلم لیگ کے حالات سر شفیع اور علامہ اقبال اور بعدہٗ سکندر حیات اور خضر حیات سے لے کر شوکت حیات تک کے جو حالات اور مسلم لیگ کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، اس کے مطالعے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلم لیگ میں بھی دھڑے بندی کے قایل تھے اور انھوں نے ہمیشہ اور ہر صوبے میں اپنے خاص مہروں کو آگے بڑھایا اور دوسروں کی ٹانگیں کھینچوائیں۔ مرزا غلام نبی جاں باز نے کاروانِ احرار جلد ہشتم میں بعض ایسے واقعات جمع کردیے ہیں، جن سے قایداعظم کے ذوق تفرقہ اندازی پر روشنی پڑتی ہے۔

اس کے علاوہ ہر صوبے میں دو دو اور تین تین کے گروپ میں یہ لوگ (مسلم لیگی) تقسیم تھے۔ مثلاً آسام میں سر سعد اللہ خاں اور عبدالمتین چودھری مل کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ بنگال میں پہلے تو مولوی فضل الحق شیر بنگال بن کر پروان چڑھے، لیکن جب قایداعظم ان سے ناراض ہوئے تو انھیں مسلم لیگ سے نکال دیا۔ پھر خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی میں مڈبھیڑ رہنے لگی۔ بمبئی میں یوں تو قایداعظم خود موجود تھے، تاہم مقامی سیاست میں مسٹر کریم بھائی اور ابراہیم چندریگر کے مابین جذبات کی دیوار حایل تھی۔ یوپی

میں چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل میں بہ ظاہر تو راے میں اختلاف نہیں تھا لیکن اندر خانے اقتدار کی رقابت موجود تھی۔ پنجاب میں ملک خضر حیات یونینسٹ پارٹی کا لیڈر تھا، جس میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ دوسری طرف یہاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور نواب افتخار حسین ممدوٹ ایک میز پر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ پنجاب کی سیاست میں خود قاید اعظم بھی دخیل تھے۔ اس موقع پر پنجاب مسلم لیگ کے معروف رہنما میاں امیر الدین کے ایک مضمون کا اقتباس جو ۲۵/ دسمبر ۱۹۷۶ء کے نوائے وقت میں شایع ہوا، قابل ذکر ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ

''دسمبر ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء میں جب مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر لڑے گئے ہیں تو اس وقت صوبۂ مسلم لیگ نے پنجاب کے صوبائی انتخابات کا انچارج مجھے بنایا تھا۔ پنجاب میں ۸۶ نشستیں مسلمانوں کی تھیں، جن میں سے ۷۹ مسلم لیگ نے جیت لیں اور باقی ۷ یونینسٹ پارٹی کو ملیں۔ نتایج کے اعلان کے بعد ایک روز راقم الحروف آئی یو خاں، میاں امین الدین اور سردار شوکت حیات ایک جگہ جمع تھے کہ خضر حیات کی طرف سے یہ پیش کش آئی کہ :س کے ساتھی ارکانِ اسمبلی مسلم لیگ اسمبلی گروپ میں شامل ہو جانے پر آمادہ ہیں۔ صرف معمولی سی شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھی ایک رکن اسمبلی مسٹر ظفر علی قزلباش کو وزارت میں شامل کر لیا جائے۔ میں نے یہ سن کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چلو کیا حرج ہے، یہ ایک معمولی شرط ہے۔ چناں چہ سب نے کہا ٹھیک ہے۔ اس میں قاید اعظم سے بھی پوچھنے کی کیا بات ہے! وزارت بنا لیں۔ اس فیصلے کے بعد ہم مسٹر دین محمد (جسٹس) کے پاس گئے اور ان سے راے طلب کی۔ انھوں نے بھی اس پر صاد کیا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ شام کو مسٹر افتخار حسین ممدوٹ کا فون آگیا کہ فلاں وقت قاید اعظم کے پاس دہلی پہنچیں اور ان سے اس کی اجازت طلب کریں۔ میں اور سردار شوکت حیات وقت مقررہ پر دہلی پہنچے تو معلوم ہوا کہ میاں ممتاز دولتانہ اور راجہ غضنفر علی بھی دہلی آئے ہوئے ہیں اور وہ اس وقت نواب زادہ لیاقت علی کے ہاں ہیں۔ چناں چہ

ہم پہلے ان کے پاس گئے۔نواب زادہ لیاقت علی سے ملاقات ہوئی۔ہم نے سارا ماجرا اُن سے کہا۔انھوں نے بھی یہی کہا کہ "ٹھیک ہے۔" خضرت حیات سے معاملہ کرلو۔ پھر راقم الحروف، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سردار شوکت حیات، اور راجہ غضنفر علی، قاید اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو صورت حال بتائی تو وہ ایک دم چونکے اور فرمایا کہ "نہیں! اگر تم ایسا کروگے تو میں لیگ سے استعفیٰ دے دوں گا۔" ہم قاید اعظم کی یہ بات سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔"

سندھ میں مسٹر جی ایم سید اور محمد ایوب کھوڑو کے درمیان دریاے سندھ کے کناروں جتنا بعد تھا۔سرحد میں عبدالرب نشتر، سردار اورنگ زیب اور عبدالقیوم خان (جن کا لیگ میں نیا جنم ہوا تھا) ہاتھا پائی تھی۔

ان حالات میں اکثریت کے باوجود مسلم لیگ بعض صوبوں میں اپنی حکومت قایم نہ کرسکی۔آسام کے سر سعد اللہ کانگریس کے رحم وکرم پر تھے۔بنگال میں آپس کی کتا چھنی نے مولوی فضل الحق کو غیر مسلموں کی جھولی میں ڈال دیا۔ چناں چہ کرسچک سرمک پارٹی اور کانگریس کو کولیشن کرنا پڑی۔پنجاب میں غالب اکثریت ہونے پر مسلم لیگ خضر حیات کی یونینسٹ پارٹی کو اپنے ساتھ نہ ملا سکی۔آخر خضرت حیات کو کانگریس سے سمجھوتا کرنا پڑا۔ سرحد میں تو ڈاکٹر خان صاحب ہی تھے۔اگر یہاں بھی عبدالقیوم خان کی حماقتوں سے سردار عبدالرب نشتر کو صوبائی الیکشن میں شکست نہ دلائی جاتی تو ممکن ہے پوزیشن دوسری ہوتی۔ سندھ میں بنے بنائے کھیل کو وہاں کے حالات نے سدھرنے کی مہلت نہ دی۔ چناں چہ صدر مسلم لیگ نے خود مداخلت کر کے گزشتہ سال ۲۵ر فروری ۱۹۴۵ء میں مسٹر جی ایم سید اور ایم ایچ گذدر کو لیگ سے نکال دیا اور ان کی جگہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کو لیگ کی چودھراہٹ سونپ دی۔ یہ شخص ہمیشہ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والا تھا۔

اس ضد کا، یا باہم کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱ر مارچ ۱۹۴۶ء کو ملک خضر حیات ٹوانہ نے پنجاب کانگریس سے کولیشن وزارت قایم کرلی اور اس کے تحت چار وزرا نے حلف اٹھالیا۔لا اینڈ آرڈر کا محکمہ ملک خضر حیات وزیر اعظم پنجاب نے اپنے پاس رکھا۔فنانس اور جیل کے

محکمے لالہ بھیم سین سچر کے سپرد ہوئے۔ سول سپلائیز اور ترقیات سردار بلدیو سنگھ کے پاس رہے۔ سر مظفر علی قزلباش محکمہ تعلیم اور میڈیکل کے انچارج ٹھہرائے گئے۔ ریوینو کا محکمہ چودھری لہری سنگھ نے سنبھال لیا۔

اس طرح مسلم لیگ نے انتخاب جیت کر بھی بنیادی طور پر اپنی پوزیشن مشکوک کر لی۔ اس کے برعکس کانگریس نے ہر صوبے میں جہاں کہ اس کی اکثریت تھی۔ بے محابہ اپنی حکومتیں قایم کیں۔ (کاروانِ احرار: ج ۸، ص ۴۴ تا ۴۷)

(۵)

ریاستوں کا مسئلہ
حیدرآباد دکن، کشمیر

حیدرآباد دکن:

۱۱ر جون ۱۹۴۷ء: حیدرآباد کے نظام نے ریاست کی آزادی کا فرمان جاری کیا۔ جس میں یہ ظاہر کیا کہ پاکستان میں شرکت ہندو رعایا کے لیے اور ہندوستان میں شرکت مسلم رعایا کے لیے باعث دل آزاری ہے۔ اس لیے حیدرآباد آزاد رہ کر دونوں مملکتوں سے دوستانہ تعلقات قایم رکھے گا اور ہندوستان سے بہ وجہ ہم سائیگی ہر معاملے میں تعاون کرے گا۔

(اسلامی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام: ج۸، ص۵۰۷)

۱۵ر جون ۱۹۴۷ء: گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا تقریر میں حیدرآباد دکن اور کشمیر کو مشورہ دیا ہے:

> ''ان دونوں ریاستوں کو میرا مشورہ ہے کہ جغرافیائی لحاظ کرتے ہوئے حیدر آباد ہندوستان میں شامل ہو جائے اور کشمیر پاکستان سے الحاق کر لے۔''

(کاروانِ احرار: ج۸، ص۳۱۸)

جولائی ۱۹۴۷ء: حیدرآباد کے وزیر اعظم نواب چھتاری نے صاف طور پر اعلان کر دیا کہ

> ''حیدرآباد کا وہ علاقہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس سے لیا تھا واپس مل جانا چاہیے۔ نیز نواب چھتاری نے نظام حیدرآباد کی طرف سے یہ بات بھی صاف کر دی کہ تقسیم ملک کے بعد حیدرآباد جغرافیائی دشواریوں کے باعث پاکستان سے اور نظریاتی اختلاف کے باعث ہندوستان سے ملحق نہیں ہوگا، لہٰذا وہ اپنی آزادی اور انفرادیت قایم رکھے گا۔''

نواب چھتاری نے اس بیان میں برار کی واپسی کا مطالبہ بھی کیا۔

جولائی ۱۹۴۷ء: ہندوستان کی آیندہ حکومت کے ساتھ تعلقات کی نوعیت طے کرنے کے لیے حیدر آباد سے ایک سرکاری وفد دہلی گیا۔ مگر اسے کسی سمجھوتے پر پہنچے بغیر واپس آنا پڑا۔ (اسلامی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: ج ۸، ص ۷۵۰)

۲۱ ر اگست ۱۹۴۸ء: حیدر آباد نے ہندوستان کی حکومت سے مفاہمت کے تمام دروازے بند دیکھ کر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کر دیا ہے۔

(اسلامی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: ج ۸، ص ۷۵۱)

۱۳ ر ستمبر ۱۹۴۸ء: انڈین یونین نے ۱۳ ر ستمبر کو علی الصبح حیدر آباد پر پوری قوت کے ساتھ فوجی حملہ کر دیا۔ ورنگل، بیدر اور عادل آباد کے ہوائی اڈوں پر بم باری کی گئی۔ سرکاری فوجوں نے برائے نام مقابلہ کیا اور ۱۴ ر ستمبر کو حیدر آباد کی افواج کے کمانڈر انچیف العیدروس نے اپنی افواج کو واپسی کے احکام دے دیے۔ رضا کاروں نے نہایت جاں بازی سے بھارتی فوج کا مقابلہ کیا اور شدید نقصان برداشت کیے۔ ۱۸ ر ستمبر کو سقوطِ حیدر آباد کا اعلان ہو گیا۔ نظام کے اختیارات بھارت کے فوجی گورنر نے سنبھال لیے۔ حیدر آباد کو انڈین یونین میں شامل کر لیا گیا اور انڈین یونین کے کانسٹی ٹیوشن کا نفاذ عمل میں آ گیا۔

(اسلامی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام: ج ۸، ص ۷۵۱)

حیدر آباد کی خودکشی:

علی گڑھ، ۱۸ ر جنوری ۱۹۶۳ء: کل یہاں روٹری کلب میں نواب سر احمد سعید خاں، رئیس چھتاری و سابق صدر اعظم ریاست حیدر آباد دکن کو ان کی پچھترویں سال گرہ کی تقریب میں دعوت دی گئی۔ اس موقع پر نواب صاحب نے اپنی تقریر میں بیان کیا: ”میں جب حیدر آباد میں تھا تو سرکار ہند نے نظام حیدر آباد کو پیش کش کی تھی کہ اگر آپ ہندوستان سے الحاق منظور کر لیں تو ہم آپ کو بہ جز فوج اُمورِ خارجہ اور رسل و رسایل کے تین شعبوں کے اور ہر طرح خودمختاری دینے کو تیار ہیں۔ اس پر میں نے اعلا حضرت نظام کی خدمت میں ایک خط کا مسودہ پیش کیا، لیکن میرا مسودہ مسترد کر دیا گیا۔ پھر میں استعفا دے کر چلا آیا اور اس کے بعد سرکار ہند کو پولیس ایکشن لینا پڑا۔ اگر اعلا حضرت نے اس وقت دور اندیشی سے

کام لیا ہوتا تو ان کا انجام وہ نہ ہوتا جو ہوا۔
اسی موقع کے لیے ہے:

ہر کس بذاست غیر نالہ کند
سعدی از دست خویشتن فریاد

حقایق اور واقعات کی طرف سے آنکھ بند کر لینے اور اندھا دھند جوش و خروش اپنے اوپر طاری کر لینے کے جو اندوہ ناک ترین نتیجے دنیا کی تاریخ میں پیش آتے رہتے ہیں ان کی فہرست کا یہ عنوان ''فنائے حیدر آباد'' بھی کچھ کم اہم نہیں۔ زبانوں پر یہ روایت تو مدتوں سے چڑھی ہوئی تھی، اب ایک ذمے دار ترین ہستی کے بیان سے اس کا وزن ہی کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔'' (صدقِ جدید۔ لکھنؤ، یکم فروری ۱۹۶۳ء: ص ۳)

ریاستیں اور قایدِ اعظم:

غلام ہندوستان میں ہندوستانی ریاستیں غیر ملکی حکومت کا سب سے بڑا آسرا تھا۔ آج جب ان کا یہ کھونٹا اُکھڑ رہا ہے، نشاط انگیز چادر تار تار ہو رہی ہے، راج سنگھاسن رعایا کے پاؤں تلے آ رہا ہے، انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ محلات کے سہانے خواب سے بیدار ہو کر راجواڑوں کے رؤسا نے ہندوستان اور پاکستان نے نظامِ نو سے بغاوت کے حیلے سوچنے شروع کیے۔ ایسے میں ہندوستان کا موقف تھا کہ ریاستوں کو ہندوستان میں مدغم کر لیا جائے، لیکن مسلم لیگ کے صدر قایدِ اعظم محمد علی جناح نے ۱۷ر جون ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی سے اعلان کر دیا کہ

> ''اقتدارِ اعلا کے ختم ہونے پر ہندوستانی ریاستیں اس امر میں آزاد ہوں گی کہ خواہ ہندوستان دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوں، خواہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں اور چاہیں تو کسی میں شریک نہ ہوں اور آزاد رہنا چاہیں تو یہ ان کی مرضی ہے۔
> مسلم لیگ کی یہی پالیسی ہے اس کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے۔''
> (روزنامہ انقلاب۔ لاہور، ۲۰ر جون ۱۹۴۷ء)

حیدر آباد دکن اور کشمیر دونوں بڑی ریاستیں تھیں، جن کے ارادے جدا جدا تھے۔ حیدر آباد انگریز سے الحاق چاہتا تھا۔ جیسے کہ چودھری خلیق الزماں کا کہنا ہے کہ

''مجھ سے نواب صاحب (حیدر آباد) نے پوچھا کہ حیدر آباد کے متعلق کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آزادی کے بعد حیدر آباد برٹش گورنمنٹ سے کوئی علاحدہ معاہدہ کرے؟'' (شاہراہِ پاکستان: ص ۱۰۴۳)

اور کشمیر ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا۔ اس سے پیشتر ۱۵ر جون ۱۹۴۷ء کو مہاتما گاندھی نے نئی دہلی میں اپنی پرارتھنا کے دوران تقریر میں کہا کہ

''ان دونوں ریاستوں کو میرا مشورہ ہے کہ جغرافیائی لحاظ کرتے ہوئے حیدر آباد ہندوستان میں شامل ہو جائے اور کشمیر پاکستان سے الحاق کرلے۔''

ان دنوں حیدر آباد میں رضا کاروں کی ایک سیاسی تنظیم انجمن اتحاد المسلمین کے نام سے سرگرم تھی، جس کا لیڈر سید محمد قاسم رضوی تھا۔ ہوسکتا ہے اس کا منشا پاکستان سے ریاست کا الحاق ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ قاید اعظم کا ۱۷ر جون کا اعلان اسی سلسلے کی کڑی ہو۔

ان دنوں ۱۹ر جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن وایسرائے ہند نے کشمیر پہنچ کر مہاراجہ سے حالات پر گفتگو کی۔

مستقبل کی بین الاقوامی سیاست میں کشمیر بڑی اہمیت کی ریاست ہے۔ یہ ایک ایسا چوک ہے جس کے راستے لداخ اور گلگت کے علاوہ افغانستان، روس اور ہندوستان سے ملتے ہیں۔ اس چوک کو انگریز کسی صورت کھلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ دوسری طرف پاکستان کی حیثیت ہنوز درجۂ نو آبادیات کی تھی۔ تاہم ہندوستان کی طرح پاکستان کو بھی چاہیے تھا کہ جغرافیائی اعتبار سے کلیتًا کشمیر کو پاکستان میں شامل کرتے، لیکن قاید اعظم نے ۱۷ر جون کا اعلان کر کے کہ ریاستیں اپنے طور پر آزاد ہیں، جس طرح چاہیں کریں۔ ریاستوں کو من مانی کرنے کی شہ دے دی۔

فیلڈ مارشل منٹگمری:

۲۵ر جون (۱۹۴۷ء) کو نئی دہلی سے اطلاع ملی کہ ڈیفنس ہیڈ کوارٹر میں فیلڈ مارشل

منٹگمری اور سر کلاڈ آکنلک کمانڈر انچیف افواج ہند کے درمیان ایک کانفرنس ہوئی، جس میں افواج کی تقسیم اور ہندوستان کے دفاع سے متعلق مسایل زیر بحث لائے گئے۔

مارشل منٹگمری کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہندوستان تقسیم ہوگا۔ ہندوستان کس طرح برطانوی سلطنت کی دفاعی اسکیم میں کھپ سکتا ہے؟ اس سلسلے میں اس نے پنڈت نہرو اور دوسرے کانگریسی لیڈروں سے ملاقات کی۔ دوران ملاقات اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان اور پاکستان کی افواج مشترک ہو، لیکن کانگریس لیڈر نے کہا کہ ایسا کرنا مشکل ہے۔ کیوں کہ مسٹر جناح کا رویہ جو ظاہر کرتا ہے وہ ہندوستانی یونین سے تعاون نہیں کرنا چاہیے بلکہ وہ دوسری ریاستوں کو اپنا حلیف بنا رہے ہیں۔ (اے پی)

(کاروان احرار: ج ۸، ص ۱۹-۳۱۷)

کشمیر-تاریخ وسیاست:

کشمیر ریاست- جموں اور کشمیر جسے عموماً کشمیر یا ریاست کشمیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی انتہائی شمالی سرحد پر واقع ہے۔ اس ریاست کے شمال میں پامیر کی بلند سطح مرتفع یعنی روسی اور چینی ترکستان، مشرق میں تبت، جنوب میں ہندوستان اور مغرب میں پاکستان اور افغانستان واقع ہیں اور اس کے اسی محل وقوع کے باعث اسے فوجی نقطۂ نظر سے بین الاقوامی اہمیت حاصل ہے۔ اس ریاست کا رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل اور آبادی ۴۰,۲۵,۰۰۰ (چالیس لاکھ پچیس ہزار) افراد پر مشتمل ہے جن میں سے کم و بیش تیس لاکھ مسلمان ہیں۔ اور ریاست کا وہ حصہ جسے وادیٔ کشمیر کہتے ہیں، قدرتی مناظر اور صحت بخش آب وہوا کے اعتبار سے دنیا کے معدودے چند بہترین مقامات میں شمار کیا جاتا ہے۔

کشمیر کی ابتدائی تاریخ ہندو دیو مالا کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ روایت مشہور ہے کہ ابتدا میں کشمیر ایک وسیع جھیل کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ جھیل ستی سار کے نام سے موسوم تھی۔ وہاں عہد قبل از تاریخ کے متعدد وحشی قبایل آباد تھے جن پر جل دیو حکومت کرتا تھا، لیکن چوں کہ جل دیو ایک ظالم حکمراں تھا اس لیے اس عہد کے ایک سنیاسی کیشپ نے عبادت و ریاضت کے ذریعے سے شاریکا نامی دیوی کو ستی سار کے باشندوں کی امداد پر آمادہ کرلیا اور دیوی نے ابابیل کی شکل میں نمودار ہو کر اپنی چونچ سے ایک سنگ ریزہ جل دیو کے سر پر

گرایا، جس سے وہ ہلاک ہوگیا۔ اس کے بعد جھیل کا پانی بھی خشک ہوگیا اور یہ سرزمین کیشپ ماریعنی کیشپ کی اقامت گاہ کے نام سے مشہور ہوگئی اور رفتہ اسے کشمیر کہا جانے لگا۔ بہ ہر حال! عہد قدیم کی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کم و بیش پانچ ہزار سال قبل سے پہلے ہی دریافت ہو چکا تھا اور وہاں مختلف ادوار میں راجاؤں کے مختلف خاندان حکومت کرتے رہے تھے۔ ۲۵۰ ق م میں اسے اشوک اعظم نے فتح کیا اور وہاں بودھ مذہب اور اس کی تہذیب کو بہت زیادہ عروج حاصل ہوا، لیکن نو سال کے بعد بودھ دھرم کا یہ عروج کامل زوال میں بدل گیا۔ چودھویں صدی عیسوی میں مسلمان کشمیر میں پہنچے، لیکن ان کا ابتدائی دور حکومت کچھ زیادہ اہم اور قابل ذکر نہیں۔ البتہ ۱۴۲۳ء میں جب زین العابدین کشمیر کے تخت حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے کشمیر کے باشندوں کی حالت کو بہتر بنانے کی کسی سعی سے دریغ نہیں کیا۔ علوم و فنون کو ترقی دی اور سنسکرت، عربی اور دوسری زبانوں کی متعدد کتابوں کے تراجم بھی کرائے۔ ۱۵۵۴ء سے ۱۵۸۸ء تک کشمیر پر ایک اور خاندان حکمران رہا اور اس کے بعد مغلوں کا دور حکومت شروع ہوا اور اسی زمانے میں نشاط، شالامار اور اسی قسم کے وہ باغات لگائے گئے جو آج بھی قدرت اور صنعت کے امتزاج اور فن کاری کے حسین ترین مرقعے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۷۵۳ء میں کشمیر پر پٹھانوں کی حکومت کا دور شروع ہوا، لیکن کشمیر کے باشندے اس دور حکومت سے مطمئن نہ ہو سکے اور انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی امداد سے ۱۸۱۹ء میں پٹھانوں کو شکست دی، مگر جب سکھوں اور انگریزوں کے مابین پہلی جنگ ہوئی تو کشمیر سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اور ۱۶ / مارچ ۱۸۴۶ء کے معاہدۂ امرتسر کی رو سے انگریزوں نے ۷۵ لاکھ روپے میں اس علاقے کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا اور انھوں نے مختلف علاقوں کو متحد کر کے موجودہ ریاست جموں اور کشمیر نیز ڈوگرا خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی، لیکن بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں تک اس ریاست میں کوئی سیاسی یا علاقائی تغیر رونما نہیں ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں جب گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستان کی تحریک آزادی نے نیا جنم لیا تو آہستہ آہستہ ہندوستان کی ریاستیں بھی اس سے متاثر ہونے لگیں اور چوں کہ ریاست جموں اور کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت

ہونے کے باوجود انھیں ان کے جائز حقوق سے بہت بڑی حد تک محروم رکھا جاتا تھا، اس لیے ۱۹۳۱ء میں ریاست کے صوبہ کشمیر کے مسلمانوں نے شیخ محمد عبداللہ کی رہنمائی میں اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کی، لیکن یہ جدوجہد ابتدا ہی سے غیر فرقہ وارانہ رنگ کی حامل رہی اور آہستہ آہستہ کامل قومی جدوجہد میں تبدیل ہوگئی۔

مسلمانوں کی اس جدوجہد سے متاثر ہو کر نومبر ۱۹۳۱ء میں مہاراجہ کی حکومت نے مسٹر بی جے گلینسی کی زیرِ صدارت ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا اور اس کمیشن نے ریاست میں مجلس قانون ساز کے قیام عوام کو کامل مذہبی آزادی دیتے جانے، قانون وراثت میں مداخلت نہ کرنے، مذہبی مقامات کی بحالی، تعلیم پر خصوصی توجہ مبذول کرنے، ملازمتوں میں تمام فرقوں کی مناسب نمایندگی، زرعی حقوق کے تحفظ، رشوت ستانی کے انسداد اور پریس کے ضوابط میں ترمیمات کرنے کی سفارشات کیں۔ اس رپورٹ کے مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ۷۵ اراکین پر مشتمل "پرجا سبھا" یعنی مجلس قانون ساز کا قیام عمل میں آیا، جن میں سے ۴۲ اراکین مہاراجہ کے نامزد کیے ہوئے تھے اور ۳۳ منتخب کیے ہوئے، منتخب اراکین میں سے ۲۱ مسلمان، ۱۰ ہندو اور ۲ سکھ تھے اور نامزدہ کردہ اراکین میں ۱۲ سرکاری افسر ۱۴ غیر سرکاری افراد اور ۱۶ مشیران حکومت شامل تھے، لیکن فروری ۱۹۳۹ء میں نامزد کیے ہوئے اراکین کی تعداد کو ۳۵ کر دیا گیا تھا اور اس مجلس کے نایب صدر کو اراکین کثرت آرا سے منتخب کیا کرتے تھے۔

اپریل ۱۹۴۴ء میں مہاراجہ نے پرجا سبھا میں شامل عوام کے نمایندوں میں سے دو افراد کو وزارت کے عہدے پر بھی باامور کیا تھا، لیکن ان وزرا کے کاموں میں وزیر اعظم کی بے جا مداخلت جاری رہی اور مارچ ۱۹۴۶ء کے وسط میں ایک وزیر نے بہ طور احتجاج اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

مئی ۱۹۴۶ء میں نیشنل کانفرنس نے "معاہدۂ امرتسر" کی تنسیخ کا مطالبہ شروع کیا اور وہ جدوجہد شروع ہوئی جو "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک کے نام سے موسوم ہے۔ اس تحریک کے نتیجے کے طور پر کشمیر کے تمام قومی رہنماؤں کو گرفتار کر کے سزائے قید دے دی گئی۔ تقسیم ہند کے بعد ہند اور پاکستان کے طول وعرض میں فرقہ وارانہ نوعیت کے جو الم ناک ہنگامے رونما ہوئے کشمیر بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مغربی پنجاب کے ہندو اور سکھ پناہ گزین

بہ تعداد کثیر ریاست میں آنے لگے۔ جموں میں فرقہ وارانہ فساد ہوا اور پوری ریاست میں بے چینی پھیل گئی اور ہر طرف شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ چناں چہ ۳۰ر ستمبر کو انھیں غیر مشروط طریقہ پر رہا کر دیا گیا۔ ہندوستان کی تقسیم اور ہند اور پاکستان کی آزادی کے سلسلے میں ''کیبنٹ مشن'' نے جو تجویز طے کی تھی اس میں ہندوستانی ریاستوں کے متعلق یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ وہ یا تو ہند اور پاکستان میں سے کسی ایک مملکت کے ساتھ وابستہ ہو سکتی ہیں یا اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر سکتی ہیں، لیکن ان باتوں کے فیصلے کا اختیار ریاستوں کے حکمران، راجاؤں اور نوابوں کو دیا گیا تھا اور ہند اور پاکستان نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا تھا۔ چناں چہ جب ۱۴ر اور ۱۵ر اگست کو پاکستان اور ہندوستان کی جدا جدا اور آزاد مملکتیں قایم ہوئیں تو ان دونوں ملکوں اور ریاست کشمیر کے مابین ایک ایسا معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے ریاست کے کسی قطعی فیصلے سے قبل دونوں ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات حسب سابق قایم رہنے چاہییں تھے، لیکن اس معاہدے کے باوجود ایک جانب تو پاکستان نے پیٹرول، نمک، چینی، گندم اور دیگر اشیا کشمیر بھیجے جانے سے روک دیں اور چوں کہ کشمیر کے ذرایع مواصلت بھی پاکستان ہی کے ماتحت کر دیے گئے تھے، اس لیے اہل کشمیر کو خط و کتابت وغیرہ میں بھی دشواریاں پیش آنے لگیں۔ بہ ہر حال ابھی کشمیر کے رہنما اور عوام اپنے مستقبل کے مسئلے پر غور ہی کر رہے تھے کہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بعض سرحدی قبایل نے کشمیر پر حملہ کر دیا اور وہ چند ہی روز میں سری نگر کے باہر پہنچ گئے۔ اس حملے کے دوسرے ہی دن ریاست کی افواج اور حکام فرار ہو گئے تھے۔ کشمیر میں کوئی حکومت باقی نہیں رہی تھی۔ خزانہ خالی ہو گیا تھا اور سری نگر میں پولیس کا ایک سپاہی بھی نظر نہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ خود مہاراجہ اور وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے کشمیری عوام کی ہنگامی حکومت قایم کی اور رضا کاروں کی امداد سے نہ صرف وادیِ کشمیر میں امن اور انتظام ہی قایم رکھا بلکہ ہندوستانی افواج کی آمد تک سری نگر کے باہر حملہ آوروں کا مقابلہ بھی جاری رکھا۔ ۲۴ر اکتوبر کو ریاست جموں اور کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ نے حکومت ہند سے امداد کی درخواست کی۔ ۲۶ر اکتوبر کو ریاست کے وزیر اعظم نے دہلی آ کر حکومت ہند سے اسی قسم کی درخواست کی، لیکن حکومت ہند نے کشمیری عوام کے رہنما شیخ محمد عبداللہ سے مشورہ کرنے سے قبل اس درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا اور جب خود شیخ

صاحب نے دہلی آکر مہاراجہ کی درخواست کی تائید کی تو حکومت ہند مدد دینے پر آمادہ ہوگئی، لیکن چوں کہ ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق سے قبل اس قسم کا کوئی قدم نہیں اُٹھایا جاسکتا تھا اس لیے ریاست کو اس شرط پر ہندوستان کے ساتھ ملحق کیا گیا کہ جب ریاست کے حالات حسب معمول ہو جائیں گے تو وہاں کے باشندے کثرت رائے سے خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔ گویا کہ ریاست کی طرف سے الحاق کی غیر مشروط درخواست کے باوجود ہندوستان نے خود اسے مشروط بنا دیا تھا اور اس طرح اہلِ کشمیر کو اس بات کا اختیار دے دیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو حالات کے حسب معمول ہو جانے کے بعد پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس فیصلے کے بعد ہندوستان کی افواج ریاست میں داخل ہوئیں اور حملہ آور پسپا ہونے لگے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں کشمیر کی ہنگامی حکومت کو ختم کر کے ذمے دار عارضی حکومت قایم کی گئی۔ ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کے بعد چوں کہ ریاست ہندوستان کا ایک حصہ بن گئی تھی، اس لیے پہلے تو حکومت ہند نے پاکستان سے اس بات کی درخواست کی وہ حملہ آوروں کو امداد دینا بند کر دے، لیکن جب اس درخواست کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو حکومت ہند نے ۲۱ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو یہ مسئلہ ادارۂ اقوام متحدہ کے غور اور فیصلے کے لیے بھیج دیا۔ اس سلسلے میں ہندوستان کی طرف سے جو عرض داشت بھیجی گئی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ریاست جموں اور کشمیر پر جو ہندوستان کے ساتھ ملحق ہو چکی ہے پاکستان کے شمالی مغربی سرحد سے ملحق علاقے کے قبایلی باشندوں نے جارحانہ حملہ کیا ہے اور پاکستان نے ان لوگوں کو اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دی ہے۔ وہ پاکستانی علاقے کو اپنے مستقر کی حیثیت سے استعمال کر رہے ہیں۔ ان حملہ آوروں میں پاکستان کے باشندے بھی شامل ہیں۔ انھیں پاکستان ہی اسلحہ، رسد پٹرول اور نقل و حمل کے وسایل مہیا کرتا ہے اور پاکستان ہی کے فوجی افسر حملہ آوروں کو فوجی تربیت دینے اور ان کی رہنمائی کرنے کے علاوہ انھیں ہر قسم کی امداد بھی دیتے ہیں۔ اس لیے ہندوستان نے مجلس تحفظ کو توجہ دلائی تھی کہ وہ پاکستان کو اس امر کی ہدایت کرے کہ وہ اپنے فوجی اور انتظامی ملازمین کو کشمیر پر حملہ میں شریک ہونے یا حملہ آوروں کو کسی قسم کی مدد دینے کی ممانعت کر دے۔ پاکستان کے شہریوں کو اس جنگ میں شریک ہونے سے باز رکھے اور حملہ آوروں

کو اپنے علاقے سے گزرنے یا اسے بہ طور مستقر استعمال کرنے کی ممانعت کر دے۔ انھیں سامانِ جنگ اور رسد بہم نہ پہنچائے اور اس قسم کی کوئی مدد نہ دے جو جنگ کو طویل بنانے کی موجب ثابت ہو۔

اس عرض داشت کے پیش نظر طویل بحث و مباحثے کے بعد مجلس تحفظ نے ۲۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو ہند اور پاکستان کے مابین مفاہمت کرانے کے لیے تین افراد پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا اور یہ بات طے کی گئی کہ کمیشن مجلس تحفظ کی طرف سے وقتاً فوقتاً دی جانے والی ہدایات پر عمل درآمد کرے گا، لیکن بعد میں کمیشن کے اراکین کی تعداد پانچ کر دی گئی۔ اس فیصلے سے ایک دن قبل ۱۹ر جنوری کو مجلس تحفظ ایک قرارداد میں ہند اور پاکستان سے یہ اپیل کر چکی تھی کہ انھیں ایسے بیان دینے سے جو حالات کو بدتر بنا سکتے ہیں گریز کرنا اور حالات کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔

مذکورہ بالا قراردادوں کی منظوری کے علاوہ مجلس تحفظ میں اصل مسئلے کو حل کرنے کی کوشش بھی جاری رہی۔ اس معاملے میں پاکستان کا مطالبہ یہ تھا کہ شیخ محمد عبداللہ کی حکومت کو توڑ دیا جائے اور کشمیر سے ہندوستانی افواج کو واپس بلا لیا جائے، لیکن ہندوستان نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ۱۷ر اپریل ۱۹۴۸ء کو بلجیم، کینیڈا، کولمبو، برطانیہ، چین اور متحدہ امریکا کی طرف سے ایک اور تجویز پیش کی گئی جسے ۲۱ر اپریل ۱۹۴۸ء کو منظور کر لیا گیا۔ اس تجویز کا مفہوم یہ تھا کہ ہند اور پاکستان کے مابین تنازعۂ کشمیر کو طے کرانے کے لیے پانچ افراد پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔

اس قرارداد کے مطابق ۷ر مئی ۱۹۴۸ء کو جو کمیشن مقرر کیا گیا اس کے لیے مجلس تحفظ نے بلجیم اور کولمبو کو اپنی طرف سے نامزد کیا۔ ہند اور پاکستان نے علی الترتیب یوگوسلادیہ اور ارجنٹائن کو اپنا نمائندہ منتخب کیا اور اس کے بعد اس میں امریکا کو شامل کر لیا گیا۔ ۱۰ر مئی ۱۹۴۸ء کو مجلس تحفظ نے ہندوستان کے رو بہ رو اس کمیشن کی حدود اختیارات سے متعلق سمجھوتے کا ایک مسودہ پیش کیا اور ۳ر جون کو مجلس نے ایک ایسی قرارداد منظور کی جس میں کمیشن کو کشمیر کے تنازعے کے سلسلے میں ضروری مسایل پر تبادلۂ خیالات کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔

کمیشن نے ۱۵؍جون سے ۳؍جولائی تک جنیوا میں اپنے اجلاس منعقد کیے اور اس کے بعد جولائی کے دوسرے ہفتے سے ۲۲؍نومبر ۱۹۴۸ء تک براعظم ہند میں رہ کر ہند اور پاکستان کی حکومتوں سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد اول تو مجلس تحفظ کے روبہ رو اپنی ابتدائی رپورٹ پیش کی، دوسرے فریقین کے درمیان عارضی طور پر جنگ بند کرانے اور پھر مستقل فیصلہ پر پہنچنے کے لیے تین حصوں پر مشتمل ایک قرارداد منظور کر کے فریقین کو بہ یک وقت اس کا مسودہ بھیج دیا۔

اس تجویز کے پہلے حصے کے فقرہ (الف) میں دونوں ملکوں کی حکومتوں کے اتفاق رائے کی شرط پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ وہ اس تجویز کی منظوری کے بعد چار یوم کے اندر کشمیر میں اپنی اپنی اور اپنے اپنے زیر اثر افواج کو جنگ بند کر دینے کی ہدایت کر دیں گی۔ فقرہ (ب) میں اس امر کی ہدایت کی گئی تھی کہ دونوں ملک کشمیر میں مزید فوج بھیجنے سے محترز رہیں گے۔ فقرہ (س) میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ جنگ بندی کے سلسلے میں اگر فریقین کے موجودہ فوجی خطوط میں کسی تغیر کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس معاملے میں دونوں ملکوں کے سپہ سالار اعظم باہم مشورہ کریں گے۔ فقرہ (د) میں کہا گیا تھا کہ اگر ضروری سمجھا گیا تو کمیشن دونوں ملکوں کی فوجی کمانڈ کے اشتراک عمل سے عارضی جنگ بندی کے فیصلے پر عمل درآمد کی نگرانی کرے گا اور فقرہ (ی) کا مفہوم یہ تھا کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں اپنے اپنے ملک کے باشندوں سے مستقبل میں مفاہمت کے لیے فضا کو سازگار بنانے کی اپیل کریں گی۔

تجویز کے دوسرے حصے میں التوائے جنگ کی شرایط کی دفعہ (الف) فقرہ اوّل کا مفہوم یہ تھا کہ ریاست میں پاکستان کی افواج کی موجودگی کے باعث چوں کہ اس صورت حال میں زبردست تغیر پیدا ہو گیا ہے، جو پاکستان نے مجلس تحفظ کے روبہ رو بیان کی تھی، اس لیے پاکستان کشمیر سے فوراً اپنی افواج کو واپس بلا لے گا۔ فقرہ دو میں مذکور تھا کہ پاکستان کی حکومت اپنے شہریوں اور قبایلیوں کو جو ریاست میں لڑائی کی غرض سے داخل ہوئے تھے وہاں سے نکالنے میں پوری امداد کرے گا۔ اور فقرہ تین میں لکھا تھا کہ جب تک اس مسئلے کا کوئی آخری فیصلہ نہ ہو جائے پاکستانی افواج کے چھوڑے ہوئے علاقے کے باشندے کمیشن کی نگرانی میں وہاں اس کا انتظام خود کریں گے۔ اور دفعہ (ب) کے فقرہ ایک میں

مذکور تھا کہ جب کمیشن حکومت ہند کو اس امر سے مطلع کر دے گا کہ لڑائی کی غرض سے آنے والے پاکستانی شہری اور قبایلی کشمیر سے چلے گئے ہیں تو حکومت ہند بھی وہاں سے اپنی افواج کو واپس بلانا شروع کر دے گی۔ فقرہ دو میں لکھا تھا کہ جب تک کشمیر کے مسئلے کا کوئی آخری فیصلہ نہ ہو جائے گا ہندوستان ریاست کے اس حصے پر قابض رہے گا، جو متارکہ کے وقت ہندوستانی افواج کے قبضہ میں ہوگا اور فقرہ تین کا مفہوم یہ تھا کہ متارکے کے دوران حکومت ہند ریاست میں امن برقرار (رکھنے) اور اہل کشمیر کے سیاسی اور شہری حقوق بحال رکھنے کی ذمے دار ہوگی اور تجویز کے تیسرے حصے میں اس بات کو تسلیم کیا گیا تھا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ باشندگان کشمیر کی رائے پر منحصر ہوگا۔ اور متارکہ کی شرایط کو پورا کرنے کے بعد استصواب رائے کے سلسلے میں دونوں ملکوں کی حکومتیں کمیشن سے مشورہ کریں گی۔

اس تجویز کی باقاعدہ منظوری سے قبل جب اس پر کمیشن اور دونوں ملکوں کی حکومتوں کے مابین تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا تو پنڈت نہرو نے کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر جوزف کاربیل کے نام ایک خط لکھ کر اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ریاست کے اس شمالی علاقے کے انتظام کے متعلق جہاں بہت کم لوگ آباد ہیں قرارداد میں کوئی تجویز موجود نہیں اور چوں کہ اس علاقے کے متعلق ریاست کی حکومت کے اقتدار کی مخالفت نہیں کی گئی اور اس لیے گلگت کے علاوہ اس تمام علاقے کے انتظام کے اختیارات ریاست کی قانونی حکومت (کو) اور دفاع کی ذمے داری حکومتِ ہند کی طرف منتقل کی جانی چاہیے۔ حکومت ہند کو اس خط کا جو جواب موصول ہوا اس کا مفہوم یہ نہ تھا کہ مذکورہ بالا علاقے کے خصوصی حالات کے پیش نظر کمیشن نے اس کے فوجی پہلو پر غور نہیں کیا، لیکن قرارداد پر عمل درآمد کے دوران اس پر غور کیا جائے گا۔ بہ ہر حال حکومت ہند نے کمیشن کی اس تجویز کو منظور کر لیا، لیکن حکومتِ پاکستان نے ۶/ ستمبر ۱۹۴۸ء کو جو جواب دیا اس میں لکھا تھا کہ جو افواج آزاد کشمیر کے ماتحت ہیں انھیں جنگ بندی کا حکم صرف آزاد کشمیر ہی کی حکومت دے سکتی ہے اور یہ کہ کشمیر کے تنازعے کے سلسلے میں آزاد کشمیر کی حکومت کو ایک لازمی فریق کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ چناں چہ ۶/ ستمبر ۱۹۴۸ء کو کشمیر کمیشن نے جو اعلان شایع کیا اس میں اس امر کا اعتراف کیا گیا تھا کہ حکومت ہند نے اس کی تجویز کو تسلیم کر لیا ہے، لیکن حکومت پاکستان نے اس کی منظوری کو بعض شرایط

کے ساتھ مشروط کر دیا ہے اور اس طرح دوسرے الفاظ میں اسے مسترد کر دیا ہے۔ ۲۵ ر نومبر ۱۹۴۸ء کو مجلس تحفظ میں کشمیر کے مسئلے پر اور ۵ ر جنوری ۱۹۴۹ء کو کشمیر کمیشن نے ریاست میں استصواب رائے عامہ کی تفصیلات پر مشتمل ایک طویل قرارداد منظور کی، لیکن اس سے قبل یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو کشمیر میں عارضی جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔

کشمیر میں استصواب رائے عامہ کے سلسلے میں جو تفصیلات طے کی گئی تھیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ ہند یا پاکستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کا فیصلہ باشندگان کشمیر کی آزادانہ استصواب رائے سے کیا جائے گا۔ استصواب رائے عامہ ۱۳ ر اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے پہلے اور دوسرے حصے کی تکمیل کے بعد کرایا جائے گا۔ ادارہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل استصواب رائے عامہ کے ناظم کو کمیشن سے مشورہ کرنے کے بعد نامزد کریں گے، لیکن اس کا باقاعدہ تقرر کشمیر کی حکومت کرے گی اور کشمیر ہی کی حکومت ناظم استصواب رائے عامہ کو استصواب رائے کرانے کے اختیارات دے گی۔ ناظم اپنے عملے کو خود مقرر کرے گا۔ ۱۳ ر اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصۂ اوّل اور دوم کی تکمیل اور ریاست میں پرامن فضا پیدا ہو جانے کے سلسلے میں کمیشن کے مطمئن ہو جانے کے بعد کمیشن اور ناظم استصواب رائے عامہ حکومت سے مشورہ کر کے ہندوستانی اور ریاستی افواج کے ہٹانے کے متعلق کوئی فیصلہ کریں گے، لیکن اس فیصلے میں ریاست اور استصواب رائے عامہ کی آزادی کا لحاظ رکھا جائے گا۔ جہاں تک پاکستان کے مقبوضہ ریاستی علاقوں کا تعلق ہے وہاں سے پاکستانی فوجوں کے ہٹانے کا فیصلہ کمیشن اور ناظم استصواب رائے عامہ مقامی حکام سے مشورے کے بعد کریں گے۔ ریاست کے تمام انتظامی اور فوجی حکام اور سیاسی عناصر سے استصواب رائے عامہ کی تیاری میں ناظم استصواب رائے عامہ کے ساتھ تعاون کی توقع کی جائے گی۔ رائے دہندگان کو متاثر کرنے کے لیے کسی قسم کی تخویف، ترغیب اور تحریص سے کام نہ لیا جائے گا۔ ریاست میں جائز سیاسی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عاید نہیں کی جائے گی۔ ہند یا پاکستان کے ساتھ الحاق کے سوال پر بلا لحاظ سیاسی اور مذہبی عقاید ہر جماعت اور ریاست کے ہر شہری کو اظہار خیال نیز ریاست میں نقل و حرکت اور آمد و رفت کی آزادی حاصل ہوگی۔ تمام سیاسی اسیروں کو رہا کر دیا جائے گا۔ ریاست میں آباد تمام اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ

کیا جائے گا اور اختلاف رائے کی بنا پر کسی کو سزا نہیں دی جائے گی۔

مذکورہ بالا تجویز کے مطابق اگرچہ کشمیر میں جنگ بند کردی گئی، لیکن چوں کہ اس تجویز کی بعض دفعات کی توضیح میں ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے مابین اختلاف رائے پیدا ہوگیا اس لیے تجویز کے حصۂ دوم اور سوم پر عمل درآمد نہیں ہوسکا۔ دونوں ملکوں کی حکومتوں کے مابین جن نکات پر اختلاف رائے رونما ہوا تھا وہ آزاد کشمیر کی فوجوں کو غیر مسلح کرنے اور پاکستان کے مقبوضہ علاقہ ریاست کے انتظامات سے متعلق تھے۔ دونوں ملکوں کی حکومتوں کے مذکورہ بالا اختلاف رائے کے پیشِ نظر ۱۵؍اپریل ۱۹۴۸ء کو کشمیر کمیشن نے متارکہ کے سلسلے میں نئی تجاویز پیش کیں، جن میں آزاد کشمیر کی افواج کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا، لیکن حکومت ہند نے ان تجاویز کو نامنظور کردیا۔ ۲۸؍اپریل کو کمیشن نے اپنی تجاویز میں مزید ترمیمات کیں، جن کے سلسلے میں حکومتِ ہند نے دوبارہ اس امر پر زور دیا کہ آزاد کشمیر کی افواج کو غیر مسلح اور منتشر کرانے کے سلسلے میں حکومتِ پاکستان سے معاہدہ کیا جائے۔ جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد فوراً ہی ان افواج کو غیر مسلح اور منتشر کرنے کا کام شروع کردیا جائے اور ریاست سے ہندوستانی افواج کی واپسی کے معاملے کو آزاد کشمیر کی افواج کو غیر مسلح اور منتشر کرنے کی رفتار کے ساتھ وابستہ رکھا جائے۔ ۳۱؍مئی ۱۹۴۹ء کو کمیشن دونوں ملکوں کو حکومتوں کے جوابات پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ انھوں نے اس کی تجاویز کو نامنظور کردیا ہے۔ نیز اس نے ایک نمایندے کو برصغیر ہند بھیج کر دونوں حکومتوں سے بعض نکات کی وضاحت کرانے کا فیصلہ بھی کیا اور اس فیصلہ کے مطابق ۱۸؍جولائی سے ۲۸؍جولائی ۱۹۴۹ء تک کمیشن نیز ہند اور پاکستان کے مابین کراچی میں جو مذاکرات ہوئے ان کے دوران میں مستقل خط متارکہ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔

کراچی کانفرنس کی کامیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے کشمیر کمیشن نے اپنے زیر اہتمام دونوں ملکوں کی ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی، لیکن چوں کہ پاکستان اس کانفرنس میں آزاد کشمیر کے مسئلہ کو زیر بحث لانا نہیں چاہتا تھا اور حکومت ہند اس معاملہ کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں تھی، اس لیے کمیشن نے اس تجویز کو واپس لے کر ۲۶؍اگست کو ایک نئی تجویز پیش کی، جس میں متنازعہ فیہ مسایل کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک حکم مقرر کرنے

کی سفارش کی گئی تھی۔ اس مرحلے پر صدر ٹرومین اور مسٹر ایٹلی نے بھی ہند اور پاکستان کو کمیشن کی مذکورہ بالا سفارش منظور کر لینے کا مشورہ دیا اور اگر چہ پاکستان نے اس تجویز کو منظور کر لیا، لیکن ہندوستان نے نامنظور کر دیا اور اس طرح جب کمیشن کو اپنے مقصد کے حصول میں ناکامی کا یقین ہو گیا تو اس نے ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو مجلس تحفظ کے روبہ رو اپنی سرگرمیوں کی مفصل رپورٹ پیش کر دی، جس میں اس نے متنازعہ کشمیر کا تاریخی پس منظر اور اپنی ایک سالہ سرگرمیوں کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد آزاد کشمیر کی فوجوں کو غیر مسلح اور منتشر کرنے، ریاست سے ہند اور پاکستان کی افواج کو واپس بلانے اور ریاست کے شمالی علاقوں کے سوالات کو متنازعہ فیہ قرار دیا تھا اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ اول تو تنازعۂ کشمیر کا فیصلہ کرانے کے لیے کمیشن کی بجائے کسی ایک فرد کو وسیع تر اختیارات دے کر ثالث مقرر کر دیا جائے، دوسرے مجلس تحفظ ہند اور پاکستان سے متارکہ کی شرایط پر پوری طرح قایم رہنے کی درخواست کرے اور تیسرے متنازعہ فیہ مسایل کا فیصلہ کرانے کے لیے ایک حکم کے تقرر کی تجویز پر مزید غور کیا جائے۔

۱۷ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو جب مجلس تحفظ میں تنازعۂ کشمیر پر بحث و مباحثہ شروع ہوا تو ناروے کے مندوب ڈاکٹر آرنے سنڈے نے یہ تجویز پیش کی کہ اس معاملے پر بحث کرنے سے قبل مجلس تحفظ کے صدر فریقین سے تبادلۂ خیالات کر کے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کریں، جسے بعد میں مجلس کے روبہ رو پیش کیا جائے۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی اور اس کے مطابق کینیڈا کے مندوب اور مجلس تحفظ کے اس وقت کے صدر جنرل میک ناین نے اواخر دسمبر ۱۹۴۹ء سے اواخر جنوری ۱۹۵۰ء تک ہند اور پاکستان کے مابین مفاہمت کرانے کی جو کوششیں کیں وہ بھی ناکامیاب ثابت ہوئیں اور ۷ر فروری ۱۹۵۰ء کو انھوں نے مجلس تحفظ کے روبہ رو اپنی جو رپورٹ پیش کی اس میں اس امر کا اعتراف کیا گیا تھا کہ اس سلسلہ میں ان کی مزید مساعی مفاہمت کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکے گا۔ چناں چہ ۲۴ر فروری ۱۹۵۰ء کو مجلس تحفظ نے ایک قرارداد منظور کر کے کشمیر کمیشن کو منتشر کر دیا۔ ہند اور پاکستان کی حکومتوں کو پانچ ماہ کی مدت میں اپنی اپنی افواج کو واپس بلانے کا لائحۂ عمل مرتب کرنے اور اس پر عمل درآمد کرنے کی دعوت دی اور کمیشن کی بجائے اپنا ایک نمایندہ مقرر کر کے اسے متنازعہ فیہ

مسایل کو حل کرنے میں ہند اور پاکستان کی امداد کرنے کی ہدایت کی۔ اس قرارداد کے مطابق ۱۴ر مارچ ۱۹۵۰ء کو مجلس نے تنازعۂ کشمیر کو ختم کرانے کے لیے ثالث کے تقرر کے سلسلے میں ایک علاحدہ تجویز منظور کی اور ۱۲ر اپریل ۱۹۵۰ء کو سر آون ڈکسن مجلس تحفظ کے نمایندہ اور ثالث مقرر ہوئے۔

سر آون ڈکسن ۱۹۵۰ء کے تقریباً وسط میں برصغیر ہند میں آئے اور کم و بیش دو ماہ تک یہاں مقیم رہنے کے باوجود انھیں ان کے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور انھوں نے مجلس تحفظ کے رو بہ روا اپنی سرگرمیوں کی جو رپورٹ پیش کی اس کی بنا پر مجلس تحفظ نے ۳۱ر اپریل ۱۹۵۱ء کو ڈاکٹر گراہم کو اپنا نمایندہ مقرر کر کے ہندوستان بھیجا، مگر وہ بھی نو ہفتوں تک جدوجہد کرتے رہنے کے باوجود دونوں ملکوں کے مابین مفاہمت کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے اور ستمبر کے دوسرے ہفتے میں واپس چلے گئے۔ ان کی رپورٹ پر ادارۂ اقوام متحدہ کی مجلسِ عمومی کے چھٹے اجلاس منعقدہ پیرس میں غور کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف کشمیر میں مجلس آئین ساز قایم ہو چکی ہے اور ۳۱ر اکتوبر ۱۹۵۱ء سے اس مجلس کے اجلاس بھی شروع ہو گئے ہیں۔ یہ مجلس دیگر اہم مسایل کے فیصلوں کے علاوہ اس امر کا فیصلہ بھی کرے گی کہ ریاست جموں اور کشمیر کو ہند اور پاکستان میں سے کس ملک کے ساتھ وابستہ کیا جائے؟

(اسرار احمد آزاد)

کشمیر اور قبایلی لشکر:

اس وقت نوشہرہ، مردان، کوہاٹ اور پشاور قلعے میں ہندوؤں اور سکھوں کے کم سے کم پندرہ ہزار پناہ گیر کیمپ میں تھے اور کننگھم انھیں پنجاب بھجوانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ وہ ریلوے لاین کے ساتھ ان گاوؤں میں پروپیگنڈا کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے جن کے متعلق یہ پتا چلتا کہ وہ پناہ گیروں کی ٹرینوں پر حملے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس بات کا امکان تھا کہ ٹرینوں کو گزارنے کے لیے باقاعدہ فوجی کارروائی کرنا پڑے گی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''انسانیت یا شرافت کی اپیل کا کوئی اثر نہیں تھا۔'' دریں اثنا اس اطلاع سے ایک اور پریشانی ہوئی کہ پاک فوج ایسی خراب حالت میں ہے کہ وزیرستان سے تمام فوجیوں کو تین ماہ کے اندر واپس بلانا پڑے گا۔ کننگھم بادل نخواستہ اس پر آمادہ ہوئے۔ انھوں نے یہ

بھی لکھا ہے کہ ان سے سرحد کے ساتھ ساتھ تقریباً ہر قبیلے نے یہ درخواست کی کہ انھیں مشرقی پنجاب جا کر سکھوں کو قتل کرنے کی اجازت دی جائے۔ میرا خیال ہے کہ میری انگلی کے اشارے پر چالیس ہزار یا پچاس ہزار کا لشکر تیار ہو سکتا تھا۔'' مہینے کے آخر میں انھیں فرقہ وارانہ جذبات میں کچھ بہتری کے آثار نظر آئے۔ اس وقت پاکستان اور بھارت کے درمیان باقاعدہ جنگ کے خطرے کی عام باتیں ہونے لگی تھیں۔ حال آں کہ پاکستان جنگ لڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ انھیں صرف یہ امید تھی کہ کشمیر میں مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے جتھے گھسنے سے جنگ کا جواز پیدا نہیں ہوگا۔ انھوں نے ایک خاص مثال بھی دی ہے۔ تقریباً پانچ سو دیہاتیوں نے جو ہزارہ یا پنجاب کے تھے، کشمیر پر یلغار کے بعد تقریباً پانچ سو رائفلیں لوٹ لیں، جو کشمیری فوجیوں نے ایک گاؤں میں جمع کر رکھی تھی۔ مہاراجہ نے ابھی تک بھارت یا پاکستان سے الحاق کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔

۱۴ر اکتوبر کو وہ پشاور کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک اجلاس منعقد کرانے میں کامیاب ہو گئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ قلعے سے ہندوؤں کو شہر اور چھاؤنی میں ان کو گھروں اور کاروبار میں واپس لانا محفوظ ہے یا نہیں۔ اگرچہ اجلاس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، لیکن یہ منصوبہ ناممکن نظر نہیں آیا۔ اس وقت کشمیر کی سرحد پر صورت حال بگڑ رہی تھی۔ کننگھم جن قبایلیوں سے بھی خطاب کر سکے ان میں آفریدی اور مہمند بھی شامل تھے۔ انھیں خبردار کیا گیا کہ اگر بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے تو ان کا اس میں حصہ لینا خطرناک ہوگا۔ ان کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ایک پنجابی جس کا نام خورشید انور تھا اور وہ مسلم نیشنل گارڈ کا رکن تھا۔ ہزارہ، سرحد اور کشمیر پر تین اطراف سے حملے کو منظم کر رہا تھا۔

صوبائی حکومت نے پٹرول اور آٹے کی خاصی مقدار لاری پر پشاور سے لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وزیر اعلا عبدالقیوم نے اس پالیسی کی حمایت کی کہ سرحد کی طرف سے عوام کی پیش قدمی میں افسر اور پولیس کسی قسم کی مدد نہ کریں،، لیکن انھوں نے واضح کیا کہ چھوٹی جماعتوں کو جانے سے روکنے میں مشکلات ہیں۔ مزید برآں حکومت پاکستان بجا طور پر اس اندیشے سے سخت پریشان تھی کہ اگر مہاراجہ کشمیر بھارت سے الحاق کا فیصلہ کرتا ہے اور بھارتی فوج وادیٔ کشمیر پر قبضہ کر لیتی ہے تو پاکستانی سرحد اس کی زد میں آ جاتی ہے، جس سے

ابھی سے پاکستان کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

بحران سنگین ہوتا گیا۔ ۲۰ ر اکتوبر کو خبر آئی کہ نو سو محسود لاری میں سوار ہو کر ٹانک سے کشمیر کے محاذ پر روانہ ہو گئے ہیں۔ کوہاٹ میں بڑی تاخیر سے انھیں روکنے کی کوشش کی گئی، کیوں کہ وہ خوش حال گڑھ کے راستے پنجاب میں پہنچ چکے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تقریباً تین سو مہمند بھی ساتھ گئے ہیں۔ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کو ٹیلے فون پر کہا گیا کہ وہ اپنی رائے کا ریڈیو پر اعلان کریں، تاکہ ہر شخص کو جن میں سرکاری حکام بھی شامل ہیں، یہ احساس ہو سکے کہ حکومت پاکستان کشمیر پر کسی قسم کے حملے کے حق میں نہیں ہے۔ جس کا جواب یہ ملا کہ ان ہی خطوط پر عبدالقیوم اور دوسروں کو پہلے ہی ہدایات جاری کی جا چکی ہیں اور ان کا خیال تھا کہ یہ کافی ہے۔ اسی رات عبدالقیوم نے ریڈیو پر خطاب کرتے ہوئے سرکاری حکام اور عوام سے کہا کہ وہ غیر جانب دار رہیں۔ ۲۲ ر اکتوبر کو یہ خبر ملی کہ کئی ہزار مسلح افراد ہزارہ سے کشمیر گئے ہیں اور انھوں نے مظفر آباد اور دومیل پر قبضہ کر لیا ہے۔ کننگھم کی پوزیشن بڑی مشکل میں آ گئی۔ انھوں نے خود بھی اس کو ''بہت آسان نہیں'' قرار دیا۔ کیوں کہ اگر وہ اس تحریک کی حمایت کریں تو مزید ہزاروں افراد جمع ہو جائیں گے، جس کی وجہ سے بڑا حملہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اس کی مذمت کریں اور تحریک ناکام ہو جائے تو ان پر یہ الزام آئے گا کہ مناسب حمایت نہ ہونے کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری تھا کہ وہ اب برطانوی افسر نہیں ہیں جو برطانیہ کے زیر کنٹرول حکومت میں کام کر رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے ملازم ہیں اور اس کے آئینی گورنر ہیں۔ ان کے ذہن میں ایک طرف تو پاکستان کی وفاداری اور دوسری طرف اپنے عزم کے درمیان کش مکش برپا تھی کہ وہ کسی ایسے اقدام کی نہ تو اجازت دیں گے اور نہ ہی اس میں شریک ہوں گے جو ان کے غیر معمولی علم اور تجربے کی بنا پر غیر انسانی ہے اور تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت اور بعد میں ان لوگوں نے ان کے اقدام کو اکثر و بیشتر غلط سمجھا ہے۔ جنھوں نے دو مملکتوں کے قیام کے بعد گورنر کی پوزیشن میں بنیادی تبدیلی کا ادراک نہیں کیا۔

۲۴ ر اکتوبر سے پناہ گزینوں کی ٹرینیں پنجاب کی طرف سے جانا شروع ہو گئیں اور ایک بھی گولی چلائے بغیر چار دنوں میں ۱۲ ہزار پناہ گزینوں کو نکال لیا گیا۔ ۳۰ ر اکتوبر تک

تمام ہندو اور سکھ پناہ گزین جن کی تعداد سترہ ہزار پانچ سو تھی بہ حفاظت روانہ ہو چکے تھے۔ وحشیانہ واقعات کے درمیان اس پُر امن نقل مکانی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ کننگھم کی بالادست اتھارٹی کی وجہ سے ہوا۔ وہ اب بھی ان تقریباً پچاس ہزار افراد کے متعلق پریشان تھے جو پشاور، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کے شہروں میں کم و بیش معمول کی زندگی گزار رہے تھے۔ انھیں امید تھی کہ وہ انھیں یہیں مقیم رہنے پر آمادہ کرلیں گے، لیکن ان کی حفاظت کے متعلق انھیں پورا اطمینان نہیں تھا۔

دریں اثنا کشمیر پر یلغار جاری تھی۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ سرحد پار سے تقریباً دو ہزار قبائلی اور غالباً ہزارہ کے دو ہزار افراد کشمیر گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی پنجاب سے کئی ہزار افراد گئے ہیں جو پوری طرح مسلح نہیں تھے۔ انھیں کوئی مزاحمت پیش نہیں آئی اور یہ جہلم سے ہوتے ہوئے بارہ مولا تک پہنچ گئے۔ کننگھم نے ایبٹ آباد کے ڈپٹی کمشنر کو حکم دیا کہ اس لشکر کے محسود لیڈروں سے رابطہ کر کے انھیں قاعدے قرینے میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ انھیں خطرہ تھا کہ اگر محسود سری نگر پہنچ گئے تو وہاں اندھا دھند لوٹ مار اور قتل و غارت گری ہوگی۔ ۲۵/اکتوبر کو کرنل اسکندر مرزا لاہور پہنچے۔ انھوں نے کشمیر کے خلاف موجودہ مہم کی پس پردہ داستان سنائی۔ وہ لیاقت علی خاں کی معذرت بھی لے کر آئے تھے کہ اس کے متعلق مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا گیا تھا۔ لیاقت خود پچھلے ہفتے یہاں آکر مجھے اس کے متعلق ذاتی طور پر بتانا چاہتے تھے، لیکن بیماری کی وجہ سے نہ آسکے۔ یہ بیماری دل کی کافی شدید بیماری معلوم ہوتی تھی۔ جناح کو خود بھی پندرہ دن قبل معلوم ہوا تھا کہ کیا کچھ ہو رہا ہے، لیکن انھوں نے کہا: ''اس کے متعلق مجھے کچھ نہ بتاؤ'' میں اپنا ضمیر صاف رکھنا چاہتا ہوں۔ اسکندر مرزا کو یقین تھا کہ جیسے ہی پٹھان کوٹ کی سڑک بن جائے گی جو شاید تین ماہ میں بن جائے، مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ بھارت میں شامل ہو جائے گا۔ اس کے پاس پونچھ اور جموں میں بہت سے سکھ اور ڈوگرہ ہیں اور وہ بھارت کی عام حکمت عملی کے مطابق مسلمانوں کو پاکستان میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تقریباً ایک ماہ قبل یہ فیصلہ ہوا تھا کہ پونچھ کے لوگ بغاوت کریں اور ان کی مدد کی جائے۔ عبدالقیوم کو شروع ہی سے یہ سب کچھ معلوم تھا۔ برطانوی افسروں کو اس سے الگ رکھا گیا تھا تاکہ وہ کسی الجھن میں مبتلا نہ ہوں۔

دوسرے دن یہ خبر تھی کہ آج رات قبایلیوں کے سری نگر پہنچنے کی توقع ہے۔ حال آں کہ کننگھم کو اس کا یقین نہیں تھا کہ ان کا روسی فوج سے مقابلہ ہو چکا ہے۔ بہ ہر کیف مزید تین ہزار قبایلی بلائے گئے اور کننگھم کو اپنی ڈایری میں یہ لکھنا پڑا: ''میں ایک آنکھ بند رکھ رہا ہوں۔'' ۲۷ رتاریخ کو دہلی ریڈیو نے بتایا کہ بھارتی فوج بہ ذریعۂ طیارہ کشمیر بھیجی جا رہی ہے۔ احکامات کے تحت وہ ۲۸ راکتوبر کو لاہور پرواز کر گئے۔

انھوں نے لکھا ہے: ''گورنمنٹ ہاؤس میں بہت سے جرنیل جمع تھے، جن میں گریسی اور کلاڈ آکنلیک بھی شامل تھے۔ ہری سنگھ کے بھارت کے ساتھ الحاق کے اعلان کے بعد کل بھارت نے اعلان کیا تھا کہ بھارتی فوج طیاروں کے ذریعے سری نگر بھیجی جا رہی ہے۔ حکومت پاکستان اپنی فوج بھی وہاں بھیجنا چاہتی تھی۔ گریسی اس کے سخت مخالف تھے، کیوں کہ اس کے معنی جنگ کے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کی حمایت کروں۔

تقریباً بارہ بجے مودی اور میں لیاقت علی کے گھر گئے۔ لیاقت علی اس وقت بھی صاحب فراش تھے۔ ہم نے ان کے بیڈ روم میں ان سے اور جناح سے ڈھائی گھنٹے تک بات چیت کی۔ جناح نے اپنی پوزیشن کافی وضاحت سے بیان کی۔ انھوں نے بتایا کہ آرکنلیک نے بھی بتایا ہے کہ دونوں مملکتوں کے درمیان جنگ کی صورت میں دونوں فوجوں کے برطانوی افسر فوراً ہی الگ ہو جائیں گے۔ (یہ عجیب لگتا تھا۔ انھیں پہلے کبھی یہ نہیں بتایا گیا تھا اور یہ حالیہ فیصلہ بھی نہیں تھا) جناح نے کہا کہ بھارت کی طرح ان کے پاس بھی فوج کی مداخلت کی معقول اخلاقی اور آئینی وجوہ موجود ہیں، کیوں کہ ہری سنگھ کا نام نہاد الحاق فراڈ ہے، جس کو تسلیم کرنا ممکن نہیں (میں وہاں ان کے دلایل سمجھ نہ سکا) کشمیر نے وہ تمام راستے بند کر دیے ہیں جو پاکستان نے بنائے تھے اور کشمیر میں تمام مسلمانوں کی جانیں خطرے میں ہیں، لیکن انھیں یہ احساس تھا کہ اس وقت پاکستانی فوج کم زور ہے۔ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ کیا ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ جنگ کا خطرہ مول لے لینا چاہیے؟ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انھوں نے اپنے ذہن میں لڑائی کے لیے فوج بھیجنے کے امکان کو ختم کر دیا تھا۔

اس کے بعد ہم نے نہایت تفصیل سے جموں کے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے فوج

بھیجنے کے سوا افراد، اسلحہ اور گولہ بارود بھیجنے کے امکانات پر غور کیا۔ جناح اور لیاقت دونوں اس بات سے سخت پریشان تھے کہ اگر جموں میں جس کا انھیں خطرہ تھا مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا۔ مودی نے تجویز پیش کی کہ بھارت کے ساتھ سمجھوتے کے تحت مسلمانوں کی حفاظت کے لیے جموں میں پاکستان کی ایک بٹالین بھیجی جائے، جس طرح کہ پاکستانی فوجی مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی جان بچانے کا کام کر رہے ہیں۔ ہم اس پر بحث کر ہی رہے تھے کہ ایک تار آیا، جس میں کہا گیا کہ بھارتی حکومت کل ماؤنٹ بیٹن، نہرو، جناح اور مہاراجہ ہری سنگھ کے درمیان ملاقات پر رضا مند ہوگئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ تجویز برطانوی حکومت کی طرف سے آئی ہوگی۔ اس لیے ہم نے جموں کے مسئلے پر بحث ترک کر دی اور اس پر غور شروع کیا کہ جناح کو کیا نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہیے۔ آخر میں ہم نے فیصلہ کیا کہ

(ا) ہری سنگھ کے بھارت کے الحاق کے فیصلے کی قانونی حیثیت اور اس کی مقبولیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دینا چاہیے۔

(ب) مطالبہ کرنا چاہیے کہ بھارت یا پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کرنے کے لیے استصواب رائے (نہ کہ ریفرنڈم جس میں صرف ووٹر حصہ لیں) کرایا جائے۔

(ج) یہ تجویز پیش کرنی چاہیے کہ استصواب رائے منعقد کرانے کے لیے دونوں کمانڈر انچیف سپردی اور لاک ہارٹ کو کمشنر مقرر کیا جائے، جن کے پاس مکمل اختیارات ہوں اور انھیں امن قایم کرنے کے لیے فوج (بھارت اور پاکستان دونوں کی فوج) استعمال کرنے کا بھی اختیار ہونا چاہیے۔

جناح نے مجھے کل تک لاہور میں ٹھہرنے کے لیے کہا۔ اگرچہ یہ مشکل تھا، لیکن مجھے ٹھہرنا پڑا۔ دریں اثنا قبایل جو کچھ کر رہے تھے وہ انھیں کرنے دینا چاہیے۔

۲۹ را کتوبر. جناح کے سیکریٹری کا آٹھ بجے صبح پیغام ملا کہ نہرو دہلی میں بیمار ہے، اس لیے آج کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا ہے۔ جناح کی خواہش تھی کہ میں ان سے دس بجے دن ان کے کمرے میں ملوں۔ جب میں ملنے گیا تو جناح، ماؤنٹ بیٹن اور نہرو سے سخت ناراض تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ معاملات کو ٹالنے کی سازش تھی، کیوں کہ کشمیر میں بھارت کی مزید

فوج اتاری جا رہی تھی۔ غالباً یہ بالکل درست تھا۔

پھر ہم نے ڈیڑھ گھنٹے تک گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ وہ اب محسوس کرتے ہیں کہ وہ قانونی اور اخلاقی طور پر آزاد ہیں کہ کشمیر کے متعلق جو فیصلہ مناسب سمجھیں کریں۔ کیوں کہ کشمیر کا بھارت سے الحاق فراڈ ہے۔ میں انھیں اس پر آمادہ نہیں کر سکا کہ وہ واضح کریں کہ فراڈ کہاں ہوا ہے۔ سوائے اس کے کہ الحاق کا طریقہ اور اس کے ساتھ ہی فوری طور پر بھارتی فوج کا کشمیر پر قبضہ اس اصول کے خلاف تھا جو الحاق کے سلسلے میں باہمی طور پر طے ہوا تھا۔ مسٹر جناح نے بلغاریہ کے مظالم کے سلسلے میں گلیڈسٹون کی مداخلت کا حوالہ بھی دیا۔ پھر انھوں نے کہا کہ مودی میرے لیے اور کمانڈر انچیف کی حیثیت سے گریسی کے لیے لازمی ہے کہ وہ کشمیری عوام کے حقوق اور جانوں کے تحفظ کی جدوجہد میں پوری طرح شامل ہو جائیں۔ مجھے پورا یقین نہیں کہ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ کیا اب تک میں اس جدوجہد میں شامل نہیں ہوں؟ اس لیے میں نے انھیں بتایا کہ چار پانچ دن قبل مجھے یہ تک نہیں معلوم تھا کہ کیا میرے قبائلیوں کا کشمیر میں داخلہ ان کی حمایت کی پالیسی کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور میرے آخری احکامات جس پر میں ابھی تک عمل کر رہا ہوں یہ تھے کہ قبائلیوں کی ضرورت نہیں ہے، جب تک پاکستان اس کے لیے نہ کہے اور ابھی تک مجھے نہیں بتایا گیا ہے کہ قبائلیوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں نے اپنے تمام افسروں سے کہا ہے کہ وہ اس معاملے میں مدد کریں۔ حال آں کہ وہ تحریک کو نہیں روک سکے ہیں۔ اگر ان کی یہی پالیسی ہے تو میں اس کی حمایت کے لیے بالکل تیار ہوں۔ بہ شرطے کہ مجھے اس پر مجبور نہ کیا جائے کہ میں کروں کچھ اور کہوں کچھ، لیکن اگر مجھے یہی کچھ کرنا ہے تو جناح کو یہ خطرہ مول لینا ہوگا کہ قبائلیوں سے میرے بعض افسروں کے تعاون کا دوسروں کو بھی علم ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ عالمی رائے اس کی مذمت کرے۔ جناح نے کہا کہ انھیں اس کا احساس ہے اور وہ یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہیں۔

انھوں نے کہا کہ کمانڈر انچیف کو کشمیر میں پاکستانی فوج بھیجنے کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے کہا کہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ کشمیری فوج بارہ مولا اور سری نگر کے ہوائی اڈوں پر قابض ہے اور وادی جہلم تک فوج کی پیش قدمی بہت مشکل ہوگی۔ کیوں

کہ بارہ مولا میں فوج اتارنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نے ان سے یہ التجا بھی کی کہ قبایلیوں کی کارروائیوں کے ساتھ ہماری فوج کو لپیٹ نہ کیا جائے۔ یہ دونوں کام ساتھ ساتھ نہیں ہوسکیں گے۔ میں نے مزید کہا کہ اگر دباؤ ڈالنا مقصود ہے تو اس وقت صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ مزید قبایلی بھیجے جائیں، لیکن ان کے لیے راشن، اسلحہ اور دوسرا سامان بھیجنے کا مناسب انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مختلف قبایل کی مخصوص تعداد بلانے کے لیے کوئی مستند اتھارٹی ہونی چاہیے۔ ہم میں اس پر اتفاق ہوگیا اور ہم لیاقت علی خاں اور مودی سے مذاکرات کے لیے لیاقت علی کے بیڈ روم میں گئے۔

انھوں نے اس کانفرنس کی تمام گفتگو کا خلاصہ بیان کیا جو یہ تھا:

(۱) ہمیں بارہ مولا میں پانچ ہزار قبایلیوں کو رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور تھک جانے والے قبایلیوں کی جگہ تازہ دم قبایلی بھیجتے رہنا چاہیے۔

(۲) پنجاب سے راشن اور اسلحہ بھیجا جائے گا۔ میں گاؤں کے دفاعی ذخیرے سے ایک لاکھ گولیاں فراہم کروں گا۔

(۳) واپسی پر قبایلیوں کو نقد رقم دی جائے گی۔

(۴) ہمیں پونچھ کو اسلحہ اور گولا بارود سے مضبوط کرنا چاہیے۔ غالباً ان کے پاس پہلے ہی کافی لوگ موجود ہیں۔

(۵) قبایلی پونچھ یا وادی جہلم پنجاب کے راستے نہیں جائیں گے (کیوں کہ یہ بالکل عیاں ہوتا) بلکہ ہزارہ کے راستے جائیں گے۔

(٦) ایک رہنما کمیٹی قبایلیوں کی بھرتی، ان کی کارروائیوں اور سامان رسد وغیرہ کو کنٹرول کرے گی۔ کمیٹی میں رحیم (کمشنر راولپنڈی) غلام سرور (ڈی سی ہزارہ) فیض اللہ (ایس پی ہزارہ) اور دو اور افسر شامل ہوں گے۔

(۷) اوپر ذکر کیے گئے افسروں کے علاوہ اگر دوسرے افسروں سے کام لیا جائے گا تو بہتر یہ ہوگا کہ انھیں رخصت پر بھیجا جائے۔

کانفرنس کے دوران دہلی سے ایک ٹیلی فون آیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا: ”نہرو صاحب فراش ہیں، آپ لوگ دہلی آئیں۔“

مسٹر جناح نے کہا: ''لیاقت صاحب فراش ہیں، آپ لوگ لاہور آئیں۔''

آخر کار یہ طے ہوا کہ تین دن بعد لاہور میں کانفرنس ہوگی۔ دریں اثنا ایک سرکاری اعلان کیا گیا جس میں تمام صورت حال کے متعلق حکومت پاکستان کے طرز عمل کی وضاحت کی گئی۔ اس طرح کشیدگی کچھ کم ہوئی اور جنگ کے امکانات بھی کم ہو گئے، لیکن کننگھم کو پورا یقین تھا کہ قبائلیوں کی مداخلت سے کشمیر کو بھارت کی گود میں ڈال دیا گیا ہے اور حکومت نے قبائلیوں کی مداخلت کی مدد کر کے زبردست غلطی کی ہے، جس کا مسٹر جناح کو بھی احساس تھا۔ نقصان ہو چکا تھا۔ کننگھم کو اس پر تشویش تھی کہ قبائلی گھر واپس آتے ہوئے راستے میں حضری اضلاع میں کہیں لوٹ مار نہ کریں۔

۳۱ / اکتوبر کو انھوں نے سنا کہ وزارت نے ایڈیشنل پولیس کے لڑاکا دستے کے تقریباً ایک سو جوانوں کو کشمیر جانے کا حکم دیا ہے۔ کننگھم نے وزیراعلا کو سختی سے کہا کہ وہ اس سے اتفاق نہیں کر سکتے اور انھوں نے انسپکٹر جنرل اوسی گریسی کو پولیس لائنز بھیجا، جہاں انھوں نے دیکھا کہ اسّی جوان جانے کے لیے تیار ہیں۔ گریسی نے انھیں بیرکوں میں واپس بھیج دیا۔ جیسا کہ کننگھم نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے ان کو بھیجنے سے جنگ کا واقعی جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ مزید برآں ہر صورت میں یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ انسپکٹر جنرل یا گورنر کی اجازت کے بغیر پولیس کو بھیجا جائے۔ کننگھم کے اس مضبوط اقدام کو وزارت نے خاموشی سے قبول کر لیا، جو ان کی بالادست اتھارٹی کی نمایاں ترین مثالوں میں سے ہے۔

دو واقعات جن کی خبریں یکم نومبر کو ملیں غیر معمولی حالات کے مخصوص واقعات تھے۔ گلگت میں گلگت اسکاؤٹس کے کیپٹن براؤن نے رپورٹ کی کہ اسکاؤٹس اور دوسروں نے وہاں کشمیری حکام کو گرفتار کر کے پاکستان کے نام پر علاقے پر قبضہ کر لیا ہے۔ کننگھم نے اسے اور اس کے ساتھی کیپٹن میتھی سن کو ہدایت کی کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کو تسلیم کر لیا جائے اور امن وامان قایم رکھنے میں مدد کی جائے۔

دوسرا واقعہ افسوس ناک تھا۔ اس کو تفصیل سے ڈیلی ایکسپریس کے نمایندے اسمتھ نے بتایا، جو بارہ مولا میں عیسائیوں کی خانقاہ میں اس وقت موجود تھا جب قبائلی اس میں داخل ہوئے تھے اور سپریئر، ایک کرنل اور مسز ڈائک کو پاکستانی فوج کے ایک افسر کے

سامنے گولی ماردی گئی، جو وہاں مزید خون خرابہ روکنے کے لیے گیا تھا۔

کننگھم کے پاس اس واقعے کی معلومات کا ایک غیر معمولی ذریعہ بھی تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ برکت اللہ سے انتہائی دل چسپ گفتگو ہوئی، جو انتہا پسند ہندوستانی کالونی کا سربراہ تھا اور انڈس کوہستان کے جنگلی علاقے میں رہتا تھا۔ اس کو دس سال پہلے تک کڑا دشمن سمجھا جاتا تھا، لیکن جب مجھے اس کے متعلق معلوم ہوا اور میں نے دیکھا کہ وہ دوستانہ رویہ اختیار کرنے پر بالکل تیار ہے تو اس کا رویہ تبدیل ہوگیا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے ملاقات کے لیے برابر آتا رہا۔ وہ ساڑھے تین ماہ سے کشمیر میں (پوری محاذ) اپنے دوسو انتہا پسندوں کے ہم راہ موجود تھا، جن میں بیشتر یوپی کے مسلمان تھے۔ اس نے اکتوبر میں بارہ مولا کے قریب لڑائی دیکھی تھی اور اخبار نویس سڈنی اسمتھ کو قید کرلیا تھا (اسمتھ نے مجھے خود بتایا کہ غالباً اس کی جان بچانے کے لیے) اور محسود کو بدترین مظالم سے روک رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پہاڑی علاقوں کے قبایلی بھارتی فوج کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اگر معقول سمجھوتا ہوجائے تو قبایلیوں کو نکالنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

نومبر تک پہلی لاری میں لدے ہوئے قبایلیوں کی کشمیر سے واپسی شروع ہوگئی، جن کے ساتھ لوٹ کا مال بھی لدا ہوا تھا۔ کننگھم نے ان قبایلیوں کی آزادانہ نقل وحرکت کو بہت خطرناک سمجھا اور اس کی اجازت دینے پر حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا اور کہا کہ وہ قبایل کی فطرت سے واقف نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے سرکاری ملازمتوں کے وقار اور نظم وضبط کو سخت نقصان پہنچا۔ انھوں نے لکھا ہے: پچھلے دو ہفتوں میں ''استعفا دینے کے لیے میں نصف درجن بہترین وجوہ تلاش کرسکتا تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رفتہ رفتہ ہم معاملات پر دوبارہ قابو پالیں گے اور ہر شخص کو اس کی کوشش کرنی چاہیے۔''

انھوں نے ۶ر نومبر کو وانا، ٹانک اور میران شاہ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے اور شام پانچ بجے کے درمیان جرگے منعقد کیے اور وزیریوں اور محسودوں پر واضح کیا کہ حکومت وزیرستان سے فوج واپس بلانا چاہتی ہے۔ اس اعلان کو بڑی خاموشی سے سنا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ سرحد سے واقف نہیں انھیں اس معاملے کو پورے مضمرات کے ساتھ سمجھانا ضروری ہے۔ اس خاموشی کی ایک وجہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ بہت سے قبایلی کشمیر گئے

ہوئے تھے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات تھی کہ روم کا کوئی گورنر خود ہی انٹونا ئین وال سے بے دخلی کا اعلان کرے۔ چند سال قبل اگر یہ صورت حال پیش آتی تو وزیری اور محسود واپس ہوتے ہوئے انتقامی کارروائیاں ضرور کرتے، ہوسکتا ہے کہ وہ قتل عام کرتے۔ سرحد کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ تازہ ترین مثال ۱۹۱۹ء میں وانا کا انخلا ہے، لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ ۲۸ر دسمبر کو پشاور میں انھوں نے سنا کہ وزیرستان سے فوجی دستوں کی واپسی شروع ہوگئی ہے اور ایک گولی بھی نہیں چلی۔ ایک معمولی تصادم میں ایک شخص ہلاک اور چار زخمی ہوئے۔ اس واقعے کے ٹھیک پچیس برس پہلے وہ شمالی وزیرستان کے پولی ٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے اس بریگیڈیئر کے ساتھ تھے جس نے پہلے پہل رزمک پر قبضہ کیا تھا (اب پرانے دشمن فقیر اپی کا اثر ورسوخ ختم ہو چکا تھا۔ جہاں تک کشمیر میں قبالیوں کی تعداد کا تعلق ہے انھوں نے ۱۷ر نومبر کو اندازہ لگایا کہ ان کی تعداد تقریباً سات ہزار ہے اور وہ سری نگر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اسی رات سری نگر سے باہر ان کی بھارتی فوج سے پھر جھڑپ ہوئی، جس میں بھاری جانی نقصان ہوا۔ جس کے نتیجے میں اگلے دو دنوں میں بڑی تعداد میں واپسی ہوئی۔ یہ حملہ ایک اور اعتبار سے بھی ناکام رہا، جس کا اظہار اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ قبالیوں کے مظالم کی وجہ سے کشمیر میں بہت سے مسلمان یہ کہہ رہے تھے کہ اگر استصواب رائے ہوا تو وہ پاکستان کی بجائے بھارت سے الحاق کے حق میں ووٹ دیں گے۔ کننگھم کا خود یہ خیال تھا کہ جب وادی کشمیر میں قبالیوں کی یلغار ہوئی اس وقت ہی بھارت سے استصواب کے سمجھوتا کا وقت ختم ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ وزیر اعلا نے ان سے کہا کہ جو لوگ کشمیر آپریشن کو منظم کر رہے ہیں وہ ہمارے قبالیوں سے تنگ آچکے ہیں۔

(انگریز راج اور پشتون سیاست، مولفہ احمد سلیم، لاہور، تخلیقات، ۱۹۹۷ء: ص ۴۴-۱۳۳)

ماؤنٹ بیٹن۔کشمیر اور دیگر ریاستیں:

وہ ریاست جس کی سرحدیں ہندوستان، چین، تبت اور مجوزہ پاکستان سے ملتی تھیں اس کے ہندو مہاراجہ ہری سنگھ کی اسٹیشن ویگن پہاڑی چکر دار راستوں پر فراٹے بھر رہی تھی۔ اس صبح کو ان کے ساتھ ہندوستان کے آخری وائسرائے سفر کر رہے تھے۔ ہری سنگھ کو

ماؤنٹ بیٹن اس وقت سے جانتے تھے جب وہ پرنس آف ویلز کے ساتھ ہندوستان کی سیاحت کے لیے آئے تھے۔ جموں کے پولو کے میدان میں انھوں نے ہری سنگھ کے گھوڑوں کے ساتھ اپنے گھوڑے دوڑائے تھے۔

اس تعلق کی بنا پر وہ ہری سنگھ سے راز داری کی گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ اسٹیشن ویگن میں گھومنے نکل پڑے تھے۔

ہری سنگھ نے صاف کہہ دیا: ''میں کسی صورت میں بھی پاکستان کے ساتھ ضم ہونا نہیں چاہتا۔'' ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا: ''آخری فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔''

آپ کی نوے فی صدی آبادی مسلمان ہے۔ جو فیصلہ آپ کریں کافی غور و فکر کے بعد کریں۔ اگر آپ پاکستان میں شامل ہوں گے تو ہندوستان اس کی مخالفت نہیں کرے گا۔ یہ یقین دہانی میں آپ کے لیے سردار پٹیل سے حاصل کر چکا ہوں، لیکن اگر آپ پاکستان میں نہیں جانا چاہتے تو آپ کو ہندوستان میں شامل ہو جانا چاہیے۔

مہاراجہ نے کہا: ''نہیں! میں ہندوستان کے ساتھ بھی نہیں ملنا چاہتا۔ میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔''

وایسرائے کے صبر کا پیمانہ چھلکنے والا تھا۔ ''لیکن آپ آزاد کیسے رہ سکتے ہیں؟ آپ چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔ آپ کی ریاست کا رقبہ زیادہ ہے اور آبادی کم۔ اگر آپ کا رویہ یہی رہا تو آپ کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہو سکتی ہے۔ اگر آپ نے احتیاط نہ برتی تو ریاست تو آپ کے ہاتھ سے جانے گی ہی، کہیں آپ کی اپنی جان کے لالے نہ پڑ جائیں۔ اتنی دور تک کبھی سوچا ہے آپ نے؟''

مہاراجہ نے گہری سانس لی اور سر ہلایا۔ وایسرائے کی منطق ان کے حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی تھی۔

سری نگر پہنچنے کے بعد دو دن تک وایسرائے اپنی بات دہراتے رہے۔

تیسرے دن مہاراجہ نے کہا: ''اچھی بات ہے جب آپ کی یہی ضد ہے تو...''

لیکن معاملہ وہاں تک پہنچ کر ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اگلی صبح کو مہاراجہ کے اے ڈی سی نے آکر ماؤنٹ بیٹن کو بتایا کہ ہز ہائی نس کے پیٹ میں سخت درد ہے اور ڈاکٹروں کی

رائے ہے کہ وہ آپ سے ملنے کے لیے نہیں آسکتے۔

ماؤنٹ بیٹن جانتے تھے کہ پیٹ کے درد کی بات سفید جھوٹ ہے۔ جب وہ دہلی کے لیے روانہ ہوئے تو مہاراجہ انھیں رخصت کرنے بھی نہیں آئے۔ اس طرح وہ کشمیر کا مسئلہ جس کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بگڑتے گئے اس کی جڑ یہ تھی کہ ایک شخص کے پیٹ میں سیاسی درد اٹھا تھا۔

بعض راجاؤں نے انضمام کا فیصلہ تو کیا، لیکن بادل ناخواستہ۔

مدھیہ بھارت کا ایک راجا انضمام کے کاغذات پر دستخط کرنے کے ساتھ لڑکھڑا کر گرا اور دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے دنیا سے کوچ کر گیا۔ دھول پور کے راناؤں کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ اس نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ ۱۷۶۵ء سے میرے آباواجداد کے اور آپ کے شہنشاہ کے درمیان جو تعلقات تھے وہ آج ہمیشہ کے لیے ٹوٹ رہے ہیں۔ بڑودہ کے گائکواڑ دستخط کرتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کئی ریاستوں کے عوام نے مظاہرے، گھیراؤ اور جلوسوں کے ذریعے اپنے حکمرانوں کو نو آزاد ملکوں کے ساتھ ملنے پر مجبور کر دیا۔ ٹراونکور کے وزیر اعلا پر کانگریس کے ایک مظاہرہ کرنے والے نے حملہ کر دیا۔ جودھ پور اور جیسلمیر کے مہاراجاؤں نے دہلی جا کر جناح سے خفیہ ملاقات کی اور پوچھا کہ ہماری آبادی کی اکثریت ہندو ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر ہم آپ کے پاکستان میں شامل ہوں تو آپ ہمیں کیا سہولتیں دیں گے؟ جناح نے دونوں کے سامنے سادہ کاغذ رکھ دیا کہ ''جو جو رعایتیں اور سہولتیں آپ چاہتے ہوں لکھ دیجیے۔ میں دستخط کیے دیتا ہوں۔'' سہولتوں اور رعایتوں کی فہرست مرتب کرنے کے لیے دونوں راجاؤں نے تھوڑا سا وقت مانگا۔ سوچنے کے نیک ارادے سے وہ ہوٹل واپس چلے گئے۔ وہاں اپنے کمرے میں انھوں نے وی پی مینن کو منتظر پایا۔ انھوں نے دونوں مہاراجاؤں سے کہا کہ وائسرائے اپنی رہائش گاہ پر آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ جودھ پور کے مہاراجہ سربراہ تھے، اس لیے وہ اکیلے وائسرائے ہاؤس پہنچے۔ وی پی مینن نے انھیں ایک ملاقاتی کمرے میں بٹھایا اور وائسرائے کی تلاش شروع کر دی۔ وائسرائے اس وقت ایک باتھ روم میں تھے۔ جیسے ہی وہ باہر نکلے مینن نے بڑی عاجزی سے کہا کہ ''آپ فوراً اس ضدی مہاراجہ کو سمجھائیے۔''

ماؤنٹ بیٹن نے جودھ پور کے مہاراجہ کو سمجھایا کہ ''صرف اپنے ذاتی فایدے کے لیے اپنی ریاست کی ہندو اکثریت کو پاکستان میں گھسیٹ لے جانا محض بے وقوفی ہے۔ میں اور مینن مل کر سردار پٹیل کو سمجھائیں گے کہ وہ آپ کی سہولتوں کا خیال رکھیں۔''

ماؤنٹ بیٹن تو یہ کہہ کر چلے گئے۔ اُدھر جودھ پور کے مہاراجہ نے جیب سے ایک ایسا فاؤنٹین پین نکالا جو انھوں نے خاص طور پر اپنے لیے بنوایا تھا۔ انضمام کے کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد انھوں نے فاؤنٹین پین کا کیپ کھولا جس میں ایک ننھا سا اعشاریہ بائیس کا پستول تھا جو انھوں نے مینن کی کھوپڑی پر تان دیا۔

مہاراجہ نے غصہ سے کہا: ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟'' خیریت یہ ہوئی کہ ماؤنٹ بیٹن اسی وقت وہاں آ گئے۔ انھوں نے پستول مہاراجہ سے چھین لی۔

برسوں بعد جب ماؤنٹ بیٹن کو جادو اور ہاتھ کی صفائی کے کھیلوں سے دل چسپی ہوئی تو انھوں نے میجک سرکل کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے وہ پستول پیش کر دی، اور آج بھی وہ سرکل کے میوزیم میں موجود ہے۔

پانچ ریاستوں نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

تین کے علاوہ بقیہ ریاستوں نے ہندوستان سے انضمام کا فیصلہ کیا، لیکن وہ تین ریاستیں بڑے جھگڑوں کا سبب بنیں۔

حیدرآباد (دکن) کے نظام کے دل سے یہ اندیشہ دور نہیں ہوتا تھا کہ ہندوستان کے ہندو ماحول میں ان کے مفاد کی پوری حفاظت نہ ہو سکے گی۔ نظام نے اپنی ریاست کو آزاد رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جونا گڑھ کے نواب کو مسلم لیگ کے ایک ایجنٹ نے یہ یقین دلایا تھا کہ آزاد ہندوستان میں ان کے پیارے کتوں کو زہر دے کر مار ڈالا جائے گا۔ جونا گڑھ کی آبادی میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور اس کی سرحد پاکستان سے نہیں ملتی تھی۔ اس کے باوجود نواب نے طے کر لیا تھا کہ وہ آزاد ہندوستان میں شامل نہیں ہوگا۔ یا پاکستان سے ملے گا یا آزاد رہے گا۔ (آدھی رات کی آزادی: ص ۵۲-۱۵۰)

کشمیر کی جنگ:

''یہ مضمون شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی سیاسی ڈائری کے قلمی مسودے میں حضرت رحمہ اللہ کے قلم سے منقول ومحفوظ ہے۔''

پاکستان کے خلاف آزاد کشمیر گورنمنٹ کے ایک افسر کے الزامات۔ مسٹر جے کے ریڈی کا بیان:

(کشمیر پر حملہ کی اسکیم کے رازوں کا انکشاف)

۱۰ ارجون۔ بمبئی: اگرچہ کشمیر کی جنگ سے متعلق گہری اور زبردست سازش کا ایک فضول سا حصہ عوام کے سامنے آچکا ہے اور ہندوستانی پریس نے جو کچھ لکھا ہے وہ پاکستان کی اس منظم سازش کا ایک چھوٹا سا ذرہ ہے۔ حکومت ہند شاید یہ نہیں جانتی کہ پاکستان نے یہ سارا کھیل غیر ملکی طاقتوں سے سازش کر کے کھیلا ہے۔ اگرچہ سارے غیر ممالک کا نام تو اس سلسلے میں نہیں لیا جاسکتا لیکن امریکا اور برطانیہ کا اس سلسلے میں گہرا ہاتھ ہے۔

سر نڈی (مودی) اور کننگھم جیسے انگریزوں نے پاکستان کو تیار کیا اور یہ یقین دلایا کہ امریکن بلاک اس کی امداد پر ہوگا اور امریکا نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس نے اسلحہ و دیگر سامان قبائلی حملہ آوروں کو دینے کے لیے پاکستان کو سپلائی شروع کر دیا۔ لاہور میں امریکن کونسل نے خوب پارٹ ادا کیا۔ یہ زبردست اور سنسنی خیز انکشافات آزاد کشمیر گورنمنٹ (پاکستان) کے سابق ڈائیکٹر آف پبلک ریلیشنز (افسر تعلقات عامہ) مسٹر جے کے ریڈی نے کیا ہے جو وہاں سے بھاگ آئے ہیں۔ مسٹر ریڈی نے بمبئی کے ہفتہ وار اخبار ''بلٹنز'' کے نامہ نگار سے ایک خاص ملاقات کے دوران کہا کہ یقینی طور پر ہندوستان کے عوام اور شاید حکومت ابھی تک یہ نہیں جانتی کہ شرارت، بزدلی، تباہی و بربادی سے بھرپور یہ حملہ پاکستان کے لیڈروں اور حکام بالا نے ان برطانوی گوروں اور شہریوں کی امداد (کے جواب میں کیا ہے۔ جو اب بھی ان مملکتوں میں اعلا عہدوں پر مامور ہیں۔

امریکن کونسلیٹ (سفارت) کے حکام کے تعاون سے اور قاید اعظم جناح کے ذاتی احکام کے تحت ماہ اگست ۱۹۴۷ء کے آخر میں بڑی احتیاط سے مرتب کیا تھا۔ حملے کی اسکیم اس وقت مرتب کی گئی جب لیگی ڈکٹیٹر کو اس امر کا احساس ہوگیا کہ ریاستوں کے راجوں اور

مہاراجوں کو اکسا کر ہند یونین کے خلاف ایک اور محاذ قایم کرنے کے لیے اس کی اسکیم بالکل کامیاب ہو رہی ہے۔

پاکستان کا جرم:

پاکستانی لیڈروں کی سازشیں اس قدر خفیہ تھیں کہ جب حکومت ہند نے پاکستان پر الزام لگایا تو صرف یہی کہ پاکستان بھی اس حملے میں شامل ہے اور اس طرح سے اس نے اس بات سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا کہ پاکستان نے کس طرح اپنے حکام اور اپنی نگرانی کے ماتحت اس حملے کی اسکیم بنائی، اس کو منظم کیا اور پھر حملہ شروع کرا کے اس کو جاری رکھا۔ شروع شروع میں قبایلیوں کے پارٹ کو بڑی اہمیت دی گئی اور پاکستان پر صرف یہی الزام لگایا گیا کہ وہ حملہ آوروں کو ٹرانسپورٹ، ہتھیار اور دیگر جنگی سامان دے رہا ہے۔ اور پاکستانی فوج، صوبۂ سرحد کی پولیس اور کمانڈروں کی سرگرمیوں کے متعلق بہت کم توجہ دی گئی۔ جس کے نتیجے کے طور پر غیر ممالک نے یہ خیال کیا کہ چوں کہ ہندوستان کی تقسیم ہوگئی ہے اور اس کے بعد زبردست فرقہ وارانہ فسادات بھی ہوئے تھے، اس لیے کشمیر پر قبایلی حملہ بھی اس فرقہ وارانہ فسادات کا ایک حصہ ہے اور مسلح قبایلی صرف کشمیر کا علاقہ پاکستان میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ انھی تاثرات کی بنا پر مسئلۂ کشمیر پر غیر ملکی پریس تبصرہ کر رہا تھا، لیکن مسٹر ریڈی نے کہا:

> ''میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ ایک مختلف کہانی ہے۔ نہ صرف پاکستان کی حکومت اور فوجی حکام نے پاکستانی رُپے اور مسلح فوجوں سے کشمیر میں فوجی سرگرمیاں شروع کیں بلکہ غیر ممالک بھی جن کو ہندوستان سے دشمنی ہے پاکستان کو اس تباہ کن فعل کو جاری رکھنے کے لیے امداد دینے میں مصروف ہیں۔ پیشتر اس کے کہ میں اور کچھ بیان کروں میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ گزشتہ اکتوبر میں جب رام چندر کاک کو وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹایا گیا، مجھے کشمیر سے نکال دیا گیا۔ ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نمایندے کی حیثیت سے میں نے امرتسر سے لاہور ٹیلی فون کیا جہاں سے جواب ملا کہ میں لاہور

جا کر فیصلہ کروں گا۔ لاہور میں میاں افتخارالدین نے میرا خیر مقدم کیا اور گورنر سر مودی سے میرا تعارف کرایا۔ جنھوں نے مجھے اگلے روز خفیہ ملاقات کے لیے بلایا اور مجھے شک ہوا اور میں نے بھی محسوس کیا کہ مسئلۂ کشمیر میں کچھ گڑ بڑ ہونے والی ہے۔ آخر رات سری نگر میں مجھے دعوت دی گئی، جہاں سردار شوکت حیات خان اور شیخ کرامت بھی موجود تھے۔ دونوں اصحاب نے مجھے اپنے اعتماد میں لیا، مجھ سے بے تکلف کہا کہ ۲۲ر اکتوبر یعنی اگلے روز اسکیم کے مطابق کوہالہ اور راج کوٹ دو طرف سے وادیٔ کشمیر پر حملہ کیا جائے گا۔''

ریاستی فوجوں کے مسلم ممبر بھاگ کر مل جائیں گے۔ اس کا یقین ہے کہ سری نگر پر تین چار روز زیادہ سے زیادہ آٹھ روز کے اندر قبضہ ہو جائے گا۔ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ عارضی حکومت قایم کی جا رہی ہے اور اگر میں چاہوں تو اقلیتوں کے نمایندوں کی حیثیت سے اس میں شامل ہو سکتا ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد کل ایسوسی ایٹیڈ پریس کے دفتر میں تھا کہ پاکستان فوج کے جنرل ہیڈ کوارٹرز کے پبلک ریلیشنز (آفیسرِ تعلقات عامہ) لفٹنٹ کرنل آلوی کا فون آیا اور چوں کہ دفتر میں اسٹاف کا کوئی ذمے دار افسر نہ تھا اس لیے میں نے ہی بات چیت شروع کر دی۔ فون پر بتلایا گیا کہ کشمیر پر حملے کی خبر نہ دی جائے، جب تک کہ خبر سری نگر سے دہلی نہیں پہنچ جاتی اور اس کے بعد رات کو ایک کمیونک جاری کیا جائے گا جو آزاد کشمیر پر ہند کی طرف سے ہوگا اور پلندری اس کی فرنٹ لاین ہوگی۔ اگلے روز حملے کے متعلق دہلی سے بھی خبریں آنے لگیں اور ایسوسی ایٹیڈ پریس نے لمبے لمبے کمیونک جاری کرنے شروع کر دیے۔ اس سے اگلے روز میرے نام سے آزاد کشمیر گورنمنٹ اور پاکستان کے حق میں ایک طویل بیان شایع کیا جو میرے علم کے بغیر ہی شایع کر دیا گیا۔

دہلی میں بھی ففتھ کالم:

مہاراجہ کشمیر جب سری نگر سے دہلی روانہ ہو گئے، اس وقت میرے پاس کوئی خبر نہیں آئی، لیکن دہلی [سے] پاکستان ہائی کمشنر نے ہمیں یہ خبر بھیجی جو غالباً انھیں یقینی طور پر کسی ففتھ کالم نے بھیجی ہوگی، راول پنڈی میں تین ماہ تک میں نے آزاد کشمیر گورنمنٹ کے پبلک

ریلیشنز آفیسر کی حیثیت سے کام کیا، لیکن اس کے بعد مجھے قتل کرنے کی اسکیم بنائی گئی۔ میں نے پشاور میں جا کر خان عبدالقیوم خان سے احتجاج کیا اور اس نے میری حفاظت کا یقین دلایا۔ میری جگہ ڈاکٹر تاثیر اور حفیظ جالندھری کو دی گئی، لیکن وہ اس کام پر نہ چل سکے۔ مجھے ایک مرتبہ پھر کہا گیا اور اس کے لیے سردار ابراہیم میرے پاس ایبٹ آباد آیا۔ میں نے سوچا یہ یہاں سے بھاگنے کا سنہری موقع ہے۔ میں نے ابراہیم سے کہا کہ مجھے کراچی جانے دیا جائے تاکہ میں الطاف حسین اور جواد سے غیر ملکی پروپیگنڈے کے لیے بات چیت کرسکوں۔ سردار ابراہیم متفق ہوگیا اور ۱۸ر مئی کو پاکستانی فوج کے ہوائی جہاز میں مجھے کراچی بھیج دیا گیا میں فوراً ائیر فورس آف انڈیا کے دفتر میں گیا اور مختلف نام سے جام نگر جانے والے ایک ہوئی جہاز میں سیٹ بک کرائی۔ پاکستان میں سات ماہ کے قیام کے بعد ۲۰ر مئی کو بمبئی پہنچا۔

جناح کی کوشش:

مسٹر جناح کی سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ مہاراجہ کشمیر اور ہندیونین میں پھوٹ ڈالی جائے۔ اس کے لیے کاک کو بھی یقین دلایا گیا، لیکن عین اس وقت کاک کو برطرف کردیا گیا اور شیخ عبداللہ کو رہا کردیا گیا۔ اس وقت جناح کو ہوش آیا اور اس نے شیخ صادق حسین کو کشمیر بھیجا، تاکہ مسلم کانفرنس [کی طرف سے] کشمیر [کی] سے پاکستان میں شمولیت کا پروپیگنڈا کیا جائے۔ بہت سے سرحدی آفیسر کشمیر میں صرف فرقہ وارانہ گڑبڑ پیدا کرنے کے لیے آئے۔ انھوں نے کشمیر میں ہتھیار اور دیگر سامان بھیجا۔ سری نگر میں انھوں نے مسلمان فوجیوں کو سری نگر پر حملے کی تربیت کے لیے ایبٹ آباد بھیجا۔ یہاں وزیراعظم سرحد کا سکریٹری ساتھ تھا تاکہ وردیوں اور ہتھیاروں کا انتظام کرسکے۔

پاکستان حیدرآباد سازش:

کشمیر کے حملے کے فوراً ہی بعد حیدرآباد کی مجلس اتحاد المسلمین کی ایگزیکٹو کمیٹی کا ایک ممبر عبدالعلیم افغانی پاکستان میں آیا، وہ لیاقت علی اور مسٹر جناح سے ملا اور مجھ سے بھی گئی

مرتبہ ملا۔ اس شخص کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ کشمیر میں کئی محاذوں پر جاتا تھا اور نظام کی فوج کے لیے وہاں سے نوجوان پٹھانوں کو بھرتی کرتا تھا۔ اس طرف سے گزشتہ چھ ماہ میں کئی سو پٹھان اور پنجابی مسلمان حیدرآباد بھیجتا رہا۔

(اخبار مدینہ۔ بجنور: ۲۱رجون ۱۹۴۸ء: ج ۳۷، نمبر ۴۴، ص ۲، کالم ۳و۴)

مسئلۂ کشمیر:

ہوگ ٹنکر کی کتاب ''مین ہو اورٹرنڈ ایمپائرس' (Men Who Overturned Empires) میں جناح صاحب کا ذکر بھی ہے۔ معنف کشمیر کے سلسلے میں لکھتا ہے:

''برطانیہ سے نکلنے کے بعد ریاستوں کی اکثریت نے گردوپیش کے حالات کے مطابق ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک میں شمولیت اختیار کرلی۔ البتہ حیدرآباد اور کشمیر نے وقتی معاہدات کے تحت آخری اور قطعی فیصلہ کرنے کے لیے مہلت طلب کرلی۔ دونوں ریاستوں کی صورت یہ تھی کہ حیدرآباد میں ہندو اکثریت تھی اور اس کا حکمراں (نظام) مسلمان تھا اور کشمیر میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، لیکن اس کا راجا ہندو تھا۔ (ایک واضح فرق یہ بھی تھا کہ حیدرآباد ہندوستان میں گھرا ہوا تھا۔ پاکستان سے اس کا کوئی سرحدی تعلق نہ تھا جب کہ کشمیر کی سرحد پاکستان سے ملتی تھی)۔

اس صورت حال کے پیش نظر سردار پٹیل نے اسکندر مرزا کو جو کہ پاکستان کے سرحدی معاملات کے نگراں تھے، فون کیا کہ ''اگر تم حیدرآباد چھوڑ دو تو میں کشمیر تمہیں دے دوں گا۔''

جناح صاحب کے سامنے جب یہ تجویز آئی تو بدقسمتی سے انھوں نے سوچا کہ کشمیر تو ان کی جیب میں ہے ہی، حیدرآباد کی صورت حال سے فایدہ اٹھایا جائے۔ چناں چہ ایک فری لانس برطانوی ہوا باز نے کراچی سے حیدرآباد ہتھیار پہنچانے شروع کردیے۔ حیدرآباد کے مسئلے پر تقریباً ایک سال تک گفتگو جاری رہی۔ بالآخر ہندوستانی فوج کو ریاست پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا گیا اور آناً فاناً نظام کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور جناح صاحب کا سارا خواب چکنا چور ہوگیا۔

کشمیر کی صورت حال واضح نہ تھی۔ جناح صاحب نہایت بے صبری کے ساتھ اپنے منصوبے کے مطابق قبایلیوں کو حرکت میں لے آئے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کے وسط میں انھوں نے

کشمیر میں داخل ہونا شروع کر دیا۔ لیاقت علی خاں وزیراعظم پاکستان نے اس معاملے میں حکومت کے ملوث ہونے سے انکار کیا۔ ۲۵/ اکتوبر کو اسکندر مرزا نے سرحد کے گورنر کننگھم کو بتایا کہ لیاقت علی خاں اس معاملے سے پوری طرح واقف تھے۔ جناح صاحب تو واقف تھے ہی، لیکن انھوں نے یہ کہا کہ مجھے اس سلسلے میں کچھ نہ بتاؤ۔ ''میرا ضمیر اس معاملے میں صاف ہے۔''

قبایلیوں کو چھوٹ دینے کا فیصلہ انتہائی نقصان دہ ثابت ہوا۔ ان حالات سے پریشان ہو کر مہاراجہ دہلی فرار ہو گیا اور اس نے ماؤنٹ بیٹن سے درخواست کی کہ کشمیر کا ہندوستان سے الحاق کر لیا جائے۔ اس کی یہ درخواست بادل ناخواستہ منظور کر لی گئی۔ قبایلی پہلے لوٹ مار میں مصروف ہو گئے تھے۔ انھوں نے سری نگر دارالحکومت پہنچنے میں دیر کر دی تھی۔ اس دوران ایک سکھ بٹالین کو وہاں پہنچا دیا گیا۔ اس نے قبایلیوں کی پیش قدمی روک دی اور انھیں ڈھکیل کر پیچھے کر دیا۔

جناح صاحب پاکستانی فوج کو کشمیر بھیجنا چاہتے تھے، لیکن ان پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ دونوں نئی مملکتوں کے درمیان جنگ ہوئی تو دونوں طرف سے انگریز آفیسرز اور این سی اوز کو ہٹا لیا جائے گا۔ اس کا نقصان ہندوستان سے زیادہ پاکستان کو ہوگا۔ جناح صاحب نے کننگھم کو ہدایت کی کہ قبایلیوں کی مدد کی جائے۔ اس نے اسے مان لیا، لیکن کہا کہ میں جو کروں گا وہی کہوں گا، مجھ سے یہ توقع نہ رکھی جائے کہ میں جو کچھ کروں گا بیان اس کے برعکس دوں گا۔ (جناح صاحب کی پالیسی اس کے برعکس تھی، وہ چاہتے تھے کہ حکومت قبایلیوں کی مدد تو ضرور کرے، لیکن حکومت کے ملوث ہونے کو ظاہر نہ کیا جائے) یہ کش مکش جنوری ۱۹۴۹ء کی جنگ بندی تک جاری رہی، جب کہ جناح صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔

(Men Who Overturned Empires Pages 67-68)

پاکستان میں سرکاری طور پر مسٹر محمد علی جناح کی جو سوانح حیات مرتب کروائی گئی ہیں۔ جس کے مؤلف ہیکٹر بولایتھو ہیں، اس بھی بعض باتوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ مثلاً:

(۱) ۲۴/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مسٹر جناح کو کراچی میں خبر ملی کہ پانچ ہزار گوریلا قبایلی صوبہ سرحد سے نکل کر کشمیر پہنچ گئے ہیں۔

(۲) اس کے دو دن بعد (۲۶ر اکتوبر کو) مہاراجہ نے ہندوستان سے کشمیر کا الحاق کر دیا اور حکومت ہند سے فوجی امداد کی درخواست کی۔

(۳) ۲۶ر اکتوبر کو مسٹر جناح بہ ذریعۂ ہوائی جہاز لاہور پہنچے، تا کہ ذرا قریب سے کشمیر کی صورت حال کا جایزہ لے سکیں۔

(۴) مسٹر جناح چاہتے تھے کہ پاکستان کی نامکمل فوج کشمیر میں داخل ہو کر مسلمانوں کو فنا ہونے سے بچائے۔

(۵) یہ خبر سن کر فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلیک ہندوستان اور پاکستان کی افواج کے سپریم کمانڈر لاہور پہنچے اور مسٹر جناح سے بات چیت کر کے انھیں اس معاملے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور جناح صاحب کو سمجھایا کہ مہاراجہ نے کشمیر کا الحاق ہندوستان سے کر دیا ہے اور حکومت ہند کشمیر میں اپنی فوجیں بھیجنے میں حق بہ جانب ہے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جناح نے ان کا یہ موقف تسلیم نہیں کیا۔ اس لیے سر کلاڈ آکنلیک نے انھیں یہ دھمکی دی:

> ''اگر پاکستان نے اپنی فوجیں کشمیر بھیجیں تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں سے تمام انگریز افسر نکال لیں اور دونوں ملکوں کے سپہ سالار بھی ان میں شامل ہوں گے۔''

ہیکٹر بولا یتھو لکھتا ہے کہ ''یہ صورت دیکھ کر جناح نے اپنی خطرناک تجویز رد کر دی۔''

کشمیر۔ پنڈت نہرو اور شیخ عبداللہ:

ایم۔ جے اکبر اپنی تالیف ''ہندوستان۔ اپنے حصار میں'' لکھتے ہیں:

(۱)

''۱۸۴۶ء میں کشمیر کا مقدر پیر پنجال کے جنوبی سلسلے کے پار کے صوبے جموں کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ جموں کے ڈوگرا راجہ نے پچھتر لاکھ روپوں میں کشمیر کو انگریزوں سے خرید لیا۔ یہ کوئی سودا نہیں بلکہ پنجاب کے سکھوں کے خلاف انگریزوں کی لڑائی میں ڈوگروں کی خدمات کا صلہ زیادہ تھا۔ جموں و کشمیر کی سلطنت سو برسوں (اکتوبر ۱۹۴۷ء) تک ڈوگروں

کے ہاتھوں میں رہی۔ سری نگر کشمیر کی موسم گرما کی راج دھانی اور جموں شہر موسم سرما کا دارالخلافہ بنا۔ ڈوگروں نے بانہال کارٹ روڈ اور جہلم دہلی روڈ بنا کر وادی کے دروازے کھول دیے۔

جموں میں، جنوب کی طرف ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر بہ حیثیت مجموعی سلطنت کے مسلمان تعداد کے لحاظ سے ہندوؤں کے مقابلے میں تین اور ایک کی نسبت سے زیادہ تھے۔ اسی لیے تقسیم کی منطق کے ہر پہلو کے پیش نظر کشمیر کو پاکستان میں جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے وجود میں آیا تھا، جانا چاہیے تھا، مگر کشمیر پاکستان میں نہیں گیا۔ جناح صاحب نے اپنے بس بھر جتن کر لیے، پہلے تو انھوں نے ہندو مہاراجہ اور مسلمانوں کے عوامی لیڈروں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی، اس میں وہ ناکام رہے۔ تب انھوں نے آزادی ملنے کے تین ہفتوں کے اندر اندر حملہ آور اور اس کے بعد پاکستانی فوجی دستے بھیجے کہ وہ طاقت کے بل پر کشمیر پر قبضہ کر لیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان لوگوں نے سری نگر پر تقریباً قبضہ کر لیا تھا مگر پھر انھیں پیچھے ڈھکیل دیا گیا۔ یہاں تک کہ ان کے تصرف میں مغرب میں وادی کا ایک چھوٹا سا حصہ اور شمال میں، افغانستان اور چین کی سرحدوں پر ایک وسیع پہاڑی بنجر علاقہ رہ گیا۔ اس وقت کشمیر منقسم ہے اور حد فاصل وہ لاین ہے جس پر ۱۹۴۸ء کے آخری دن پہلی ہند پاک جنگ میں جنگ بندی کے وقت فوجیں کھڑی تھیں۔ کشمیریوں کی بہت بڑی تعداد ہندوستان میں رہتی ہے۔ سری نگر ان کا دارالخلافہ ہے۔ پاکستان کے مقبوضہ کشمیر پر مظفر آباد کے شہر سے ایک حکومت حکمرانی کرتی ہے اور جو اپنے علاقے کو آزاد کشمیر کا نام دیتی ہے۔

دو آدمیوں نے کشمیر کو ہندوستان میں رکھا۔ دونوں کشمیری برہمن خاندانوں کے اخلاف تھے۔ ان میں سے ایک ظاہر ہے کہ جواہر لال نہرو تھے جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے اپنی آخری سانس تک یعنی ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء تک ہندوستان کے وزیر اعظم رہے تھے۔ دوسرے فرد تھے شیخ عبداللہ جن کے خاندان نے اٹھارھویں صدی کے اواخر میں برہمن ازم کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے جنھیں پیار سے لوگ ''بابائے قوم'' یا ''شیر کشمیر'' کہتے تھے اپنے عوام کو ایسی خود اعتمادی اور ایک ایسا نظریہ دیا جس سے انھیں ایک غلام ماضی کے بوجھ سے نجات دلائی اور صدیوں بعد پہلی دفعہ اس سرزمین کو آس دلائی۔ وہ اپنے

مشن کو بیان کرنے کے لیے اپنے پسندیدہ شاعر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ اکثر پڑھا کرتے تھے:

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے!

ایک کامیابی جسے سمجھنے میں ایک ہی چشمے سے دیکھنے کی وجہ سے دنیا کو آج بھی دشواری ہوتی یہ تھی کہ شیخ عبداللہ اور کشمیری ۱۹۴۷ء میں پاکستان جانے کے بجائے ہندوستان میں ٹھہرے۔ جیسا کہ شیخ عبداللہ بار بار کہا کرتے تھے کہ جناح صاحب کے ساتھ وہ ایک مشترکہ مذہب رکھتے ہیں اور نہرو کے ساتھ ایک مشترکہ خواب۔

یہ دو خاندان نہرو کا خاندان اور شیخ عبداللہ کا خاندان، جس طرح ہندوستان اور کشمیر کی سیاست پر حاوی رہے ہیں اس کی شاید نظیر نہیں مل سکتی۔ دونوں خاندان بہترین ذاتی دوست تھے اور بدترین سیاسی دشمن۔ جب انھوں نے ایک دوسرے سے تعاون کیا امن تھا۔ جب دونوں لڑے تو سری نگر پھٹ پڑا۔ دونوں نے ہندوستانی قومیت، سیکولرزم اور جمہوریت سے زبردست تعلق اور وفاداری کا مظاہرہ کیا اور دونوں جب ان تعصبات اور کمزوریوں کا شکار ہوئے جنھیں اگر تعدیل قوت کی منطق کی روشنی میں دیکھیے تو انھوں نے سارے ملک کو متزلزل کر کے رکھ دیا۔ ۱۹۴۷ء میں شیخ عبداللہ اور جواہر لال نہرو دونوں نے ایک آواز ہو کر کہا کہ کشمیر کو ہندوستان میں رہنا ہے، کیوں کہ یہی وہ معمل ہے جہاں انسانیت، جمہوریت اور اخوت کے نظریات کی انتہائی مشکل حالات میں آزمائش کی جاسکے گی۔ اگر مسلم کشمیر ایک سیکولر اور سوشلسٹ ہندوستان میں پل بڑھ سکتا ہے تو اس سے بہتر جواز اس نظریے کے خلاف نہیں پیش کیا جاسکتا، جس نے ملک کو تقسیم کرایا اور پاکستان بنوایا۔

جناح صاحب نے تقسیم سے پہلے شیخ عبداللہ کی طرف سے بارہا دھتکارے جانے کے باوجود کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ کشمیر کے پاکستان سے الحاق میں کوئی دشواری بھی ہوسکتی ہے، کیوں کہ بہرحال انگریز ہندوستان کی تقسیم کی ضمانت کلی طور پر مذہب کی بنیاد پر لے رہا تھا۔ کشمیر میں چوں کہ مسلمانوں کی زبردست اکثریت تھی، لہٰذا وہ پاکستان کا حصہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو پاکستان سے الحاق کرنے پر مجبور کرنے کی اپنے بس بھر کوشش کی۔ ہندوستان کے پہلے وزیر داخلہ مستحکم عزم ارادے کے مالک سردار پٹیل بھی کشمیر پاکستان کو دینے پر پورے طور پر راضی تھے۔ اس معاملے میں کسی جغرافیائی

خلط ملط کا بھی کوئی سوال نہیں تھا۔ کشمیر صرف یہی نہیں کہ نئے ملک کے ساتھ مشترکہ سرحد رکھتا تھا بلکہ اس کی بہت سی ضروری سپلائی اور خدمات کا انحصار ان علاقوں پر تھا جو پاکستان میں جانے والے تھے۔ اس بہ ظاہر منطقی منظر نامے میں صرف ایک رکاوٹ تھی۔

کشمیری پاکستان نہیں جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے دو قومی نظریے پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ اس وقت بھی جس بیسویں صدی کی غیر معمولی چوتھی دہائی میں کشمیر کی سرحدوں پر پنجاب میں اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو ذبح کر رہے تھے کشمیر کی وادی میں متعصبانہ قتل کا ایک بھی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس کے برعکس کشمیری مسلمانوں نے ان پاکستانیوں کے خلاف لڑ کر اپنی جانیں دیں جو کشمیر میں اپنے مسلمان بھائیوں کو غلامی سے نجات دلانے والے ''جہاد'' میں اپنے فوجیوں اور اپنے لٹیروں کو وادیٔ کشمیر میں بھیج رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جب پناہ گزینوں کے کیمپس بھرے ہوئے تھے اور دل خالی تھے، دہلی میں مسلمانوں کے ایک مجمعے کو خطاب کرتے ہوئے کسی حد تک فخر کے ساتھ کہا تھا:

> ''میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری یا مولانا آزاد کی پیروی کریں، مگر میں آپ سے یہ ضرور کہتا ہوں کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایتوں کی ضرور پیروی کریں: جو تیرہ سو سال قبل انھوں نے دی تھیں۔ رسول مقبول صرف مسلمانوں کے نہیں تمام نوع انسانی کے محسن تھے...... آپ دو قومی نظریے اور اپنے بعض لیڈروں کی پھیلائی ہوئی نفرت کے شکار ہو گئے ہیں۔ ہم کشمیر کے لوگوں نے اس کا اثر نہیں لیا اور اس سے مدافعت کی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم امن و سکون کی فضا میں رہ رہے ہیں اور آپ اور آپ کے ہزاروں بھائی ناقابل بیان مصایب سے گزر رہے ہیں۔ آپ کو میری نصیحت ہے امن و شانتی کے ساتھ رہیے اور پروپیگنڈے سے گم راہ نہ ہوئیے۔''

شیخ عبداللہ ایک مشترکہ بصیرت کی بنا پر نہرو اور گاندھی کے ساتھ رہے، مگر اس وقت کیا ہوگا اگر دہلی میں یہ مشترکہ بصیرت بدل جائے؟ اس وقت کیا ہوگا جب قوم پرستی اور جمہوریت کم زور ہونا شروع ہو جائے اور رجعت پسند مذہبی قوتیں اپنا زور دکھانے لگیں اور

اس وقت کیا ہوگا جب ملک کا دستور خود اس کے محافظوں کے ہاتھوں باطل ہونے لگے۔ انڈین یونین کی اساس ایک مخصوص نظریے پر رکھی گئی تھی، جو فرد کو اس کی آزادی بھی ودیعت کرتی ہے اور مہاتما گاندھی کے سماجی فلسفے سے ایک مشترکہ وفاداری کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ اسی لیے یونین کی بقا ان ہی اقدار کے تحفظ اور استحکام پر منحصر ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان کے اتحاد اور اس کی یک جہتی کو خطرات جتنے بیرونی ہیں اتنے ہی داخلی بھی ہیں۔ دہلی میں برسر اقتدار لوگ اگر کسی بہانے کا سہارا لے کر بھی اس بنیادی نقطے سے ہٹ گئے تو یہ اتنا ہی خطرناک ہو سکتا ہے جتنا کہ پاکستانی فوج تھوڑی سی زمین پر قبضہ کر کے اسے دہلی کے اثر سے آزاد قرار دے دے۔

شیخ عبداللہ نے آزادی کے بعد صرف چھ سال کشمیر میں حکومت کی۔ ۱۹۵۳ء میں انھیں جیل بھیج دیا گیا، جب کہ دہلی میں ان کا بہترین دوست وزیر اعظم تھا۔ شیخ عبداللہ جو اب بھی اس مقصد کے وفادار تھے پھر واپس آئے اور اپنی زندگی کے آخری سات برسوں میں کشمیر کی عنان حکومت ان کے ہاتھوں میں رہی۔ ۱۹۸۲ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جسد خاکی پر ہندوستان کا پرچم لپیٹا گیا تھا۔

ان کے بعد ان کے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ان کی جگہ لی اور ۱۹۸۳ء کے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ انھیں ورثے میں صرف عقیدہ ہی نہیں ووٹ بھی ملے ہیں۔ جولائی ۱۹۸۴ء میں وہ متعدد ایسے فیصلوں کی بنا پر حکومت سے ہٹائے گے، جنھوں نے اگرچہ جمہوریت کی روح کو پامال کر دیا مگر انھیں نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی کی منظوری حاصل رہی۔ ۱۹۵۳ء کی طرح اس دفعہ بھی کشمیری عوام احتجاج کے لیے سڑکوں پر نکل آئے اور پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ کیا کچھ تبدیل نہیں ہوا تھا؟ یا انسانی اطوار کی کجروی کے باوجود یہ توقع باقی تھی کہ وہ خواب جو ۱۹۴۷ء میں دیکھا گیا تھا کسی دن صحیح ثابت ہوگا؟ (ہندوستان اپنے حصار میں: ص ۲۷-۲۲۴)

(۲)

۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء: راکھشش ''مہیش اسوارا'' پر ''دیوی درگا'' کی فتح ''کشمیری محل'' میں ہر سال بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ درگا ایک ایسی دیوی ہے، ڈوگرے جس کی

بہت پرستش کرتے ہیں۔ تقریبات کے سلسلے میں وہاں ایک رواج یہ تھا کہ وہاں کے امرا ریشمی کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر سونے کا ایک ٹکڑا ہری سنگھ کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور ان کا یہ عمل ان کی وفاداری کا ایک ثبوت تصور ہوتا تھا۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام کو امرا اپنی وفاداریوں کا اظہار کر ہی رہے تھے کہ تمام روشنیاں گل ہوگئیں۔ جشن میں شریک لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ ہوا کیوں؟ مگر حقیقت یہ تھی کہ مہورا کے پاور ہاؤس میں جو ساری وادی کو بجلی سپلائی کرتا تھا حملہ آوروں نے قبضہ کر کے اسے نذر آتش کر دیا تھا۔ قبایلی اب سری نگر سے پچاس میل سے کچھ کم ہی فاصلے پر تھے۔ جموں اور کشمیر کے عظیم حکمراں نے پہلا کام وہ کیا جو ان کا ذہن سوچ سکتا تھا اور یہ کام تھا کہ انھوں نے اپنے لاتعداد تھیلے جمع کرنے شروع کیے اور چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اپنے عوام کو لٹیروں حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہوگئے۔

نہرو کو اس بحران کی اطلاع ۲۴ر اکتوبر (۱۹۴۷ء) کی رات میں ملی۔ ان کے ہوش اُڑ گئے۔ شیخ عبداللہ اس وقت ان ہی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے، دونوں نے مختلف امکانات اور مختلف کارروائیوں پر غور کیا۔ شیخ عبداللہ نے کشمیر کو بچانے کے لیے ہندوستانی فوج کو وہاں بھیجنے کے فیصلے کی پوری قوت کے ساتھ تائید کی، مگر نہرو اس عمل کے آئینی پہلو کی توثیق پہلے چاہتے تھے۔ اگلی صبح ۲۵ر اکتوبر کو کابینہ کی ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی، اسی سہ پہر رائل انڈین ایرفورس کا ایک جہاز ڈی سی تھری سری نگر کے ہوائی اڈے پر اُترا، اس جہاز میں ریاستوں کی وزارت کے سکریٹری وی پی مینن تھے۔ ان کے اوپر یہ ذمے داری ڈالی گئی تھی کہ وہ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے کاغذات پر دستخط لے لیں۔ ہندوستانی فوجیں کشمیر میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گی جب تک کہ انھیں آئینی طور پر یہ اختیار نہ مل جائے۔ ابتدائی مذاکرات ختم ہوئے۔ مینن واپس دہلی آگئے۔ دوسرے دن وہ ایک دوسرے جہاز کے ذریعے جموں روانہ ہوئے۔ (رات میں مہاراجہ اپنا روپیہ اور قیمتی خزانہ لے کر ٹرکوں اور کاروں کے ایک قافلے کے ساتھ جموں کے محفوظ شہر کی طرف بھاگ گئے تھے) مہاراجہ نے بہ خوشی کاغذات پر دستخط کر دیے، کشمیر ہندوستان کا ایک حصہ بن گیا۔

مگر ایک الجھن تھی، یہ الحاق عارضی تھا۔ ایک اصول تھا جس پر شیخ عبداللہ کوئی

مفاہمت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ خاندان جس نے کشمیر انگریزوں سے پچھتر لاکھ رُپے میں خریدا تھا، اسے کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ایسا فیصلہ کرنے کا حق صرف کشمیری عوام کو تھا اور بعد کو کسی وقت ان عوام کو اس فیصلے کی توثیق کا حق دیا جانا چاہیے۔ اس توثیق کا طریقہ کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں ابھی تک کسی کے ذہن میں کوئی صاف بات نہیں تھی۔ نہرو کے سوانح نگار ایس گوپال کے مطابق یہ ماؤنٹ بیٹن تھے جنھوں نے استصواب رائے عامہ تجویز کیا تھا۔ اس وقت نہ تو الحاق کے عارضی ہونے کا پہلو اور نہ ہی توثیق کا خیال کوئی مسئلہ سمجھا گیا۔ ہندوستان کے لیے شیخ عبداللہ کی وفاداری کسی قسم کے شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ یہ جناح صاحب نہیں پنڈت نہرو تھے جنھوں نے یہ بات رکھی اور علی الاعلان کہہ دی تھی کہ الحاق کے فیصلے میں یہ شرط شعوری طور پر رکھی گئی تھی۔

۲ر نومبر کو آل انڈیا ریڈیو پر ایک نشریے میں جس کے الفاظ جب بھی کشمیر پر بحث ہوتی ہے، دہرائے جاتے ہیں، نہرو نے کہا:

> ''آج کی رات میں آپ لوگوں سے کشمیر کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ مشہور ومعروف وادی کے حسن کے بارے میں نہیں بلکہ اس دہشت کے بارے میں جس کا اس نے ابھی حال ہی میں مقابلہ کیا ہے... ۲۴ر اکتوبر کی رات تھی جب ریاست کشمیر کی جانب سے ہم سے الحاق اور فوجی امداد کی درخواست کی گئی تھی.... سری نگر بلکہ پورے کشمیر کا مقدر تذبذب کا شکار تھا۔ ہم کو ہنگامی پیغامات بھیجے گئے، صرف مہاراجہ کی حکومت کی طرف سے ہی نہیں بلکہ عوام کے نمائندوں خصوصاً کشمیر کے عظیم لیڈر شیخ محمد عبداللہ جو اس وقت نیشنل کانفرنس کے صدر بھی ہیں، کی طرف سے بھی۔ کشمیر کی حکومت اور نیشنل کانفرنس دونوں نے ہم پر انڈین یونین سے کشمیر کے الحاق کو منظور کرنے کے لیے زور ڈالا۔ ہم نے اس الحاق کو منظور کرنے کا فیصلہ کیا اور ہوائی جہاز کے ذریعے اپنے سپاہی بھیج دیے مگر ہم نے ایک شرط بھی لگا دی کہ اس الحاق کی جب نظم و ضبط اور امن وشانتی قایم ہو جائے گی تو عوام سے بھی توثیق کرانا ہوگی۔ ہم اس بات کے لیے مضطرب تھے کہ بحران کی اس گھڑی میں عوام کو اپنی بات کہنے کا

موقع دیے بغیر کوئی آخری فیصلہ نہیں ہونا چاہیے! یہ طے کرنا بہر حال ان کا کام ہے اور مجھے یہ بات بھی صاف کرنے کی اجازت دیجیے کہ اس پورے عرصے میں ہمارا یہ مؤقف رہا ہے کہ دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے بارے میں ایک تنازعہ ہے اور فیصلہ ریاست کے عوام کو کرنا چاہیے۔ یہ ہماری اس پالیسی کے مطابق تھا کہ ہم نے کشمیر کے الحاق کے معاہدے میں یہ شرط بھی بڑھا دی۔''

دراصل یہ جناح صاحب تھے جنھوں نے استصواب رائے عامہ کے خیال کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی فوجیں ریاست میں ہیں وہاں ایمان داری کے ساتھ رائے شماری ہو ہی نہیں سکتی۔ جناح صاحب کو یہ یقین تھا کہ جب تک شیخ عبداللہ کی قیادت ہے کشمیری ہندوستان کے حق میں ہی رائے دیں گے۔

اسی تقریر میں جس میں پنڈت نہرو نے الحاق کی توثیق کے لیے ''اقوام متحدہ جیسی بین الاقوامی تنظیم کے تحت عام رائے معلوم کرنے'' کا وعدہ کیا تھا اسی میں انھوں نے دنیا کو یہ بھی بتایا تھا کہ کشمیر کیوں نظریاتی طور پر ہندوستان کا حصہ ہے۔ سری نگر پر تباہی آئی ہوئی تھی اور حملہ آور تقریباً دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے، انتظامیہ کا کوئی وجود باقی نہیں رہ گیا تھا، فوج نہیں تھی، پولیس نہیں تھی، روشنی اور بجلی خراب ہو چکی تھی اور پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد وہاں تھی اور پھر بھی سری نگر کسی ظاہری سراسیمگی کے بغیر حسب معمول تھا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور لوگ سڑکوں پر چل پھر رہے تھے۔ اس معجزے کا سبب کیا تھا؟ شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے ان کے رفیقوں، ان کے غیر مسلح مسلمان، ہندو اور سکھ رضا کاروں نے حالات کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ نظم و ضبط کو قایم رکھا اور پریشانی اور سراسیمگی کو روکا۔ یہ ایک حیرت ناک کام تھا جو انھوں نے کیا اور ایک ایسے وقت میں کیا جس میں اکثر لوگوں کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایسا اپنی تنظیم کے مضبوط ہونے کی وجہ سے بھی کیا، مگر اس سے بھی زیادہ اس لیے کیا کہ وہ ان بے رحم اور ظالم و جابر حملہ آوروں سے اپنے ملک کو محفوظ رکھنے کا مصمم تہیہ کر چکے تھے، جو ان کے ملک کو تباہ کر رہے تھے اور تشدد کے بل بوتے پر انھیں پاکستان میں شامل ہونے پر مجبور کر رہے تھے۔

ایک ایسے لمحے میں جب ہر آن مقدرات بدل رہے تھے، شیخ عبداللہ کے کارنامے بیان کرنے میں پنڈت نہرو کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہے تھے۔ ۲۶ر اکتوبر اتوار کے دن اس وقت بھی جب ایک سہما ہوا مہاراجہ جموں میں بیٹھا الحاق پر دستخط کر رہا تھا، شیخ عبداللہ نے اعلان کیا کہ کشمیر میں دس ہزار افراد پر مشتمل ایک امن بریگیڈ بنائی گئی ہے جو حملہ آوروں سے عوام کی حفاظت کرے گی۔ نیشنل کانگریس کے چند وہ رضا کار جو پاکستانی قبایلیوں سے لڑے اساطیری بن گئے۔ جیسے بارہ مولا کے مقبول شیروانی۔ جب بالآخر ہندوستانی فوج بارہ مولا میں داخل ہوئی، انھوں نے دیکھا کہ مقبول شیروانی کو ایک بلی پر کیلوں سے ٹھوک کر گولی ماردی گئی ہے اور اصل قصبے میں زندگی کی علامت محض ایک روتے ہوئے کتے کی آواز تھی جو مشن ہاسپٹل میں راہباؤں اور مدر سپریر کی لاشوں پر رو رہا تھا۔ ۲ر اکتوبر کو جب تباہ کاریاں اپنے عروج پر تھیں، کشمیر کے لیے روانہ ہوتے ہوئے (اپنے جاگیردار پیش رو ہری سنگھ کے برعکس جو مخالف سمت میں بھاگے تھے) شیخ عبداللہ نے کہا:

''میں واپس جارہا ہوں حملہ آوروں کے خلاف عوام کی مدافعتی جدوجہد کی قیادت کے لیے۔''

الحاق کی شرایط کے مطابق اب جب کہ ہری سنگھ اپنی ذمے داریوں سے سبک دوش ہوگئے تھے، شیخ عبداللہ کو نئی حکومت کی سربراہی کرنا تھی۔ ۳۱ر اکتوبر کو انھوں نے اپنے قریبی ساتھیوں مرزا افضل بیگ، بخشی غلام محمد، شام لال صراف اور جی ایم صادق کے ساتھ حلف لیا۔ اسی دن مہاتما گاندھی نے اپنی پرارتھنا سبھا میں کہا کہ میں نے جب بھی فوجیوں اور سامان کو کشمیر لے جانے والے جہازوں کی آوازیں سنی میرا دل شیخ عبداللہ میں لگا رہا۔ (ملک کا ہر فاضل جہاز اس کام میں لگا دیا گیا تھا) ان جہازوں نے کشمیر کو بچالیا۔ ۳۱ر اکتوبر کو نہرو نے دو ٹیلی گرام پاکستان بھیجے، جس میں امن وشانتی قایم کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ تاروں کا کوئی جواب نہیں ملا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کو ابھی بھی یہ خیال تھا کہ وہ اس لڑائی میں جیتنے والا ہے، مگر جلد ہی لڑائی کا رخ بدلنے لگا اور حملہ آور لٹیرے جو اچھی طرح مسلح بھی تھے اور تعداد میں بھی بہت تھے، پیچھے دھکیلے جانے لگے۔ چودہ مہینے بعد جب تک جنگ بندی ہوگی تو اس وقت ان کے پاس مغرب میں زمین کا محض ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور شمال میں دور

افتادہ بنجر آراضی ہوگی۔ ہندوستانی فوج کے کمانڈروں کا آج بھی یہ خیال ہے کہ انھیں روک دیا گیا، نہیں تو انھوں نے اپنے ملک کے لیے ''کشمیر کے مسئلے'' کو تقریباً حل کر دیا تھا۔ سری نگر کے کنارے سے انھوں نے پاکستانی فوج کو پونچھ کے مغرب میں اسی جگہ تک ڈھکیل دیا تھا جہاں سے پاکستان نظر آنے لگا تھا اور وہ شمال میں گلگت پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھے، مگر پنڈت نہرو نے اقوام متحدہ کے اہتمام میں جنگ بندی کو قبول کر لیا۔ بہر حال کشمیر کا اصل مسئلہ نہ تو پاکستان کے رویے کا تھا کہ یہ تو اس سے مختلف ہو ہی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اقوام متحدہ کی ثالثی کی کوالٹی کا تھا کہ یہ بھی اس سے زیادہ مؤثر نہیں ہو سکتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ دو افراد جو ۱۹۴۷ء کے ہندوستان میں ان اقدار کی علامت تھے جو ملک کو متحد رکھ سکتی تھیں، شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے لگے۔

۱۹۴۷ء کے رشتۂ یگانگت کو جن جذبات اور جس اعتماد نے جنم دیا تھا وہ شاید ۱۱رنومبر کو سری نگر سے زیادہ کہیں اور ظاہر نہیں تھا۔ ۱۱رنومبر کو پنڈت نہرو دہلی سے کشمیر کے دورے پر آئے۔ اس وقت تک سری نگر کے نواحی علاقے خالی کرائے جا چکے تھے اور بریگیڈیر ایل پی سین کے فوجیوں نے بارہ مولا پر قبضہ کر لیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اس وقت کی کیفیت اور موڈ کی تصویر کشی کی تھی، جب انھوں نے ۵رنومبر کو شائع ہونے والے روز نامہ ''ہندوستان ٹائمز'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''پاکستان کی قبر وادیٔ کشمیر میں کھودی جائے گی۔'' ۱۱ر نومبر کو رفیع احمد قدوائی، اچوت پٹوردھن اور اپنی بیٹی اندرا گاندھی کے ساتھ پنڈت نہرو سری نگر پہنچے۔ ایک بار پھر پر جوش استقبال ہوا۔ ہوائی اڈے سے شہر تک سڑک کے دونوں طرف لوگوں کے ہجوم تھے۔ اسی دن جلسے عام میں تالیاں بجاتے ہوئے مجمع کو پنڈت نہرو نے بتایا کہ ''ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ہم ساتھ کھڑے ہوں گے اور دشمن کا مل کر مقابلہ کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے، پھر مڑے اور انتہائی جذبات میں اپنا ہاتھ شیخ کی طرف بڑھا دیا جو پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ متحیر شیخ نے فوراً پنڈت جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دو دوست محبت اور وفاداری کی عالمی علامت کے طور پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے اور مجمع خوشی سے چلائے جا رہا تھا۔

پنڈت نہرو جنھیں ہندوستانی موقف کے آئینی طور پر جائز ہونے کا یقین تھا۔ ۳۱ر

دسمبر ۱۹۴۷ء کو یہ مسئلہ انجمنِ اقوام متحدہ کے سامنے لے گئے، جس پر بعد کو انھیں خود بھی بہت افسوس رہا۔ پنڈت نہرو چاہتے تھے کہ پاکستان پر بین الاقوامی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنے حملہ آوروں کو واپس بلائے۔ سیکورٹی کونسل نے حسب توقع فریقین سے امن کی اپیل کی۔ حملہ آوروں نے کہ جنھوں نے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی تھی وہ انداز اختیار کیا کہ جیسے سیکورٹی کونسل کا وجود ہی نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کی کوششوں کے سلسلے میں پاکستان کا ردِعمل یہ تھا کہ موسم گرما میں جب ہندوستان نے اپنا کامیاب حملہ شروع کیا انھوں نے حملہ آوروں کے ساتھ ساتھ اپنی باقاعدہ فوج کے سپاہی بھی محاذ پر بھیجنے شروع کر دیے۔

پاکستان نے اب یہ کہنا شروع کیا ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اقوام متحدہ کی نگرانی میں بہ یک وقت اپنی فوجیں ہٹانا چاہییں، تاکہ ایک ایماندارانہ استصواب ہو سکے۔ یہ کہتے ہوئے پاکستان نے اس سیدھی سادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ وہ کشمیر میں کوئی آئینی حیثیت نہیں رکھتا ہے جب کہ ہندوستان کی حیثیت آئینی تھی۔ اس دلیل میں ایک سے زیادہ چالیں تھیں۔ پاکستان کو جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے فوقیت حاصل تھی۔ پاکستان بروقت ہی اپنے نائبین یعنی قبائلیوں کو واپس بھیج سکتا تھا اور یہ ظاہر کر سکتا تھا کہ کشمیر پر حملہ سوائے ایک ''داخلی معاملے'' کے اور کچھ نہیں ہے۔ پاکستان نے ۱۹۴۷ء میں بھی یہی کیا تھا اور ۱۹۶۵ء میں بھی اسے یہی کرنا تھا۔ دوسرے یہ کہ پاکستانی فوجی اڈے کشمیر پر حملہ کرنے کے لیے بہت قریبی فاصلے پر تھے۔ ایبٹ آباد کی دوری صرف سولہ میل تھی۔ راول پنڈی اکتیس، مری پندرہ، سیال کوٹ چھ اور جہلم محض چار میل کے فاصلے پر تھا۔ دوسری طرف کسی بحران میں اچھی تعداد میں ہندوستانی فوج کو لانا پہلی ہی دفعہ مشکل کام تھا، جو ظاہر ہے کہ بار بار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

شیخ عبداللہ جو اب کشمیر کے وزیر اعظم تھے وہ بھی ہندوستانی فوج کی واپسی نہیں چاہتے تھے۔ وہ نیویارک گئے اور وہاں کہا کہ ''وہ پاکستان کو انھیں غلام بنانے کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ کشمیر میں ہندو مسلمان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' جنوری ۱۹۴۸ء میں شیخ عبداللہ نے نیویارک میں دوپہر کے ایک کھانے کے موقعے پر کہا کہ ''ہم کشمیر میں یہ زبان استعمال نہیں کرتے ہیں..... پچھلے سترہ برسوں میں نیشنل کانفرنس کے سامنے سیکولر جمہوریت کے حصول کا

مقصد رہا ہے۔"

کشمیر سے متعلق اقوام متحدہ کی طول طویل کارروائیوں کا ذکر ایک بے مصرف عمل ہوگا، کیوں کہ اس کا رول آخری تجزیے کے بعد بھی نظر آتا ہے کہ محض رسمی اہمیت کا تھا جو لڑائیاں اہمیت رکھتی ہیں وہ وہ تھیں جو میدانِ جنگ میں لڑی گئیں یا پھر ہندوستان اور پاکستان کے باہمی مذاکرات میں۔ شیخ عبداللہ نے چاہا کہ پنڈت نہرو ۴۸-۱۹۴۷ء میں پاکستان کو الٹی میٹم دیں اور اس ملک کے خلاف جنگ کا اعلان کردیں، مگر پنڈت نہرو نے ان کے اس خیال کو رد کردیا۔ اقوام متحدہ میں برطانیہ اور امریکا نے بڑی بے شرمی کے ساتھ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کی دلیلوں کی تائید کی۔ برطانیہ نے جناح صاحب کا یہ نظریہ کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، مان لیا تھا۔ وہ یہ نہیں مان سکتے تھے کہ وہ غلطی پر تھے اور ان کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آسکتی تھی کہ کشمیر جیسا بڑی مسلم اکثریت والا علاقہ ہندو انڈیا کے ساتھ اپنے الحاق کو ترجیح دے سکتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے تو یہاں تک کیا کہ وہ جولائی ۱۹۴۷ء میں بہ نفس نفیس کشمیر گئے، تاکہ مہاراجہ کو پاکستان کے ساتھ الحاق پر تیار کرسکیں۔ مگر شیخ عبداللہ نے بار بار اس بات پر اصرار کیا کہ وہ ہندوستان کی طرف ہیں۔ مسئلے کے اقوام متحدہ میں جانے کے پورے ایک سال گزرنے پر جنگ بندی کے بعد پاکستان نے "آزاد کشمیر" کی حکومت کے قیام کا اعلان کیا اور اس کی راج دھانی اپنے مقبوضہ علاقہ مظفر آباد (پہلا شہر جسے حملہ آوروں نے لوٹا تھا) میں بنائی۔ جنگ بندی نے درحقیقت لڑائی کو ختم کرایا اور لیڈروں کو اس بات کا موقع دیا کہ اُن وعدوں کی طرف توجہ مبذول کرسکیں، جن کا انھیں پاس رکھنا ہے۔

ہندوستان کے آئین نے مسئلے کی جو بین الاقوامیت اختیار کرچکا تھا، خصوصی نوعیت کو تسلیم کرتے ہوئے، کشمیر کو آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے ذریعے ایک خصوصی حیثیت عطا کی۔ اب شیخ عبداللہ نے الحاق کے لیے عوامی جواز کے حصول کا عمل شروع کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل نے ایک آئین ساز اسمبلی کے قیام کے لیے انتخابات کا باقاعدہ مطالبہ کیا۔ ستمبر اکتوبر ۱۹۵۱ء میں انتخابات ہوئے۔ نیشنل کانفرنس نے ہر کامیابی حاصل کرلی۔ وادیٔ کشمیر اور لداخ کی پینتالیس نشستوں میں سے صرف دو پر پارٹی کے

امیدواروں کے خلاف امیدوار کھڑے ہوئے۔اس زبردست کامیابی پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا مسعودی نے کہا کہ یہ کامیابی پاکستان کے ان دعووں کا کہ کشمیری پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں، کشمیری مسلمانوں کی طرف سے مسکت جواب تھا۔اپنے دوست کی کامیابی کا جشن منانے کے لیے پنڈت نہرو سری نگر گئے، وہاں یکم ستمبر کو ان کا استقبال ''نہرو اور ہندوستان ہمیشہ'' ''کشمیر جنگ بازوں کے ساتھ نہیں نہرو کے ساتھ جائے گا۔'' جیسے نعروں سے ہوا۔ پاکستان نے جب دیکھا کہ پاکستان دوست امیدواروں کی جیت کے کوئی امکانات نہیں ہیں تو اس نے ان انتخابات کے معتبر ہونے میں شکوک پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہدایتیں بھجوائی گئیں کہ امیدواروں کو اپنے نامزدگی پرچے داخل کرنے چاہییں اور پھر کوشش کرنا چاہیے کہ ان کو گرفتار کرلیا جائے تاکہ پاکستان یہ دعویٰ کرسکے کہ انتخابات میں بے ایمانی ہوئی ہے۔مگر شیخ عبداللہ کی حکومت نے کہ اسے اپنی کامیابی پر کامل یقین تھا کسی کو بھی گرفتار نہیں کیا۔جس دن اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا سارے کشمیر میں خوشی وانبساط کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف اس احساس کی ایک مسرت تھی کہ بالآخر صدیوں بعد کشمیر کے عوام اپنی قسمت کا خود فیصلہ کررہے تھے۔اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے مولانا مسعودی نے کہا:

''ہمارا مستقبل اب ہمارے ہاتھوں میں ہے۔آج ہم نے اپنے مقدر کو اپنی آرزوؤں اور اپنے خوابوں کے مطابق بنانے کا حق حاصل کرلیا ہے۔''

اسی دن ایک جلسے عام میں شیخ عبداللہ نے ہندوستان کے عوام اور ان کے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کا کشمیر کی تاریک ترین گھڑی میں پاکستانی حملے کے وقت امداد دینے پر شکریہ ادا کیا۔انھوں نے مزید کہا کہ ہم نے اب پہل اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور اب اپنے ملک کی تقدیر بنانے کے اقدامات ہم کریں گے۔ ۵رنومبر ۱۹۵۱ء کو اسمبلی کو پہلی دفعہ خطاب کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے وہ چار اہم کام گنوائے جو کرنے تھے۔

مستقبل کی کشمیر کی حکومت کے لیے ایک دستور کی تیاری۔

شاہی خاندان کے مستقبل کا فیصلہ۔

ان سابق زمین داروں کے مسئلے پر غور، جو اس زمین کے معاوضے طلب کررہے تھے جو ان سے لے لی گئی تھی اور

ہندوستان کے الحاق پر فیصلہ لینا۔

انھوں نے یہ بات بالکل صاف کردی کہ وہ ہندوستان کے الحاق کو ترجیح دینا اسمبلی کے لیے بہترین کارگزاری سمجھتے ہیں۔ (ہندوستان اپنے حصار میں: ص ۵۷-۲۵۱)

فردوس گم شدہ - بازیافت کی سعی ناکام:

مسٹر ایم۔جے اکبر اپنی تالیف ''ہندوستان اپنے حصار میں'' میں لکھتے ہیں:

جناح صاحب نے کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے لیے اپنا بس بھر زور لگالیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اس بات کو ہمیشہ ہی خودکشی کے مترادف سمجھا تھا۔ تقسیم کے بعد جب ایسا محسوس ہوا کہ نہ تو نیشنل کانفرنس اور نہ ہی مہاراجہ کی حکومت کشمیر کو پاکستان میں لے جانے کے لیے تیار ہے تو جناح صاحب نے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کیا۔ اس وقت مہاراجہ ہری سنگھ ہوائی قلعوں کی تباہ کن تعمیر میں اُلجھ چکے تھے اور ان کے ذہن میں خود مختار سلطنت کے عجیب عجیب نقشے گھومنے لگے تھے۔ ان کے درباریوں کی خوشامدانہ تجاویز تو یہاں تک تھیں کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عظیم سلطنت کی بازیافت کرسکتے ہیں۔ جولائی میں کشمیر کے ایک دورے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس اشارے کے باوجود کہ سب سے اچھی بات یہ ہوگی کہ پاکستان سے الحاق کیا جائے۔ مہاراجہ نے ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء تک کسی کاغذ پر دستخط نہیں کیے تھے۔ اس کی جگہ پر کشمیر نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے ساتھ توقف کا ایک معاہدہ کرلیا۔ ہندوستان مذہبی فسادات کے علاوہ حیدرآباد، جوناگڑھ اور ریفیوجیوں کے مسایل کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس صورت حال سے فایدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان نے کشمیر پر قبضہ کرنے کا ایک منصوبہ تیار کرلیا۔

جناح صاحب کا مقصد اور منصوبہ:

۲۴/اگست کو جناح صاحب نے اپنے ملٹری سکریٹری کو حکم دیا کہ وہ وسط ستمبر میں کشمیر میں دو ہفتے کی چھٹیاں گزارنے کے انتظامات کردے، مگر یہ سن کر انھیں بہت زبردست دھکا لگا کہ ہری سنگھ انھیں وادی میں قدم بھی نہیں رکھنے دیں گے۔ معاصرین کا خیال ہے کہ اس

تحقیر نے جناح صاحب میں کشمیر میں چھٹیاں منانے کا عزم اور محکم کر دیا۔ ستمبر کے وسط تک کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے صوبۂ سرحد کے قبایلیوں کو کشمیر بھیجنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ پاکستان کے لیے یہ عمل اس وار کی حیثیت رکھتا تھا جس سے بہ یک وقت تین شکار ہوتے تھے۔

اول یہ کہ اس کارروائی سے پٹھانوں کی توجہ کو کابل کی طرف سے ہٹایا جا سکتا تھا (جب ۳۰ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کو اقوام متحدہ میں داخل کیا گیا تھا، افغانستان واحد ملک تھا جس نے اس کی مخالفت کی تھی)۔

دوم یہ کارروائی اس پاکستانی فوج کا استعمال کیے بغیر ہی کشمیر کو پاکستان میں شامل کرادے گی جس کی سرزمین کشمیر میں موجودگی آئینی طور پر کسی طرح بھی جایز نہیں ہو سکتی اور

سوم یہ کہ یہ کارروائی قبایلیوں کو ان کے پسندیدہ مشغلے یعنی لوٹ مار کا بھی موقع فراہم کردے گی جو بہت دنوں سے ان کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ قبایلی لیڈروں کو یہ سمجھایا گیا کہ یہ لڑائی صرف یہی نہیں کہ ایک ہندو راجہ کے چنگل سے اپنے مسلمان بھائیوں کو آزاد کرانے کے لیے جہاد ہو گی، بلکہ منزل پر مالِ غنیمت حاصل کرنے کے بھی بے پناہ مواقع فراہم کرے گی۔

یہ قبایلی ۲۲ر، ۲۳ر اکتوبر (۱۹۴۷ء) کی رات میں جہلم کے پار کشمیر میں داخل ہوئے۔ سرحدی مورچے پر نہایت آسانی سے قبضہ ہو گیا۔ سری نگر تقریباً ایک سو چالیس میل دور تھا جہاں پہنچنے کے لیے موٹر کے لائق ایک سڑک تھی۔ جموں و کشمیر کی موسم گرما کی راجدھانی پر تکنیکی طور پر چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر قبضہ ہو سکتا تھا، مگر جب لٹیروں کے سربراہوں نے سیدھے سری نگر جانے کا فیصلہ کیا تو اس انکشاف سے انھیں ایک بہت بڑا دھکا لگا کہ ان کے پیرو اُن کے ساتھ ہیں ہی نہیں! پٹھان رات کی تاریکی میں غایب ہو گئے تھے۔ وہ لوگ قریب کے قصبے مظفرآباد میں لوٹ مار کے لیے چلے گئے۔ دراصل وہ جانتے تھے کہ مقدم کیا چیز ہے۔ اس حرص و ہوس کی وجہ سے سری نگر پر دھاوے میں چند انتہائی اہم دنوں کے لیے خلل پڑ گیا اور ان ہی دنوں میں برصغیر کی تاریخ ایک بار پھر سے لکھی گئی۔

(ہندوستان اپنے حصار میں: ص ۵۰-۲۴۹)

پنڈت جواہر لال نہرو اور کشمیر:

۲/نومبر ۱۹۴۷ء: ''ہم نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ بالآخر وہاں کے لوگ ہی کریں گے۔ ہم نے یہ وعدہ نہ صرف جموں و کشمیر کے عوام سے بلکہ دنیا سے بھی کیا ہے۔ ہم نہ تو کبھی اس سے انحراف کریں گے اور نہ ہی ایسا کر سکتے ہیں۔''

۵/مارچ ۱۹۴۸ء: ''ہم خود کشمیر کے مسئلے کے حل کی سچی خواہش رکھتے ہیں اور ہماری سچی خواہش ہے کہ آزادی کی قوتوں کو معمولی انداز میں کام کرنے کی اجازت ہونی چاہیے، تاکہ وہ اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور نتیجہ مصنوعی ہوگا اور ہم کوئی فیصلہ اپنے طور پر نہیں نافذ کر سکتے اور یقیناً پاکستان بھی کوئی فیصلہ نہیں تھوپ سکتا۔ بالآخر میرے ذہن میں اس بارے میں کوئی تذبذب نہیں کہ کشمیر میں بالآخر کشمیر کے عوام ہی فیصلہ کریں گے۔ ہماری یہ خواہش بھی ہے کہ ان کو بغیر کسی بیرونی دباؤ یا مداخلت کے فیصلہ کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔''

۴/جون ۱۹۴۸ء: ''میں اس بات کو پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کے ہندوستان کی حکومت ہر حال میں اپنے وعدے پر قایم رہے گی۔ یہ وعدہ خود یہ کہتا ہے کہ یہ کشمیر کے لوگوں کا حق ہے وہ کسی بیرونی مداخلت کے بغیر اپنی قسمت کا فیصلہ کریں۔ یہ یقین دہانی اب بھی برقرار ہے اور آیندہ بھی برقرار رہے گی۔''

لوک سبھا میں:

میں ایوان کو یہ یاددہانی کرانا چاہتا ہوں کے یہ ہمارا یک طرفہ اعلان تھا کہ کشمیر کے لوگوں کو اپنا فیصلہ خود ہی کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں پاکستان نے جو کچھ کیا یا کہا اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم نے کشمیر کے لوگوں سے وعدہ کیا ہے اور اقوام متحدہ سے بھی یہی وعدہ ہے۔ ہم اس پر قایم تھے اور آج بھی قایم ہیں۔ کشمیر کے لوگوں کو فیصلہ کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ (لاہور-لاہور، ۳۰/جنوری ۱۹۹۹ء سرورق)

مولانا ابوالکلام آزاد اور کشمیر:

۲۴/جون ۱۹۵۰ء: مولانا آزاد وزیر تعلیم ہند نے سری نگر کے اودنگھ کالج کے تقسیم اسناد

میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اہالیان کشمیر، مسئلہ کشمیر خود حل کر سکتے ہیں، جب وہ ذہنی اور دماغی حیثیت سے اس کے اہل ہو جائیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عمومی تعلیم کا پورا بندوبست کیا جائے۔ انگریزوں کی ڈیڑھ سو سالہ حکومت کے بعد ابھی پندرہ فی صد آدمی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں ملک کو فوراً ایک نصب العین مقرر کر کے اس پر عمل شروع کر دینا چاہیے۔ قدیم عہد میں ہندوستانیوں کے ذہن بلند اور وسیع تھے۔ اسلام نے بھی یہ تعلیم دی ہے کہ وسیع النظری اور رواداری سے کام لو۔ حقیقت و صداقت کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ جن ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیمات اتنی وسیع ہوں ان میں تنگ دلی نظر آئے؟ جب مسلم لیگ کو عروج حاصل ہوا تو اس نے اپنی سیاست کی بنیاد مذہب پر رکھی تھی مگر اب عملاً ہندوستان میں لیگ کا وجود ختم ہو چکا ہے، تاہم بعض لوگ اسی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اگر یہی تعصب اور تنگ دلی کی فضا طاری رہی تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ تعلیم کے بعد ہی تعصب کا قلعہ منہدم ہوگا اور ہم ہندوستانی روایات کے مطابق ترقی کا شاندار محل تعمیر کر سکیں گے۔ (مولانا آزاد-ایک سیاسی ڈائری)

پاکستان اور کشمیر-ایک مبصر کی نظر میں:

پاکستان نے اب تک جو پالیسیاں اپنائی ہیں وہ تو مسلمانانِ کشمیر کے لیے بھی اس کی پریشانی اور ہمدردی کو بھی محض منافقت قرار دیتی ہیں۔ اس کے بلند بانگ اور بار بار کے دعوے ہیں کہ وہ مسلمانانِ کشمیر کو ہندو کنٹرول سے آزادی دلانے کے درپے ہے، لیکن تیس لاکھ کشمیر کے مسلمانوں کے لیے وہ پانچ کروڑ ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل داؤں پر لگانے کے لیے تیار ہے۔ یہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان کو اس کا تو بہ خوبی اندازہ ہونا ہی چاہیے کہ کشمیر میں رائے شماری کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء کے جذبات پھر ابھر سکتے ہیں۔

پھر تازہ ہند پاک آویزش کے نتیجے میں پیدا شدہ احساسات سے قطع نظر خود تاریخ قیام پاکستان اور قیام کے بعد کی ساری ہولناکیاں ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ عام ہندو کے لیے یہ بڑا مشکل ہے کہ پاکستان دشمنی کے ساتھ تحت الشعور ہی میں سہی، وہ کسی نہ کسی حد تک مسلم دشمن بھی نہ ہو، چاہے وہ مسلمان ہندوستانیوں کا پاکستان سے رشتہ بھلے ہی نہ جوڑتا ہو،

لیکن ہندو پاکستانیوں کو ہندوستان کے ساتھ ضرور جوڑتا ہے۔ نتیجہ فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں عیاں ہے کہ ہندو پاکستانیوں پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا بدلہ مسلمان ہندوستانیوں سے چکایا جاتا ہے۔ یہ پلٹی ہوئی شکل میں یرغمال کے نظریے کے سوا اور کیا ہے؟ اگر اور کسی وجہ سے نہ سہی، تو ہندوستان کے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ہی پاکستان کو اپنی اقلیت کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے، مگر ہو یہ رہا ہے کہ وہ اس کی عین ضد پر عمل پیرا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دبی ہوئی ہندو فرقہ پرستی کی چنگاریوں کو ہوا دینے کی ہر ممکن کوشش جاری ہے۔

یہ اپنے آپ کو اسلامی مملکت کہنے والے کا ایسا مسلم دشمن رویہ آخر کیوں ہے؟ شاید وجہ یہی ہو کہ ہندوستان دشمنی ہی وہ قوت ہو سکتی ہے، جو پاکستان کے دونوں بازوؤں کو متحد رکھ سکتی ہے اور ہندوستان کے سیکولر ہونے کی صورت میں اس جذبے کو پوری حرارت و شدت نصیب نہیں ہو سکتی، نہ اسلام خطرے میں دکھایا جا سکتا ہے۔

(محمد علی جناح از مرزا راشد علی بیگ، جنرل خدا بخش لائبریری - پٹنہ: ۱۹۹۶ء، نمبر ۱۰۳، ص ۳۶۴)

مسئلہ کشمیر کا حقیقت پسندانہ حل:

۲۳ رنومبر ۱۹۵۳ء: امین الملک سر مرزا محمد اسماعیل سابق وزیر اعظم خیدر آباد و میسور کے قلم سے ٹائمز آف انڈیا ۲۳ رنومبر ۱۹۵۳ء میں ہند اور پاکستان کے مابین امن و مفاہمت کی راہ میں کشمیر کا مسئلہ سب سے بڑی رکاوٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مسئلے کا آئیڈیل حل وہی ہو سکتا ہے جو فریقین میں سے کسی کو بھی پوری طرح مطمئن نہ کرے اور اس سمجھوتے کو پائیدار بنانے کی صورت یہی ہے کہ کوئی فریق یہ محسوس نہ کرنے پائے کہ اس کی کوئی بات نہیں مانی گئی۔ رائے شماری کے ذریعے فیصلہ مہلک نتائج کا حامل ہوگا اور اس سے مسئلہ حل نہ ہوگا بلکہ اور زیادہ شدید صورت اختیار کرلے گا۔ اس حقیقت کو محسوس کر لینا چاہیے کہ کشمیر کی تقسیم اب ناگزیر ہے۔ بلکہ فی الحقیقت وہ عالم وجود میں پہلے ہی آچکی ہے۔ اس لیے پاکستان کو اجازت دی جائے کہ کشمیر کے جن حصوں پر وہ قابض ہے بہ دستور قابض رہے۔ البتہ اس میں پونچھ کا اضافہ کر دیا جائے، کیوں کہ وہاں مسلمان غیر معمولی اکثریت میں ہیں اور جغرافیائی اعتبار سے بھی یہ پاکستان کا علاقہ ہے اور ہندوستان بہ دستور جموں اور لداخ پر

قابض رہے۔

رہی وادیٔ کشمیر کہ وہی اصل جھگڑے کی جڑ ہے وہ دونوں میں سے کسی کو نہ دی جائے۔ اسے بعض جزوی سرحدی تغیرات کے ساتھ ساتھ ایک مکمل خود مختار ریاست کی شکل دے دی جائے۔ جو اندورنی معاملات میں بالکل خود مختار ہو، لیکن غیر ملکی اور دفاعی ذمے داریوں سے بالکل سبک دوش رکھی جائے اور اسے اس چھوٹے براعظم (ہندوستان) کے سوا کسی اور غیر ملکی حکومت سے براہِ راست تعلقات قایم نہ رکھنے دیا جائے۔

اس قسم کا حل جملہ فریقوں ہند پاکستان اور کشمیر کے لیے معقول ثابت ہوگا اور کوئی دشمنی کا جذبہ بعد میں باقی نہ رہنے پائے گا۔ وادیٔ کشمیر کو اس امر کا حق دیا جاسکتا ہے کہ اگر ہندوستان یا پاکستان میں سے کوئی اسے ستائے تو وہ اقوام متحدہ میں اپیل کر سکے۔ یہ سمجھوتا ہر فریق کو کسی نہ کسی حد تک قربانی کرنے پر مجبور کرے گا، لیکن اس کے بعد یہ کتنا زیادہ قابل قدر ہوگا؟ بہت کم مسایل ایسے ہیں جو اس قدر جلد اور جاں بازانہ طریقے پر طے ہو سکتے ہیں، لیکن یہ مسئلہ میری قطعی رائے ہے کہ ایسے ہی حل کا طالب ہے۔

(صدقِ جدید۔لکھنؤ: ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۳ء، ص ۷)

چند حقایق:

پروفیسر ایس ایم برک اور سلیم الدین قریشی نے مشترکہ کاوشوں سے برطانوی راج کے بارے پرانی دستاویزات کے مطالعے اور تحقیق کے بعد ایک کتاب تحریر کی ہے، اس کتاب کے مضامین و مشمولات کے تعارف میں آصف جیلانی (لندن) نے ایک مضمون لکھا ہے، جو یکم اگست ۱۹۹۵ء کے جنگ کراچی میں صفحہ ۳ پر شایع ہوا ہے۔ اس میں کشمیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کتاب میں تقسیم اور اقتدار کے منتقلی کے بارے میں جو ابواب ہیں وہ اس اعتبار سے ''تازہ ترین'' کہے جاسکتے ہیں کہ ان میں حال میں پہلی بار منظر عام پر آنے والی پرانی دستاویزات اور کاغذات شامل ہیں۔ پھر کتاب میں کشمیر اور حیدر آباد سمیت چھ دوسرے رجواڑوں کے انضمام کے بارے میں الگ الگ باب ہیں۔ کشمیر کا باب ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ جون ۱۹۴۷ء ہی میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال

نہرو اور مہاتما گاندھی نے یہ کوششیں شروع کردی تھیں کہ ریاست جموں و کشمیر کے مہاراجہ آزادی کا اعلان نہ کریں بلکہ وہ بھارت میں شمولیت پر رضامندی ظاہر کریں۔ اس مقصد کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور گاندھی جی کشمیر گئے تھے اور مہاراجہ سے ملاقاتیں کی تھیں۔ مہاراجہ کشمیر پر آزادی کے اعلان کے لیے زور ان کے وزیر اعظم رام چندرا کاک دے رہے تھے۔ چناں چہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور گاندھی جی کے دورے کے بعد رام چندرا کاک کو برطرف کردیا گیا اور ہائی کورٹ کے جج مہاجن کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا، جو بعد میں بھارت کے چیف جسٹس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس زمانے میں شیخ عبداللہ کی بھی رہائی عمل میں آئی، جس کے لیے نہرو اور گاندھی بہت زور دے رہے تھے۔ کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مہاراجہ نے کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی دستاویز پر دستخط کشمیر میں بھارتی فوج کے داخلے کے بعد کیے تھے اور دراصل یہ دستاویز دستخط کے لیے گورنر جنرل کے سیکرٹری وی پی مینن لے کر جموں گئے تھے۔ کشمیر کے سلسلے میں جہاں جواہر لال نہرو اپنے آباؤ اجداد کے تعلق و نسبت کی وجہ سے بے حد جذباتی تھے وہاں سردار پٹیل کا انداز فکر حقیقت پسندانہ تھا۔ کتاب میں کہا گیا ہے کہ گو سردار پٹیل پاکستان کے دوست نہیں تھے، لیکن وہ اس بات پر آمادہ تھے کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہو۔ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے ان کا خیال تھا کہ کشمیر جہاں مسلم اکثریت ہے بھارت کے لیے عدم استحکام کا باعث بنے گا۔ سردار پٹیل نے اشارہ دیا تھا کہ حیدر آباد اور کشمیر کے سوال پر دونوں ملکوں میں سمجھوتا ہوسکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں عین ممکن تھا کہ اس بنیاد پر پُر امن سمجھوتا ہو بھی جاتا کہ حیدر آباد بھارت میں اور کشمیر پاکستان میں شامل ہو، لیکن قاید اعظم محمد علی جناح کو حد سے زیادہ اعتماد تھا کہ کشمیر بالآخر پاکستان میں شامل ہوگا، ان کا کہنا تھا کہ کشمیر پاکستان کی گود میں پکے پھل کی مانند آگرے گا (اور حیدر آباد تو ایک مسلم ریاست ہے ہی، وہ پاکستان سے الگ نہیں رہ سکتی!) یہ ان کا بے حد غلط اندازہ تھا۔"

آصف جیلانی نے یہ بھی لکھا ہے:

"اس نئی کتاب میں دستاویزات سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے مہاراجہ نے کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کے پہنچنے کے بعد الحاق کی دستاویز پر دستخط کیے تھے اور دستاویز پر ۲۶ اکتوبر کی جعلی تاریخ تحریر کی گئی تھی۔ اس کتاب میں یہ انکشاف بھی کیا گیا

ہے کہ کشمیر میں ہندوستانی فوج کے داخلے کے فوراً بعد قاید اعظم محمد علی جناح نے اس زمانے کے پاکستانی فوج کے قایم مقام کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی کو پاکستانی فوجوں کو کشمیر بھیجنے کا حکم دیا تھا، جسے جنرل گریسی نے ماننے سے صاف انکار کر دیا اور اس کی اطلاع انھوں نے فی الفور اس زمانے کے ہندوستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل آکنلیگ کو دے دی۔''

کشمیر اور حکومت ہند:

''یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے دو خط ہیں جو انھوں نے نہرو کابینہ کے وزیر مواصلات کو لکھے تھے۔ ان سے کشمیر کی اندرونی صورت حال پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ وزیر مئی ۱۹۵۲ء میں کابینہ میں شامل ہوئے تھے۔ یہ خط اس کے بعد کے زمانے کا ہے۔'' (اس ش)

مائی ڈیر جگ جیون رام!

ٹیلی گراف اور پوسٹ آفس کے بارے میں آپ کی جو چٹھی مجھے ملی تھی اس کی کاپی میں نے چیف منسٹر جموں کشمیر کو بھیج دی تھی۔ ان کا جو جواب مجھے ملا ہے میں آپ کو بھیجتا ہوں۔

یہ بات کہ ایسی جگہوں کے لیے جو محض کلرکی کی جگہ ہیں کشمیر کے ۴۳ امیدوار درخواست دیں اور ان میں صرف ایک آدمی کامیاب ہو، یقیناً میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ افسوس ہے کہ اس طرح کی باتوں کا جو اثر کشمیر پر پڑتا ہے اور اس سے کشمیر کے مسئلے میں جو خرابیاں پڑتی ہیں، اس کا اندازہ ان لوگوں کو نہیں ہے جن کے سپرد گورنمنٹ نے ریکروٹ کا کام کیا ہے۔

ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ ابھی کشمیر نے صرف تین سبجیکٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے حوالے کیے ہیں، جس میں ایک کمیونی کیشن اور دوسرا ڈیفنس ہیں۔ اگر ان دونوں منسٹریوں کا یہ حال ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں کے لیے ان میں کوئی جگہ نہیں نکل سکتی تو پھر دوسرے سبجیکٹوں میں اکسیشن کر کے ہم کیا امید کر سکتے ہیں؟

ہم اس کا کیا جواب دیں؟

آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد نے جگ جیون رام نے ریاست میں پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے ملازمین کے ایک انٹرویو کے سلسلے میں لکھا تھا اور اس کا جواب وزیراعلا ریاست جموں اینڈ کشمیر شیخ عبداللہ کو بھیج دیا تھا، لیکن اس پر اپنے ردِعمل سے بھی وزیر مواصلات کو مطلع کر دیا تھا۔ جگ جیون رام کے مولانا کا دوسرا خط اسی ردِعمل کے اظہار میں ہے۔ ملاحظہ فرمایے:

مائی ڈیر جگ جیون رام!

آپ کا ٹیلی گرام ملا، میں میسج کل بھیج دوں گا۔ یہ چٹھی میں ایک اور اہم معاملے کی نسبت لکھتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ ہمارے انٹرسٹ کے لیے یہ بات کتنی ضروری ہے کہ ہم کشمیر کے باشندوں کے اندر گورنمنٹ آف انڈیا کے لیے اچھے خیالات پیدا کرائیں اور ان کے اندیشے جو ہمارے طرزِعمل کی نسبت ہیں، وہ یک قلم دور ہوں، لیکن افسوس ہے کہ اس بات کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے اور ایسی باتیں ہو جاتی ہیں جو یہاں کشمیر میں ہمارے خلاف ایک پروبلم بن جاتی ہیں اور پھر اس کے اثرات ہمارے تعلقات کو خراب کرتے ہیں۔

کیمونی کیشن یونین سبجیکٹ ہے، اس لیے کشمیر اسٹیٹ کا پوسٹ اور ٹیلی گراف ڈیپارٹمنٹ آف انڈیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اسٹیٹ گورنمنٹ ایک عرصے سے یہ شکایت کر رہی ہے کہ اس محکمے کی سروس میں کشمیری مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ جتنے آدمی رکھے جاتے ہیں نان مسلم ہیں۔

ابھی حال میں نادرن سرکل کی کلرکی کے لیے امتحان لیا گیا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے لیے کشمیر کے ۳۷ نان مسلم کی اور ۶ مسلمانوں کی درخواستیں آئیں۔ امتحان کے بعد ۶۰ نان مسلم لیے گئے اور صرف ۲ مسلم۔

شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کا کہنا یہ ہے کہ کشمیر کے ایجوکیٹڈ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد بے کار ہے اور اسٹیٹ ان کے لیے کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ اگر ان جگہوں کو اچھی طرح ایڈورٹائز کیا جاتا تو چھ مسلمانوں کی جگہ دو تین سو مسلمان درخواست دے دیتے، لیکن انڈین گورنمنٹ نے غالباً صرف گورنمنٹ گزٹ میں خبر نکال دی ہوگی اور پھر اگر اور کوئی انتظام کیا گیا ہوگا تو ایسا کہ ۳۷ نان مسلموں نے تو درخواست دے دی اور مسلمان بے خبر رہ

گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام کشمیر میں سے صرف ۴ مسلمان کلرک لیے گئے اور نان مسلم ۶۰ کامیاب ہو گئے۔ اگر گورنمنٹ آف انڈیا کے ہاتھ میں اس ڈیپارٹمنٹ کے جانے کا یہ نتیجہ نکلا ہے تو کیوں کر کشمیر بھروسا کر سکتا ہے کہ اس کا انٹرسٹ فیوچر میں محفوظ رہے گا۔

میں نے شیخ عبداللہ کو سمجھایا کہ بغیر حالات دریافت کیے ہوئے مناسب نہیں ہے کہ کوئی رائے قایم کی جائے۔ میں اس معاملے پر منسٹری کو توجہ دلاتا ہوں۔

مہربانی کر کے معلوم کیجیے کہ اس بارے میں اصلی حالات کیا ہیں، تاکہ میں شیخ عبداللہ کو کوئی جواب بھیج سکوں۔

آزاد

جگ جیون رام کے نام خطوط میں ریاست جموں اینڈ کشمیر میں مسلمان ملازمتوں کے بارے میں جو ذکر آیا ہے اس سلسلے میں شیخ عبداللہ کے نام پہلا اور تیسرا خط ہے۔ تیسرے خط میں مولانا نے انھیں تحریر فرمایا تھا:

مائی ڈیر شیخ عبداللہ!

پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف ڈیپارٹمنٹ کے متعلق آپ نے جو شکایت کی تھی وہ میں نے مسٹر جگ جیون رام کو بھیج دی تھی۔ ضروری تحقیقات کے بعد انھوں نے یہ چٹھی مجھے بھیجی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سری نگر کے اردو اخبار ''خدمت'' میں بھی اس کا اشتہار شایع ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں یہ شکایت نہیں کی جا سکتی کہ پبلی سٹی کافی نہیں ہوئی۔ بہرحال ان کی چٹھی کی کاپی آپ کو بھیجتا ہوں۔

آزاد

جواہر لال نہرو کے نام مولانا آزاد کا خط

مئی ۱۹۵۳ء میں وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو مولانا ابوالکلام آزاد ان کے قایم مقام قرار پائے۔ اسی دوران مولانا کشمیر گئے اور شیخ عبداللہ سے ملاقات کی۔ یہی زمانہ تھا کہ پاکستان میں وزارتی انقلاب آیا اور محمد علی بوگرا پاکستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور مسئلۂ کشمیر پر توجہ دی گئی۔ کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان پاکستان کے دونوں وزراے اعظم دہلی میں ایک ملاقات کر چکے تھے اور طے پایا تھا جب وہ

۲ر جون ۱۹۵۳ء کو ملکۂ الزبتھ کے جشن تاج پوشی کے موقع پر انگلینڈ میں موجود ہوں گے تو ان کی ملاقات ہوگی اور گفتگو کو آگے بڑھائیں گے۔ پروگرام کے مطابق ۹ر جون کو یہ ملاقات ہوئی۔ اس موقع پر مولانا ابوالکلام نے جموں میں شیخ عبداللہ سے اپنی ملاقات کے نتیجے سے پنڈت جی کو مطلع کیا اور محمد علی بوگرا سے پنڈت جی سے ملاقات اور پیش رفت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ مولانا اس ملاقات کے نتائج معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''کل شیخ عبداللہ سے دو گھنٹے تک باتیں ہوئیں، آج پھر ہوں گی۔ امیڈیٹ خطرہ جو پیدا ہو گیا تھا اب وہ ٹل گیا ہے۔ انھوں نے مان لیا کہ سردست وہ پبلک کے سامنے کوئی بات نہیں رکھیں گے۔ اب باتیں اصلی پروبلم پر ہو رہی ہیں۔ کل نیشنل کانفرنس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے ملوں گا (اسٹاپ)۔

محمد علی سے جو باتیں ہوئیں اس کا امپریشن آپ پر کیا ہوا؟ مہربانی کر کے لکھیے۔''

(آثار ونقوش۔ کراچی، ۱۹۹۷ء: ص ۱۶۶)

(۶)

مسئلہ قومیت

متحدہ قومیت:

۲۷ر اگست ۱۹۲۸ء: جمعیت علماے ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس آج لکھنؤ میں بعد نمازِ ظہر ڈھائی بجے مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی کی صدارت میں شروع ہوا، اس میں مولانا سید حسین احمد مدنی رکن مجلس عاملہ نے بھی شرکت فرمائی۔ اس اجلاس میں نہرو رپورٹ پر غور کرنے اور تبصرہ کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی تشکیل دی گئی۔ سب کمیٹی کے ارکان یہ ہیں:

(۱) حضرت مفتی کفایت اللہ — صدر جمعیت علماے ہند

(۲) مولانا احمد سعید دہلوی — ناظم جمعیت علماے ہند

(۳) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

(۴) حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری

(۵) مولانا حسرت موہانی۔

کمیٹی کی مکمل رپورٹ نہرو کمیٹی پر تبصرے کے سلسلے میں درج کی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں ''متحدہ قومیت'' کے ضمنی عنوان سے بھی اس کے مفہوم اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس مقام پر یہی بحث موقعے کی مناسبت سے درج کی جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر کسی ملک کو یہ بات حاصل ہو کہ اس کے تمام باشندے ایک مذہب کے پابند ہوں اور ایسی جماعتیں نہ ہوں جن کی تہذیب، طرزِ معاشرت، اخلاق و عادات، نسل اور زبانیں، جذبات و حیات متباین و متضاد ہوں تو وہ بڑا خوش قسمت ملک ہوگا۔ نیز اگر کسی ملک کے باشندے مختلف مذہب تو رکھتے ہوں، لیکن وہ حقیقتاً اپنے مذاہب کے پرستار نہ ہوں اور مذہب کی بنا پر ان میں جنگ و جدل نہ ہو بلکہ صرف سیاسی

خیالات کی بنا پر اختلافات رکھتے ہوں اور مذہب کو سیاسیات میں دخل نہ دیتے ہوں تو وہاں بھی سیاسی ارتقا کے لیے جمہوری اصول کی بنیاد پر قوانین وضع کیے جاسکتے ہیں، لیکن بد قسمتی سے ہندوستان کو یہ دونوں حیثیتیں حاصل نہیں ہیں نہ تو یہاں حجاز ونجد کی طرح ایک مذہب رکھنے والی قوم آباد ہے، بلکہ اپنی مختلف العقاید اور متباین ومتضاد مذاہب کی ماننے والی قومیں آباد ہیں، جن کے مذہبی خیالات رسم ورواج تہذیب وتمدن میں زمین آسمان کا فرق ہے اور نہ یہاں کی بڑی اور اہم قومیں اپنے مذہبی وعقاید کو کسی حالت میں بھی نظر انداز کرنے اور صرف سیاسی خیالات کے لحاظ سے بحث ونظر کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مسلمان تو اس لیے کہ انکار مذہب اور سیاست دو الگ چیزیں نہیں ہیں، اور ہندو اس لیے کہ وہ مذہبی عقاید اور مذہبی رسم ورواج کو اپنی قومیت کا بہترین محافظ خیال کرتے ہیں۔

اس موقع پر ہم ہندو مہاسبھا کے ایک ذمے دار افسر کا قول نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، جس نے مذکورہ بالا نظریے کی صراحت کر دی ہے۔ ڈاکٹر مونجے نے آل پارٹیز کانفرنس بمبئی میں ہندو مہاسبھا کی پوزیشن ان الفاظ میں واضح کی تھی۔

جہاں تک ہندوؤں کے ملی معاملات کا تعلق ہے ہندو مہاسبھا فرقہ وارانہ جماعت ہے اور جہاں ملی معاملات کا تعلق ہے وہ کانگریس کی ہم خیال ہے۔

(ہمدرد: ۲۳ مئی ۱۹۲۸ء: ص ۵)

پس یہ تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کا اول اور اعلا درجے کے تمام باشندے ایک ہی مذہب کے پابند ہوں۔ قدرتاً اور فطرتاً حاصل نہیں ہے۔

اور دوسرا درجہ کہ مختلف مذاہب کے پابند اپنے اپنے مذاہب کو پس پشت ڈال کر اور ملک کے ارتقا میں مذاہب سے بالکل قطع نظر کر کے شریک ہوں۔ یہ درجہ بھی ہندوستان کو حاصل نہیں ہے اور ڈاکٹر مونجے کا مذکورہ بالا اعتراف اور ماضی قریب میں ہندوستان کے فرقے وارانہ ہنگامے، قربانی گاؤ کے خلاف بلوے، مساجد کے سامنے باجے بجانے پر لڑائیاں اس کی شاہد عادل ہیں۔

ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ فرقہ وارانہ مناقشات سخت مذموم اور وطن کی آزادی کے لیے سم قاتل ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ ہندوستان

کے دستور اساسی بنانے والوں کا فرض ہے کہ وہ ان حالات کو نظر انداز نہ کریں اور ایک امر واقعہ کو کالعدم فرض کر کے وہ اصول عاید نہ کر دیں جو ان واقعات کے نہ ہونے کی صورت میں عقلی یا جمہوری یا قومیت متحدہ کے نام سے عاید کیے جا سکتے تھے۔

قومیت متحدہ باہمی شفقت و محبت، اطمینان و اعتماد، صلح و رواداری کی فضا پیدا کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے، دستور اور قانون کی گرفت سے نہیں ہو سکتی۔ دستور اور قانون کا منصب یہ ہے کہ وہ ہر اقلیت بلکہ ہر ہر فرد کے حقوق کی حفاظت کرے اور اس کے لیے دفعات بنائے تاکہ کوئی زبردست زیردست پر ظلم نہ کر سکے۔

ہندوستان کا دستور اس نظریے کو سامنے رکھ کر بنانا ہے کہ نہ یہاں ایک مذہب کے باشندے آباد ہیں اور نہ مختلف مذاہب کے پابند مذہبی مناقشات جنگ و جدل کو چھوڑ چکے ہیں۔ بلکہ ان میں مذہبی مناقشات کا بازار گرم ہے اور خدا جانے کب تک گرم رہے گا۔ لہٰذا دستور میں ایسے دفعات لازمی طور پر رکھے جانے چاہییں کہ اکثریت اقلیت پر ظلم و زیادتی نہ کر سکے اور ہر جماعت اپنی اپنی جگہ اپنے حقوق کے حصول پر مطمئن ہو۔

ہندوستان کی موجودہ حالت میں اس کی حکومت اور حکومت کی نوعیت اور اس کی کامیابی کا مسئلہ صرف اقلیتوں کے اطمینان و اعتماد کا مسئلہ ہے۔ اگر ہندوستان کی قلیل التعداد قومیں اپنے حقوق کی طرف سے مطمئن نہ ہوں گی تو نہ آزادی حاصل ہو سکے گی اور نہ کامیاب حکومت قایم ہو سکے گی۔ ہندوؤں کا ایک مذہب ہے اور ان کی جداگانہ تہذیب و تمدن ہے۔ مسلمانوں کا ایک مذہب ہے اور ان کی تہذیب و تمدن جدا ہے۔ باوجود صدیوں کے میل جول اور قرب و ہمسائگی کے آج بھی ہندوؤں کی اکثریت مسلمانوں سے اتنی دور ہے کہ ان کے ہاتھ کا کھانا کھانے پانی پینے کو تیار نہیں ہے۔ ہندو مہاسبھا کے نمایندے سندھ کی علاحدگی کے خلاف یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ کسی صوبے کو فرقہ وارانہ بنیاد پر جدا کرنا اصولِ قومیت کے منافی ہے، لیکن انھوں نے کبھی ٹھنڈے دل سے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ایک ملک، ایک احاطہ، ایک محلے بلکہ ایک گھر میں رہنے اور ایک دکان پر بہ حیثیت شریک بیٹھنے اور ایک کارخانے میں مل کر کام کرنے کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ کا کھانا نہ کھانا اور پانی نہ پینا یہ کس قومیت متحدہ اور کس جمہوری اصول کے موافق ہے؟ اور کیا یہ علاحدگی اور

اجنبیت اور یہ دوری اور نفرت سیاسی اتحاد اور ملکی ارتقا پر اثر انداز نہیں ہے؟ ضرور ہے اور اس کا انکار کرنا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے۔

ہندو مسلم مسئلہ:

پس ہندوستان کے مسئلے کا نچوڑ صرف ایک ہے اور وہ ہندو مسلم مسئلے کے مختصر الفاظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندو مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان میں اور کوئی قوم نہیں ہے یا جو ہے وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں قوموں کو ہندوستان میں طبعی طور پر یہ درجہ حاصل ہے کہ ان کا باہمی تصفیہ ہو جانے کے بعد دوسری اقلیتوں کا اعتماد حاصل کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ بعض اقلیتیں مسلمانوں کے ساتھ ہو جائیں گے اور ان پر اعتماد کریں گی اور بعض ہندوؤں کے ساتھ ہو جائیں گی اور ان پر اعتماد کریں گی اور اگر بالفرض کوئی اقلیت غیر مطمئن بھی رہی تو ہندو مسلمان اپنے باہمی سمجھوتے کے بعد متفق ہو کر اس کو مطمئن کرنے میں زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ہندو قومیت کے حقوق:

ہندوؤں کو ہندوستان میں تقریباً تین چوتھائی کی اکثریت حاصل ہے اور ان کے ہر قسم کے حقوق کی حفاظت کے لیے ان کی کثرت تعداد اور مالی، تعلیمی قوت پوری ضمانت ہے۔ اس لیے ان کو تو کوئی اندیشہ کسی اقلیت سے ہو ہی نہیں سکتا۔

مسلم قومیت:

مسلم قومیت ہندوستان میں تقریباً ایک چوتھائی کی اقلیت میں ہے اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ان کے مذہبی آثار اور گزشتہ دورِ حکومت کی اسلامی یادگاریں اور مذہبی ادارے ایسے ہیں جن کو مسلمان اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور بہت سی چیزیں ہیں جن کو آئندہ ہندوستانی سیاست میں بڑا دخل ہے۔ اس لیے وہ بجا طور پر متفکر ہیں کہ ان کے حقوق مذکورۂ بالا کی حفاظت کا اگر پورا قابل وثوق انتظام نہ کر دیا گیا تو ان کی ایک چوتھائی کی

اقلیت قانونی حیثیت سے اپنے حقوق کی حفاظت میں ناکام رہے گی۔ اس لیے وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک کہ دستورِ اساسی کی بنیادی دفعات میں ان چیزوں کی حفاظت کی ضمانت نہ کر دی جائے، تاکہ جیسے ہندو اپنی اکثریت کی وجہ سے اپنے حقوق کی حفاظت پر مطمئن ہیں مسلمان دستور کی بنیادی دفعات پر اطمینان کر سکیں۔

متحدہ قومیت کا لزوم اور اس کے مفہوم کی حقیقت:

''متحدہ قومیت'' کے مفہوم و لزوم پر حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنے خطبۂ صدارت بارھویں اجلاس عام جمعیت علمائے ہند منعقدہ جون پور مورخہ ۷/ تا ۹/ جون ۱۹۴۰ء میں یہ فکر انگیز روشنی ڈالی ہے:

''ہم باشندگان ہندوستان بہ حیثیت ہندوستانی ہونے کے ایک اشتراک رکھتے ہیں، جو کہ اختلاف مذاہب اور اختلاف تہذیب کے ساتھ ہر حال میں باقی رہتا ہے۔ جس طرح ہماری صورتوں کے اختلافات، ذاتوں اور صنفوں کے تباین، رنگوں اور قامتوں کے افتراقات سے ہماری انسانیت میں فرق نہیں آتا اور اسی طرح ہمارے مذہب اور تہذیبی اختلافات ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز نہیں ہیں۔ ہم سب وطنی حیثیت سے ہندوستانی ہیں اور وطنی منافع کے حصول اور مضرات کے ازالے کا فکر اور اس کے لیے جدوجہد مسلمانوں کا بھی اسی طرح فریضہ ہے جس طرح دوسری ملتوں اور غیر مسلم قوموں کا۔ اس کے لیے سب کو مل کر پوری طرح کوشش کرنی ازبس ضروری ہے۔ اگر آگ لگنے کے وقت میں تمام گاؤں کے باشندے آگ نہ بجھائیں گے، سیلاب آنے کے وقت میں تمام گاؤں کے بسنے والے بند نہ باندھیں گے تو گاؤں برباد ہو جائے گا اور سبھی کے لیے زندگی وبال ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک ایک ملک کے باشندوں کا فرض ہے، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی، ملک پر جب کوئی عام مصیبت پڑ جائے تو مشترکہ قوت سے اس کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس اشتراک وطنی کے فرائض سب پر یکساں عاید

ہوتے ہیں۔ مذاہب کے اختلاف ہے اس میں کوئی رکاوٹ یا کم زوری نہیں ہوتی۔ ہرایک اپنے مذہب پر پوری طرح قایم رہ کر ایسے فرایض کوانجام دے سکتا ہے۔ یہی اشتراک میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں اور اسمبلیوں میں پایا جاتا ہے اور مختلف المذاہب ممبر فرایض شہر یا ضلع یا صوبہ یا ملک کوانجام دیتے اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی معنی اس جگہ متحدہ قومیت کے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے معانی جولوگ سمجھ رہے ہیں وہ غلط اور ناجایز ہیں۔ اسی معنی کی بناپر کانگریس نے فنڈامینٹل میں ہر مذہب اور ہر تہذیب اور ہر زبان اور رسم ورواج کے تحفظ کا التزام کیا ہے، دھوکا نہ کھانا چاہیے اور بے وقوفوں کی بات پر نہ جانا چاہیے۔ اس کے خلاف یورپین لوگ قومیت متحدہ کے جو معنی مراد لیتے ہیں اور جو کانگریسی اشخاص انفرادی طور پر کانگریس کے فنڈامینٹل کے مفہوم کے خلاف معانی بیان کرتے ہوں ان سے یقیناً جمعیت علما بیزار اور تبرا کرنے والی ہے۔''

(خطبات صدارت-اشاعت گوجراں والہ (پاکستان) ۱۹۹۰ء: ص ۵۵-۲۵۴)

نیشن کے معنی:

آج کل اردو زبان میں قوم اور قومیت کے لفظ اصطلاحی طور پر نیشن اور نیشنلزم کے لیے بولا جاتا ہے اور اس لفظ ''قومیت'' کے معنی انسائیکلوپیڈیا آف ریجن اینڈ ایتھکس میں یہ ہیں کہ

''قومیت وہ وصف عام یا متعدد اوصاف کا ایسا مرکب جوایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو اور ان کو جوڑ کر ایک قوم بنادے........ ہر ایسی جماعت ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو نسل، مشترکہ روایات، مشترک مفاد، مشترک عادات ورسوم اور مشترک زبان کے رابطوں سے باہم مربوط ہوتے ہیں اور ان سب سے زیادہ اہم رابطہ ان کے درمیان یہ ہوتا ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور ان کے درمیان مختلف

حیثیتوں سے الفت و موانست ہوتی ہے غیر قوم کا آدمی ان کو غیر اور اجنبی محسوس کرتا ہے۔'' (سہ روزہ مدینہ۔ بجنور: ۲۸ر نومبر ۱۹۴۴ء)

ہندوستان ہمارا ہے!

مندرجۂ بالا عنوان سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کا ایک نادر مضمون ماہنامہ نئی زندگی۔ الہ آباد بابت ماہ مارچ ۱۹۴۶ء میں شایع ہوا ہے، ملاحظہ فرمایے:

''ہندوستان کی تمام بسنے والی قوموں میں صرف مسلمان ایسی اقوام قدیمہ میں سے ہیں جن کا مذہب اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور انسانی نشو ونما فقط حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا ہے۔ یہی قرآن کی تعلیم ہے۔ باقی اقوام ہندیہ اس کے قایل نہیں ہیں۔ اسلامی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان ہی میں اُتارے گئے اور یہاں ہی انھوں نے سکونت کی اور یہاں ہی سے اُن کی نسل دنیا میں پھیلی اور اسی وجہ سے انسانوں کو آدمی کہا جاتا ہے۔ چناں چہ ''سبحۃ المرجان فی تاریخ ہندوستان'' میں متعدد روایات اس کے متعلق مشہور ہیں۔ بائبل میں بھی اس کے حصہ ''عہد قدیم'' میں یہی ذکر کیا گیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۸۰ میں ہے:

وتنزل آدم بالهند و تنزل معه الحجر الاسود وقبضة من ورق الجنة فبثه بالهند فبث شجرة الطيب فانما اصل بالجاء به من الطيب من الهند من قبضة الورق اللتى هبط بها آدم وانما قبضها اسفى على الجنة حين اخرج منها وقال عمران ابن يمينة عن عطاء ابن السائب عن سعيد ابن جير عن ابن عباس قال هبط آدم بدحنا ارض الهند. الخ

''سبحۃ المرجان'' میں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا یہاں پھیل جانا اور کھیتی وغیرہ کرنا مذکور ہے۔ بنا بریں اسلامی روایات اور تعلیمات کے مطابق آبائی وطن عہد قدیم سے ہندوستان مسلمانوں ہی کا ہوگا۔ جو لوگ انسانی اور اُسی نسل کو ایسا نہیں مانتے۔ وہ اس دعوے

کے مستحق نہیں ہیں اور مسلمانوں کے لیے اس کو اپنا وطن قدیم سمجھنا ضروری ہے۔

حسب تعلیمات اسلامیہ اور تصریحات قرآنیہ جتنے پیغمبر اور اُن کے جانشین دنیا میں ہوتے ہیں سب کا مذہب اسلام ہی تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد بھی اسلام کے پیرو تھے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا. (سورۂ یونس:۱۹)

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ. (سورۂ بقرہ:۲۱۳)

اور اُس کے بعد جب تفرقے ہوئے تو جہاں جہاں بھی انسانی نسلیں تھیں وہاں پیغمبر اور اُن کے سچے جانشین بھیجے گئے۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ. (سورۂ رعد:۷)

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا. (سورۂ فاطر:۲۴)

اور سچے پیغمبر اور اُن کے سچے جانشین۔ سب کے سب دین اسلام ہی رکھتے تھے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا. (سورۂ شوریٰ:۱۳)

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ. (سورۂ آل عمران:۱۹)

وغیرہا آیات اور احادیث بہ کثرت اس مضمون پر دلالت کرتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہندوستان میں ہی قبل زمانہ خاتم النبیین حضرت محمد علیہ السلام انبیا آئے ہوں۔ چناں چہ اولیاء اللہ نے ہندوستان میں مختلف مقامات پر انبیا علیہ السلام کی قبریں بہ طور کشف والہام اور روحی ملاقات کے معلوم کی ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی اور مرزا مظہر جانِ جاناں رحمتہ اللہ علیہما اور دیگر بزرگوں کی تصانیف میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔ مگر جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے تحریف وغیرہ کر کے شرک اور کفر وغیرہ اختیار کرلیا اسی طرح ہندوؤں نے بھی اختیار کیا۔ چناں چہ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ اس کی تفصیل اپنے بعض مکتوبات میں پوری طرح فرماتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ قدیم زمانہ سے یہ ملک بھی مذہب اسلام کا گہوارہ رہا ہے۔ لہٰذا صحیح اور یقیناً صحیح ہے کہ بہ حیثیت مذہب ابتدا سے ہی یہ ملک اسلام کا وطن ہے۔

مسلمانوں کے سوا جو قومیں ہندوستان میں سکونت پذیر چلی آتی ہیں وہ عموماً اپنے

مردوں کو جلا ڈالتی ہیں اور اُن کی راکھ کو دریا میں بہادیتی ہیں۔ یا پارسی اپنے مردوں کو پرندوں کو کھلا دیتے ہیں۔ بہ خلاف مسلمانوں کے کہ وہ اپنے مردوں کو زمین میں دفن کرتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی سکونت جسمانی اس زمین میں زندگی میں بھی مثل دیگر اقوام رہی اور مرنے کے بعد بھی ان کی سکونت یہاں ہی رہی۔ اُن کی قبریں محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت میں انھیں قبروں سے اُن کے مردے اٹھیں گے اور جو اجزا جسم کے قبر میں مٹی ہو گئے تھے انھیں اجزا سے اُن کا جسم پھر بنایا جائے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کی سکونت جسمانی اس سرزمین میں قیامت تک کے لیے ہے۔ بہ خلاف دوسری جلائی جانے والی یا پرندوں کو کھلانے والی قوموں کے کہ ان کی سکونت جسمانی صرف دنیاوی زندگی تک کے لیے ہے اور بس۔ اسی وجہ سے اُن کے اسلاف کا کوئی نام و نشان کسی جگہ پایا نہیں جاتا اور مسلمانوں کے قبرستان، روضے، قبے، زیارت گاہیں وغیرہ ہر جگہ موجود ہیں اور مسلمان اُن کی حفاظت اور عظمت ضروری سمجھتے ہیں۔

غیر مسلموں کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روحیں تناسخ (آواگون) کے ذریعے سے جزا اور سزا بھگتی ہیں۔ اس لیے وہ کسی دوسرے جون (قالب) میں ڈال دی جاتی ہیں۔ خواہ وہ انسانی ہوں (اگر عمل اچھے تھے) خواہ وہ حیوانی یا نباتاتی یا حشرات الارض وغیرہ کا ہو (اگر عمل خراب تھے) پھر اگر انسان بنایا گیا تو کوئی خصوصیت نہیں کہ ہندوستان ہی میں پھر پیدا ہو۔ افریقہ، امریکا، یورپ، آسٹریلیا وغیرہ جہاں بھی پرماتما چاہے اُس کو اُس کے عمل کے مناسب بھیج دے۔ غرضے کہ مرنے کے ساتھ ہی اس کی روح کا تعلق جسم اور اس کے اجزا سے بھی بالکلیہ منقطع ہو جاتا ہے۔ نیز اُس کے گاؤں، شہر، دیس، قوم، جاتی وغیرہ سب سے منقطع ہو جاتا ہے۔ بہ خلاف مسلمانوں کے کہ وہ تناسخ کے قایل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک روح کا تعلق جسم انسانی کے ساتھ صرف ایک دفعہ ہوتا ہے۔ موت کے بعد وہ برزخ میں محفوظ کر دی جاتی ہے اور اپنے اعمال کی سزا اور جزا کا کچھ حصہ وہاں ہی حاصل کرتی رہتی ہے۔ اس کا نہایت ضعیف تعلق اپنے بدن اور اس کے اجزا اور اپنی قبر، وطن، برادری، اولاد وغیرہ سے رہتا ہے۔ یہ تعلق اگرچہ ایک درجے میں نہیں ہوتا، مگر تاہم کسی نہ کسی درجے میں تفاوت کے ساتھ باقی رہتا ہے اور اسی تعلق سے قیامت میں یہ روح اس قبر پر پہنچے گی اور

اس کے اجزاے سابقہ کا جسم بن جائے گا اور وہ اس میں حلول کر کے پھر زندگی جسمانی حاصل کرے گی۔ جس طرح ہم اگر دنیا میں اپنے گھر اور اہل وعیال کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں تو ہمارا تعلق اپنوں اور اپنے گھروں اور بستیوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ رہتا ہے۔ ایسا ہی یا اس سے زاید تعلق مرنے کے بعد روحوں کو بھی سب سے رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے قبروں کی زیارت کرنے اور اصحاب قبور کو سلام کرنے اور اُن کو دعا وایصال ثواب وغیرہ کرنے کا حکم ہوا۔ نیز حکم دیا کہ لوگ اپنے اسلاف اور عام مومنین کی قبروں کی زیارت کرتے ہوئے دنیا کی بے ثباتی پر عبرت کے آنسو بہائیں اور گزرے ہوئے لوگوں کے لیے دعائیں کریں۔

یہ چیز اُن مرگھٹوں میں کہاں ہیں کہاں نصیب ہوسکتی ہے جہاں کے باقی ماندہ راکھ کو بھی دریا میں بہائیں گے اور سمندروں کے نذر کر چکے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمتہ اللہ علیہ تفسیر عزیزی پارہ عم صفحہ ۵۰ پر فرماتے ہیں:

> ''نیز در سوختن بآتش تفریق اجزا بدن میت است کہ بسبب آں علاقہ روح از بدن انقطاع کلی می پذیرد و آثار ایں عالم بآں روح کم تر میرسد و کیفیات آن روح بایں عالم کم تر سرایت میکند و در دفن کردن چوں اجزائی بدن بہ تمامہ، یک جامی باشند علاقہ روح با بدن از راہ نظر و عنایت بحال می ماند و توجہ روح بزائرین مستانسین و مستفیدیں بہ سہولت میشود کہ بسبب تعین مکان بدن گو تا مکان روح ہم متعین است و آثار ایں عالم از صدقات و فاتحہ ہا و تلاوت قرآن مجید چوں درآں بقعہ کہ مدفن بدن اوست واقع شود بہ سہولت نافع میشود پس سوختن گویا روح را بے مکان کردن است و دفن کردن گویا مسکنے براے روح ساختن بنا بریں است کہ از اولیاء مدفونین و دیگر صلحاے مومنین انتفاع و استفادہ جاری ست وآں ہارا افادہ و اعانت نیز متصور بہ خلاف مردہ ہاے سوختہ کہ ایں چیزہا اصلا نسبت بآں ہا در اصل مذہب آں ہا نیز واقع نیست بالجملہ طریق قبر و دفن نعمت است عظیم در حق آدمی۔''

خلاصہ یہ کہ قبر روحوں اہل دنیا کے لیے ریڈیو اور آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کے

صندوق اور تار ہوائی لاسلکی اور ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے آفس کی طرح ہے، جس میں ایک درجے تعلق کا ہر دو طرف سے رہتا ہے اور اُس تعلق ہی کی وجہ سے افادہ اور استفادہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر چہ وہ تعلق دنیاوی تعلق سے بہت کم زور ہے اور ممکن ہے کہ بعض وجوہ سے قوی بھی ہو۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کو مرنے کے بعد بھی اُس ملک اور اس کی زمینوں کے ساتھ روحانی تعلق اس قدر قوی اور باقی رہتا ہے کہ دوسری قوموں اور مذاہب میں نہیں پایا جاتا اور وہ قومیں اپنی مذہبی حیثیت سے اُس کی قایل بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہی حق ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن اور سب سے زیادہ اپنا وطن سمجھیں۔

اسلامی تعلیم اور عقاید کی حیثیت سے ایک وقت آنے والا ہے جب کہ تمام انسان پھر زندہ کیے جائیں گے اور ان کے اجسام کے جو اجزا متفرق ہو کر مٹی وغیرہ میں مل گئے تھے، جمع کیے جائیں گے اور جسم بن کر اسی روح کو اس میں داخل کیا جائے گا اور اس جسم کے ساتھ وہ محشر میں اور جنت میں جائیں گے۔ اس لیے وطن جس میں وہ پرورش پاتے تھے، جیسے کہ دنیاوی زندگی میں نفع اٹھانے اور ہر قسم کی حاجتوں کا مرکز تھا مرنے کے بعد بھی ایک درجے تک نفع اُٹھانے اور احتیاج کا مرکز رہے گا اور اس کی مٹی سے جو کہ بعد از دفن قبرستان میں دوسری مٹی سے مل گئی تھی نفع اٹھائے گا۔ بہ خلاف دوسرے باشندگان ہند کے کہ وہ ایسا اعتقاد نہیں رکھتے ہیں۔ ان کے اعتقاد میں ان کی روحیں دوسری مٹی سے بنے ہوئے جسموں میں داخل ہو کر ان جسموں سے تعلق قایم کرتی ہیں اور ان کی پرورش میں سرگرم ہو کر پہلے اجزاے جسمانیہ سے بالکل بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہندوستان میں ہیں، کبھی چین میں، کبھی جاپان میں، کبھی انگلینڈ میں، کبھی فرانس میں، کبھی انسان میں، کبھی حیوان میں:

وفا داری مجو از بلبلانِ چشم
کہ ہر دم بر گلے بر دیگر سرایند

جس طرح آرین، ہسپین، یونانی، مصری، منگول وغیرہ قومیں ہندوستان میں آکر بسیں اور انھوں نے یہاں کھیتیاں کیں اور باغ لگائے مکان بنائے بود و باش اختیار کی۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی یہاں پہنچ کر یہ اعمال وطنیہ اختیار کیے۔ کسی کو ہزار برس، کسی کو نو سو، کسی کو آٹھ سو برس یا کم و بیش ہو گئے۔ پشت ہا پشت یہاں گزر گئیں۔ اس لیے دنیاوی زندگی

اور اس کے لوازم کی حیثیت سے مسلمان کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ بالخصوص دو اقوام جو کہ پہلے سے بھی ہندوستان کی باشندہ ہیں مذہب اسلام کی حقانیت دیکھ کر پہلے مذہب کو چھوڑ کر اسلام کی حلقہ بہ گوش ہوئی ہیں اور وہی عنصر آج مسلمانانِ ہند میں غالب ہے، لہٰذا کسی دوسری قوم کو یہ جایز نہیں ہے کہ وہ آج یہ دعویٰ کرے کہ ہندوستان مسلمانوں کا وطن نہیں ہے، صرف ہمارا وطن ہے۔ ہندوستان کی بہبود میں جس طرح دوسری قوموں کی بہبودی ہے اُسی طرح مسلمانانِ ہند کی بھی بہبودی ہے، لہٰذا یقیناً اس حیثیت سے بھی ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ وطن عزیز ہے اور پیارا ہے۔ نہ مسلمان اس کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جا سکتے ہیں نہ جائیں گے اور نہ کوئی دوسرا وطن ان کو اپنے آغوش میں لے سکتا ہے۔ نو کروڑ مسلمانوں کو یہاں ہی رہنا اور یہاں ہی اپنی نسل اور طریقے کو پھیلانا اور امن وامان کی زندگی چلانا ہے۔ رہا یہ امر کہ پھر مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں سے کیوں تعلقات رکھتے ہیں اور ان کی مصیبتوں پر بلبلا اٹھتے ہیں؟ تو یہ اس روحانی تعلق کی بنا پر ہے جو کہ اتحاد اور توافق مذہب کی بنا پر دوسری جگہ کے مسلمانوں سے ہوا ہے اور جس کی تعلیم بھی روحانی ترقی کرتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسی کہ دوسری قوموں کو جنوبی افریقہ، فیجی، ماریشش ایسٹ وغیرہ کے ان ہندوستانیوں سے ہوتا ہے جو کہ ان ملکوں میں بود و باش کیے ہوئے ہیں۔ اگر وہاں پر کسی قسم کے مظالم ان ہندوستانیوں پر ہوتے ہیں تو ہندوستان کی بسنے والی قوموں میں بے کلی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ امر مسلمانانِ ہند کو ہندوستانی وطنیت اور اس سے پیار و محبت سے بیگانہ نہیں بناتا۔

امور مذکورہ بالا کی بنا پر ممکن ہے کہ غیر مسلم ہندوستانی بہ آسانی ایک وطن سے منتقل ہو کر دوسرے وطن میں چلے جائیں، مگر مسلمانانِ ہندوستان کو یہاں سے منتقل ہونا از بس مشکل ہے۔ نہ وہ اپنی مساجد سے بیگانگی اختیار کر سکتی ہیں نہ اپنے مقابر سے، نہ اپنی زمینوں سے اور نہ اپنے گھر بار سے اور نہ انھیں اس قدر استطاعت ہے۔

دو قومی نظریہ:

دو قومی نظریے، اس کی حقیقت اس کے مہلکات اور مسٹر محمد علی جناح کے اس سے

اخلاص کے بارے میں چودھری خلیق الزماں خاں لکھتے ہیں:

''مسٹر جناح جداگانہ انتخاب کی ۱۹۳۵ء تک ہمیشہ مخالفت کرتے رہے، مگر ۱۹۴۰ء میں انھوں نے بھی مسلمانوں کو ایک علاحدہ نیشن کہنا شروع کیا۔ اس کا کوئی خاص فرق ہندوستانی سیاست میں اس وقت تک نہ پڑا جب تک انگریزی اقتدار قایم رہا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس سے غیر ممالک میں مسلم لیگ کا مطالبہ زاید صحیح بنیاد پر نظر آنے لگا، مگر اس کا اتنا مہلک اثر مسلم اقلیتوں پر تقسیم ہند کے بعد پڑا کہ اللہ کی پناہ! یعنی ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں پاکستانی تھے اور نہ ہندوستانی۔ مختلف مذہبی اقلیتیں تو ایک ملک میں رہ سکتی ہیں مگر مختلف نیشنل اقلیتیں بہ حیثیت شہری کے ملک میں نہیں رہ سکتی تھیں اور تمام صوبوں کے مسلمان فوراً تقسیم کے بعد اس کس مپرسی میں مبتلا ہو گئے تھے، جب مسٹر جناح نے پاکستان کو دس کروڑ مسلمانوں کا ہوم لینڈ یا وطن کہا تھا تو انھیں مسلمانوں کے ہندوستان سے انخلا کا سامان بھی مہیا کر لینا تھا۔ چہ جائے کہ تقریباً نصف مسلم آبادی کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا۔

یہ دو نیشن نظریہ (قوم نہیں بلکہ نیشن اپنے تمام وسیع معنوں میں) تقسیم ہند کے بعد ان چار کروڑ مسلمانوں کے لیے جو ہندوستان میں رہ گئے ہیں بڑا ہولناک ثابت ہوا۔ کیوں کہ ۱۴ر اور ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو وہ نہ پاکستانی نیشن رہ گئے اور نہ ہندوستانی! جس کی وجہ سے ان پر بدترین مصایب نازل ہوئے۔ یکم اگست ۱۹۴۷ء کو مسٹر جناح نے ہندوستان کے اقلیتی نمایندوں سے رخصت ہونے کے لیے ان کو بلوایا۔ اس موقعے پر سید رضوان اللہ سکریٹری یوپی مسلم لیگ اور ممبر کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی نے اقلیتی مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق جناح صاحب سے کچھ بہت ٹیڑھے سوالات کیے، جن سے وہ بہت پریشان نظر آئے۔ اس سے پہلے انھیں اس قدر پریشان میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گفتگو کی یہ نوعیت دیکھ کر میں نے اسے ختم کرانا ہی مناسب سمجھا اور رضوان اللہ سے کہا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اب اس کا اعادہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم سب ان سے رخصت ہو کر چلے آئے۔ اس گفتگو کا اثر مسٹر جناح پر اتنا گہرا اور عمیق پڑا کہ ۱۱ راگست ۱۹۴۷ کو بہ حیثیت ہونے والے گورنر جنرل پاکستان اور پاکستان کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے پریسیڈنٹ کے انھوں

نے اولین موقعے پر دو قومی نظریے کو اپنی ایک تقریر کے ذریعہ بالکل ختم کر دیا۔ ان کی تقریر یہ تھی:

''اب اگر ہم پاکستان اسٹیٹ کو فراغت اور خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو کلیتاً عوام کی خصوصاً غربا کی خدمت میں لگ جانا چاہیے۔ اگر ہم سب گزشتہ واقعات کو بھلا کر اور اختلاف کو ختم کر کے متحدہ طور سے کام میں مشغول ہو جائیں تو ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ اگر ہم اپنا ماضی بدل ڈالیں اور سب مل کر یک جہتی سے کام شروع کر دیں۔ خود تم کسی قوم کے ہو، خواہ تمہارے آپس کے تعلقات پہلے کچھ ہی رہے ہوں، خواہ تمہارا رنگ، ذات اور دین کچھ ہی رہا ہو، مگر وہ اب ہر صورت سے پاکستان کا شہری ہے۔ جس کے تمام وہی حقوق اور وہی ذمے داریاں ہیں جو کسی اور کی ہیں۔ اس سے زاید اور اس پر زور نہیں دے سکتا۔ ہم کو اسی جذبے سے کام کرنا ہے اور تھوڑے عرصے میں اکثریت اور اقلیت اور ہندو قوم اور مسلم قوم کے قصے ختم ہو جائیں گے۔ کیوں کہ خود مسلمانوں میں پٹھان، پنجابی اور شیعہ سنی وغیرہ ہیں اور اسی طرح ہندوؤں میں برہمن، ویش، کھتری اور بنگالی اور مدراسی وغیرہ یہ سب دور ہو جائیں گے۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی میں یہی مختلف حالات حارج رہے ورنہ ہم بہت پہلے آزاد ہو گئے ہوتے۔ آپ کسی مذہب، ذات یا عقیدے کے ہوں اس کو اسٹیٹ کے کام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

یہ واضح اور روشن تبدیلی ہمارے سیاسی مسلک میں ایسے وقت آئی جب لاکھوں مسلم جانیں جا چکی تھیں اور لاکھوں کی نوبت آ رہی تھی اور اس سے زاید یہ کہ لاکھوں خاندان اور افراد اپنے آبائی وطن اور ماحول کو خیر باد کر کے پاکستان کی طرف چل پڑے تھے۔

(شاہراہ پاکستان از چودھری خلیق الزماں: ص ۹۴۴-۹۴۲)

دو قومی نظریہ اور مسٹر جناح:

کیا جناح کو واقعی دو قومی نظریے پر یقین تھا جو انھوں نے مسلمانوں کے لیے الگ

ریاست کی مانگ پر اتنا زور دیا؟ کیا انھیں فرقہ واریت سے کوئی ہمدردی تھی؟ کیا انھوں نے پاکستان صرف مسلمانوں کے لیے بنوایا تھا؟ کیا وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو الگ الگ دو خانوں میں بانٹ کر رکھنا چاہتے تھے؟ ہم ذرا ان سوالوں پر بھی غور کرلیں۔ ۷/اگست ۱۹۴۷ء کو انھوں نے دلّی چھوڑ دیا کہ پھر اسے کبھی نہیں دیکھا۔ انھوں نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کے سامنے اپنی پہلی تقریر ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کو کی۔ اس میں انھوں نے حسب ذیل اعلان کیا:

''پاکستان کی اس ریاست میں آپ آزاد ہیں۔ آپ آزاد ہیں اپنے مندروں میں جانے کے لیے، آپ آزاد ہیں اپنی مسجدوں یا کسی دوسری عبادت گاہ میں جانے کو! آپ خواہ جس مذہب یا ذات یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں اس کا اس بنیادی اصول سے کوئی تعلق نہیں کہ ہم سب کے سب ایک ہی ریاست کے شہری ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہم لوگوں کو اپنے سامنے اپنا آدرش رکھنا چاہیے اور آپ دیکھیں گے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ہندو، ہندو اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی معنی میں نہیں کیوں کہ یہ تو ہر شخص کے ذاتی اعتقاد کا معاملہ ہے، بلکہ سیاسی معنی میں ریاست کے ایک شہری ہونے کی حیثیت سے!'' (لائف آف جناح از ہیکٹر بلا یتھو: ص ۱۹۷)

مندرجۂ بالا اعلان جناح کی سیاست کی باطنی روح کو دکھاتا ہے۔ یہاں پرانے جناح، ہندو مسلم اتحاد کے بغیر موجود ہیں۔ وہ سارے ہندو فرقے سے نہیں لڑ رہے تھے۔ وہ تو گاندھی اور کانگریس سے لڑ رہے تھے، جس پر گاندھی جی کا تسلط ہو گیا تھا۔ انھیں پورے خلوص کے ساتھ یہ یقین ہو گیا تھا کہ گاندھی جی کانگریس کو غلط راستے پر لے جا رہے ہیں، جو افراتفری تک پہنچائے گا۔ انھوں نے اپنے کو ایسے غیر موافق حالات میں پایا جہاں نہ صرف جاہل ہندو عوام نے بلکہ ہندو دانش وروں نے بھی اپنی سمجھ بوجھ کو گاندھی واد کی قربان گاہ پر دھونی رمانے کے لیے بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ ان حالات میں ایک فرقہ واریت کو چھوڑ کر لڑنے کے لیے کوئی دوسری قوت انھیں میسر نہیں تھی، جیسے ہی وہ ایک ایسی ریاست قایم کرنے کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے جہاں گاندھی اور گاندھی کی

کانگریس کا حکم نہ چل سکے، انھوں نے فرقہ واریت کا اپنا ہر روپ ختم کر دیا جسے وقتی طور پر انھوں نے اختیار کر رکھا تھا۔

اب سبھی حلقوں میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان کا بٹوارا سبھی متعلقہ لوگوں کے لیے سراسر برائی کا باعث ثابت ہوا۔ صرف یہی نہیں کہ اس سے ہندو مسلم مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلا بلکہ اُلٹے اس نے سیکڑوں نا قابل حال مسایل پیدا کر دیے۔ ہر سمجھ دار آدمی دو قومی نظریے کو اسی طرح رد کر دے گا جس طرح خود جناح نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے سامنے اپنی پہلی تقریر میں رد کر دیا۔ دو قومی نظریہ کا جواز کہاں ہے؟ جب کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کی مسلم آبادی کا نوے فیصد ہندو نسل سے ہے، جن کی آبا و اجداد نے تبدیل مذہب کیا تھا۔ جناح خود گجراتی ہندو نسل کے ہیں۔ علم الانسان کی رو سے مسلمان کی بہت بڑی اکثریت ایسی ہے کہ اس میں اور ہندوؤں سے کوئی بھی فرق نہیں ہے۔ علاقائی لحاظ سے دونوں کی مادری زبان ایک ہی ہے۔ ہم لوگوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ پانچ یا چھ کروڑ مسلمان ابھی بھی ہندوستان میں باقی بچے ہوئے ہیں۔ تقسیم سے انھیں کیا فایدہ پہنچا؟ عام لوگ تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ انھیں سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا، مگر یہی نہیں جنھیں تقسیم سے سب سے زیادہ نقصان پہنچا، یہ لوگ تقسیم کی منسوخی کا دل سے خیر مقدم کریں گے۔

اسکے ماسوا اس برصغیر کی حفاظت کے خیال سے بھی پھر مل جانے (Confederate) کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے لارڈ ویول کا طریقۂ عمل خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے بٹوارے کے سوال کو دفاعی نقطۂ نظر سے ایک سپاہی کی طرح دیکھا تھا اور یہ نتیجہ نکالا تھا کہ دو قومی نظریے پر مبنی یہ تقسیم اپنے تمام ذیلی اور لازمی نتایج کے ساتھ ہندوستان کے دفاع کو خطرناکی کے ساتھ کم زور کر دے گی اور شمال و مغرب کی طرف سے حملے کا دروازہ کھول دے گی۔ سوال کے اس پہلو کو دھیان میں رکھتے ہوئے انھوں نے مرکزی اسمبلی کے ممبران کو حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا تھا:

> ''آپ جغرافیہ کو نہیں بدل سکتے، دفاعی نقطۂ نظر سے بیرونی دنیا سے تعلقات کی بنا پر اور بہت طرح کے اندرونی اور بیرونی مسایل کے لحاظ سے ہندوستان ایک فطری اکائی ہے۔ تواریخ ایسی بہت سی مثالیں پیش کرتی ہے کہ مختلف تہذیبوں

یا مذہبوں کی حامل ہوتے ہوئے بھی دو فرقوں اور حتیٰ کہ دو قوموں نے بھی ایک ساتھ رہنے کا انتظام کرلیا ہے۔''

ہم عصر تواریخ نے اس شان دار سپاہی وایسرائے کے ساتھ مناسب برتاؤ نہیں کیا، جس نے ہندوستان، اس کے عوام اور اس کی عظیم الشان فوج کو دو حصوں میں بانٹنے کی جواب دہی لینے پر اپنے معزز عہدے سے ڈسمس کیے جانے کو ترجیح دی۔ کسی نے بھی نہ گاندھی نے نہ جناح نے اور نہ کسی دوسرے سیاست داں نے تقسیم کی خرابیوں کو اتنا صاف ڈھنگ سے دیکھا جتنا صاف صاف ویول نے لکھا تھا۔

پچھلے انیس برسوں میں اور خاص کر حال کے مہینوں میں ملک کے اندر اور باہر جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ زوردار طریقے پر یہ مانگ کر رہے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے ہندو اور مسلمان پھر سے مل جائیں۔ مشترک دماغ کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کا کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) بن سکتا ہے، لیکن سبھی اکائیوں کو پوری خود مختاری ہو۔ ہندوستان اور پاکستان کی باہمی رضامندی سے اس میں شریک اکائیوں کی از سر نو تنظیم ہو سکتی ہے، لیکن اس معاملے میں کسی طرح کی باہری مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ ہم لوگ آگ کے دریا سے گزرے ہیں اور اس عذاب نے ہمیں ٹھیک کر دیا ہے۔ ہندوستان بہت سے اقلیتی فرقوں کا ملک ہے اور یہ پورے انکسار کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ نامناسب سلوک نہیں کیا ہے۔ اوپری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پھر سے اتحاد (Reunion) کا کام بہت مشکل ہے۔ پھر بھی یہ ناممکن نہیں ہے کیوں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے عوام اور عام لوگوں میں نیک خواہشات کی فراوانی ہے۔ ہم لوگوں کو سب سے پہلے عوام اور عام لوگوں کے مفاد پر اپنا دھیان دینا چاہیے۔ اب اپنی سیاست کا پھر سے جائزہ لینے کا وقت آ گیا ہے۔ خود احتسابی کے بغیر نیا تجزیہ ممکن نہیں۔

پھر سے اتحاد (Reunion) کی راہ پُر پیچ، تاریک اور دشوار گذار ہو سکتی ہے، لیکن ہمیں رکاوٹوں سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے اور نہ ارض موعود کی تلاش سے ہی ہمت کھونا چاہیے۔ اگر ہندوستان اور پاکستان مل جائیں اور اگر فرقہ پرستی سے احتراز کیا جائے تو ہندوستان اور پاکستان کی ''دولت مشترکہ'' دنیا کی مضبوط ترین طاقتوں میں سے ایک ہوگی

اور اس قابل ہوگی کہ دنیا کی قسمت کو بدل سکے۔

(جناح اور گاندھی: ایس کے مجمدار/ مترجم: تقی رحیم، خدا بخش لائبریری جرنل، نمبر ۱۰۱: ص ۹۰-۲۸۸)

دوقومی نظریہ- جناح صاحب کا پچھتاوا:

سری پرکاش نے لکھا ہے کہ مسٹر محمد علی جناح کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، جو ایک دوسرے کی پڑوسی ہیں اور آمنے سامنے مدمقابل ہیں، لیکن جب پاکستان قایم ہوگیا اور مسٹر جناح اس کے پہلے گورنر جنرل منتخب ہوئے تو ایسا اندازہ ہوا کہ وہ ایک حد تک پچھتائے سے تھے۔ کراچی بار ایسوی ایشن میں انھوں نے تقریر کی، میں وہاں موجود تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ملک کا بٹوارا ہو چکا ہے۔ اب یہاں کے غیر مسلم باشندوں کو بلا امتیاز مذہب وملت اپنے کو پاکستانی سمجھنا چاہیے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ انھوں نے اپنی سابق رائے اور اس خیال میں کیسے مطابقت کی؟ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندوستان میں جو مسلمان ہیں وہ اپنے کو ہندوستانی سمجھیں اور پاکستان کے معاملات سے بالکل سروکار نہ رکھیں۔

مجھ کو بہ حیثیت ہائی کمشنر بہت سے مسلم احباب، جن سے میں ہندوستان میں واقف تھا یا وہ جن سے پاکستان میں دوستانہ روابط ہو گئے تھے، متعدد چھوٹے بڑے جلسوں میں مدعو کیا کرتے تھے۔ خوش بیان مقررین حاضرین جلسہ سے پوچھتے کہ ''تم انڈین ضابطۂ فوج داری کے مطابق حکومت چاہتے ہو یا قرآن کے مطابق؟'' فطرتاً ہر شخص جواب دیتا تھا ''قرآن کے مطابق''۔ یہ جواب سن کر مقرر کہتا تھا ''تب تو تمہاری عورتوں کو پردے میں رہنا ضروری ہے اور چور کی سزا یہ ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔'' گویا ان کے نزدیک یہ دونوں باتیں اسلامی فرایض ہیں۔ جن مسلم خواتین سے مجھے مختلف پارٹیوں میں ملنے کا اتفاق ہوتا تھا ان سے میں یہ پوچھا کرتا تھا کہ کیا آپ لوگ پردہ نشینی کو ترجیح دیتی ہیں؟ ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ اب ہم پردے سے باہر آگئے ہیں اور پھر پردے میں واپس جانا منظور نہیں۔ بہت سے لوگوں کی رائے تھی کہ ہاتھ کاٹا جانا بہت سخت سزا ہے۔ موجودہ قانون چور کو سزا دینے کے لیے کافی ہے۔

مجھے یہ صاف نظر آتا تھا کہ جب انگریزوں کی مدد سے مسٹر جناح نے دنیا کے نقشے پر ایک نئی آزاد ریاست (خواہ ملک) کا نام لکھوا دیا اور اس میں ذرا شک نہیں کہ ایک فرد کا یہ کارنامہ عدیم النظیر ہے، تو ان کا خیال تھا کہ چوں کہ پاکستان میں مسلمانوں کی آبادی کسی ایک مسلم سلطنت سے زیادہ ہے، اس لیے دوسرے مسلم ممالک پاکستان کی پیشوائی تسلیم کر کے مسٹر جناح کو مسلم سلطنتوں کا لیڈر مان لیں گے۔ میرے ہم عصر نمایندگان افغانستان، ایران اور سعودی عرب نے تبادلۂ خیالات کے دوران مجھ سے صاف صاف کھلے الفاظ میں کہا کہ سب سے مقدم چیز جس سے ہماری وفاداری ہے وہ ہمارا وطن ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اس خیال کے ہم نوا تھے کہ مذہب کو ملک کے مقابلے میں ترجیح دی جائے۔

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کبھی خوش گوار نہیں رہے۔ اگرچہ قیام پاکستان کا خیال جس شخص کے دماغ میں پیدا ہوا اس نے افغانستان کو بھی پاکستان میں شامل کر لینا چاہا تھا۔ اور حرف ''الف'' سے افغانستان مراد ہے۔

مسٹر جناح کو اس پر تعجب ہوا بلکہ وہ دل شکستہ اور مایوس ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء سے پاکستان میں جو واقعات یکے بعد دیگرے تیزی کے ساتھ رونما ہوئے ان سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ جن اغراض کو مدنظر رکھ کر قیام پاکستان کی تحریک ہوئی ان میں سے ایک بھی شرمندۂ تکمیل نہ ہوئی۔ ممکن ہے کہ میری رائے غلط ہو، لیکن مجھے صدمہ ضرور ہے۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں مسٹر جناح کا انتقال ہو گیا اور ہندوستان کے نظام حکومت کا دستور العمل وہ نہ دیکھ سکے۔ ان کے مقلدین بالخصوص اخبار ''ڈان'' اور اس کے ایڈیٹر مسٹر الطاف حسین اچھی طرح جانتے تھے کہ مسٹر جناح کو یہ بالکل گوارا نہ تھا کہ تقسیم شدہ ہندوستان کو ''انڈیا'' کے نام سے یاد کیا جائے اور یہ کہ مسٹر جناح کی رائے تھے کہ اس کو ہندوستان کہا جائے۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ ہم نے ابتدا ہی سے ان کی رائے نہیں مانی تو وہ غصہ ہوتے تھے۔

(پاکستان- قیام اور ابتدائی حالات: ص ۵۰ و ۵۲، ۵۳)

(۷)

قومی زبان

۱۴ر مارچ ۱۹۲۶ء: جمعیت علماے ہند کا ساتواں سالانہ اجلاس علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صدارت میں کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو ملک کی قومی زبان کی حیثیت سے قبول کرلیا جائے۔ قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:

''جمعیت علماے ہند کا یہ اجلاس ہندوستان کی تمام اقوام کو توجہ دلاتا ہے کہ وہ اردو زبان اور اردو رسم الخط کو ہندوستان کی متفقہ قومی زبان اور متفقہ قومی رسم الخط قرار دینے کی پوری سعی کریں۔ کیوں کہ اس زبان اور رسم الخط کو اپنی سہولت اور وسعت کے لحاظ سے اس کا استحقاق ہے اور ہندو مسلمان، سکھ عیسائی، اور ہندوستانی قومیت کے دوسرے طبقات اس سے یک ساں فایدہ اٹھا سکتے ہیں اور یہی وہ زبان اور رسم الخط ہے جس کو کسی مخصوص طبقہ کے ساتھ خصوصیت نہ ہونے کی وجہ سے ہندستانی زبان اور ہندستانی رسم الخط قرار دیا جاسکتا ہے۔''

''مسئلۂ زبان'' کے سلسلے میں عبدالحق، راجندر پرشاد معاہدے کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ یہ ایک تاریخی معاہدہ تھا، جس سے انحراف نے برصغیر کی پوری سیاسی اور سماجی کو سخت متاثر کیا تھا۔ ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں۔ معاہدہ یہ ہے:

''بہار کی اردو کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ر اگست ۱۹۳۷ء میں ہمیں ہندستانی زبان کے مسئلے پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ہمیں فکر تھی کہ اردو، ہندی اور ہندستانی کے مناقشے میں ہو، غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں ہیں، انھیں دور کیا جائے۔ اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں جن مباحث پر گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ فن میں بڑی حد تک متفق الراے ہیں۔ چناں چہ ہم کو

اس پہ اتفاق ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہندستانی ہونی چاہیے اور یہ اردو رسم الخط اور دیوناگری دونوں میں تحریر اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لیے سرکاری زبان تسلیم کی جانی چاہیے۔ ہندستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول اور انتخاب کا معیار یہی عام استعمال یا رواج ہونا چاہیے۔ مزید براں ہماری رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو بہ حیثیت ادبی زبانوں کے ترقی کرنے کے پورے مواقع دیے جانے چاہئیں۔ ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی اہل علم کے اشتراک عمل سے ہندستانی الفاظ کی ایک اساسی لغت تالیف کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لغت کی تدوین اور اس قسم کے حل طلب مسایل کے واسطے جیسے اصطلاحی الفاظ کا انتخاب ہے، ایک مختصر نمایندہ کمیٹی کا انعقاد کسی قریبی تاریخ میں ہونا چاہیے جس میں اردو اور ہندی کے ایسے ذی اثر حامی شامل ہوں جو ان دونوں زبانوں کو قریب تر لانے کی ضرورت مانتے ہیں اور ہندستانی زبان کو ترقی دینے کے قائل ہیں، تاکہ اس طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں حسن ظن پیدا کیا جائے۔

شرح دستخط
مولوی عبدالحق
(بابو) راجندر پرشاد

مسئلہ زبان:

۱۹۳۷ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور بابو راجندر پرشاد میں دوسرے معنوں میں گویا کانگریس اور انجمن ترقی اردو میں ایک معاہدہ طے پا گیا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان، ہندستانی ہوگی، جو کہ پورے ملک میں عام طور سمجھی جاتی ہے اور شمالی ہند میں بولی جاتی ہے۔ یہ زبان عربی اور فارسی اور سنسکرت کے الفاظ سے خالی ہوگی اور فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی اور سرکار دربار میں یکساں طور پر اسی کا چلن ہوگا، لیکن لیگی ذہنیت سے متاثر ایک عالم دین کے ایک فتوے نے کہ اردو زبان مسلمانوں کی شرعی زبان ہے اور اس کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے، اس معاہدے کو کھٹائی میں ڈال دیا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ مولوی عبدالحق لیگ کے زیر اثر آ گئے اور اس طرح ایک لسانی سماجی مسئلہ سیاسی

اور فرقہ وارانہ مسئلہ بن گیا اور اس کا آخری اور دور رس نتیجہ نہ نکلا کہ ہندوستان میں قومی زبان ہندی کو بنا دیا گیا اور پاکستان میں اردو اور بنگلہ کو مساوی الحیثیت دو قومی زبانیں بن گئیں۔ مولوی عبدالحق نے خود اعتراف کیا ہے:

''اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے، روشن نہیں۔'' (قومی زبان-کراچی: یکم و ١٦/ مارچ ١٩٥١ء)

پاکستان میں صوبوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی صوبائی زبانوں کو اپنی سرکاری زبان بنا لیں۔ صوبۂ سندھ نے اپنا یہ قانونی اور دستوری حق استعمال بھی کر لیا۔ دستور میں اردو کا قومی زبان کی حیثیت سے ذکر ہے، لیکن اب تمام صوبائی زبانیں پاکستان کی قومی زبانیں ہیں۔ انگریزی سرکاری زبان ہے۔ سرکار دربار میں اسی کا راج ہے۔ اردو اپنی سخت جانی کی بنا پر زندہ ہے۔ پاکستان میں عام بول چال کی زبانیں مقامی اور صوبائی ہیں اور رابطے کی زبان اردو ہے۔ پاکستان کے بڑے شہروں میں جلسوں جلوسوں کی زبان بھی عام طور پر اردو ہی ہے۔ مسلم لیگ کی غلط اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے پھیلائے ہوئے زہر ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ پاکستان میں اردو آفیشل لینگ وتج بھی نہ بن سکی۔

''ہندستانی'' جسے ہندوستان کی قومی زبان بنایا جانا تھا، کیا تھی؟ اس کی وضاحت اور نمونے کی زبان کے لیے گاندھی جی، راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین موجود ہیں، میں ہندستانی زبان کے نمونے کے طور پر گاندھی جی کی ایک تحریر جو انھوں نے مولانا آزاد کے ایک مضمون پر بہ طور تعارف لکھی تھی، پیش کرتا ہوں۔ گاندھی جی کی ہندستانی تحریر کا نمونہ یہ ہے:

''اوپر کا مضمون میری تعریف کے لیے نہیں ہے۔ جو آدمی اپنا دھرم سمجھ کر کچھ سیوا کرتا ہے، اس میں تعریف کیا؟ مولانا صاحب عالم فاضل ہیں فارسی اور عربی میں لیاقت رکھتے ہیں، اس لیے اردو خوب جانتے ہیں، لیکن وہ جانتے ہیں کہ نہ تو عربی فارسی ملی ہوئی اردو ہندوستان کی عام زبان ہو سکتی ہے اور نہ سنسکرت ملی ہوئی ہندی ہی۔ اس لیے وہ اردو اور ہندی کا میل چاہتے ہیں اور دونوں کو ملا کر بولتے ہیں۔ میں نے ان سے پرارتھنا کی ہے کہ ہر ہفتے ایک چھوٹا سا ہندستانی

مضمون دیتے رہیں، جس سے ہندستانی کا ایک نمونہ ہریجن سیوک پڑھنے والوں کو ملتا رہے۔ اس کوشش کا پہلا نمونہ اوپر کا مضمون ہے۔

م ک گاندھی'

(ہریجن سیوک، ۲۶ رمئی ۱۹۴۵ء)

مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ ہندستانی زبان کا سب سے اچھا نمونہ کون سا ہے تو میں کہوں گا کہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ترجمۂ قرآن ''موضح القرآن'' جسے انھوں نے خود ہندی زبان قرار دیا ہے۔

بابو راجندر پرشاد جو اردو اور ہندی والے معاہدے میں کانگریس کی طرف سے ہندی کے نمایندے تھے، ذیل میں ان کا ایک مضمون جو ہندستانی زبان کی وضاحت اور نمونے کے طور پر شایع کیا گیا تھا، درج کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہندستانی اس بولی کو کہتے ہیں جس کو اُتر ہندوستان کے سب ہی رہنے والے چاہے وہ ہندو ہیں یا مسلمان سمجھتے ہیں۔ ناگری اور فارسی دونوں اکچھروں میں لکھی جاتی ہے۔ کانگریس نے اسی کو سارے ہندوستان کے لیے قومی زبان یا راشٹر بھاشا مان لیا ہے اور جہاں کے لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے ہیں، وہاں اس کو پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس لیے اس کی عزت اور بھی بڑھ گئی ہے اور اس کی شکل کیا ہونی چاہیے؟ اس پر بھی بہت چرچا ہونے لگا ہے۔ ہندستانی کے دو روپ کہے جاسکتے ہیں۔ ایک جس کا نام ہندی ہے، اس میں ہندی کے شبد بہت آتے ہیں۔ دوسرا اردو جس میں اسی طرح فارسی اور عربی کے لفظ بہت آتے ہیں۔ دیاکرن ایک ہونے پر بھی دونوں کے لکھنے میں فرق پڑ گیا اور وہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جو سنسکرت کے شبد آتے ہیں ان کا کہیں کہیں ہندی کے دیاکرن کے مطابق دیوہار نہیں کرکے سنسکرت دیاکرن کے بھی مطابق دیوہار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح فارسی اور عربی کے لفظوں کو عربی اور فارسی کا جامہ کہیں کہیں پہنایا جاتا ہے۔ کچھ کٹر لکھنے والے یا بولنے والے اگر وہ ہندی کے پریمی ہیں تو فارسی اور عربی کے لفظوں کو اور اگر وہ اردو کے حامی ہیں تو سنسکرت کے شبدوں کو چن چن کر اپنے لیکھوں سے نکال دیتے ہیں اور سنسکرت، فارسی یا عربی کے لفظوں کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندی اور اردو ایک

دوسرے سے الگ بھاگتی جارہی ہیں۔ ہندستانی بیچ کا راستہ لیتی ہے۔ وہ نہ تو سنسکرت کے شبدوں کا وہشکار کرتی ہے اور نہ فارسی عربی کے لفظوں کو خارج کرتی ہے۔ اس کا اپنا دیا کرن ہے، جس کو وہ ہمیشہ کام میں لاتی ہے اور سنسکرت یا فارسی عربی کے قاعدے سے کام نہیں لیتے ہیں۔ اگر ان کے کسی شبد کو لیتی ہے تو اس کو اپنا جامہ پہناتی ہے اور اپنے میں ملا لیتی ہے۔

انگریزی جملے کا ہندی یا اردو ترجمہ دو اخباروں سے دے کر میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان میں اور ہندستانی میں کیا فرق ہے اور کون سب کے لیے سہل ہو سکتی ہے؟

> "The priliminary step to be taken in connection with the preparation of electoral rolls for the Federal Legislative were indicated by Sir Nripendra Nath Sirkar, the Law Member in the Central Assembly to day."

> ''فیڈرل لے جس لے چر (Legislature) کے لیے فہرست رائے دہندگان تیار کرنے کے سلسلے میں جو ابتدائی کارروائی کی جائے گی اس کے بارے میں سر، ان، سرکار لا ممبر نے آج اسمبلی میں روشنی ڈالی۔''

اس میں ''فہرست رائے دہندگان'' ہندستانی قاعدہ نہیں بلکہ فارسی قاعدے کی اضافت کا نمونہ ہے۔ پھر ''رائے دہندگان'' بھی فارسی قاعدے کے مطابق ہے۔ ''رائے دہندہ'' کا جمع یا بہو وچن بنایا گیا ہے، ہندستانی قاعدے کے مطابق نہیں۔ میری سمجھ میں اس کی صحیح ہندستانی شکل یہ ہونی چاہیے:

''فیڈرل لے جس لے چر (Legislature) کے لیے رائے دینے والوں کی فہرست تیار کرنے میں جو شروع میں کارروائی کی جائے گی اس کو لا ممبر سر، ان، سرکار نے آج اسمبلی میں کچھ بتلایا۔''

> Replying to a question in the United Provinces Legislative Assembly to day, Dr.

Katju. Minister for Justice, gave a list of grants in aid which the Government had sanctioned for the purpose of improvements in new fields of manufacture,

''سنپوکت پرانتیہ ویوستھاپکا پریشد نے ایک پرشن کا اُتر دیتے ہوئے نیاے منتری ڈاکٹر کٹجو نے اُن اڈیوگ دھندوں کی سوچی دی جن کی اُنتی کے لیے سرکار نے سہایتا دینا سویکار کیا ہے۔''

اس میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں ویاکرن تو ہندستانی ہی کا استعمال ہوا ہے، مگر جو شبد آئے ہیں وہ سنسکرت کے ہیں اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ جیسے فارسی عربی کے لفظ جان بوجھ کر نکالے گئے ہیں۔ ''پرشن'' اور ''اُتر'' ''سوچی'' اور ''سہایتا'' سنسکرت کے شبد ہیں۔ فارسی اور عربی سے لیے گئے سوال جواب، فہرست اور مدد کچھ کم چالو نہیں ہیں۔ اُدیوگ دھندوں کے بدلے میں صرف دھندا کافی ہوسکتا ہے۔ ہندستانی میں کسی شبد کا وہشکار نہیں ہے، چاہے وہ کسی بھی بھاشا کا ہو لے لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جیسا اوپر دکھلایا گیا ہے انگریزی کے لفظ لیے گئے ہیں۔ پہلی مثال میں فیڈرل لے جس لے چر (Legislature) جوں کا توں رکھا گیا ہے، دوسری میں لے جس لیٹو (Legislative) اسمبلی کا ''انتھا ویواستھاپکا پرشد'' (سنسکرت) سے لیا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس جھگڑے کا نپٹارا ایک طرح سے ہوسکتا ہے کہ جتنے عربی فارسی کے لفظوں کو ہندی کے اچھے لکھنے والوں نے استعمال کیا ہے اور جتنے سنسکرت کے شبدوں کو اچھے اردو لکھنے والوں نے ویوہار کیا ہے ان کو ہندستانی میں لے لینا چاہیے اور ان کے علاوہ بھی نئے لفظوں کا وہشکار اس لیے ہی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کسی خاص زبان سے لیے گئے ہیں بلکہ اس میں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کہاں تک جلد لوگوں میں چل گئے ہیں یا چل جائیں گے۔ اگر وہ آسانی سے لوگوں کی سمجھ میں آجاتے ہیں تو ان کو نکالنا ہندستانی کو کمزور بنانا ہوگا۔ آج کل بہت سے نئے لفظ گھڑنے ہوں گے کیوں کہ نئے وچار پھیل رہے ہیں۔ نئے معنے سامنے آرہے ہیں، جن کے لیے ہندی اور اردو میں بھی لفظ نہیں ہیں، ان کے لیے لفظ

سنسکرت یا عربی فارسی سے ہی بنائے جاسکتے ہیں۔اس میں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ آسانی سے بولے اور سمجھے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ ہوسکتا ہے کہیں کہیں انگریزی کے شبد ہم کو رکھ لینا پڑے اس سے ہماری ہندستانی کم زور نہیں ہوگی مگر ہم کو اپنے دیا کرن کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ''سٹیشن'' شبد لینا ہی ہے تو اس کا بہو وچن ''سٹیشنز'' نہیں کرنا چاہیے بلکہ ''سٹیشنوں'' یا ''سٹیشنیں'' ہی ہونا چاہیے۔''رائے دہندگان'' سے ''رائے دینے والے کہیں اچھا ہے اور رائے دہندگان تو کسی حالت میں نہیں ماننا چاہیے اگر رائے دہندہ لیا بھی جائے تو اس کا بہووچن (جمع) رائے دہندوں سے ہونا چاہیے۔

اس لیے میری رائے میں اپنے دیاکرن کو اچھوتا اور شدھ کرنا چاہیے۔لفظوں کو کسی بھی بھاشا سے وہ کیوں نہ آئے ہوں اگر چل گئے ہوں اور چل جانے کے لایق ہوں، آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہوں تو لینے میں جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ایسا کرنے سے ہی ایک معنی والے کئی لفظ ہندستانی میں آویں گے اور جب لفظوں کا خزانہ بڑھے گا تو ان کے معنی میں بھی فرق پڑے گا اور باریکی آوے گی۔اس لیے لفظوں کے نکالنے کی کوشش ٹھیک نہیں جچتی ہے۔

راجندر پرشاد

اردو زبان کا مفہوم بدلنے کی کوشش:

۱۹۳۹ء: جمعیت علماے ہند کا گیارھواں، سالانہ اجلاس منعقدہ ۳ ر تا ٦ ر مارچ ۱۹۳۹ء مولانا عبدالحق مدنی کی صدارت میں بہ مقام دہلی ہوا تھا۔اس جلسے میں جو قراردادیں پاس ہوئیں ان میں ایک اہم قرارداد ہندوستان کی قومی زبان کے بارے میں تھی۔قرارداد میں کہا گیا تھا:

''کانگریس نے ہندستانی زبان کی جو تعریف اپنی دستاویزوں میں کی ہے وہ یہ ہے کہ ہندستانی زبان وہ ہے جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔اس تعریف کے بہ موجب ہندستانی زبان اور اردو زبان کا مطلب ایک ہوجاتی ہے، مگر ہم بعض ذمے دار کانگریسیوں اور کانگریسی حکومتوں کے بعض ذمے دار افراد کا رویہ اس کے خلاف پاتے ہیں وہ قصداً موقع بے موقع سنسکرت کے ایسے نامانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں جو شمالی ہند میں تو درکنار

دوسرے صوبوں میں بھی نہیں بولے جاتے، جن کو سمجھنے سے بھی عام لوگ قاصر رہتے ہیں۔اس رویے سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کانگریسی حکومتیں نامحسوس طریق پر یہ کوششیں کررہی ہیں کہ ہندستانی زبان کو سنسکرت کے قالب میں ڈھال دیں اور خود اپنا متعین کیا ہوا ''ہندستانی زبان'' کا مفہوم بدل دیں۔ یہ رویہ یقیناً قابل افسوس ہے اور اس سے ہندوستان میں باہمی کش مکش بڑھنے اور مسلمانوں کو کانگریس سے بدظن کرنے کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا یہ اجلاس انڈین نیشنل کانگریس سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ جلدازجلد اس کا تدارک کرے۔

(جمعیت علماے ہند (دستاویزات اجلاس ہاے عام) مرتبہ پروین روزینہ،اسلام آباد،۱۹۸۱ء:ص ۶۴۶)

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ:

''حضرت مولانا سندھی نے ماہنامہ کتاب- لاہور کے اجرا کی تقریب سے اس کے کارکنان کو یہ تحریر عنایت فرمائی تھی۔ یہ رسالہ سید نذیر نیازی اور پروفیسر محمد سرور کی نگرانی میں جاری ہوا تھا۔ایم ظہیرالدین اس کے مدیر مسئول تھے۔ یہ رسالہ جنوری ۱۹۴۲ء سے نکلنا شروع ہوا اور اس کے پہلے شمارے ہی میں حضرت مولانا سندھی'' کی یہ تحریر شایع ہوئی تھی۔''

(ا-س-ش)

آرین قومیں جو وسطِ ایشیا سے اتر کر ایران اور ہند کی پرانی تہذیب کا مرکز بنیں وہ ایک ایسی زبان بولتی تھیں جو سنسکرت اور فارسی کے لیے ماں کا رتبہ رکھتی ہے۔اگر آپ اب تک اس حقیقت سے ناآشنا ہیں تو مولانا (محمد حسین) آزاد کی ''سخن دان پارس'' پڑھیے۔

ہماری ''اردو'' اس ام الالسنہ زبان کی قایم مقام ہے جو ہند کی ناگری اور ایران وتوران کی فارسی کی آمیزش سے پیدا ہوئی۔قدیم آریوں نے شمالی ہند کے اس خطے کو (جو پشتو بولنے والی قوموں کے وطن سے شروع ہوکر بنگال اور بندھیا چل پر ختم ہوتا ہے) اپنی تہذیب کا مرکز بنایا۔ پشاور، لاہور، دہلی، متھرا، اجودھیا، اجین، گیا کی تاریخ اس قدر خوبیوں کی مالک

ہے کہ قوموں کی برادری میں پرانا ہندی اول قطار میں بیٹھتا ہے۔ ۱۰۰۰ عیسوی دوسری ہزار کی ابتدا سے ہند کی نئی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ قدیم آریہ کے نقش قدم پر چل کر مسلم آریہ حملے شروع کرتا ہے۔ اس سے پہلے ایرانی تورانی قومیں عیسوی پہلے ہزار کے آخری حصے میں قرآن کی تہذیب سے رنگین ہو جاتی ہیں۔ بغداد کی عربی خلافت کی تاثیر سے بخارا اور غزنی میں قرآن کا بین الاقوامی انقلاب اپنا مستقل مرکز بنا لیتا ہے اور سنائی، رومی، فردوسی، نظامی، سعدی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ وہی آرین نسل ہے جو نئی ذہنیت اور نئے تمدن کی مالک بن چکی ہے۔ اس نے آریوں کی پرانی تاریخ کو سلطان محمود کے زمانے سے دہرانا شروع کیا اور دو سو سال کے قلیل عرصے میں آریہ ورت پر ہر پہلو سے قابض ہو گئے۔ اس طرح آرین نسل کے دونوں حصے سندھ اور گنگا جمنا کے کنارے پر پھر جمع ہو گئے انھیں کے امتزاج سے "نیا ہندوستان" اور ہماری دہلی کی "اردو" پیدا ہوئی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان مسلمان آریوں کے ساتھ اسلام کا سامی عنصر بہ طور مرشد اور استاذ ضرور شامل رہا، مگر اکثریت آرین قوموں کی ہی تھی۔

اس دور پر آٹھ سو برس سے ستاون سال زیادہ گزر جاتے ہیں کہ یورپ کی ایک آریہ قوم اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں، عالم گیر جیسے مسلم آرین ہندوستانی بادشاہوں کی اولاد سے تخت خلافت چھین لیتی ہے، مگر دہلی اپنی زبان کی ترقی میں کوتاہی نہیں کرتی۔ اس کے دونوں علمی ادارے دیوبند اور علی گڑھ جہاں تک ان سے بن پڑا سر توڑ کوشش کرتے رہے۔ کالج پارٹی نے اردو کا دامن یورپ کے اعلا علوم سے بھر دیا۔ دیوبندی نظام نے ایران و توران میں اردو بولنے والے علمی حلقے پیدا کر دیے۔

ہندوستان دنیا سے علاحدہ نہیں رہ سکتا، اس لیے آریہ ورت کو دکن اور بنگال کی طرح ایران و توران سے بھی برادرانہ تعلقات پیدا کرنا ہوں گے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اردو ہی آیندہ ہندوستان کا مستقبل روشن کر سکتی ہے۔ ہم اردو کی حیات کے لیے اس کے دونوں منبعوں فارسی اور ناگری کی مخلوط درس گاہیں قایم کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اس کی بین الاقوامیت کی تکمیل کے لیے انگریزی زبان کو اس کا ضمیمہ بنانا بھی مانتے ہیں، لیکن وہ پرانے ہندوستان کی ذہنیت جو ناگری کو آلہ بنا کر اردو کی بین الاقوامی قوت کو فنا کرنا اپنا قومی کام

سمجھتی ہے، ہم اس کے دشمن ہیں!

ہمیں اپنے نوجوان عزیزوں کی ہمت سے بفضلہ تعالیٰ توقع ہے کہ یہ نیا مجلہ جو اردو کے ایک تاریخی مرکز سے شایع ہوتا ہے اردو کی بین الاقوامی ترقی میں بڑی نام وری پیدا کرے گا۔ اگر خدا کو منظور ہے تو ہم اس مضمون کو اور پھیلا کر لکھیں گے۔ واللہ ہوالموفق!

عبیداللہ

اکتوبر ۹۴۱ ہندی ⓿

بیت الحکمت۔ جامعہ نگر دہلی

حاشیہ ⓿: مولانا سندھی ۱۰۰۰ء میں ہندوستان پر محمود غزنویؒ کے حملے سے نہ صرف تاریخ ہند کا ایک نیا دور مانتے ہیں بلکہ اس کی اہمیت ان کے نزدیک اتنی ہے کہ وہ ۱۰۰۰ء سے ہندوستان کا نیا کلینڈر بھی شروع کرتے ہیں، جسے وہ ہندی کلینڈر کہتے ہیں۔ اس تحریر پر مولانا سندھیؒ نے اکتوبر ۹۴۱ ہندی تاریخ تحریر درج کی ہے۔ اس میں شروع کی ۱۰۰۰ء شامل کر دیجیے تو ۱۹۴۱ء تاریخ بنتی ہے۔ یعنی اکتوبر ۱۹۴۱ء۔

(ا۔س۔ش)

زبان کے مسئلے پر مولانا حسین احمد صاحب کے ارشادات۔
انجمن ترقی اردو کے نمایندے کو جواب:

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ صدر جمعیت علماے ہند سے گورکھ پور میں ''انجمن ترقی اردو'' کے نمایندے نے اردو زبان کے سلسلے میں چند سوالات کیے تھے، وہ مع جوابات حسب ذیل ہیں:

سوالات:

(۱) کانگریس کے ذمے داران کی کھلی ہوئی اردو دشمنی کے متعلق آپ کی کیا تجویز ہے؟

(۲) پرشوتم داس ٹنڈن نے جو ہندی ساہتیہ سمیلن کے رکن خصوصی ہیں، سوراج کا ہندی زبان سے تعلق ظاہر کیا ہے؟ اور آل انڈیا ہندی جرنلسٹ کان پور کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ہندی قومیت ہے، قومیت کانگریس ہے اور کانگریس سوراج۔''

(لیڈر، ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۲ء)

(۳) اردو کا شرعی درجہ کیا ہے اور کیوں؟

(۴) آپ کا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے متحدہ قومیت ضروری ہے، تو کیا متحدہ زبان کی ضرورت نہیں ہے اور کیا اردو ہندوستان کی عام زبان ہے؟

(۵) ہندوستان کی عام زبان کیا ہے؟ اور کانگریس نے زبان کے مسئلے میں کس زبان کی قرارداد منظور کی ہے اور اس پر اب تک کیا عمل کیا گیا ہے؟

(۶) برطانوی ہندوستان میں اردو یونی ورسٹی کی تجویز زیر غور ہے۔ آپ کی رائے میں ذریعۂ تعلیم اپنی زبان ہو تو اس کے نتائج کیا ہوں گے؟

(۷) اس وقت تک آپ نے زبان کے مسئلے پر جو نہایت ہی اہم مسئلہ بن گیا ہے کوئی رائے نہیں دی۔ اس سے عوام میں ایک طرح کی بے چینی ہے۔

(۸) رسم الخط کے مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے ہندی یا اردو؟

(۹) گاندھی جی کی ہندستانی کیا ہے؟

نمائندہ انجمن ترقی اردو۔ دہلی

جوابات:

تمہید: اردو زبان نہ تو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور نہ ان کی سیاسی زبان ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے اور سیاسی زبان اخیر زمانۂ حکومتِ اسلامیہ تک فارسی رہی۔ اردو زبان ہندوستان ہی میں بنی، جس کا منشا ہندوستان کے باشندوں کو ایک زبان پر متفق کرنا تھا۔ جس کا سہرا سلاطینِ مغلیہ بالخصوص شہنشاہ اکبر کے سر پر ہے۔ اردو نے مقبولیت عامہ حاصل کی اور باوجود اس کے کہ اس کے بنانے اور پالنے والوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا، مگر وہ روز افزوں ترقی کرتی رہی۔ آج نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ہندوستان، افغانستان، ایران، عراق، شام، فلسطین، عرب، مصر، الجیریا، تیونس، برما، تبت، چین، جاوا، جاپان، فلپاین، امریکا، آسٹریلیا، ایسٹ افریقہ، ساؤتھ افریقہ، جزایر ہند چینی وغیرہ کے بڑے بڑے شہروں میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے چھوٹے بڑے شہروں اور دیہات وقصبات میں بھی اس زبان کا یہی طرۂ امتیاز ہے۔ اس لیے یقیناً یہی زبان یہ اہلیت رکھتی ہے کہ اس کو تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار دیا جائے۔ یہی زبان شمالی ہند (یوپی، پنجاب، بہار وغیرہ) کے عام حصوں کے باشندے خواہ

وہ ہندو ہوں یا مسلمان، استعمال کرتے ہیں۔ اس کی ترقی کے لیے کوشش کرنا حق بہ جانب ہے۔ مگر اس میں توسط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ افراط اور تفریط ہر امر میں خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ مسلمانوں کا اس امر میں اس قدر غلو کرنا کہ وہ آزادی کی اشد ضروری جدوجہد کو پس پشت ڈال دیں اور غلامی پر قناعت کرتے ہوئے دن رات اسی فکر میں لگے رہیں کہ اردو کی محافظت کی جائے، اسی کو ترقی دی جائے، اسی کے لیے ہر وقت جنگ و جدل کی جائے، آزادی کی مساعی میں بے توجہی ہوتی جائے، میرے نزدیک یہ غلامی کے قبیح نتائج ہیں۔ مسلمانوں نے جب کہ اپنی مذہبی اور سیاسی زبان چھوڑ دی اور ایک اجنبی زبان اختیار کرلی تو خواہ وہ اردو ہو یا ہندی ہو یا سنسکرت ہو یا گجراتی یا پشتو یا گورمکھی یا تامل یا بنگلہ یا انگریزی یا فرانسیسی یا چینی یا جاپانی وغیرہ سب برابر ہیں۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

مندرجۂ بالا تمہید کے بعد جوابات مندرجۂ ذیل ملاحظہ ہوں؛

(۱) جس شخص نے بھی اردو کی دشمنی میں اپنے آپ کو سرگرم رکھا ہو وہ اس کا ذمے دار ہے۔ وہ خواہ کانگریسی ہو یا مہا سبھائی ذمے دار ہو یا غیر ذمے دار، وہ بھی غلامانہ ذہنیت کا اسی طرح شکار ہے جس طرح اردو کی دوستی میں غلو اور افراط کرنے والا۔

(۲) پرشوتم داس ٹنڈن کے متعلق مذکورہ سوالات کے الفاظ اگر صحیح ہوں اور ان سے مراد وہی ہو جو سایل سمجھ رہا ہے تو وہ بھی اس کے اندر غلط کار غلامانہ ذہنیت ڈوایڈ اینڈ رول کے شکار ہیں!

(۳) اردو جب کہ شرعی زبان نہیں تو اس کا درجہ بھی وہی ہوگا جو کہ دنیا کی اور زبانوں کا۔

(۴) تمہید میں اس جواب گزر چکا ہے۔

(۵) ہندوستان کے بڑے شہروں میں اور یوپی، پنجاب، بہار وغیرہ کے عام حصوں میں بے شک اردو کو عام تسلط حاصل ہے۔ کانگریس نے ہندستانی کو عام زبان تسلیم کیا ہے۔ ہندوستان سے وہ زبان مراد ہے جو امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ صدر کانگریس نے دہلی کے اجلاس کانگریس میں ایک قرارداد غلط فہمی کو دور

کرنے کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ

"ہندستانی زبان سے کانگریس کی مراد وہ زبان ہے جو عام طریقے سے شمالی ہندوستان (یوپی، پنجاب، بہار وغیرہ) میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔"

اور اسی مفہوم کو ورکنگ کمیٹی کی جانب سے ایک ریزولیوشن کی شکل میں دہلی کے اسی اجلاس میں پیش کیا گیا تھا جس کی تحریک سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کی تھی۔ کانگریس اب تک اسی ریزولیوشن پر قایم ہے۔ اہل غرض اس میں اپنی اغراض شامل کر کے غلط کاریاں کر رہے ہیں۔

(۶) بہت اچھی تجویز ہے۔ ذریعہ تعلیم اپنی زبان ہو تو طلبا کو آسانی ہوگی اور علوم میں جلد کامیابی کی امید ہے۔

(۷) میرے نزدیک جیسا کہ تمہید سے واضح ہے، یہ فرعی مسئلہ ہے، سب سے زیادہ اہم اور اشد ضروری مسئلہ آزادی ہے جو کہ ہندوستانیوں کی تمام فلاکتوں اور مصیبتوں کے لیے تریاق اور نافع تر علاج ہے۔ ہندوستانیوں کی غلامی ہر قسم کے مصایب کی جڑ ہے۔ اسی غلامی کی وجہ سے (لڑاؤ اور حکومت کرو) کے ماتحت یہ اور اس قسم کے فتنے پیدا ہوتے ہیں اور کیے جاتے ہیں، تاکہ اتحاد کو برباد کیا جائے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بہ گذارند و سر طرۂ یارے گیرند

(۸) رسم الخط کے مسئلہ میں کانگریس فیصلہ کر چکی ہے، "فنڈامینٹل" دیکھیے۔

(۹) یہ سوال گاندھی جی ہی سے پوچھنا چاہیے، میں نے تو جب بھی ان کو بولتے ہوئے سنا نہایت سادہ اردو میں تقریر کرتے تھے۔

(زندگی-آلہ آباد: بابت ماہ مارچ ۱۹۴۵ء: ص ۱۴-۱۲)

۴رتا ۷رمئی ۱۹۴۵ء: زبان کے مسئلے کو جمعیت علمائے ہند فرقہ وارانہ بنیاد کے بجائے ملک وقوم کے وسیع تر مفاد میں حل کرنا چاہتی تھی، لیکن ملک میں جو فرقہ وارانہ تعصب کی فضا مسلم لیگ نے پیدا کر دی تھی اس سے بعض کانگریسی اور نیشنلسٹ ذہن متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ جمعیت کے اکابر کی اس پر نظر تھی، اس لیے اس نے اپنے چودھویں سالانہ اجلاس

میں یہ قرارداد پاس کی۔

جمعیت علماے ہند کا ایہ اجلاس یوپی صوبہ کانگریس کمیٹی کے بعض سرکردہ عہدے داروں اور کانگریس وزارت کے بعض اراکین کی اردو کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں کو قومی اور ملکی تحریک کے مفاد کے خلاف سمجھتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ جس طرح ہندوستان کی تقسیم کا تخیل بدیشی حکمرانوں کا پیدا کیا ہوا تخیل ہے اسی طرح اردو کو مسلمانوں کی زبان اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان کا تخیل بھی اجنبی حکمرانوں کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس کا مقصد ہندو مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج کو وسیع کرنا ہے۔

اس کانفرنس کی راے میں اردو (ہندستانی) ہندوستان کی کئی صدیوں سے مشترکہ زبان ہے اور کانگریس جیسی قومی جماعت کے ذمہ دار عہدے داروں اور سرکردہ اراکین کا اردو ہندی کی جھگڑے میں پڑکر اردو (ہندستانی) خلاف معاندانہ ذہنیت کا اظہار کرنا اور ہندی کی ترویج کے لیے کانگریس آرگنائزیشن میں اپنی پوزیشن سے ناجائز فایدہ اٹھانا قومی اور ملکی مفاد کے ساتھ صریح غداری سمجھتا ہے O۔

حاشیہ O: اردو کی عوامی اور علمی حیثیت کے بارے میں جمعیت علماے ہند کے بزرگوں کے خیالات ہمیشہ واضح رہے، اس کے مطابق جمعیت کی پالیسی تھی۔ قارئین کرام نے دو بزرگوں کے خیالات بھی مطالعہ فرماے اور جمعیت کی ایک قرارداد بھی پڑھی، افکار میں حقیقت ہے اور آرا میں توازن بھی! مستفسر کے سوالات میں ایک شرارت کی جھلک صاف محسوس کی جاسکتی ہے اسی طرح جوابات میں جواب دہندہ کے ذہن کے توازن، فکر کے اعتدال، راے کی اصابت، نظر کی باریکی، بیان میں بصیرت و تدبر اور عزایم میں استقلال کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ ان مختصر اور جامع جوابات نے حضرت شیخ الاسلام کی مدبرانہ شخصیت کے کتنے محاسن کو ظاہر کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے مراتب کو بلند فرماے۔ آمین

ایک خاص ذہنیت اور قومی زبان کا مسئلہ

(کانگریس اسمبلی پارٹی کی میٹنگ میں مولانا آزاد کی تقریر)

۱۴ ستمبر ۱۹۴۹ء: مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست نے سنجیدہ ذہنوں میں بھی نفرت و تعصب کا ایسا زہر گھولا تھا کہ ہندستانی زبان کے ایک سماجی اور متفقہ مسئلے کو بھی ہندو مسلم مسئلہ

بنادیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس میں یہ طے شدہ مسئلہ بھی تعصب کی بھینٹ چڑھ گیا۔
مولانا ابوالکلام آزاد کی انتہائی مخلصانہ کوشش اور مدبرانہ رائے بھی دلایل، فہم وفراست اور اخلاص کی روشنی میں زیر بحث لانے اور صحیح فیصلے تک پہنچنے کے بجائے فرقہ وارانہ تعصبات اور غلط جذبات کی نذر ہوگئی اور نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا آزاد کے قومی زبان نے متعلق ڈرافٹنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔

نئی دہلی-۱۴ر ستمبر ۱۹۴۹ء: مسئلہ زبان پر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ممبران کانگریس کی بدلی ہوئی ذہنیتوں پر سخت مایوسی کا اظہار کیا اور کہا:

''مسٹر آینگر کی طرف سے جو فارمولا پیش کیا گیا ہے وہ ہرگز میری منشا کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے کہ ذاتی طور پر میں ہندستانی کا حامی ہوں۔ یہی وہ زبان ہے جو شمالی ہندوستان میں بولی اور ملک میں سمجھی جاتی ہے، لیکن اس وقت ایسی فضا پیدا ہوچکی ہے جس کے پیش نظر صرف یہی ایک فارمولا تھا جس پر زیادہ ممبروں کو ایک جگہ جمع کیا جاسکا۔''

مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ مفصل تقریر ہے جس میں مسئلے کا تفصیل کے ساتھ جایزہ لیا ہے اور ہر پہلو کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مولانا کی اس تقریر کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ مولانا نے فرمایا:

''جب میں نے دیکھا کہ انڈین یونین میں مسلم لیگ کے ختم ہوجانے اور اس کے نقطۂ نظر کے مردہ ہوجانے کے بعد بھی ایک دو اصحاب کے سوا صاف دماغی سے غور کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے اور قومی زبان کے مسئلے میں دلیل اور فہم وفراست سے کام لینے کے بجائے غلط جذبات کی پیروی کی جارہی ہے اور انھیں جذبات پر اصرار کیا جارہا ہے تو میں نے ڈرافٹنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا اور یہ لکھ دیا کہ اس مسئلے میں خدمت نہیں کرسکتا۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ میں نے حق بات کہنے میں کبھی ان لاکھوں ہم مذہبوں کی پروا نہیں کی جو مجھے بت کی طرح پوجنے کے لیے تیار تھے۔ مین نے ان کی گالیاں سنیں اور آج تک سن رہا ہوں۔ اس لیے میں اس وقت بھی صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر ہاؤس اپنے ووٹوں کی اکثریت سے اس مسودے کے مطابق فیصلہ کر رہا ہے تو یہ حد درجے تنگ ذہنیت کا مظاہرہ ہوگا اور ایک ایسا فیصلہ ہوگا جس سے زیادہ غلط اور برا کوئی دوسرا فیصلہ نہیں

ہوسکتا۔ بیچ کی راہ وہی تھی جس کو میں نے پچھلے اجلاس میں دلایل کے ساتھ واضح کیا تھا کہ ہندستانی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو سرکاری حیثیت دیتے ہوئے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ سرکاری اطلاعات اور کورٹ میں درخواستیں وغیرہ اردو میں بھی دی جاسکتی ہیں اور قبول کی جائیں۔'' (پندرہ روزہ ''قومی زبان'' کراچی، ۱۶/اکتوبر ۱۹۴۹ء)

اردو کی خلاف غلط انداز فکر اور ڈرافٹنگ کمیٹی سے مولانا ابوالکلام آزاد کا استعفیٰ:

ستمبر ۱۹۴۹ء: ہندوستان کی قومی زبان کے فیصلے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے ایک ممبر مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ وہ ہندوستان کے وزیر تعلیم بھی تھے، لیکن اس حیثیت سے زیادہ ان کو خصوصیت یہ تھی کہ اس مسئلے میں سب سے زیادہ صایب الرائے اور مشورہ دینے کے اہل شاید وہی تھے۔ وہ اردو ہندی کش مکش میں ایک بلند خیال اور ملکی وقومی مفاد و مصالح کو سمجھنے والے اور سب سے زیادہ فکر کرنے والے تھے۔ وہ لسانی قومی تعصبات سے بلند شخصیت کے مالک تھے۔ کمیٹی کے اراکین کے خیالات سن کر اور رجحانات دیکھ کر انھوں نے کوشش کی کہ ارکان فراغ قلبی، بلند خیالی اور قومی مفاد کے گہرے شعور کے ساتھ قومی زبان کے بارے میں رائے دیں، لیکن انھوں نے دیکھا کہ دلایل کی محکمی سے انکار نہ کرنے کے باوجود لسانی تعصب سے بلند ہو کر فیصلہ کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں۔

مولانا آزاد چاہتے تھے کہ اردو ہندی کے قضیے میں الجھے بغیر ''ہندستانی'' کو قومی زبان تسلیم کرلیا جائے۔ جیسا کہ گاندھی جی کے منشا کے مطابق راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق کے مابین ۱۹۳۷ء میں اس اہم قومی مسئلے پر فیصلہ ہو کر معاہدہ طے پا گیا تھا اور خود مولانا آزاد کے بیان کے مطابق اس سے پہلے ''مہاتما گاندھی اور پنڈت موتی لال نہرو کے مشورے سے یہ طے ہوا تھا کہ ہمیں ہندی اور اردو میں سے کوئی لفظ نہ لینا چاہیے، بلکہ ہندستانی کا لفظ اختیار کیا جائے، کیوں کہ اس میں ایک قسم کی لچک پائی جاتی ہے اور یہ زبان ان تمام ردیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے جو شمالی ہند میں پیدا ہو گئے ہیں۔'' (آزاد کی تقریریں: مرتبہ انور عارف۔ کراچی، ۱۹۶۱ء: ص ۲۷۳) یہ ۱۹۲۸ء کا فیصلہ تھا اور اس فیصلے پر ۱۹۳۷ء تک کوئی اعتراض و

اختلاف پیدا نہ ہوا تھا۔

مولانا نے یہ بات پوری طرح محسوس کر لی کہ کمیٹی کے ارکان کو ان کے غلط انداز فکر اور ان کی رائے اور فیصلے کو بدلا نہیں جا سکتا تو ڈرافٹنگ کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ ملک کے ہر طبقۂ خیال میں اس صورت حال سنگینی اور قومی مسایل میں غلط انداز فکر کی زہرناکی اور اس کی ہلاکت خیزی کو خاص طور پر محسوس کر لیا گیا۔ اس صورت حال سے متاثر ہو کر ماہ نامہ آستانہ- دہلی کے ایڈیٹر مستحسن فاروقی صاحب نے ذیل کا اداریہ لکھا تھا۔ آستانہ- دہلی کا یہ اداریہ ''اردو کے خلاف فرقہ پرستوں کا طوفان'' (اور) مولانا ابوالکلام آزاد کا استعفا'' کے دہرے عنوان سے شایع ہوا تھا، ملاحظہ فرمائیں:

''اردو کی مخالفت کا جنون اب اس حد تک ترقی حاصل کر چکا ہے کہ اس سلسلے میں تاریخی حقایق و دلایل کا پیش کرنا ایک سعی لاحاصل ہے۔ ڈرافٹنگ کمیٹی میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر روشن خیال ارکان نے دلایل و براہین کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ اردو ہندو مسلمانوں کا ایک مشترکہ سرمایہ ہے۔ ان کے اتحاد کی ایک غیر فانی یادگار اور ایک مقدس میراث ہے۔

بعض فاضل ممبران نے روس اور سویزرلینڈ کی مثالیں بھی پیش کیں کہ وہاں کئی زبانیں عام طور پر بولی جاتی اور سمجھی جاتی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صدر کانگریس ڈاکٹر سیتا رامیہ نے بھی یہ ارشاد فرمایا کہ

''اردو لندن یا واشنگٹن سے ہندوستان نہیں آئی ہے، بلکہ یہ اسی ملک میں پیدا ہوئی اور اسی ملک میں پروان چڑھی ہے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی کے بیانات بھی پیش کیے گئے جن میں آں جہانی نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اردو ہندو مسلم ملاپ کی ایک یادگار ہے اور سرکاری دفاتر اور سرکاری مدارس میں اردو اور ہندی دونوں رسم الخط جاری رہنے چاہییں۔''

اور تمام اہم دلیل کے بعد بھی فرقہ پرست ممبران کی طرف سے اردو کی شدید مخالفت جاری رہی اور اسے (ایک غیر ملکی زبان ثابت کرنے کی کوشش کی گئی)۔

یہ فرقہ پرستی کا مظاہرہ اس قدر روح فرسا اور افسوس ناک تھا کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد جیسے متین اور سنجیدہ بزرگ بھی اسے برداشت نہ کر سکے اور ڈرافٹنگ کمیٹی سے استعفیٰ

دینے پر مجبور ہو گئے۔ استعفیٰ دیتے وقت حضرت مولانا نے جو بیان شائع کیا ہے وہ ایک درسِ عبرت ہے۔ حضرت موصوف فرماتے ہیں:

''میں نے جب یہ دیکھا کہ عقل و بصیرت کی حدیں ختم ہو رہی ہیں اور غلط جذبات کا سمندر پوری شان کے ساتھ موجزن ہے تو میرے لیے اس کے سوا کوئی راہِ عمل نہ تھی کہ میں ڈرافٹنگ کمیٹی سے استعفیٰ پیش کردوں۔ میں کسی فرقہ وارانہ تحریک کی تائید نہیں کرسکتا۔ اگر میں اس طرزِ عمل کو پسند کرتا تو ان لوگوں سے دور نہ رہتا جو مجھے بت کی طرح پوجنا چاہتے تھے۔''

یہ کسی جذبات پرست انسان کا بیان نہیں بلکہ ایک ایسے شخص کا بیان ہے جو اپنے حلقۂ اثر میں کوہِ استقلال سمجھا جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ فرقہ پرستوں نے اس بیان کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ان حالات میں ہمیں اس تجویز سے کامل تر اتفاق ہے کہ مشترکہ سرمایے اور مشترکہ دولت کے افسانے کو ختم کرکے مسلم اقلیت کو باضابطہ اپنی سیکولر اسٹیٹ سے یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ اردو مسلمانوں کی قومی زبان ہے اور سیکولر اسٹیٹ کو اس زبان کی حفاظت کرنی چاہیے۔

(ماہنامہ آستانہ-دہلی: بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۹ء: ص ۱۰)

زبان کا مسئلہ، افاداتِ عالیہ حضرت شیخ الاسلامؒ:

۱۹۵۱ء: زبان کے مسئلے پر حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنے خطبۂ صدارت سترھویں اجلاس عام منعقدہ حیدرآباد دکن مورخہ ۲۷ر تا ۲۹ر اپریل ۱۹۵۱ء میں بھی ان بلند اور پُر حقیقت خیالات عالیہ کا اظہار فرمایا:

''ہمارے ملک کی پارلیمنٹ نے ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان قرار دیا ہے۔ بہت سے اداروں کی کوشش یہ ہے کہ ہندی ادب کو مختلف علوم وفنون کا حامل بنایا جائے اور ہندی زبان کو ایسی ترقی یافتہ زبان بنادیا جائے کہ پندرہ سال کے اندر وہ انگریزی کی جگہ لے سکے۔

مسلمان جو کم وبیش سو برس تک غیر ملکی زبان یعنی انگریزی کو فروغ دینے میں سرگرم

عمل رہے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہندی سے نفرت کریں یا اس کو علمی زبان بنانے کی کوششوں میں حصہ نہ لیں۔ انگریزی بہت سے سمندروں کو پار کر کے ہندوستان پہنچی تھی، لیکن ہندی زبان کسی دوسرے ملک سے نہیں آئی، وہ خود ان کے ملک میں پیدا ہوئی اور بہت سے علاقوں میں خود مسلمانوں نے اس کی تلقین میں حصہ لیا۔

لیکن اس جد وجہد کے ساتھ اس حیثیت اور اس اہمیت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ جو ہند یونین میں اردو کو حاصل ہے۔ انصاف اور جمہوری ملک کی جمہوریت کا تقاضا ہے کہ جو تہذیب وثقافت یا جو کلچر بھی اس کے حدود مملکت میں نشو ونما پا چکا ہے اس کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا مساوی طور پر موقع دیا جائے۔

اور اگر کوئی زبان یا کوئی تہذیب اپنی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے جمہوریت کے مزاج سے خاص مناسبت رکھتی ہو تو اس کی ترقی اور حوصلہ افزائی لامحالہ خود جمہوریت کی تائید وتقویت ہوگی۔ اردو زبان کی فطرت جمہوری واقع ہوئی ہے، جس طرح انڈین یونین مختلف تہذیبوں اور مختلف فرقوں کے سنبل وریحاں کا گلشن ہے، ٹھیک اسی طرح اردو یا ہندستانی زبان گل ہائے رنگارنگ کا خوب صورت گلدستہ ہے۔

اردو کو کسی خاص فرقے یا مذہب کی زبان قرار دینا نہ صرف یہ کہ اردو اور اس کی تاریخ پر بہت بڑا ظلم ہے، بلکہ تاریخی حقایق اور خود اپنے مشاہدات پر ظلم وستم کا ایک نقاب ڈال دینا ہے۔

اردو شاہی محلات یا مسلمانوں کے گھروں میں پیدا نہیں ہوئی، بلکہ بازاروں، مشترک مجلسوں، مشترک تفریح گاہوں میں اس نے جنم لیا اور ہندو مسلمانوں کے گھروں میں ملک کی مشترک دولت بن کر داخل ہوئی۔ اس کے جنم داتا صرف حضرت سلطان الاولیا سلطان نظام الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز نہیں بلکہ جس طرح حضرت موصوف نے اس زبان کی تخم پاشی کی اسی طرح ہردیو، سنبل دیو اور چیتل دیو وغیرہ نے اس کی تخم ریزی میں حصہ لیا۔

آج بھی ہند یونین کے گھروں، بازاروں، تفریح گاہوں اور عام مجالس میں اسی زبان کا سکہ رائج ہے، یہی زبان انڈین یونین کے شمال وجنوب میں رابطۂ اتحاد ہے اور یہی زبان مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال میں اتصال پیدا کر رہی ہے۔

آج اگر آپ ہندوستان سے باہر جائیں تو جس طرح آپ کے فرقہ وارانہ خدوخال کو مٹا کر صرف ایک انڈین یا ہندی کا لفظ آپ کے تعارف کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے ایسے ہی اردو زبان آپ سب کی مشترک زبان مانی جاتی ہے اور غیر ملکی شخص اسی اردو کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ بول کر آپ سے انسیت کا اظہار کرتا ہے۔

اردو کی اسی جمہوری فطرت کا یہ اثر ہے کہ باوجودے کہ آج تک کوئی ترقی پذیر سیاسی اور سرکاری اقتدار اس کو نصیب نہیں ہوا، لیکن امریکا کی قومی جغرافیائی سوسائٹی کی تحقیق کے بہ موجب انگریزی کے بعد صرف اردو ہی کو یہ مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے بولنے والے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

آج دنیا کے بین الاقوامی ادب میں اگر ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں سے کسی نے نمایاں حیثیت حاصل کی ہے تو وہ صرف اردو اور بنگالی ہے۔ ان دونوں زبانوں کی ادبی اور علمی تصانیف کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

بہ ہر حال اس زبان کی عام مقبولیت تاریخی محبوبیت اور ہندو مسلم میل جول کی چلتی پھرتی دل کش تصویر ہونے کی بنا پر ضروری تو یہ تھا کہ مہاتما گاندھی کی تمنا پوری ہوتی اور ہندستانی کو ملک کی سرکاری زبان قرار دیا جاتا۔

دستور ساز اسمبلی نے اگر چہ اردو کو یہ حیثیت نہیں دی۔ تاہم مقام اطمینان ہے کہ جمہوریۂ ہند کے دستور اساسی نے اس کو ملک کی ایک ایسی مادری زبان قرار دیا ہے جو صوبہ جات میں بولی جاتی ہے اور ثانوی حیثیت میں سرکاری زبان بن سکتی ہے۔

لیکن ہم چشم پوشی نہیں کر سکتے، مختلف صوبہ جات کے محکمہ ہائے تعلیم اور سررشتہ تعلیم کے بہت سے افسر اور اسی طرح مختلف محکموں کے کارپرداز مسلسل کوشش کر رہے ہیں کہ اردو کی اہمیت کو ختم کیا جائے اور اس کو کسی صوبے میں بھی علاقائی زبان نہ رہنے دیا جائے، یہ تعصب کی افسوس ناک کوتاہ بینی اور تنگ نظری ہے کہ وہ اردو کو ہندی کا حریف سمجھ کر کوشش کر رہے ہیں کہ اردو کو ملک سے ناپید کر دیا جائے۔

اسکولوں، دفتروں، سڑکوں، اور ریلوے کے بورڈوں سے اردو مٹانے کے بعد بھی جب اطمینان نصیب نہ ہوا تو کوشش یہ کی گئی کہ اردو بولنے والوں کے اعداد و شمار کو زبردستی کم

کیا جائے۔ یعنی ایک عمل کر گزرنے کے بعد کوشش کی گئی کہ اس کی دلیل گھڑلی جائے۔

اس طرح نہ صرف یہ کہ ایک حقیقت پر جو آفتاب عالم کی طرح تاباں اور درخشاں ہے۔ پردہ ڈالنے کی مضحکہ انگیز کوشش کی جارہی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آزاد جمہوریۂ ہند کے موزوں ترین دستور کی تردید کی جارہی ہے اور اس کی بقا اور ترقی کے راستے بھی زبردستی بند کیے جارہے ہیں۔

مرکزی حکومت کے نقطۂ نظر کے خلاف بہ ظاہر اردو کو خالص مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اس ''معصوم اور بے خطا'' کے ساتھ یہ ناروا سلوک کیا جارہا ہے، لیکن اگر تعصب کی عینک لگا کر زبان کے مسئلے پر نظر ڈالی جاتی ہے تو نہ مسئلے کی اصل حقیقت سامنے آسکتی ہے اور نہ وطن کی کوئی خدمت انجام پاسکتی ہے۔

محبان وطن کا فرض ہے کہ زبان کے مسئلے پر صرف لسانی نقطۂ نظر سے غور کریں اور اسی حیثیت کو سامنے رکھ کر مختلف جذبات کا احترام کرتے ہوئے پیچیدگیوں کا حل تلاش کریں۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس طرزِ عمل سے جو زبان کے بارے میں اختیار کیا جارہا ہے۔ کام کو مختصر کیا جارہا ہے یا نئی زبان اور غیر مانوس الفاظ کا بار ڈال کر کام کو مشکل بنایا جارہا ہے اور بالخصوص بچوں کی تعلیم کو (جو زیادہ سے زیادہ سہل اور عام فہم انداز میں ہونی چاہیے) مشکل اور پیچیدہ بنایا جارہا ہے۔

اس بحرانی کیفیت کے باوجود ہمیں مسرت ہے کہ تاریکیوں میں بھی کچھ روشن ستارے نظر آرہے ہیں اور اکثریت ہی کے افراد میں سے ایک کافی تعداد صاف دماغ اور انصاف پسند دوستوں کی موجود ہے، جنھوں نے اس بحرانی دور میں بھی انصاف کا دامن نہیں چھوڑا، ان کی مسلسل کوشش یہ ہے کہ یہ تاریکی ختم ہو اور حقیقت اپنی تابانیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی جدوجہد کامیاب ہوگی، کیوں کہ زیادہ عرصے تک حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ بالآخر انصاف اور صداقت ہی کو کامیابی نصیب ہوا کرتی ہے۔

مخالفین اردو کے رویے پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ صرف تنقید یا واویلا سے اردو محفوظ نہیں رہ سکتی۔

اگر آپ فی الواقع اردو کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حوصلہ افزائی کے لیے آپ کو

ایثار کرنا پڑے گا۔ صرف گفتگو کرنے سے زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ زبان کی اصل زندگی اس کا لٹریچر ہے۔ اخبارات و رسایل، دارالمطالعے لائبریریاں اور تصنیف و تالیف کے وہ ادارے جو اردو زبان کو زیادہ سے زیادہ علمی جواہر سے مرصع کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں، زبان کا اصل سرمایہ ہیں۔ ان کو ترقی دینا ان کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے اور اگر ہم اردو زبان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس فریضے کی انجام دہی میں پورے ایثار سے کام لینا ہوگا۔ (خطبات صدارت: اشاعت گوجرانوالہ (پاکستان) ۱۹۹۰ء: ص ۵۲-۲۴۸)

مطبوعات

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے متعلق کتب کی اشاعت کا فکری اور منفرد ادارہ

(۱) شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ - ایک سیاسی مطالعہ

حضرت مدنیؒ کی شخصیت وسیرت، مشاہدات وتاثرات، سیاسی افکار وخدمات، اخلاقی اور روحانی مقام، نوادر علمیہ پر اہل قلم کے نادر مضامین قیمتی مجموعہ۔

مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۲) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ - ایک سیاسی مطالعہ

حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی خطبات وفتاویٰ اور خطوط وپیغامات کا قیمتی مجموعہ

تالیف: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۳) برصغیر پاک وہند کی شرعی حیثیت

تالیف: حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ۔ مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۴) فتویٰ دار الحرب - تاریخی وسیاسی مطالعہ

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کا فتویٰ جو تحریک آزادی کا سبب بنا۔

تالیف: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۵) مکتوبات شیخ الاسلامؒ (مکمل)

حضرت شیخ الاسلامؒ کے خطوط کا مجموعہ مع دس جدید خطوط۔ چار حصے دو جلد میں

مرتبہ: حضرت مولانا نجم الدین اصلاحیؒ

(۶) مکتوبات شیخ الاسلامؒ (سلوک طریقت)

حضرت مدنیؒ کے وہ مکاتیب جو تصوف سے متعلق ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ اور فدائے ملت حضرت مولانا السید اسعد مدنیؒ کی فرمائش پر

حضرت مولانا محمود احمد صاحبؒ نے جمع فرمائے ہیں۔

(۷) ایمان افروز باتیں

رموز تصوف، مسایل علمیہ، معارف وحقایق، پند وموعظت اور سیاست ماضیہ پر مشتمل حضرت مدنیؒ کے علوم ومعارف کا فکر انگیز وایمان افروز مجموعہ

مرتبہ: حضرت مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی

(۸) علمائے ہند کا سیاسی موقف

برصغیر پاک وہند کی تحریک آزادی میں علمائے حق کا موقف اور کردار خوب وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تحریر: حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ،

تکمیل وتدوین: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۹) مناقب شیخ الاسلامؒ

حضرت مدنیؒ کی وفات پر اہل علم کے مضامین شایع ہوئے تھے، انہیں حضرت مولانا افضال الٰہی قاسمیؒ نے جمع کیا ہے۔

(۱۰) معارف مدنیہ (تین جلد)

جامع ترمذی (جلد اول) کی آسان اردو شرح

افادات: حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ

مؤلف: حضرت مولانا طاہر حسن امروہیؒ

(۱۱) نقش حیات

حضرت مدنیؒ کی خودنوشت سوانح، جس کا ایک ایک نقش ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔

(۱۲) تحریک اتحاد بین المسلمین اور جمعیت علمائے ہند

تالیف: حضرت مولانا سید اخلاق حسین قاسمیؒ

تدوین: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۱۳) نسبت مدنی اور اس کے احترام کے معلم

فدائے ملت امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کی صفت عالیہ پر ایک تحریر

از: حافظ تنویر احمد شریفی

(۱۴) تذکرۂ شیخ الہندؒ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ کے حالات زندگی اور خدمات عالیہ پر ایک گراں قدر علمی اور تحقیقی مجموعہ مع اضافات جدیدہ

تصنیفات: حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ دہلویؒ، سید الملت حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ۔ تالیف وتدوین: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(۱۵) سیاسی ڈائری (۸ جلد)

حضرت مدنیؒ کی سیاسی ڈائری، جس میں تحریک آزادی کا پس منظر، کون کیا تھا؟ کانگریس، مسلم لیگ، جمعیت علمائے ہند کی تاریخ نہایت تفصیل کے ساتھ افکار و اخبار کی روشنی میں۔

تالیف: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری